عقائد و نظریات اور معاملات سے تعلق رکھنے والے

کئی اہم مسائل کا شرعی حل اور ان پر دلائل کا ایک مضبوط ذخیرہ بنام

انوار الفتاویٰ

از قلم

مفتی محمد اسماعیل حسین نورانی

فرید بک سٹال

۳۸۔ اردو بازار لاہور

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہ ہو (الانبیاء: ۷)

عقائد ونظریات اور معاملات سے تعلق رکھنے والے
کئی اہم مسائل کا شرعی حل اور ان پر دلائل کا ایک
مضبوط ذخیرہ بنام

انوار الفتاوٰی

(جلد اوّل)

از قلم
مفتی محمد اسماعیل حسین نورانی
جامعہ انوار القرآن، گلشن اقبال کراچی

ناشر
فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور

فہرست

انوارُ الفتاویٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیثِ دل

الحمد للّٰہ رب العالمینO والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیّد
المرسلینO وعلیٰ آلہ الطیبین واصحابہ الطاھرینO
ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدینO

ماہ ربیع الاول 1428ھ/ اپریل 2007ء میں پہلی مرتبہ ''انوار الفتاویٰ'' کے نام سے دارالافتاء جامعہ انوار القرآن (گلشن اقبال' کراچی) کے کچھ منتخب فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ فرید بک سٹال نے نہایت قلیل عرصہ میں بہت عرق ریزی کرکے اس کو مارکیٹ میں پیش کیا۔ چونکہ فتاویٰ کا یہ مجموعہ اہل علم کے لیے نہیں' بلکہ عام لوگوں کی رہنمائی کے لیے شائع کیا گیا تھا اور اس کا طرزِ بیاں بھی بہت سہل تھا' اس لیے عوام الناس میں اس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور پھر عادت کے مطابق لوگوں نے اس کی دوسری جلد کا مطالبہ شروع کردیا۔
اس عرصہ میں بعض نامور علماء کرام نے بھی انوار الفتاویٰ کو شرف ملاحظہ بخشا اور اپنی گرانقدر آراء وتأثرات سے نوازا۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت علامہ مفتی محمد وسیم اختر القادری (رئیس دارالافتاء بہارِ شریعت مسجد' بہادر آباد' کراچی) قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے فقیر کی درخواست پر اس مجموعہ کا تنقیدی نظر سے بالاستیعاب جائزہ لیا اور بہت ذمہ داری کے ساتھ اصلاح کا فریضہ سرانجام دیا۔ بعض فتاویٰ میں انہوں نے کچھ مفید قیودات کا اضافہ کرنے کی طرف رہنمائی کی اور بعض فتاویٰ میں فقیر کے تحریر کردہ جواب سے اختلاف کرتے ہوئے دلائل کے ساتھ اپنا مؤقف بیان کیا۔

چنانچہ پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت زیرنظر ایڈیشن میں جو بڑی تبدیلیاں کی گئی ہیں' ان کے عنوانات اور صفحہ نمبر نوٹ کرنا قارئین کے لیے ضروری ہیں تاکہ پہلے ایڈیشن کی غلطی اور دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح واضح ہوجائے:

(1) سسرال میں نماز قصر ادا کرنا (ص179 پہلا ایڈیشن)
(2) اپنے کافر ہو جانے کی قسم اٹھانے کا شرعی حکم (ص128)
(3) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے نکاح کا شرعی حکم (ص25,249)
(4) اپنی خوشی سے قرض کی رقم اضافہ کے ساتھ لوٹانا (ص365)
(5) بغیر ثبوت وصیت کی شرعی حیثیت (ص377)
(6) کمپنی کی طرف سے جاری ہونے والے واجبات کا شرعی حکم (ص393,392)

یہ وہ عنوانات اور مسائل ہیں جن میں سے بعض میں کم اور بعض میں زیادہ تبدیلی کی گئی ہے' حتیٰ کہ دو تین مقامات پر پچھلا جواب کالعدم کر کے نئے سرے سے جواب تحریر کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ نیا ایڈیشن قارئین کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ نیز گزشتہ ایڈیشن میں شراکت کے کاروبار کے حوالہ سے ایک سوال کے جواب میں کچھ تشنگی تھی اور سائل کی طرف سے بھی اُس سوال میں کچھ تبدیلی سامنے آئی' جس کے پیش نظر اُسے موجودہ ایڈیشن سے نکال دیا گیا ہے اور سرِ دست اُس کے جواب پر تحقیق جاری ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ انوار الفتاویٰ کی جلد دوم میں اس کو مکمل تحقیق کے ساتھ شامل کیا جائے گا۔

میں یہاں مفتی وسیم صاحب اور اُن تمام علماء' اصدقاء اور رفقاء کا شکر گزار ہوں جنہوں نے کسی بھی حوالہ سے اس کتاب کو بہتر بنانے میں اپنی قیمتی رائے سے اس فقیر کو نوازا۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو نافع بنائے اور اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں سید محسن اعجاز (فرید بک سٹال) کی جو کوشش ہے' اس کو قبول فرمائے اور انہیں اس کی بہترین جزاء عطا فرمائے۔

یہاں پر یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ فرید بک سٹال جیسے معروف طباعتی ادارہ سے فقیر کا اس کم عمری میں تعلق قطعاً ممکن نہ تھا' اگر درمیان میں مفسّرِ قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ کی شخصیت نہ ہوتی۔ فقیر پر آپ کی بے شمار عنایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ نے فقیر کو تصنیف و تالیف کا طریقہ سکھایا اور نہ صرف سکھایا بلکہ تفسیر خازن کے ترجمہ و تحقیق جیسا گراں قدر کام ذمہ لگا کر ہمیشہ کے لیے شعبۂ تصنیف و تحقیق سے وابستہ کر دیا اور فرید بک سٹال سے تعلق قائم کروا کے کتاب کی اشاعت کا مسئلہ حل فرما دیا۔ یوں انوار الفتاویٰ

کے نام سے مسائل شرعیہ کے بیان پر مشتمل یہ کتاب بھی حضرت استاذِ مکرم ہی کے سلسلۂ فیضان کی ایک کڑی ہے۔

نیز یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ فقیر تصنیف و تالیف کے یہ تمام کام جس ادارہ میں انجام دے رہا ہے وہ جامعہ انوار القرآن (مدنی مسجد گلشن اقبال) ہے۔ جو بحمدہٖ تعالیٰ استاذ العلماء حضرت علامہ محمد حسن حقانی اشرفی مدظلہ العالی کے زیر سایہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔[1] ان کی علمی، فکری اور روحانی سرپرستی میں فقیر کافی عرصہ سے اس ادارہ میں تدریس، تالیف اور افتاء کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ بشمول ان کی شخصیت کے کئی جید اساتذہ مثلاً شیخ الحدیث علامہ غلام جیلانی اشرفی، علامہ مولانا محمد رضوان احمد نقشبندی، حضرت علامہ مولانا محمد اسحاق قادری رضوی اور علامہ مولانا محمد یونس شاکر قادری رضوی دامت برکاتہم سے فقیر نے اسی ادارہ میں درس نظامی پڑھا ہے۔

اس ادارہ میں رہتے ہوئے افتاء کے دوران فقیر نے جہاں استاذ العلماء علامہ محمد حسن حقانی اشرفی اور علامہ غلام جیلانی اشرفی مدظلہما العالی سے استفادہ کیا، وہاں ساتھ ہی مفسر قرآن علامہ غلام رسول سعیدی، فقیہ ملت مفتی منیب الرحمٰن اور مفتیٔ اہل سنت مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی دامت برکاتہم العالیہ سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے۔ ان میں مفسر قرآن علامہ سعیدی مدظلہ کی فقاہت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ تبیان القرآن کے نام سے تفسیر کی 12 مجلدات، شرح صحیح مسلم کے نام سے شرح حدیث کی 7 ضخیم مجلدات اور اب نعمۃ الباری

[1] 17 جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ بمطابق ۱۱ جون ۲۰۰۹ء بروز جمعرات قبیل المغرب حضرت اس دُنیا سے رحلت فرما گئے۔ اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون O حضرت کا سانحۂ ارتحال تمام مسلمانوں کے لیے بالخصوص ہم تشنگانِ علم کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم اس صدمہ پر صبر کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں دست بہ دُعا ہیں کہ ربّ کریم اُن کی مرقدِ انور پر ہمیشہ ہمیشہ رحمت کے پھول برسائے۔ دینِ متین کی ترویج و ترقی کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں جو قربانیاں دیں اور کارنامے انجام دیئے وہ سب مقبول و ماجور ہوں اور "جامعہ انوار القرآن" کے نام سے ایک مضبوط اور فیض آفرین ادارہ قائم کر کے جو مشن وہ ہمیں دے کر رخصت ہوئے ہیں، ربّ کریم اُس پر اخلاص کے ساتھ ہمیں قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(حضرت کی شخصیت پر مستقل مضمون اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔)

کے نام سے صحیح بخاری پر مفصل تحقیقی کام حضرت کی جلالت علمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
فقیہ ملّت مفتی منیب الرحمٰن مدّ ظلّہ کا علمی اور فقہی مقام بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تفہیم المسائل کے نام سے تادمِ تحریر 4 جلدوں پر مشتمل اُن کا علمی اور تحقیقی کام اُن کے ''فقیہ ملّت'' ہونے کا روشن ثبوت ہے۔ اسی طرح علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی مدّ ظلّہ بھی اہل سنت کے صاحبانِ تحقیق اور اربابِ قلم میں ممتاز اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ فقہی جزئیات پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت دسترس اور وسیع نظر عطا فرمائی ہے۔ جس کی روشن دلیل آپ کے قلم سے جاری ہونے والے بے شمار علمی اور تحقیقی فتاویٰ ہیں' جو اگرچہ تا حال شائع نہیں ہوئے' لیکن فقیر کو اُن میں سے متعدد فتاویٰ کی زیارت اور مطالعہ کا شرف حاصل ہے' اور انشاء اللہ جب ان کے شائع ہونے کا کوئی انتظام ہوگا تو آپ کی وُسعتِ علمی اور قلم کی پختگی کا یہ دعویٰ بالکل واضح اور مبرھن ہو جائے گا۔

فقیر کو بحمدہٖ تعالیٰ ان جمیع شخصیات سے اکتسابِ فیض کا شرف حاصل ہے۔ اور مختلف مسائل میں ان کی ہدایت اور رہنمائی قدم قدم پر شاملِ حال ہے۔ اور ان سب پر مستزاد (کرم بالائے کرم) وہ خصوصی نظرِ عنایت ہے جو فقیر کو مرشد گرامی قائد اہل سنت علامہ شاہ احمد نورانی صدّیقی علیہ الرحمہ سے حاصل ہوئی ہے۔ فقیر نے آپ سے بے شمار دُعائیں' نصیحتیں اور شفقتیں پائی ہیں۔

سو فقیر کی تالیف یا تدریس میں جہاں بھی کوئی حسن اور خوبی ہے' وہ بلا شبہ استاذ العلماء علامہ حقانی اور قائد اہل سنت علامہ نورانی سے لے کر محدث بے بدل استاذ مکرم علامہ سعیدی تک فقیر کے جتنے علمی اور روحانی سرپرست ہیں' ان کی طرف راجع ہے اور جہاں کہیں نقص اور خامی ہے' وہ فقیر کی اپنی غفلت کی طرف راجع ہے۔

اللہ رب کریم میرے ان تمام علمی اور رُوحانی سرپرستوں کا فیض تا ابد جاری و ساری رکھے اور ان کے طفیل مجھے اور جمیع قارئین کو علم و عمل کی ترقی' جان و مال' عزت و آبرو کی حفاظت' ایمان کی سلامتی اور ایمان پر خاتمہ بالخیر نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

محمد اسماعیل قادری نورانی

(مفتی و مدرس جامعہ انوار القرآن' گلشن اقبال' کراچی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف کتاب

استاذ العلماء حضرت علامہ مفتی محمد حسن حقانی اشرفی
(پرنسپل جامعہ انوار القرآن گلشن اقبال کراچی)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم اما بعد فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم. فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون.

اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسا طبقہ ہونا ضروری ہے جو دین میں سمجھ اور فقاہت پیدا کرنے کے لیے اپنا وقت صرف کر کے جہاں یہ نعمت مل سکے وہاں جائے اور دین کی سمجھ حاصل کرنے کے بعد قوم کو برے افعال و اعمال سے خوب اچھی طرح آگاہ کرے تاکہ قوم کے افراد بدعقیدگی' بے دینی اور حرام کے ارتکاب سے بچیں۔

سرکار دو عالم نبی محترم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین''۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کے لیے خیر اور بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں سمجھ اور فقاہت عطا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ علم دین میں فقاہت حاصل کر کے شرعی قوانین (قرآن وحدیث' اجماع صحابہ اور اجتہاد) کے ذریعہ دین کی نشر و اشاعت میں لگ جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول و مقرب ہو کر منصب خاص حاصل کر لیتے ہیں۔

فتویٰ کیا ہے؟ فتویٰ درحقیقت قوانینِ شریعت کو ایک خاص نہج سے بروئے کار لانے کا نام ہے' اللہ تعالیٰ نے اس میدان فقاہت وفتویٰ نویسی میں حضور ﷺ کے صدقے میں ہمیشہ ایسے رجال کار اسلامی معاشرے میں پیدا فرمائے ہیں جو قرآن وسنت کی باریکیوں میں

غوطہ زن ہو کر درِ آبدار نکال کر لاتے رہے ہیں۔ ایسے افراد پہلے بھی تھے' اب بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے' جو اس کارِ دین کو شبانہ روز کاوشوں کے ذریعہ آگے بڑھاتے رہیں گے۔

محترم مولانا مفتی محمد اسماعیل حسین نورانی قادری (مفتی و مدرس جامعہ انوار القرآن گلشن اقبال بلاک 5) ایسے ہی رجال کار کی ایک یادگار تصویر اور خاکہ ہیں جنہوں نے ابتداء عمر یعنی بلوغ سے ہی تعلیمِ دین میں قدم رکھا ہے اور تصنیف و تالیف کو اپنا وطیرہ بنایا ہے۔ زیر نظر کتاب بنام ''انوار الفتاویٰ'' ان کے فتاویٰ اور علمی بصیرت کی کھلی نظیر و دلیل ہے۔ مفتی محمد اسماعیل حسین نورانی قادری نے اپنے عنفوانِ شباب سے ہی تدریس کے ساتھ تحقیق' تفسیر' تشریح اور فتوی نویسی میں ایک خاص حصہ پایا ہے۔ (فلہ الحمد)

مفتی صاحب موصوف کے علمی کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے اس کم عمری میں تفسیر' حدیث اور فقہ تینوں پر کچھ نہ کچھ کام کیا ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن کی پہلی جلد پر تحقیقی اور فکری کام طبع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے اور جستہ جستہ مقبولیت پا رہا ہے۔ اسی طرح حدیث کے میدان میں ان کا اپنے استاذ محترم محقق اور شارحِ صحیح مسلم کی شرح و تحقیق پر ایک انتہائی جامع مگر مختصر تبصرہ بصورتِ مقالہ طبع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ مفتی صاحب موصوف کی کاوشوں اور جہد مسلسل کی جیتی جاگتی تصویر اب فقہ میں ''انوار الفتاوی'' قارئین کے سامنے موجود ہے۔ گویا کتاب الٰہی (قرآن کریم)' حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' اور احکام شرعیہ تینوں اہم دینی فنون پر کام کر کے اس کم عمری میں دینی اور اخروی سعادت پا رہے ہیں۔

ان کے مرشد گرامی قائدِ ملت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی قادری نور اللہ مرقدہ کا فیضان اور ان کے استاد حضرت علامہ غلام رسول سعیدی صاحب شارحِ صحیح مسلم کی نگاہِ تربیت کا اثر ہے کہ احقر محمد حسن حقانی خلف الرشید مفتیٔ آگرہ مفتی عبد الحفیظ حقانی کی سرکردگی میں چار سال سے جامعہ انوار القرآن میں تدریس کے ساتھ ساتھ فتوی نویسی کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ویسے تو گزشتہ تین چار سالوں میں ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر سینکڑوں فتاوی کا ایک ضخیم حصہ معرضِ وجود میں آیا ہے لیکن میری خواہش ہوئی کہ ان کے کچھ منتخب فتاوی انوار الفتاوی کے نام سے منظرِ عام پر لائے جائیں۔ میرے والد (مفتیٔ آگرہ) کا یہ فرمان کہ مفتی مجتہد ہوتا ہے' ناقل کو مفتی نہیں کہا جاتا' اس حیثیت سے مفتی محمد اسماعیل حسین نورانی انوار

الفتاوی میں جگہ جگہ فقہی بصیرت کے موتی بکھیرتے نظر آئیں گے۔ تقریباً ہر فتوی فقہ کی متداول کتب کے حوالے سے ان کی گہری نظر کا عکاس ہے۔ خاص طور پر انہوں نے حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز کی تصنیف بہار شریعت اور اعلیٰ حضرت مجدد ملت مولانا شاہ احمد رضا خان قادری علیہ الرحمۃ کے فتاویٰ رضویہ کے حوالہ جات سے اپنے فتاوی کو آراستہ کیا ہے۔ مفتی محمد اسماعیل نورانی نے بے حد کاوش اور محنتِ شاقہ کے ساتھ نہ صرف فتاوی جاری کئے بلکہ جمع کر کے ایک کتابی شکل میں علمِ دین کے پیاسوں کو سیراب کیا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کام پر لائقِ صد تحسین ہیں اور انوار الفتاوی کی شکل میں ان کے مرشدِ گرامی علامہ شاہ احمد نورانی، شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی اور دیگر اساتذۂ فن کا فیضان ان کے سر کا تاج بن کر چمکتا رہے گا۔

میری دعا ہے کہ موصوف کو اللہ تعالیٰ ”اللھم زد فزد“ کی برکتوں سے نوازے، دنیا میں علمی ناموری اور آخرت میں کامیابی و کامرانی، نیز رحمتِ خداوندی، شفاعتِ مصطفوی ﷺ اور ان کے جملہ اساتذہ اور اکابرین کی قرابت ان کا مقدر بنے۔ (آمین)

احقر
محمد حسن حقانی اشرفی
پرنسپل جامعہ انوار القرآن
گلشن اقبال بلاک 5، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استاذ العلماء علامہ حقانی ایک عظیم شخصیت

از قلم: حضرت علامہ محمد رضوان احمد نقشبندی
(مہتمم جامعہ انوار القرآن، گلشن اقبال کراچی)

استاذ العلماء، مظہر علم و دانش، صائب الرائے، عالی ہمت، صاحب عزیمت حضرت علامہ مفتی محمد حسن حقانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی زندگی کے متعدد گوشے ایسے ملتے ہیں جو انسان کی نظر اور توجہ کو فوراً اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ اور دل و دماغ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ زندگی کے یہی وہ رنگ ہوتے ہیں جو صرف سانس لینے سے نہیں بنتے بلکہ اس کے پیچھے کچھ اور حقائق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو تنفس کا ایک طبعی عمل ہے جو ہمیں جسمانی موت سے بچا رہا ہے۔ جب کہ انسان کی پہچان، اس کی بقا اور اس کا مقام کسی اور چیز پر موقوف ہے۔ جسے ہم انسان کہتے ہیں وہ محض خاک کا پتلا نہیں ہے جو ہوا کے دوش پر کھڑا ہے بلکہ انسان تو ایک ہستی ہے جس کی ایک حقیقت ہے، وہ تمام جانداروں میں اپنی پہچان آپ ہے، اُس کا اپنا تشخص ہے، اس کی جوہریت بالکل مختلف ہے، وہ عظیم مقصدیت سے ہمکنار ہے، وہ علم و حکمت، فضل و کمال اور نور و بصیرت کے بے شمار امکانات سے بھرپور ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنی انسانیت کے ساتھ ہے ورنہ وہ صرف آدمی ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ انسانوں ہی کی دنیا ہے کہ جہاں جذبات کے انگارے دہکتے ہیں، تخیلات کے غنچے چٹختے ہیں، افکار و نظریات کے چمن مسکراتے ہیں، علم و عمل اور جدوجہد کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں اور فضائل و درجات کی منزلیں طے ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پھر ہر ایک اپنی مثال آپ ہوتا ہے اور ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کی مانند ہر باکمال ایک شاہکار بن

جاتا ہے۔اس حوالے سے جب ہم حضرت علامہ حقانی صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو آپ کی شخصیت ہمیں گوناگوں خصوصیات' علمی وفکری کمالات اور عملی صلاحیتوں کا حسین مرقع نظر آتی ہے۔

آپ کی ذات گرامی ایک انجمن کی مانند تھی۔آپ عظیم صاحب علم تھے۔ ہر معاملہ میں تدبر وفراست عیاں تھی' صائب الرائے تھے' فکر گہری اور دوررس تھی' صاف گوئی سے کام لیتے۔حق بات کہتے مگر حکمت ودانائی کے تقاضوں کے ساتھ۔آپ کی زبان نہایت فصیح تھی اور حافظہ غضب کا تھا۔ گفتگو فرماتے تو سارے پہلوؤں اور گوشوں کو سمیٹ لیتے۔آپ کے انداز گفتگو میں نکتہ آفرینی بھی ہوتی اور بذلہ سنجی بھی۔ بروقت فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی' نیز یہ یاد رہتا کہ کس سے کیا بات ہوئی ہے۔ برس ہا برس کی باتیں یاد رکھتے' لوگ بھول جاتے مگر آپ کو یاد رہتی تھیں۔مجالس ومحافل میں ان کی موجودگی ہر ایک بآسانی محسوس کر لیتا تھا۔اُن کی ذاتی خوبیاں ہر ایک کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھیں' حالات پر بھرپور نظر رکھتے تھے آپ ایک بہترین تجزیہ نگار اور مبصر بھی تھے۔مطالعہ کا شوق اخیر عمر تک رہا' اس لیے اخبارات ورسائل اور تجزیئے' تبصرے سب پڑھتے رہتے تھے' ملکی وبین الاقوامی' سیاسی ومذہبی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی تھی۔آپ ایک دردمند شخصیت تھے۔آپ کے دل میں قوم وملت اور امت مسلمہ کا درد چھپا ہوا تھا مزاج میں حدت رکھنے کے باوجود تعلقات کی قدر فرماتے تھے' بسا اوقات دل میں چھپے ہوئے جذبات آنسوؤں کا روپ دھار لیتے تھے۔آپ کے پُر خلوص اور فصاحت وبلاغت سے لبریز انداز گفتگو سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

مذکورہ بالا کلمات آپ کی ہمہ پہلو شخصیت کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں' آیئے قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کی انجمنِ حیات کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں:

انتظامی صلاحیت

قدرت نے آپ کو بھرپور انتظامی صلاحیت سے مالا مال کیا تھا۔آپ ایک مذہبی عالم ہی نہیں بلکہ زبردست منتظم بھی تھے۔نظم وضبط کی باریکیوں اور اس کے تقاضوں سے خوب واقف تھے۔ساری زندگی خود بھی اس کی پابندی کی اور اپنے اردگرد ماحول بھی ایسا ہی بنا کر رکھا۔نظم کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے تھے۔ ہر کام کو اس کے وقت اور طریقہ

مناسب پر دیکھنا چاہتے تھے اور اس معاملہ میں سختی فرماتے۔ ہر ایک کو سمجھاتے' سکھاتے اور تربیت دیتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آپ کی خدمت میں رہ جاتا وہ کندن بن جاتا تھا۔

آپ کی اپنی زندگی میں نظم وضبط کی ایسی پابندی نظر آتی ہے کہ تمام معمولات لڑی میں موتیوں کی طرح پروئے ہوئے معلوم دیتے ہیں۔ آپ کا نظام زندگی ایک مضبوط قلعہ کی مانند تھا جس کو کوئی توڑ نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے زیر انتظام چلنے والے ادارے' مساجد اور مراکز نظم وضبط کا ایک حسین پیکر ہوتے تھے۔ آپ کا حسنِ انتظام سب کو نظر آتا تھا اور کوئی شخص بھی اس کا اعتراف کیئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ آپ کے انتظام کی خوبی یہ تھی کہ آپ ماحول پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ ہر چیز کی خبر رکھتے اور ہر بات پیش نظر رہتی۔ بصیرت وفراست کا عالم یہ تھا کہ بعد میں پیش آنے والے حالات کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا اور اس کی پہلے سے منصوبہ بندی کر لی جاتی تھی۔ آپ کی مردم شناسی بھی بڑی زبردست تھی' پہلی نظر میں ہی آدمی کی صلاحیت اور استعداد کا اندازہ لگا لیتے تھے پھر اسی مناسبت سے خدمت یا منصب سپرد فرماتے تھے۔

اندازِ تدریس

استاذ العلماء حضرت حقانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی یوں تو متنوع خصوصیات اور گوناگوں کمالات کی مظہر تھی لیکن جس چیز کو آپ نے سب سے زیادہ اہمیت دی اور جسے اپنی پہچان بنایا وہ درس وتدریس کا شعبہ ہے۔ مسندِ درس کی آپ زینت بنے۔ ہر طرح کے حالات میں آپ نے اس رشتے کو قائم رکھا۔ اور علم کے پیاسوں کو کبھی محروم نہیں لوٹایا۔ ذوقِ تدریس کا عالم یہ تھا کہ مدرسہ کے علاوہ گھر پر بھی وقت دے دیا کرتے تھے۔ یہ خاکسار خود آپ کے گھر پر حدیث شریف کا درس لیتا رہا ہے۔ اور بھی کئی لوگ ہیں جو مدرسہ کے علاوہ گھر پر پڑھتے رہے ہیں۔ غرض حضرت کو تدریس سے بڑا شغف تھا۔ وہ اس پر نازاں تھے کہ وہ ایک معلم ہیں بلکہ کبھی کبھار فرماتے کہ: میں پاک پروردگار سے ایک ہی دعا کرتا ہوں کہ ساری زندگی پڑھایا ہے اب پڑھاتا ہوا ہی دنیا سے جاؤں۔

منصبِ معلمیت سے بڑھ کر کونسا منصب ہو سکتا ہے۔ انسان کو اس پر ناز کیوں نہ ہو

جب کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس منصب کی تعریف فرمائی اور ایک موقع پر اپنے آپ کو صرف معلم بتایا۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: "انما بعثت معلمًا" (میں تو صرف معلم بن کر آیا ہوں) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا میں سب سے اعلیٰ رتبہ ان لوگوں کا ہے جو قرآن وحدیث اور دین وشریعت کا علم دوسروں کو سکھا رہے ہیں۔ اور یہ کام سب سے بہتر انداز میں ایک معلم ہی کرسکتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اساتذہ دین اگر اخلاص کے ساتھ دین کی تعلیم دیں تو وہ یقیناً آج کل کے پیروں، فقیروں، اماموں، خطیبوں اور واعظوں سے لاکھ گنا بہتر ہیں۔ جس مسلک اور جماعت میں معلموں کی جتنی کثرت ہوگی وہ مسلک اور جماعت اُتنے ہی کامیاب وکامران رہیں گے اور دیگر جماعتوں پر انہیں غلبہ حاصل رہے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کل پیری مریدی کرنا سب سے آسان کام ہے اور پڑھنا پڑھانا نہایت مشکل۔ بہت سے لوگ شاید اسی وجہ سے معلمیت سے گریزاں ہوکر پیری مریدی اور سیر وسیاحت کو اپنا چکے ہیں۔ اللہ ہی جانے اس قوم کا کیا بنے گا جو اپنے پیروں، فقیروں پر جان چھڑکے اور اپنے واعظوں اور خطیبوں کو آسمان تک پہنچادے مگر اپنے معلمین اور اساتذہ کی قدر ومنزلت نہ پہچانے۔ مگر استاد محترم حقانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مسند درس کو زینت بخشی، اس منصب کا حق ادا کیا اور ساری زندگی اس کے تقاضوں کو نبھایا۔

درس وتدریس کے حوالے سے آپ کی صلاحیت کا عالم یہ تھا کہ چھوٹی بڑی تمام کتابوں کو پڑھانے کا یکساں ملکہ حاصل تھا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اپنی تدریسی مہارت کے ذریعے آسان بنادیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر غبی وذہین طالب علم سبق کو آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ ہم نے بہت سے اساتذہ کو پڑھاتے دیکھا مگر جو انداز آپ کا تھا وہ کسی کا نہیں تھا۔ آپ کے درس میں طلباء کبھی بور نہیں ہوتے تھے۔ حیبت وظرافت کا عجیب ماحول ہوتا تھا۔ دلچسپی بھی قائم رہتی تھی اور ہوشیاری بھی۔ آپ کے حلقۂ درس سے مستفیض ہونے والوں کی تعداد اور اب وہ دنیا میں کہاں کہاں موجود ہیں، اس کا احاطہ ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کا سلسلۂ فیض اب کئی نسلوں میں منتقل ہوچکا ہے۔ خدا اس سلسلہ کو قیامت تک جاری وساری رکھے۔

اندازِ خطابت اور طریقۂ گفتگو

جس طرح ہر آدمی شاعر نہیں ہوسکتا اسی طرح ہر آدمی خطیب بھی نہیں ہوسکتا' انداز خطابت اور فن گفتگو بھی خدائی عطیوں میں سے ایک عطیہ ہے۔ جس شخص کے اندر قدرت نے یہ جوہر رکھ دیا ہے وہ تعلیم وتربیت اور مناسب ماحول ملنے کے بعد آگے آجاتا ہے اور اپنا لوہا منوالیتا ہے۔ حضرت حقانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس نعمت سے بھی وافر حصہ نصیب ہوا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فصاحت وبلاغت سے نواز تھا۔ آپ کی گفتگو اور خطابت کا انداز دونوں بہت متاثر کن تھے۔ آپ کی باتیں دلوں کو موہ لیتی تھیں۔ آپ کا انداز مدلل تھا اور طریقہ منطقی۔ اشارات بھی معنی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ ہر بات کو اس کے رنگ میں کہنا جانتے تھے۔ آپ کی گفتگو سے متاثر ہوکر لوگ روتے بھی تھے اور ظرافتِ طبع دیکھ کر خوش بھی ہوتے تھے۔ مگر جب مزاح فرماتے تو صیت بھی قائم رہتی تھی۔

عمدہ گفتگو اور اچھی خطابت کے لیے ذہنی صلاحیت کو بڑا دخل ہے۔ اور حقانی صاحب کی ذہنی صلاحیت اور قوت حافظہ کا عالم یہ تھا کہ وہ عموماً دن' تاریخ مہینہ سب یاد رکھتے تھے۔ اعداد وشمار پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی تھی۔ اشخاص اور مقامات کے نام یاد رہ جانا بھی ان کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی محفل میں بیٹھنے والوں کو بہت حاضر دماغ رہنا پڑتا تھا۔ ان کے انداز خطابت کے حوالے سے یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ مسجد کا منبر ہو یا مذہبی وسیاسی اسٹیج' مدرسہ کا ماحول ہو یا کالج ویونیورسٹی کی دنیا' مجمع کم ہو یا زیادہ کسی بھی عنوان پر بڑے ماہرانہ انداز میں گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے لوگ عموماً آپ کی گفتگو اور انداز خطابت کے مداح تھے۔

اصول پسندی اور نظم وضبط

حقانی صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں جوہر آپ کی اصول پسندی اور نظم وضبط بھی تھا آپ ہر کام کو اس کے وقت پر کرنے کے عادی تھے اور پابندیٔ وقت کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ یہاں تک اگر کوئی آپ سے کسی پروگرام کے لیے وقت لیتا اور ٹائم پر نہ پہنچتا تو آپ اُس کے ساتھ جانے سے انکار کردیتے۔ اسی طرح اگر کسی پروگرام میں شریک ہوتے اور وہاں تاخیر ہوتی تو وقت ضائع کیے بغیر واپس چلے آتے۔ آپ اپنے اصولوں کے ایسے پابند تھے کہ لوگوں

کو آپ کے اصولوں کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ اس معاملے میں آپ لوگوں کے پیچھے نہیں چلتے تھے بلکہ انہیں اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ آپ کے معمولات ڈسٹرب ہونے سے بچ جاتے تھے۔ اور لوگوں کو بھی پابندیٔ وقت اور نظم وضبط کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یقیناً آپ کا یہ طرز عمل بہت سے علمائے کرام اور پیرانِ عظام کے لیے سبق آموز ہے۔

حقانی صاحب نظم وضبط کا حسین مرقع تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے دار العلوم امجدیہ میں طالب علمی کے زمانے میں آپ اسمبلی کے وقت باقاعدگی سے پہنچتے تھے اور طلباء کی حاضری خود لیا کرتے تھے۔ جب کہ کئی اساتذۂ کرام آپ کے بعد تشریف لاتے تھے۔ آپ کے نظم وضبط اور اصول پسندی کو دیکھ کر بہت سے لوگوں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا۔ لوگ آپ کی خدمت میں صرف علم پڑھنے ہی کے لیے نہیں آتے تھے بلکہ وہ آپ سے وقت کی قدر بھی سیکھتے تھے، نظم وضبط کی پابندی کرنا اور زندگی کو اپنے اصولوں کے ساتھ گذارنا سیکھتے تھے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ایک کامیاب وکامران زندگی کے لیے یہ سب باتیں کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ افراد واقوام کی تعمیر وترقی اور عروج وارتقاء میں نظم وضبط اور اصول پسندی کو جتنا دخل ہے وہ کسی پر بھی مخفی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نظم وضبط سے خالی اور بے اصولی پر مشتمل طرز حیات ایک انسان کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ اور ایک انسان اور حیوان کے درمیان نمایاں فرق اسی وصف سے قائم ہوتا ہے۔

نهارك هائم وليلك نائم　　　كذالك في الدنيا تعيش البهائم

"تیرا دن بھر بھٹکتے پھرنا اور رات بھر سوتے رہنا' دنیا میں چوپایوں کا طرز زندگی بالکل ایسا ہی ہے"

ایک حدیث میں ہے: "من حسن اسلام المرء تركه مالا يعنيه" آدمی کے اسلام کی خوبی لایعنی (بے مقصد) باتوں کو چھوڑ دینا ہے۔

اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "اني لاكره ان ارى احدكم فارغاسبهللا لافي عمل دنياه ولا في عمل اخرته"۔

بے شک مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ میں تم میں سے کسی ایک کو بھی فارغ بے کار بیٹھا ہوا دیکھوں کہ نہ تو وہ اپنی دنیا کے لیے کچھ کرے اور نہ اپنی آخرت کے لیے۔

یہ ہیں ہمارے دین کے اعلیٰ وارفع اصول اور پاکیزہ تعلیمات۔ لیکن بدقسمتی ہے ہمارے اہل وطن کی کہ کروڑوں لوگ آج بھی اپنا قیمتی وقت فلموں، ڈراموں، کھیل تماشوں، ہوٹلوں، بازاروں، چوباروں، فٹ پاتھوں، نائٹ کلبوں اور تفریح گاہوں میں برباد کر رہے ہیں۔

کاش کوئی چپکے سے آ جائے　میری قوم کو یہ سمجھا جائے
زندگی نہیں کوئی شئی ایسی　جس کو کسی سے بدلا جائے

دیانت داری اور بے لوثی

دیانت داری اور بے لوثی ایسے اوصاف انسانی کردار و عمل کے وہ جواہر ہیں جن کے بغیر انسان کی ساری خوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں اور کوئی فضیلت فضیلت نہیں رہتی۔ گویا جس میں دیانت و امانت نہیں اس میں کوئی خوبی اور کمال نہیں۔ چاہے دوسرے حوالوں سے وہ کتنا ہی متقی و پرہیزگار کیوں نہ ہو۔ حدیث نبوی ہے: ''الا لا ایمان لمن لا امانة له'' جس میں امانت داری نہیں اُس کا ایمان نہیں۔

گویا امانت و دیانت ایمان کا نور اور اسلام کی روح ہے۔ جس کے بغیر آدمی کا دین مکمل نہیں ہوتا۔

اُستاذ العلماء حضرت حقانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہنے والے احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت کی ذات میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ دیانت داری گویا آپ کے مزاج کا حصہ تھی اور بے لوثی آپ کی طبیعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے معاملات میں ہمیشہ دیانت و امانت کے اصولوں پر عمل پیرا رہتے۔ مشاہرہ بمقابلہ خدمت کو دوسروں کے لیے بھی پسند کیا اور اپنے لیے بھی اختیار کیا۔ حق سے زیادہ وصول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جب کہ آپ حق سے کم لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ لوگوں سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو نبھاتے تھے۔ ہر ایک سے ہمدردی اور خیر خواہی کا اظہار کرتے۔ مفید مشوروں سے نوازتے اور مسائل اور ضروریات میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے راستے نکالنے کی کوشش کرتے۔ اور یہ سب کچھ ذاتی طمع اور خود غرضی سے خالی ہوتا تھا۔ ساری زندگی مدرسہ و مسجد سے منسلک رہے مگر اسے کبھی بھی اپنی جاگیر نہیں سمجھا۔ اور نہ کبھی اپنی ذاتی آمدنی کا ذریعہ بنایا، مدرسہ کی تمام منفعتیں مدرسہ کے لیے ہی وقف ہوتی تھیں، اُنہیں کبھی ذاتی

مصرف میں نہ لاتے تھے۔ ایک ایک پائی کا حساب رکھتے تھے۔ ماسواء وظیفے کے مدرسہ سے کچھ نہ لیتے۔ اپنے علاج معالجہ کا خرچ بھی خود اٹھاتے تھے۔ ایک پیسہ بھی اگر ذمہ پر باقی ہوتا تو اسے ضرور ادا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے گئے تو دونوں ہاتھ خالی تھے' نہ ذاتی گاڑی' نہ بنگلہ' نہ کوٹھی اور نہ بینک بیلنس کچھ بھی نہیں تھا۔ بس جو کچھ تھا وہ اپنی محنت' کوشش اور خدمت کا معاوضہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو خودداری اور بے لوثی سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے سوال نہیں کیا۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اپنی غرض کے لیے کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ ہمیشہ لوگوں سے بے نیاز اور مستغنی ہو کر رہے۔ لوگوں سے دینی اخوت قائم رکھی اور ہمیشہ اللہ واسطے محبت کی۔ یہاں تک کہ اپنے رفقاء اور مصاحبین کے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی یاد رکھتے۔ ان کی قدر کرتے' غائبانہ تعریف کرتے اور کسی کسی پر فخر بھی فرماتے اور جن لوگوں سے کبھی کوئی تعلق رہا نہیں یاد کر کے کبھی کبھی رو پڑتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میرے نانا مرحوم حج کے دوران منیٰ کے ایک خوفناک حادثہ میں شہید ہو گئے تھے تو اُس کی خبر جب میں نے آپ تک پہنچائی تو آپ آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ یہ آپ کے خلوص اور بے لوثی کی دلیل تھی۔

ادب واحترام اور تواضع

انسان کے لیے اصل کمال یہ نہیں کہ اس کا ادب اور احترام کتنا کیا جاتا ہے اور اُس کے آگے لوگ کیسی تواضع سے پیش آتے ہیں بلکہ انسان کی عظمت اور بلندی اس بات میں ہے کہ وہ خود اپنے بڑوں کے آگے کتنا مؤدب ہے اور دوسروں کے لیے اُس میں کتنی تواضع ہے۔ اس اعتبار سے اگر حضرت حقانی صاحب کی کتابِ حیات کو دیکھا جائے تو اس میں ہمیں تواضع وادب کا باب بھی دکھائی دیتا ہے۔ آپ بزرگوں کی محبت اور عقیدت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ خود بھی اس کیفیت سے لبریز تھے۔ بزرگوں کا بڑے ادب سے ذکر کرتے نیز اُن کے ایام کا اہتمام فرماتے۔ خصوصاً حضرت غوث اعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلۂ اشرفیہ سے تعلق رکھنے والے اکابر مشائخ کے لیے اپنے گھر میں محافل کا اہتمام فرماتے۔ آپ کو اپنے اساتذہ پر فخر تھا۔ خصوصاً غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا اکثر ذکر

فرماتے تھے۔ علماء میں علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کا نہایت ادب کرتے تھے۔ اوراحترام میں ان کے پیروں کو بھی ہاتھ لگالیا کرتے تھے۔ کچھوچھہ شریف کی خانقاہ سے نسبت رکھنے والے کوئی بزرگ جب بھی تشریف لاتے تو آپ ان کی پوری طرح خاطر مدارات فرماتے اوران کی عزت وتکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ فرماتے۔

محبت وادب اورتواضع وانکسار کی اس آمیزش نے حضرت حقانی صاحب کی شخصیت کو اورزیادہ باوقاراور پرکشش بنادیا تھا۔

حرفِ آخر

علامہ حقانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گوناگوں خوبیوں اورکمالات میں سے چند نمایاں خوبیوں کا یہ ایک اجمالی تذکرہ ہے' جس کا تعلق فقط آپ کی شخصی خوبیوں سے ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کمالات پر اوردیگر خصوصیات پر اگر علامہ کی زندگی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے اورخصوصاً سیاست کے میدان میں آپ کی بلندئ کردار پر قلم اٹھایا جائے تو شک نہیں کہ ایک مفصّل کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

اللہ رب کریم آپ کی مرقدِ مبارک پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اورآپ کے علمی' عملی' روحانی وعرفانی فیوض وبرکات سے ہم سب کو متمتع اور مالا مال فرمائے۔ آمین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمۃ الکتاب

(فتویٰ نویسی کی تاریخی اور شرعی حیثیت)

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی

(مہتمم وبانی جامعہ نضرۃ العلوم کراچی)

الحمد لله رب العلمين والصلوة و السلام على سيد المرسلين وعلى اله وصحبه اجمعين اما بعد فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم
بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ" (النساء:۱۷۶)
وہ آپ سے فتویٰ معلوم کرتے ہیں' کہہ دیجئے اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

اظہر من الشمس ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فتویٰ معلوم کیا اور فتویٰ اللہ تعالیٰ نے دیا لیکن اللہ تعالیٰ کو مفتی کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے افعال کے اطلاق سے مشتقات کا اطلاق لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات توقیفی ہیں' برخلاف اسم ذات کے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو خدا کہنا جائز ہے' نیز معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نائب مطلق ہیں۔

اس فرمان خداوندی میں لفظ "یستفتون" آیا ہے جس کا مصدر "استفتاء" ہے نیز لفظ "یفتی" آیا ہے جس کا مصدر "افتاء" ہے۔

استفتاء کے معنی ہے فتویٰ معلوم کرنا اور افتاء کے معنی ہے فتویٰ دینا اور فتویٰ کو "فتیا" اسی طرح "فتوی" بھی پڑھا گیا ہے اس کی جمع "فتاوی" اور "فتاوِ" آتی ہے اور

"فتوی" کا شرعی معنی قوی و مدلل حکم شرعی اور شرعی فیصلہ کے ہیں۔

علامہ ابوزہرہ لکھتے ہیں: "**الافتاء اخص من الاجتهاد لان الاجتهاد هو استخراج الاحكام الفقهية من مصادرها سواء كان فيها سؤال ام لم يكن اما الافتاء فانه لا يكون الا عند السوال عن حكم واقعة وقعت**"۔ افتاء اجتہاد سے اخص ہے کیونکہ اجتہاد' احکام فقہیہ کو ان کے مصادر سے نکالنا ہے خواہ ان کے بارے میں سوال ہو یا نہ ہو جب کہ افتاء وقوع پذیر کسی واقعہ کے حکم سے متعلق سوال کرنے کے وقت ہی ہوتا ہے۔

التراتیب الاداریۃ میں ہے کہ صحابہ کرام کسی مسئلہ کے پیش آنے سے پہلے اس کے پوچھے جانے اور جواب دینے کو ناپسند کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے حرج اور نقصان میں ڈالے جو ایسی چیز کے پوچھنے کے درپے ہو جو واقع نہ ہوئی ہو۔ (اس پر آثار صحابہ کرام سنن دارمی میں موجود ہیں۔)

اب اللہ تعالیٰ کے فرمان: "يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ"۔ (النساء: ۱۷۶) میں غور کیجئے کہ اس سے فتوی کی تاریخی اور شرعی حیثیت متعین ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے کلالہ کی میراث سے متعلق فتوی معلوم کیا اس میں استفتاء کا ثبوت ہے۔ نیز ان کا استفتاء سے مقصود یہ تھا کہ حضور ﷺ انہیں میراث کلالہ سے متعلق افتاء یعنی فتوی مرحمت فرمائیں۔ گو کہ فتوی اللہ تعالیٰ نے دیا اس سے اس کی اہمیت کا پتا چلا اور جب افتاء نبی ﷺ کی تردید نہیں ہے تو آپ کے فتوی دینے سے کیا چیز مانع ہے؟ لہٰذا یہ آپ کے فتوی دینے کے جواز پر واضح دلیل ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں فتاوی کا فریضہ آپ نے خود بنفس نفیس انجام دیا۔ کہ صحابہ کرام انفرادی یا اجتماعی طور پر پیش آنے والے کسی معاملہ پر پیدا شدہ اشکال کے حل کے لیے حضور ﷺ سے استفتاء کرتے تو آپ فتوی ارشاد فرماتے۔ اس سلسلہ میں متعدد احادیث کریمہ ذخیرہ احادیث میں موجود ہیں اور اہل سیر نے نبی کریم ﷺ کے اس گوشہ کو بھی قلمبند کیا ہے' اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ فتوی ارشاد فرماتا جیسا کہ متذکرہ آیت کریمہ اور دیگر آیات کریمہ میں ہے اور سنن دارمی کی روایت کے مطابق وہ قرآن مجید میں تیرہ ہیں' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: "ما

رأیت قوما خیر ا من اصحاب النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم''۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ کتاب العلم کے چار ابواب میں لفظ ''فتیا'' لائے ہیں ان میں سے ایک ''باب ذکر العلم و الفتیا فی المسجد'' یعنی مسجد میں علمی بات بتانے اور فتوی دینے کا باب'' ہے۔

اس باب کے تحت یہ حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما سے مروی ہے: '' ان رجلا قام فی المسجد فقال: یا رسول اللہ ! من این تأمرنا ان نھلّ؟ فقال رسول اللہ ﷺ: یھل اھل المدینۃ من ذی الحلیفہ ویھل اھل الشام من الجحفۃ ویھل اھل نجد من قرن وقال ابن عمر: ویزعمون ان رسول اللہ ﷺ قال: ویھل اھل الیمن من یلملم''۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۹)

ایک شخص نے مسجد میں کھڑے ہو کر عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ ! آپ ہمیں کہاں سے احرام باندھنے کا حکم دیتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے اہل شام جحفہ سے اور اہل نجد قرن سے احرام باندھیں' حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما کا بیان ہے: لوگ خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اور اہل یمن یلملم سے احرام باندھیں۔

نیز صحیح البخاری ہی میں ذکر کردہ باب سے پہلے باب میں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا بیان ہے: '' کنت رجلا مذ اء فامرتُ المقداد بن الاسود ان یسأل النبی ﷺ فسألہ فقال: فیہ الوضوء''۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۹)

میں بہت مذی نکلنے والا مرد تھا یعنی مجھے مذی بہت آتی تھی میں نے حضرت مقداد کو نبی کریم ﷺ سے (اس کے متعلق) پوچھنے کا امر کیا (آیا اس میں وضو کافی ہے یا غسل ضروری ہے) انہوں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: اس میں وضو (کافی) ہے۔

سنن ابی داؤد میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالی عنہ نے عرض کی: '' یا رسول اللہ ! ان ام سعد ماتت فای الصدقۃ افضل قال الماء فحفر بیرا وقال ھذہ لام سعد''۔ (ج ۱ ص ۲۳۶)

یارسول اللہ! سعد کی ماں فوت ہوگئی ہے پس کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا:

پانی کا تو انہوں نے ایک کنواں کھودا اور کہا: یہ سعد کی ماں کے لیے ہے' یعنی اس کا ثواب سعد کی ماں کے لیے ہے نیز معلوم ہوا کہ جس چیز کا ثواب میت کو پہنچانا مقصود ہو اس کی اضافت میت کی طرف کرنا جائز ہے بعض جہلاء کا اس اضافت کو عبادت کا نام دے کر شرک کا فتوی جڑنا عدل وانصاف کا خون کرنا ہے۔

صحیح البخاری میں حضرت سعد رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت ہے: ''استفتی النبی ﷺ فی نذر کان علی امه فتوفیت قبل ان تقضیه فافتاه ان یقضیه عنها''۔(ص ۱۲۵۲)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالی عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اس نذر سے متعلق فتوی معلوم کیا جوان کی والدہ کے ذمہ تھی اور وہ اسے پورا کرنے سے پہلے وفات پا گئیں تو آپ نے انہیں ان کی طرف سے اسے پورا کرنے کا فتوی دیا۔

حضور ﷺ کبھی سائل کے سوال کا مفصل جواب مرحمت فرمادیتے جیسا کہ پہلی روایت سے ظاہر ہے اور کبھی مختصر جیسا کہ بعد کی تینوں روایات سے واضح ہے اور بعض اوقات جواب میں طریق استنباط بھی بیان فرمادیتے بطور اختصار ایک روایت قلمبند کی جاتی ہے:

صحیح البخاری میں ہے: ''عن ابن عباس رضی الله تعالی عنهما ان امرأة جاء ت الی النبی ﷺ فقالت ان امی نذرت ان تحج فماتت قبل ان تحج افاحج عنها؟ قال :نعم حجی عنها ارأیت لو کان علی امك دین اکنت قاضیته؟ قالت نعم. فقال :اقضوا الله الذی له فان الله احق بالوفاء''۔(ص ۱۳۶۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک عورت آئی تو اس نے عرض کی: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی' پھر وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہوگئی تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں تو اس کی طرف سے حج کر' بتا تو سہی اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتی؟ اس نے عرض کی: ہاں پس آپ نے فرمایا: تم اللہ کو وہ ادا کرو جو اس کے لیے ہے کیونکہ اللہ تعالی ادا کئے جانے کا زیادہ حق دار ہے۔

اس روایت میں فوت شدہ کے حق میں نذر حج کو حقوق مالیہ کے مماثل قرار دیا گیا ہے' یہ طرق استنباط میں سے ایک طریقہ ہے تاکہ نئے حالات اور پیش آمدہ مسائل میں استنباط مسائل

کی راہ کشادہ ہو اور احکامات اسلامیہ کی جامعیت اور ہمہ گیریت قائم رہے اور اہل اسلام کو کسی گوشہ میں دین اسلام کے سوا کسی اور دین کی طرف احتیاج نہ رہے۔

چنانچہ علامہ زاہد الکوثری لکھتے ہیں: ''فالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یفقه اصحابه فی الدین ویدرّبهم علی وجوه الاستنباط حتی کان نحو ستة من الصحابة رضوان الله علیهم اجمعین یفتون فی عهد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو دین میں فقیہ بناتے تھے اور ان کو استنباط کے طرق کی پہچان کراتے تھے یہاں تک کہ صحابہ کرام میں سے تقریباً چھ حضرات عہد نبوت میں فتوی دیتے تھے۔

التراتیب الاداریۃ میں ہے کہ حافظ شامی نے فرمایا: عہد نبوت میں اصحاب فتوی چھ تھے: (۱) حضرت عمر (۲) حضرت علی (۳) حضرت عبد اللہ بن مسعود (۴) حضرت ابی بن کعب (۵) حضرت زید بن ثابت (۶) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور الاصابۃ میں ہے: ''روی سهل بن ابی خیثمة عن ابیه قال کان الذین یفتون علی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من المهاجرین عمر و عثمان و علی و ثلاثة من الانصار ابی بن کعب و معاذ بن جبل و زید بن ثابت''۔ (ج ۴ ص ۲۷۷)

علماء اہل حدیث میں سے شیخ وحید الزمان لکھتے ہیں: ''لم ینکر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتوی غیره فی زمانه لانه صدر عن تعلیمه''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں صحابہ جو فتوے دیتے تھے آپ ان پر انکار نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے فتوی خود آپ کی تعلیم کے اثر تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں چودہ صحابہ فتوی دیا کرتے تھے لیکن یہ اس وقت تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں موجود نہ ہوتے اگر آپ خود تشریف فرما ہوتے تو پھر کوئی صحابی فتوی نہ دیتا البتہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کی موجودگی میں بھی فتوی دیتے جیسے منقول ہے کہ حضرت ابو طالب نے اپنی بیماری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں اور ناتواں ہو گیا ہوں تو جس بہشت کی تم خوشخبری دیا کرتے ہو اس میں سے کچھ میوہ مجھ کو بھیجو۔ ابوبکر نے یہ سن کر جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے بہشت کا پانی اور میوہ کافروں پر حرام کر دیا ہے۔

(لغات الحدیث، کتاب العین ص ۱۸۶)

المختصر رسول اللہ ﷺ کے وصال شریف کے بعد فتوی دینے کی ساری ذمہ داری مجتہدین صحابہ کرام پر آ گئی اور وہ مجتہدین صحابہ کرام جن کے فتاوی محفوظ ہوئے ان کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے جن میں تقریبا بیس صحابیات ہیں۔

اہل علم حضرات نے ان کی تقسیم تین طبقات پر کی ہے:

(الف) ......مکثرین: یعنی وہ صحابہ کرام جن میں سے ہر ایک کے منقول فتاوی پر ایک بڑی جلد کی کتاب مرتب ہوسکتی ہے ان اہل افتاء صحابہ کرام کی تعداد سات ہے: (۱) حضرت عمر (۲) حضرت علی (۳) حضرت عبداللہ بن مسعود (۴) حضرت زید بن ثابت (۵) حضرت عبداللہ بن عمر (۶) حضرت عبداللہ بن عباس (۷) ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین۔

(ب) ......متوسطین: یعنی وہ صحابہ کرام جن میں سے ہر ایک کے منقول فتاوی سے ایک چھوٹی جلد کی کتاب مرتب ہوسکتی ہے ان کی تعداد بیس ہے: (۱) خلیفہ رسول حضرت ابو بکر صدیق (۲) امیر المؤمنین حضرت عثمان (۳) ام المؤمنین حضرت ام سلمہ (۴) حضرت معاذ بن جبل (۵) حضرت ابو موسی اشعری (۶) حضرت انس (۷) حضرت ابو ہریرہ (۸) حضرت عبد اللہ بن عَمر و (۹) حضرت عبد اللہ بن زبیر (۱۰) حضرت ابو سعید خدری (۱۱) حضرت سلمان فارسی (۱۲) حضرت معاویہ (۱۳) حضرت عبادہ بن صامت (۱۴) حضرت سعد بن ابی وقاص (۱۵) حضرت عبد الرحمٰن بن عوف (۱۶) حضرت عمران بن حصین (۱۷) حضرت زبیر (۱۸) حضرت طلحہ (۱۹) حضرت جابر (۲۰) حضرت ابوبکرہ۔

(ج) ......مقلین: یعنی وہ صحابہ کرام جن کے منقول فتاوی کی تعداد بہت کم ہے ان سب حضرات کے فتاوی سے ایک چھوٹی جلد کی کتاب مرتب ہوسکتی ہے ان کی تعداد تقریبا ایک سو بائیس ہے۔

حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان نے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، شام، مصر اور یمن میں افتاء کی خدمت سرانجام دیں۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان میں روایت حدیث میں سب سے بڑھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ ہیں جیسا کہ تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی میں ہے: "اکثرھم

حدیثا ابو هریرة رضی الله تعالی عنه"۔آپ سے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں اس کی وجہ بھی آپ بیان فرماتے ہیں' جیسا کہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کی: "**یا رسول الله !انی اسمع منك حدیثا کثیرا انساه' قال: ابسط رداء ك فبسطته قال فغرف بیدیه ثم قال ضمه فضممته فما نسیت شیئا بعده**"۔(ج۱ص۳۵)

یارسول اللہ! میں آپ سے بہت سی حدیثیں سنتا ہوں پر بھول جاتا ہوں' آپ نے فرمایا: اپنی چادر پھیلاؤ پس میں نے اسے پھیلا دیا تو آپ نے اپنے دونوں دست مبارک سے چلو لیا پھر فرمایا: اسے (سینے سے) لگالو تو میں نے اسے (سینے سے) لگالیا اس کے بعد میں کسی چیز کو نہیں بھولا۔

اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت کا بیان ہے نیز معلوم ہوا کہ کثرت روایت حدیث' کثرت فہم دین کو لازم نہیں' لہٰذا صحابہ کرام علیہم الرضوان میں فتویٰ میں سب سے بڑھ کر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جیسا کہ تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی میں ہے: "**اکثرهم فتیا تروی. ابن عباس رضی الله تعالی عنه**"۔اس کی وجہ بھی آپ بیان فرماتے ہیں جیسا کہ بخاری شریف (ج۱ص۱۴) میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو دعا دی: "**اللهم فقهه فی الدین**"۔یا اللہ! اسے دین میں فقیہ بنا دے۔لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام کی یہ غایت احتیاط تھی کہ فتویٰ دینے میں بہت تحری اور غور وفکر کرتے تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ان کی بجائے دوسرا کوئی قابل افتاء اس میں کافی ہو جائے جیسا کہ سنن الدارمی میں مذکور آثار صحابہ کرام سے اظہر من الشمس ہے۔

علامہ زاہد الکوثری لکھتے ہیں:

والصحابة رضی الله تعالی عنهم شاهد وا التنزیل و تلقوا علم الدین من النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مباشرة کانوا یتهیبون الافتاء ویحیل بعضهم علی بعض الاجابة عن مسئلة خوفا من الزلل.

اور صحابہ کرام علیہم الرضوان نے تنزیل کا مشاہدہ کیا یعنی انہوں نے نزول قرآن کا

مشاہدہ کیا نزول قرآن کا زمانہ پایا وہ شان نزول اور اسباب نزول سے باخبر تھے اور تقدیم و تاخیر سے واقف تھے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے بلاواسطہ علم دین وصول کیا لیکن ان کا حال یہ تھا کہ وہ فتویٰ دینے سے بچتے تھے اور لغزش کے خوف کی وجہ سے ان میں سے بعض مسئلہ کا جواب دینے کو بعض پر منحصر کر دیتے۔

چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ ابوالمنہال کہتے ہیں: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صَرف (سونے‘ چاندی کی بیع) کے بارے میں سوال کیا‘ انہوں نے کہا حضرت زید بن ارقم مجھ سے زیادہ جانتے ہیں ان سے سوال کرو‘ میں نے حضرت زید سے سوال کیا‘ انہوں نے کہا حضرت براء بن عازب سے سوال کرو وہ زیادہ عالم ہیں پھر ان دونوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سونے کے بدلے میں چاندی کی ادھار بیع سے منع فرمایا ہے۔

(شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۳۳۶)

علامہ زاہد الکوثری لکھتے ہیں: ”**ولو لا خوف السلف من اثم کتم العلم لما کانوا یتصدون للافتاء بالمرة ولکن نری الناس الیوم علی خوف ذلك یتزاحمون علی الفتیاء ویتسابقون فی حمل التبعة فما من مجلة او صحیفة فی البلد الا وفیها فتاوی عن مسائل**“۔ متقدمین کو اگر علم کو چھپانے کے گناہ کا خوف نہ ہوتا تو وہ ایک بار بھی فتویٰ دینے کی طرف متوجہ نہ ہوتے لیکن آج ہم لوگوں کو اس کے خلاف دیکھ رہے ہیں وہ فتویٰ دینے پر ایک دوسرے کو دبا رہے ہیں اور اس ذمہ داری کو اٹھانے میں باہم مسابقت کر رہے ہیں کہ شہر میں کوئی رسالہ یا اخبار نہیں چھپتا مگر اس میں مسائل سے متعلق فتاویٰ ہوتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آج بس فتویٰ دینے کی دھن سوار ہے خواہ افتاء کا اہل ہو یا نہ ہو حالانکہ فتویٰ امور دین سے ہے اور فتویٰ دینا بہت ہی اہم دینی ذمہ داری ہے کہ فتویٰ دینا حقیقۃً مجتہد کا کام ہے کہ سائل کے سوال کا جواب کتاب وسنت‘ اجماع وقیاس سے وہی دے سکتا ہے کہ افتاء کا یہی پہلا مرتبہ ہے جو اصل ہے۔

اور افتاء کا دوسرا مرتبہ نقل ہے یعنی صاحب مذہب سے جو بات ثابت ہے سائل کے جواب میں اسے بیان کر دینا۔ اور یہ اصلاً فتویٰ دینا نہ ہوا بلکہ مستفتی کے لیے مفتی یعنی مجتہد کا

قول نقل کردینا ہے' مفتی ناقل کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ مفتی اصیل یعنی مجتہد کے قول کو مشہور' متداول اور معتبر کتب سے اخذ کرے' نیز اس کو بیدار مغز ہونا چاہیے غفلت برتنا اس کے لیے درست نہیں' کیونکہ اس زمانہ میں اکثر حیلہ سازی سے صورت بدل کر فتوی حاصل کرلیا جاتا ہے اور لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ فلاں مفتی نے مجھے فتوی دے دیا ہے اور اسے اپنی کامیابی تصور کی جاتی ہے' نیز اپنے زمانے کے حالات سے باخبر رہے اور اجماعی وانفرادی مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدبر وتفکر سے کام لے لہٰذا جو فتوی دینے کا اہل ہو اس کے لیے فتوی دینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ فتوی دینا لوگوں کو دین کی بات بتانا ہے اور یہ خود ایک ضروری چیز ہے کیونکہ کتمان علم حرام ہے' اور غلطی ہو جائے تو رجوع کرنے میں کبھی دریغ نہ کرے کیونکہ غلط فتوی دے کر رجوع نہ کرنا' خواہ شرم سے ہو یا تکبر سے بہر حال حرام ہے۔

صحابہ کرام اور اہل علم اکابرین امت کے پیش نظر کتمان علم کی وعید بھی تھی اور غلط فتوی کا موجب گناہ ہونا بھی تھا' اسی وجہ سے وہ فتوی دینے سے متعلق انتہاء درجہ کی احتیاط کرتے تھے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس سلسلہ میں لاپرواہی اور بے احتیاطی برتنے سے فتوی کا رعب و عزت اور شرع مطہر کی جلالت اور فقہاء اسلام کی حرمت پر حرف آئے گا۔ جب کہ فی زمانا اس اہم معاملہ میں احتیاط کا دامن چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ حد تو یہ ہے کہ مسند افتاء پر نا اہل تک بیٹھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے امت مسلمہ کے دلوں سے فتوی کا رعب وعزت اور شرع مطہر کی جلالت اور فقہاء اسلام کی حرمت اٹھتی جارہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''من سئل عن علم علمه ثم کتمه الجم یوم القیمة بلجام من النار''۔ (احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' مشکوۃ المصابیح ص ۳۴)

یعنی جس سے علم کی وہ بات پوچھی گئی جس کو جانتا تھا پھر بھی اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

لغات الحدیث میں ہے: مثلاً کوئی اسلام لانا چاہے اور اسلام کے عقائد اور ارکان پوچھے یا حلال' حرام کا فتوی چاہے یا اور کسی شرعی مسئلہ (کا فتوی چاہے) اور وہ جان بوجھ کر نہ بتائے تو سخت گناہ گار ہوگا۔ (کتاب العین ص ۱۸۴)

حضرت شیخ محقق فرماتے ہیں: یعنی جس علم کا جاننا ضروری ہو اور علماء میں سے کوئی اور

اسے بیان کرنے والا بھی نہ ہو اور بیان کرنے سے کوئی صحیح عذر بھی مانع نہ ہو بلکہ بخل اور علم دین سے لاپرواہی کی بنا پر چھپائے تو اس مذکورہ سزا کا مستوجب ہوگا۔

(اشعۃ اللمعات مترجم ج ۱ ص ۵۰۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**من افتی بغیر علم کان اثمه علی من افتاه**''۔

(ابوداؤد' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۵)

یعنی جسے بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ اس پر ہوگا جس نے اسے فتویٰ دیا۔

اس صورت میں افتاء کا پہلا فعل مجہول ہوگا اور اگر پہلا فعل معروف ہے تو دوسرا فعل استفتی کے معنی میں ہوگا اور ترجمہ ہوگا کہ جس نے بغیر علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ اس پر ہوگا جس نے اس سے فتویٰ طلب کیا۔

غرضیکہ جو افتاء کا اہل نہ ہو اس کا فتویٰ دینا تو جرم ہے ہی' پر جو جانتے بوجھتے ایسے شخص سے فتویٰ معلوم کرے وہ بھی مجرم ہوگا' لہٰذا لازم ہے کہ اہل افتاء سے فتویٰ معلوم کیا جائے۔

سنن ابن ماجہ کی روایت میں ہے: ''**من افتی بفتیا بغیر ثبت فانما اثمه علی من افتاه**''۔ (ص ۶)

اس روایت میں بھی سابق دونوں احتمال ہیں نیز ابن عساکر کی روایت میں ہے: ''**من افتی بغیر علم لعنته ملائکة السماء و الارض**''۔ (کنز العمال ج ۱۰ ص ۱۹۳) جس نے بغیر علم کے فتویٰ دیا تو زمین و آسمان کے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ پیش آمدہ مسائل میں اہل افتاء سے فتویٰ معلوم کرنا اور مسئلہ کا حل چاہنا قرآن مجید' احادیث صحیحہ' صحابہ و تابعین اور بعد کے فقہاء اسلام کے تعامل سے ثابت ہے' قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی ضروری ہے کہ اہل افتاء سے رجوع کیا جائے' ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ**''۔ (النحل: ۴۳) پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے سوال کرو۔

علامہ شمس الدین سخاوی لکھتے ہیں: ''**قال الامام النووی رحمه الله تعالی فی الروضة: یستحب عند ارادة الافتاء ان یستعیذ من الشیطن ویسمی الله تعالی و یحمده و یصلی علی النبی ﷺ و یقول: لا حول ولا قوة الا بالله ویقول**

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی‘‘۔

(القول البدیع ص ۱۰۲)

امام نووی علیہ الرحمۃ نے ’’روضہ‘‘ میں فرمایا کہ فتوی دینے کے ارادہ کے وقت (مفتی کے لیے) مستحب ہے کہ وہ شیطان سے (اللہ تعالیٰ کی) پناہ مانگے اور اللہ تعالیٰ کا نام لے اور اس کی حمد کرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود بھیجے اور ’’لا حول ولا قوۃ الا باللہ‘‘ پڑھے اور پھر ’’رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی‘‘ پڑھے۔

اس مختصر بیان سے شاید فتوی کی تاریخی اور شرعی حیثیت کا پتا چل گیا ہوگا۔ باقی رہا ’’لفظ نویسی‘‘ یعنی لکھنے کا کام تو یہ فتوی کے لیے لازم نہیں کہ فتوی کے محض لکھنے کا کام غیر مفتی بھی مفتی کے املاء پر کرسکتا ہے‘ نیز مفتی پر فتوی لکھنا ضروری نہیں ہے۔ جس طرح ابتداء اسلام میں کتابت حدیث کی ممانعت کے باوجود حدیث کا انکار نہیں کرے گا مگر مجنون‘ اسی طرح کتابت فتوی کی ممانعت نہ ہونے کے باوجود اس کا ثبوت نہ بھی ہو تو انکار فتوی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ فتوی اس کو کہتے ہیں جس میں حکم شرعی کا بیان ہو‘ کتاب سے یا سنت سے۔ اور اہل اسلام و ایمان میں سے بھلا کون اس کا انکار کرسکتا ہے یا پھر اجماع سے اور اس کا انکار‘ راہ مؤمنین سے ہٹ کر نار جہنم کی طرف جانا ہے یا پھر اجتہاد سے لہٰذا جو جس صاحب مذہب کا مقلد ہے وہ حسب شرائط جس کی تفصیل فقہاء اسلام نے لکھی ہے اپنے امام کا قول مانے گا اور اس پر عمل کرے گا البتہ جو کسی امام کا بھی مقلد نہ ہو وہ اس اجتہادی فتوی کا انکار کرے تو دو صورتیں ہیں یا تو وہ مجتہد مطلق ہوگا یا نہیں پہلی صورت میں وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرے گا اور دوسری صورت میں فتوی کا انکار موجب ناری ہوگا۔

بہرحال ابتداء اسلام میں کتابت فتوی کا معمول نہ تھا البتہ فتاوی دیئے جاتے تھے اور بالعموم اذہان میں محفوظ رکھے جاتے تھے یہاں تک کہ بعد میں احادیث کی طرح فتاوی بھی مدون ہوئے جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ‘ مصنف عبدالرزاق‘ مصنف وکیع‘ سنن ابن منصور‘ سنن بیہقی‘ تمہید ابن عبدالبر‘ اور استذکار ابن عبدالبر میں صحابہ و تابعین کے فتاوی موجود ہیں پھر بعد میں باقاعدہ تحریری فتاوی کا سلسلہ جاری ہوا جو آج تک جاری ہے اور ان کی طباعت

بھی ہوتی رہی اور آج بھی ہو رہی ہے۔ چند مشہور کتب فتاوی درج ذیل ہیں: (۱) فتاوی قاضی خان (۲) فتاوی النوازل (۳) فتاوی بزازیہ (۴) خلاصۃ الفتاوی (۵) تنقیح الفتاوی الحامدیۃ (۶) فتاوی عالمگیری (۷) فتاوی رضویہ وغیرہ۔

عرض ختامی

الحمد للہ تعالیٰ! عنقریب ایک اور علمی و تحقیقی فتاویٰ موسوم بہ (انوار الفتاوی) دیدہ زیب زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ خزائن علمیہ و ذخائر فقہیہ میں اضافہ کا حامل منصۂ شہود پر آرہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس سے امید واثق ہے کہ یہ انظار کو منور قلوب کو معطر اور اذہان کو مطمئن کرنے کے علاوہ علمی و تحقیقی معلومات میں زیادت اختلافی گتھی کی اتفاقی سلجھی سے افکار کی سجاوٹ اور ضلالت وغوایت کی بادسموم سے حفاظت کا ذریعہ بنے گا باایں وجہ کہ اس میں قدیم و جدید اسئلہ کے اجوبہ دلائل و براہین کے لبادہ سے مرصع و مزین ہیں۔

یہ فتاوی یقیناً تشنگان علم و فن کے واسطے باعث تسکین اور نہ صرف عوام بلکہ خواص کے لیے بھی معلومات افزا ہوگا۔ فی الجملہ یہ فتاوی صاحب الفتاوی کی وسعت علمی اور فقاہت دینی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ **کما لا یخفی علی من یطالع انوار الفتاویٰ۔**

انوار الفتاویٰ کی وجہ تسمیہ غالبا یہ ہے کہ صاحب الفتاوی فاضل جلیل عالم نبیل مفتی محمد اسماعیل نورانی زیدہ مجدہ کی نسبت روحانیہ قائد ملت اسلامیہ مبلغ اسلام حافظ قاری حضرت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ رحمۃ الباری سے ہے اور نورانی نور سے منسوب ہے جیسے حقانی حق سے منسوب ہے اور نور کی جمع انوار ہے۔

روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت قائد ملت اسلامیہ علیہ الرحمۃ کے "نورانی" سے ملقب ہونے میں کسی خارجی شہادت کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ ان کی پرنور صورت و سیرت اور بے داغ علمی سیاست خود اس پر شاہد ہے نیز مفتی موصوف حضرت مبلغ اسلام علیہ رحمۃ الغفار ہی کی نسبت سے نورانی کہلاتے ہیں اور یہ نسبت ایسی ہی ہے جیسے ایک شافعی کی امام شافعی علیہ رحمۃ القوی کی طرف۔

صاحب الفتاوی کی نسبت علمیہ خاتم المنظمین صدر المدرسین استاذ الاساتذہ حضرت

علامہ مولانا مفتی محمد حسن حقانی متعنا اللہ تعالیٰ بطول الحیاۃ سے ہے جو درحقیقت مفتی موصوف کے سرپرست علمی اور مربی عملی ہیں ان ہی کی مساعی جمیلہ سے ادارہ ''جامعہ انوار القرآن'' علمی حلقوں میں بالعموم اور تنظیم المدارس میں بالخصوص مشہور و معروف ہوا۔ اسی انوار القرآن کے چشمہ علمی سے انوار الفتاوی کا سوتا جاری ہوا ہے' کہ جامعہ مزبورہ میں صاحب الفتاوی کی علمی و عملی تربیت مہتمم جامعہ اور رئیس دار الافتاء قبلہ مفتی محمد حسن حقانی مدظلہ العالی کی خصوصی نگرانی میں شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی' شیخ الادب حضرت علامہ محمد اسحٰق رضوی اور مفکر اسلام حضرت علامہ مولانا محمد رضوان احمد خان نقشبندی ایسے ماہر اساتذہ کے روبرو زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے ہوئی اور جب اس تربیت پر مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ محمد منیب الرحمٰن دامت برکاتہم العالیہ کی شفقت و عنایت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی مہر اعتماد محقق دوراں اور مفسر قرآن شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے علوم نقلیہ و عقلیہ سے کشید روشنائی میں تر بتر ثبت فرمادی تو گلستان علم میں ایک اور گل کھل اٹھا جو گلستان علم کے ماحول کو معطر و معنبر کرنے لگا' آسمان علم میں ایک اور خورشید طلوع ہوگیا جو آسمان علم کی فضا کو اپنی ضیا پاشیوں سے روشن کرنے لگا اور چشمہ علم میں ایک اور سوتا پھوٹ پڑا جو زمین علم کو سیراب کرنے لگا' مگر ان تمام حقائق کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت اصلیہ ہے کہ جب مفتی موصوف نے شب و روز اخلاص کے ساتھ انتھک محنت و مشقت سے کتاب و سنت کا علم' دین قیم کا فہم حاصل کیا اور مختلف علوم و فنون کو پڑھا تو نتیجہ میں جو علم نافع حاصل ہوا اس کا حق ادا کرنے میں انہوں نے غفلت و تساہل سے ہرگز کام نہ لیا بلکہ ''لکل شیء حق'' کے پیش نظر ابتداء ہی سے علم دین کے اولین حق' عمل بالاخلاص کو عقیدۂ راسخہ کی جھرمٹ میں ادا کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے علمی صلاحیت اور فنی قابلیت کے جواہر عطا فرما کر ان کا حق ادا کرنے کی بھی توفیق کامل مرحمت فرمادی کہ مفتی موصوف درس و تدریس' وعظ و نصیحت' دعوت و تبلیغ' امامت و خطابت' تصنیف و تالیف اور ترجمہ و افتاء ہر ایک میدان کے شہسوار ہوگئے۔

اظہر من الشمس ہے کہ جب ادائے حق کامل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دینی و دنیوی' عزت و بھلائی بلندی و سرخروئی اور کامیابی و کامرانی عطا فرماتا ہے اور ذلت و رسوائی' ناکامی و نامرادی سے حفاظت فرماتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب انوار الفتاویٰ کو دین متین کی مزید خدمت کر کے اہل اسلام کی خیر خواہی کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں حاسدوں کے حسد، شریروں کے شر اور ظالموں کے ظلم سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین

محمد الیاس رضوی اشرفی

۲۲ فروری ۲۰۰۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ جلیل

غلام جیلانی اشرفی
(استاذ الحدیث جامعہ نضرۃ العلوم' کراچی)

الحمد لله الذی هدانا الی الصراط المستقیم والصلوۃ والسلام
علی من اختص بالخلق العظیم وعلی آله وصحبه الذین
قاموا لنصرة الدین القویم. اما بعد!

دنیا میں ہر مذہب و ملت اور قوم و ملک کے افراد کسی نہ کسی نظامِ حیات و اقدار پر کاربند ہیں' انسانیت کی معلوم تاریخ کے مطابق مختلف نظریات انسانوں کے سامنے پیش کیے جاتے رہے' ان میں سے کچھ تو پہلے ہی مرحلے میں رد کر دیئے گئے اور کچھ کو قبولیت کی سند سے نوازا گیا مگر ان میں سے بھی بہت سے عملی میدان میں آ کر ناکام و ناقابل عمل ثابت ہوئے۔ غالباً اس کو دیکھ کر نظریات میں فلسفہ جدلیات کا نظریہ پیش کیا گیا' جو کہ تھیس (THESIS) انٹی تھیس (ANTI-THESIS) اور سن تھیس (SYNTHESIS) پر مشتمل ہے۔

گزشتہ دو سے ڈھائی ہزار سالہ تاریخ انسانیت میں انسانیت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے انسانوں ہی میں سے کچھ لوگ غور و فکر' تفکر و تدبر کرتے رہے اور مسائل کا حل پیش کرتے رہے' یوں فلسفۂ نظامِ حیات یوماً فیوماً آگے بڑھتا رہا اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور یہ تسلسل جاری رہا۔ جبھی ہیگل کو یہ کہنا پڑا کہ نظریۂ نظام حیات میں ایک تھیس (THESIS) پیش کیا گیا' پھر اس کے خلاف ایک دوسرا نظریہ پیش کیا گیا جسے وہ انٹی تھیس (ANTI-THESIS) کہتا ہے۔ پھر ان دونوں نظریات میں تصادم واقع ہوا اور اس تصادم کے بطن سے ایک سن تھیس (SYNTHESIS) نے جنم لیا اور یہ تسلسل ہنوز جاری ہے۔

نظریات کی انہی ماضی کی تاریخوں میں وہ تاریخی مرحلہ بھی ہے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی سرزمین پر بابِ نبوت کو بند کرتے ہوئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ساتھ کامل واکمل نظام حیات آخری پیغام کے طور پر رہتی دنیا تک کی انسانیت کے جملہ مسائل کے حل کے لیے پیش کیا۔ جبھی تو ڈاکٹر اقبال نے اسلامی نظریۂ حیات کا دیگر نظریہ ہائے حیات سے تقابل کیا تو بے ساختہ پکار اٹھے:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

نظریہ حیات واقدار میں یہ ایک ایسا تھیس ہے کہ جس کا انٹی تھیس دنیا آج تک پیش نہیں کر سکی، اور تاریخ گواہ ہے کہ جس نے بھی یہ مذموم کوشش کی ناکام ونامراد ہوا۔ یہاں آکر جدلی فلسفہ بھی دم توڑ گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے اس نظامِ حیات کی تکمیل اس وقت ہوئی جب "الیوم اکملت لکم دینکم" پر مشتمل مژدۂ جاں فزاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سنایا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عملی طور پر مکمل توضیح وتفسیر فرما کر اس دارِ فانی سے پردہ فرما گئے۔

اس نظام حیات کی منجملہ خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فقہ واجتہاد کی مکمل گنجائش موجود ہے، اور اسی خوبی کے سبب یہ نظریہ کل بھی قابل عمل تھا، آج بھی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ظاہری و دنیوی میں متعدد مواقع پر صحابہ کرام اجتہاد فرماتے رہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی توثیق فرماتے رہے، اس طرح اسلامی نظریۂ حیات کی مضبوط بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھی اور بعد میں تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس بنیاد پر مضبوط فقہی عمارات تعمیر کیں۔ انہی عمارات میں مسلمان آج تک پناہ گزیں ہیں اور امن و عافیت میں ہیں، جو ان سے باہر گیا وہ کہیں بھی پناہ حاصل نہ کر سکا۔

قرآن وحدیث اور فتویٰ

فتویٰ درحقیقت استفتاء کا جواب ہے۔ قرآن کریم میں استفتاء اور افتاء دونوں کو ایک ہی آیت میں سورۃ نساء میں دو مقام پر آیت نمبر ۱۲۷ اور ۱۷۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی ایک سے زائد مقام پر استفتاء اور افتاء وارد ہوا ہے۔ جو لوگ فتویٰ کو دین سازی کا نام دیکر رد کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ ان مقامات کا بغور مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ فتویٰ قرآن وحدیث کے مطابق دینی مسئلہ بتانے کا نام ہے۔ نہ کہ دین گھڑنے کا۔

ویسے قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھے گئے سوالوں کا جواب دیا ہے اور اسلوب یہ ہے کہ اسے ''یسئلونک'' سے تعبیر فرمایا ہے ان کی تعداد ۱۵ ہے۔ چنانچہ عالم عرب میں اب بھی یہ اسلوب معروف ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر دینی معلومات کا پروگرام اسی نام سے نشر کیا جاتا ہے۔

اجتہاد یا تقلید محض

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کی سب سے بڑی خوبی اس میں فقہ و اجتہاد کی گنجائش ہے' سو اس سلسلہ میں تاریخی شہادت موجود ہے کہ ائمہ اربعہ یعنی مجتہدین مطلق جو کہ طبقات فقہاء میں سب سے پہلے طبقے کے فقیہانِ امت ہیں' انہوں نے قیاس و اجتہاد کے لیے قواعد وضوابط اور اصول وضع کیے۔ انہیں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق ان کے بعد آنے والے مختلف طبقات کے فقہاء نے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کیا اور اس طرح اسلامی نظریۂ حیات اپنی ارتقائی منازل کی طرف رواں دواں رہا۔ اور ہر عصر کے چیلنجز قبول کر کے اپنی مسلمہ حیثیت ثابت کرتا رہا تا آنکہ وہ زمانہ آیا کہ تقلید جامد پر اس حد تک اصرار کیا گیا کہ اگر کوئی کسی امام کا مقلد ہے تو اس کے مذہب کی جزئیات سے آگے سوچنا بھی گوارہ نہ کرے۔ مثلاً اگر کسی حنفی عالم دین سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ فقہ حنفی کی جزئیات پر مشتمل جو سابقہ کتب موجود ہیں انہیں سے جواب دے اور اس مسئلہ پر براہ راست کتاب وسنت سے استدلال نہ کرے یہاں تک کہ اپنے فتویٰ میں کتاب وسنت سے دلیل بھی پیش نہ کرے۔ بلکہ صرف فقہ حنفی کی جزئیات پر مشتمل کتاب کا حوالہ دے۔ اگرچہ اس فکر کے حاملین بہت

تھوڑی تعداد میں تھے مگر پھر بھی اس کا ردعمل بہت شدید ہوا اور معاشرہ میں ایک ایسے طبقے نے جنم لیا کہ جنہوں نے مجتہدین مطلق کے تمام اصول اور قواعد وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر براہ راست قرآن وحدیث اور بعض نے تو حدیث نبوی ﷺ کو بھی ترک کر دیا اور صرف کتاب اللہ سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق استدلال کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں امت فکری انتشار کا شکار ہوگئی اور اب حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو دارالافتاء میں مطلوبہ معیار کا مفتی نہیں ہے اور دوسری طرف زندگی کے مختلف شعبوں میں بزعم خود مجتہد بنے بیٹھے لوگ نظر آتے ہیں۔ اس صورتحال سے نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ صاحبان علم وفضل تقلید محض پر اصرار کرنے کے بجائے اس بات پر اتفاق کریں کہ مجتہدین مطلق نے جو اصول وقواعد اور ضوابط مرتب کئے انہیں پر برقرار رہتے ہوئے انہیں کی روشنی میں کسی بھی پیش آمدہ نئے مسئلہ پر قرآن وحدیث سے براہ راست استدلال کیا جائے اور عامۃ المسلمین کے عمل کرنے کے لیے بہتر راستے کی نشاندہی کی جائے۔

دارالافتاء کا معیار

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک دارالافتاء کا معیار یہ تھا کہ مستند اور معتبر کسی ایسے دارالعلوم میں جہاں مکمل درس نظامی کی تعلیم دورۂ حدیث سمیت باقاعدگی کے ساتھ ہوتی تھی ان اداروں میں دارالافتاء بھی قائم ہوتا تھا' بیٹھتے تھے اور فتویٰ نویسی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

اب حالت یہ ہے کہ ہر مسجد کے امام نے اپنے نام کے ساتھ مفتی لکھ کر بورڈ آویزاں کر رکھا ہے اور اپنے حجرے کو دارالافتاء بنایا ہوا ہے حالانکہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں کہ جو علم وفقہ کی کسی عربی کتاب کی تفہیم تو دور کی بات ہے مختصر عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ اگر یہ روش برقرار رہی تو توقع ہے کہ مساجد کے مؤذن اور خادم بھی اپنے نام کے ساتھ مفتی کا بورڈ آویزاں کرلیں گے۔ پھر کیا ہوگا اللہ بہتر جانتا ہے۔

مفتی کا معیار

کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ حقیقت میں مفتی وہ ہے جس کے سامنے اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش کیا جائے جس کی کوئی نظیر سابقہ فتاویٰ اور کتب فقہ میں نہ ہو تو وہ اصولوں کی روشنی میں اس مسئلے کا حل پیش کر سکے' اس طرح یہ بات واضح ہے کہ ایسا معیاری مفتی طبقات فقہاء میں

مجتہدین مطلق کے بعد جو طبقات ہیں ان میں سے کسی طبقے کا ضرور ہو جب کہ اس وقت حالت یہ ہے کہ کسی دارالافتاء میں کوئی قدرے مشکل سوال پیش کر دے تو پہلے اسے پندرہ بیس دن بعد کی تاریخ دی جاتی ہے اور اس کے بعد دو تین چکر لگوا کر جواب دیا جاتا ہے کہ آپ کا سوال گم ہو گیا۔ اور جن مسائل کا جواب دیا بھی جاتا ہے تو ان میں سابقہ فتاویٰ یا کتب فقہ میں سے کسی کتاب سے کوئی جزئیہ تحریر کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ''مفتی'' کی حیثیت سے دستخط فرما دیتے ہیں۔ حالانکہ موصوف ناقل محض ہیں مفتی تو وہ تھے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اپنے معیار پر نظر ثانی کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

انوار الفتاویٰ

علمی، فکری اور فقہی تحقیقات پر مبنی مجموعہائے فتاویٰ میں انوار الفتاویٰ یقیناً ایک خوبصورت اضافہ ہوگا۔ اس مجموعہ فتاویٰ کے مفتی، نوجوان بلکہ نوخیز، باصلاحیت بلکہ باکمال، متقی اور پرہیزگار، حافظ قرآن، مدرس ومفسر محمد اسماعیل نورانی صاحب ہیں۔ جس توجہ ومحنت سے تدریس وتحریر کی راہ پر گامزن ہیں توقع ہے کہ مستقبل میں مطلوبہ معیار کے مفتی بن جائیں گے۔

محمد اسماعیل نورانی کے فتاویٰ کے مصدق اور ان کے مربی استاذ الاساتذہ علامہ محمد حسن حقانی صاحب ہیں جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کے زیر سایہ انشاء اللہ تعالیٰ محمد اسماعیل نورانی ترقی کے اوجِ ثریا پر پہنچیں گے۔ ڈاکٹر اقبال کا یہ معروف شعر قدرے تصرف کے ساتھ محمد اسماعیل نورانی کی نذر کرتا ہوں:

ہو فقاہت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

غلام جیلانی اشرفی

۲۱ فروری ۲۰۰۷ء

و

معمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ عزوجل کی طرف غصہ اور ظلم کی نسبت

سوال:

اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ کوئی شخص تقریر کے دوران احادیث مبارکہ سنائے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کرے کہ کل بروز قیامت اللہ تبارک وتعالیٰ فلاں فلاں شخص سے رحمت کے ساتھ نہیں کلام فرمائے گا بلکہ غصہ اور ظلم کے ساتھ کلام فرمائے گا اور فلاں فلاں شخص پر رحمت کی نگاہ نہیں فرمائے گا بلکہ ظلم کی نگاہ فرمائے گا' اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے غصہ اور ظلم کا لفظ استعمال کرنا کس زمرے میں آئے گا' بے ادبی' حرام یا کفر؟ برائے کرم رہنمائی فرمائیں۔ شکریہ

[سائل: محمد آصف عطاری' R-18 مدرسۃ المدینہ' گلشن شمیم' یٰسین آباد]

جواب:

عربی زبان میں غصہ کو ''غضب'' کہتے ہیں اور غضب کا لفظ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے لیے استعمال فرمایا ہے۔ جیسے فرمایا: ''وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ'' منافق مردوں اور عورتوں پر اور مشرک مردوں اور عورتوں پر اللہ نے غضب اور لعنت فرمائی۔ (الفتح:٦)

لیکن اللہ عزوجل کے لیے جہاں بھی ''غضب'' کا لفظ آیا ہے' اُس سے وہ معروف غصہ مراد نہیں ہے جو دل کے بھڑکنے کی وجہ سے آتا ہے' بلکہ اس سے بدلہ لینا اور سزا دینا مراد ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے مقامات پر ''غضب'' کا ترجمہ عموماً غضب ہی کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ اُردو کا لفظ ''غصہ'' سن کر ذہن چونکہ دل کے بھڑکنے کی طرف منتقل ہوتا ہے' اس لیے اللہ عزوجل کے لیے اس کا استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی جگہ غضب یا جلال کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔

جہاں تک لفظ ''ظلم'' کا تعلق ہے تو اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف قطعاً جائز نہیں ہے'

بلکہ فقہاء نے اس کو کفر قرار دیا ہے۔
علامہ عالم بن علاء انصاری حنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''**من نسب الجور الی اللہ فقد کفر**'' جس نے اللہ عزوجل کی طرف ظلم کی نسبت کی وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا۔
(فتاویٰ تاتارخانیہ ج۵ ص۴۶۶) **واللہ و رسولہ اعلم بالصواب**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے پر چند اہم سوالات کے جوابات

سوال:
حاضر و ناظر کا معنی و مفہوم کیا ہے؟

جواب:
حاضر کا معنی ہے: موجود اور ناظر کا معنی ہے: دیکھنے والا' اللہ کے کسی پیغمبر کے لیے جب یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنی عطاء اور قدرت سے ساری کائنات اور کائنات کا ظاہر و باطن اس پیغمبر کے سامنے کر دیا اور دور و نزدیک کی آوازیں سننا یا تھوڑے سے وقت میں پورے عالم کی سیر کر لینا اور بیک وقت کئی مقامات پر جلوہ گر ہونا اور پوری کائنات کو ہتھیلی کی مانند ملاحظہ کرنا آسان فرما دیا۔

سوال:
کیا کسی نبی اور پیغمبر کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے؟

جواب:
جی نہیں! یہ شرک نہیں ہے کیونکہ انبیاء کے لیے یہ قدرتیں اور طاقتیں اللہ عزوجل کی جانب سے عطا کردہ ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے تمام فیصلوں میں اپنی مرضی اور اختیارِ مطلق کا مالک ہے' اس لیے وہ اپنے نبیوں کو جس طرح چاہے نواز سکتا ہے' اس لیے نبی کی کسی بھی طاقت اور عظمت پر اعتراض کرنا درحقیقت اللہ کے فیصلہ پر اعتراض کرنا ہے اور اللہ کے فیصلہ پر اعتراض کرنا ایسا خطرناک اقدام ہے' جس نے شیطان کو ہمیشہ کے لیے مردودِ بارگاہ

کر دیا' کیونکہ شیطان بھی اللہ کے پیغمبر کی عزت و عظمت کو نہ دیکھ پایا اور نبی کی تعظیم سے انحراف کرکے توحید سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

حاضر و ناظر کے موضوع پر جب بھی شرک کا وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی قدرت پر نظر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ غور کر لینا چاہیے کہ ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی پورے عالم میں بیک وقت نہ جانے کہاں کہاں جلوہ گر ہوتے ہیں اور مسلسل لوگوں کی روحیں قبض فرماتے ہیں۔ تو جب ایک فرشتے کی یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ مختلف مقامات پر حاضر و ناظر ہو تو انبیاء کرام جو بلاشبہ تمام فرشتوں سے افضل مخلوق ہیں' وہ قدرتِ الٰہیہ سے حاضر و ناظر کیوں نہیں ہو سکتے؟ اور جب حضرت عزرائیل کا پوری کائنات میں حاضر و ناظر ہونا باعثِ شرک نہیں ہے تو کسی پیغمبر کا حاضر و ناظر ہونا شرک کیونکر ہو سکتا ہے۔

سوال:

نبی اکرم ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے پر قرآن مجید میں کوئی دلیل موجود ہے یا نہیں؟

جواب:

جی ہاں! آپ کا حاضر و ناظر ہونا' قرآن مجید کی کئی آیتوں سے ثابت ہے' اختصار کے پیشِ نظر ہم صرف تین آیتیں پیش کر رہے ہیں:

(۱) "اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا" (پیارے حبیب!) بے شک ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ہے۔ (الاحزاب: ۴۵) "شاھد" کا لفظ عربی میں اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی جگہ موجود ہو اور واقعہ کا مشاہدہ کر رہا ہو' لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ پیارے حبیب ہم نے آپ کو کائنات کا مشاہدہ کرنے والا بنا کر بھیجا۔ شیخ محقق شاہ محمد عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ "شاھد" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کے تمام احوال و انجام سے باخبر اور اس میں موجود ہیں۔ (مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۲۶۰ ملخصاً)

(۲) "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ" اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ لوگوں پر (اجتماعی) عذاب نازل فرمائے جبکہ آپ ان لوگوں میں جلوہ گر ہیں۔ (الانفال: ۳۳) اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی امت میں اذنِ الٰہی سے موجود ہیں اور اسی کو حاضر و ناظر کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۳) ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ'' نبی اہلِ ایمان سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (الاحزاب:۶) دیوبندیوں کے مشہور عالم شیخ قاسم نانوتوی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں ''اولٰی'' کا لفظ قرب کے معنی میں ہے۔

(ملاحظہ فرمائیں: تحذیر الناس ص ۱۴' مطبوعہ دارالاشاعت' کراچی)

مذکورہ تمام آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نبی اکرم ﷺ عطائے الٰہی سے حاضر و ناظر ہیں اور مسلمانوں سے ان کی جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کا حاضر و ناظر ہونا شرک نہیں ہے' کیونکہ اگر یہ شرک ہوتا تو قرآن مجید اس کو شانِ رسالت کے طور پر بیان نہ فرماتا۔

سوال:

نبی اکرم ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے پر احادیث میں کوئی دلیل موجود ہے یا نہیں؟

جواب:

جی ہاں! آپ کے حاضر و ناظر ہونے پر صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ترمذی اور دیگر کئی کتابوں میں بہت واضح احادیث موجود ہیں' لیکن ان احادیث کو پیش کرنے سے قبل ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انبیاء کرام پر جو موت آتی ہے' وہ فقط وعدۂ الٰہی کی تکمیل کے لیے آتی ہے اور اس کے فوراً بعد انہیں پہلے سے زیادہ سننے اور دیکھنے کی طاقت عطا فرما کر زندہ کر دیا جاتا ہے اور وہ دفنائے جانے کے باوجود اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور انہیں رزق بھی دیا جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان اللّٰہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللّٰہ حیّ یرزق'' بے شک اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسم کو فنا کرنا حرام کر دیا ہے' پس اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے' اسے رزق بھی دیا جاتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ: ۷ ۱۶۳' مشکوٰۃ المصابیح: ۱۳۶۶)

نیز یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ جب ایک عام آدمی اس دنیا سے انتقال کرتا ہے تو اس کی قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت کو پہلے سے زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دفنانے والے جب واپس جانے لگتے ہیں تو مردہ اُن کے جوتوں کی

آہٹ سنتا ہے۔ (صحیح بخاری:۱۳۳۸، صحیح مسلم:۲۸۷۰) حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر کفار کی لاشوں سے جب خطاب فرمایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر حیرت ظاہر کی تو آپ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا: "ما انتم باسمع منهم" "تم لوگ ان مُردوں سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ (صحیح بخاری:۳۹۷۶، صحیح مسلم:۲۸۷۵) مقامِ غور ہے کہ ایک عام انسان (خواہ مسلمان ہو یا کافر) کے مرنے کے بعد اس کے سننے اور دیکھنے کی قوت بڑھا دی جاتی ہے تو انبیاء کرام جو مخلوق میں بلاشبہ سب سے افضل اور بے مثال ہوتے ہیں' ان کی قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت کا اندازہ کیسے ممکن ہے؟ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تو قرآن مجید نے یہاں تک فرمادیا: "وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى" (پیارے حبیب!) آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی گھڑی سے بہتر ہوگی۔ (الضحیٰ:۴) جب آپ کا ہر اگلا لمحہ پچھلے لمحہ سے بہتر ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنی ظاہری حیات میں تو آپ اپنی امت کے حالات سے باخبر ہوں اور دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد محروم ہو جائیں!!

اس تمہیدی اور ضروری گفتگو کے بعد ہم سوال کے اصل جواب کی طرف آتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے پر احادیث میں کس طرح ثبوت موجود ہیں' چنانچہ اس سلسلے میں اختصار کے پیش نظر چند احادیث پیش خدمت ہیں:

(۱) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**انی فرط لکم وانا شهید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الان**" یعنی بلاشبہ میں تمہارا پیش رو ہوں اور تم پر حاضر و ناظر ہوں اور خدا کی قسم! میں اس وقت بھی اپنے حوضِ کوثر کو دیکھ رہا ہوں۔ (صحیح بخاری:۱۳۴۴، صحیح مسلم:۲۲۹۶) حاضر و ناظر کے مفہوم میں چونکہ یہ بات شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے لیے دور و نزدیک کی چیزیں برابر فرمادیتا ہے' اس لیے یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے پر ایک واضح دلیل ہے۔

(۲) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**ان اللہ زوالی الارض فرایت مشارقها ومغاربها**" یعنی اللہ تعالیٰ نے میرے لیے پوری زمین کو سمیٹ دیا ہے' اس لیے میں نے زمین کی تمام سمتوں کو دیکھ لیا ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۸۸۹، سنن ترمذی: ۲۱۷۶)

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زمین کی تمام سمتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے برابر کر دی گئی ہیں اور قرب و بُعد کا فرق مٹا دیا گیا ہے اور گزشتہ حدیث کی رُو سے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرشِ زمین سے حوضِ کوثر کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں تو گنبد خضرا سے پوری کائنات کو ملاحظہ فرمانا کیونکر ممکن نہیں ہے!

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**من رأنی فی المنام فسیرانی فی الیقظة**'' یعنی جس شخص نے خواب میں میرا دیدار کیا، وہ عنقریب بیداری میں بھی میرا دیدار کرے گا۔ (صحیح بخاری: ۶۹۹۳، صحیح مسلم: ۲۲۶۶) اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے شہر یا اپنی مسجد کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے فرمایا کہ جو خواب میں آپ کے دیدار سے مشرف ہوا، وہ عنقریب بیداری میں بھی آپ کا دیدار کرے گا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کائنات میں حاضر و ناظر نہیں ہیں تو بیداری میں آپ کا دیدار کیسے ممکن ہے!!

(۴) ۶۱ ھ میں محرم الحرام کی دس تاریخ کو میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو جب شہید کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حاضر و ناظر ہونے کی وجہ سے) وہاں بھی جلوہ افروز تھے، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس دن خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ آپ کے سرِ انور اور ڈاڑھی مبارک میں غبار لگا ہوا تھا۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی اس حالت کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''**شھدت قتل الحسین انفا**'' یعنی میں ابھی قتل حسین کے موقع پر موجود تھا۔ (سنن ترمذی: ۳۷۷۱، مشکوٰۃ: ۶۱۶۶) ملاحظہ فرمائیں کہ سرکار گیارہ ہجری میں وصال فرمانے کے باوجود ۶۱ ہجری کے واقعہ میں جلوہ افروز ہیں! کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ عزوجل نے آپ کو حاضر و ناظر بنایا ہے اور آپ صرف روضۂ انور سے کائنات کا مشاہدہ ہی نہیں فرماتے بلکہ بوقتِ ضرورت کہیں تشریف لے جانا چاہیں تو تشریف بھی لے جاتے ہیں!!

(۵) معراج کی شب اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو بیت المقدس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی اقتداء میں جمع فرمایا اور تمام انبیاء کو اپنے محبوب کی زیارت عطا فرمائی' آپ خود ارشاد فرماتے ہیں: ''فجمع لی انبیاء علیھم السلام فقد منی جبریل حتی امتھم ''یعنی میرے لیے تمام انبیاء کرام جمع کیے گئے اور جبریل امین نے مجھے آگے کیا حتیٰ کہ میں نے ان سب کو نماز پڑھائی۔ (سنن نسائی: ۴۵۰) نماز کے بعد نبی اکرم ﷺ نے راستے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا' جیسا کہ فرمایا: ''مررت علی موسی وھو یصلی فی قبرہ ''یعنی میں موسیٰ علیہ السلام کی قبر کے پاس سے گزرا تو وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح مسلم: ۲۳۷۵) پھر اسی رات نبی ﷺ نے آسمانوں پر مختلف انبیاء کرام سے ملاقات فرمائی' جس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے' دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام سے' تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے' چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے' پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے' چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ خصوصاً اس سفر سے واپسی کے وقت چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے آپ کی امت کی آسانی کے لیے نمازوں میں کمی کروانے کی آپ سے سفارش فرمائی۔ (صحیح بخاری: ۳۸۸۷' صحیح مسلم: ۱۶۴) شب معراج کی ان تمام مستند تفصیلات سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد زندہ ہوتے ہیں' وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ عطائے الٰہی سے پوری کائنات میں تصرف کر سکتے ہیں اور آنِ واحد میں کروڑوں میل کا سفر کر کے مختلف جگہوں پر حاضر ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پردہ کر جانے کے بعد لوگوں سے بے خبر نہیں ہو جاتے' بلکہ خوب باخبر رہتے ہیں اور مشکل پیش آنے سے پہلے ہی ان کی مدد فرماتے ہیں۔

جو لوگ نبی کو حاضر و ناظر کہنا شرک سمجھتے ہیں' وہ بتائیں کہ انبیاء کرام دنیا سے پردہ فرمانے کے باوجود معراج کی شب بیت المقدس میں کیسے پہنچے اور پھر اسی شب آسمانوں پر کیسے پہنچے؟ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ہی شب میں اپنی قبر میں اور

بیت المقدس میں اور چھٹے آسمان پر بیک وقت جلوہ گر ہو سکتے ہیں تو سیّد الانبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ دنیا سے پردہ فرمانے کے باوجود حاضر و ناظر کیوں نہیں ہو سکتے؟ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کی مدد کر سکتے ہیں تو خود رسول اللہ ﷺ گنبد خضرا سے مدد کیوں نہیں فرما سکتے!!

ہر مسلمان دنیا میں کسی جگہ بھی نماز ادا کرے وہ اس بات کا پابند ہے کہ تشہد میں جب نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں سلام پیش کرے تو "السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللّٰه وبرکاته" کے الفاظ کہے (یعنی اے نبی! آپ پر سلام ہو! اور اللہ کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں!) (صحیح بخاری: ۱/۸۳، صحیح مسلم: ۴۰۲) نبی ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے باوجود تشہد میں تمام مسلمانوں کا ("ایھا النبی" کہہ کر) نبی اکرم ﷺ کو پکارنا اور براہِ راست آپ کو مخاطب کر کے سلام پیش کرنا' اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آپ کائنات میں بلاشبہ حاضر و ناظر اور جلوہ گر ہیں۔ علمائے اہل سنت اور علمائے دیوبند کے درمیان متفقہ شخصیت حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح میں بعض اہل معرفت کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نماز کے دوران نبی اکرم ﷺ کو یوں مخاطب کرنا اس لیے ہے کہ حقیقتِ محمدیہ تمام چیزوں میں جاری ہے۔ (آگے آپ کے فارسی عبارت کے الفاظ یہ ہیں:)

"پس آنحضرت در ذاتِ مصلّیان موجود و حاضر است پس مصلی را باید کہ ازیں معنی آگاہ باشد وازیں شہود غافل نہ بود' تا بانوارِ قرب واسرارِ معرفت متنور و فائض گردد"

(ترجمہ) نبی اکرم ﷺ نمازیوں میں موجود اور حاضر ہوتے ہیں' اس لیے نمازی کو "السلام علیک" کے اس معنی و مفہوم سے آگاہ رہنا چاہیے اور نبی اکرم ﷺ کی موجودگی سے غافل نہیں ہونا چاہیے' تاکہ قرب کی تجلیات اور معرفت کے اسرار و رموز سے روشنی حاصل ہو سکے۔ (اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۰۱ مطبوعہ ملتان) غیر مقلدین کے پیشوا نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے بھی اپنی کتاب (مسک الختام ص ۲۴۴) یہ بات لکھی ہے۔

(۷) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انّ اللہ عزوجل رفع لی الدنیا فانا انظر الیھا والی ما ھو کائن فیھا الی یوم القیامۃ کما انظر الی کفی ھذہٖ'' یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات میرے سامنے پیش فرمادی' اس لیے میں کائنات کو اور جو کچھ اس کائنات میں قیامت تک ہونے والا ہے' وہ سب کچھ اس طرح دیکھ رہا ہوں' جیسے اپنی یہ ہتھیلی دیکھ رہا ہوں۔ (کنزالعمال: ۳۱۸۱۰' جمع الجوامع: ۴۸۴۹)

اس حدیث سے اور گزشتہ دیگر احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حاضر و ناظر کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ روضۂ انور سے پوری کائنات کو ہتھیلی کی مانند ملاحظہ فرما رہے ہیں اور کسی جگہ کرم فرمانا چاہیں تو تشریف بھی لے جاسکتے ہیں۔

سوال:

جب اس موضوع پر یہ تمام دلائل موجود ہیں تو پھر علماء اہل سنت اور علماء دیوبند کے درمیان اس مسئلہ میں بنیادی غلط فہمی اور وجہ اعتراض کیا ہے؟

جواب:

بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ مخالفین نے حاضر و ناظر کا ایک غلط مفہوم فرض کر لیا ہے اور لوگ پھر اُس مفہوم کو اہل سنت کا عقیدہ سمجھنے لگ گئے' حالانکہ وہ مفہوم محض فرض کردہ اور غلط ہے' نہ کہ اہل سنت کا عقیدہ۔ چنانچہ مخالفین نے یہ مشہور کیا کہ جو لوگ حاضر و ناظر کا عقیدہ رکھتے ہیں' اُن کے نزدیک مکان' مسجد' میدان' غرض زمین کا کوئی حصہ نبی کے وجود سے خالی نہیں ہے اور جب ہر جگہ نبی موجود ہے تو اس سے بہت ساری بے ادبیاں لازم آتی ہیں!

ہم یہ کہتے ہیں کہ حاضر و ناظر کا جو مفہوم عوام میں پھیلایا گیا ہے وہ اہل سنت کا عقیدہ نہیں ہے۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ حیاتِ جسمانی کے ساتھ اپنی قبرِ انور میں جلوہ فرما ہیں اور وہاں سے پوری کائنات اور کائنات کے احوال کا مشاہدہ فرما رہے ہیں۔ ہاں اگر تصرف فرما کر کائنات میں کسی جگہ جانا چاہیں تو عطائے الٰہی سے اس کی طاقت بھی آپ کو حاصل ہے۔

حضرت حکیم الامت شارحِ مشکوٰۃ مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

حاضر و ناظر کے شرعی معنی یہ ہیں کہ قوتِ قدسیہ والا ایک ہی جگہ رہ کر تمام عالم کو اپنے کفِ دست کی طرح دیکھے اور دُور و قریب کی آوازیں سُنے یا ایک آن میں تمام عالم کی سیر کرے اور صدہا کوس پر حاجت مندوں کی حاجت روائی کرے۔ یہ افتار خواہ صرف روحانی ہو یا جسم مثالی کے ساتھ ہو یا اسی جسم سے ہو جو قبر میں مدفون یا کسی جگہ موجود ہے۔ ان سب معنی کا ثبوت بزرگانِ دین کے لیے قرآن و حدیث و اقوالِ علماء سے ہے۔

(جاء الحق ص ۱۲۹ ' مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ' لاہور)

حضرت مفسرِ قرآن شارح بخاری و مسلم علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی اس عقیدہ کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

ہماری تحقیق یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے جسم اقدس کے ساتھ روضۂ منورہ میں تشریف فرما ہیں اور تمام کائنات آپ کے سامنے حاضر ہے' جس کو آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ آپ جب چاہیں جہاں چاہیں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ اگر ایک آن میں متعدد مقامات پر تشریف لے جانا چاہیں تو یہ بھی ممکن ہے' یہی حاضر و ناظر کا صحیح مفہوم ہے۔

(توضیح البیان ص ۲۴۰ ' مطبوعہ حامد اینڈ کمپنی' لاہور)

سوال:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حاضر و ناظر کا عقیدہ چودھویں صدی کی ایجاد ہے' اس کا کیا جواب ہے؟

جواب:

گزشتہ سطور میں ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں کہ حاضر و ناظر کا عقیدہ قرآن مجید اور مستند احادیث مبارکہ سے ثابت ہے' لہٰذا جو شخص اس عقیدے کو چودھویں صدی کی ایجاد قرار دیتا ہے' وہ درحقیقت قرآن و حدیث کے ارشادات کو چودھویں صدی کی ایجاد سمجھتا ہے' اس لیے ایسے شخص کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے!!

جواب کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ عظیم اور معروف بزرگانِ دین جو اہل سنت اور مخالفینِ اہل سنت کے درمیان متفق علیہ ہیں' وہ سب اسی عقیدے پر قائم و دائم رہے ہیں۔ "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہم یہاں چند بزرگانِ دین کے

بابرکت اقوال پیش کر رہے ہیں:

(۱) عظیم مفسرِ قرآن علامہ محمد اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ' حضرت امام غزالی قدس سرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: "قال الامام الغزالی رحمۃ اللّٰہ تعالٰی والرسول علیہ السلام لہ الخیار فی طواف العوالم مع ارواح الصحابۃ رضی اللّٰہ عنھم لقد راہ کثیر من الاولیاء"۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کی ارواح کے ساتھ پوری کائنات میں چکر لگانے کا اختیار حاصل ہے' اولیاء کرام کی کثیر تعداد نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

(روح البیان ج ۱۰ ص ۱۱۶' فی آخر سورۃ الملک' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)

(۲) صاحب شفاء حضرت قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ان لم یکن فی البیت احدٌ فقل السلام علی النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ" یعنی اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو یوں کہا کرو کہ نبی پر سلامتی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔
اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "لان روحہ علیہ السلام حاضر فی بیوت اھل الاسلام" یعنی گھر میں داخل ہوتے وقت نبی کریم ﷺ کو سلام اس لیے کرو کہ آپ کی روحِ مبارک مسلمانوں کے گھروں میں حاضر ہوتی ہے۔

(الشفاء مع شرحہ ج ۲ ص ۱۱۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

(۳) معروف مفسر اور عظیم محدث حضرت امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ والرضوان لکھتے ہیں: "انّ المراد بردّ الروح التفرغ من الشغل وفراغ البال ممّا ھو بصددہٖ فی البرزخ من النّظر فی اعمال امتہ والاستغفار لھم من السّیئات والدّعاء بکشف البلاء عنھم والتردُّد فی اقطار الارض لحلول البرکۃ فیھا وحضور جنازۃ من مات من صالح امتہ فان ھذہ الامور من جملۃ اشغالہ فی البرزخ کما وردت بذالک الاحادیث والاٰثار"۔
یعنی دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد نبی اکرم ﷺ کے مشاغل یہ ہیں کہ آپ اپنی اُمت کے اعمال ملاحظہ فرماتے ہیں' اُمت کے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں'

اُمت کے لیے مشکلات سے چھٹکارہ کی دعا کرتے ہیں' زمین کے اطراف واکناف میں تشریف لے جاتے ہیں' تاکہ آپ کی برکت پہنچ جائے' اپنی اُمت کے نیک افراد کے جنازہ میں شرکت فرماتے ہیں۔ ان تمام معمولات کی تائید میں احادیث وآثار موجود ہیں۔ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۱۵۳' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ' فیصل آباد)

حاضر وناظر کے موضوع پر مزید تفصیلات اور اعتراضات کے جوابات کے لیے حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ کی تصنیف ''جاء الحق'' اور مفسّر قرآن علاّمہ غلام رسول سعیدی مدّظلہ العالی کی تصنیف ''توضیح البیان'' کا مطالعہ فرمائیں۔

مروّجہ ایصالِ ثواب اور فاتحہ کی شرعی حیثیت

بسم اللہ الرحمن الرحیمO

نحمدہٗ ونصلی ونسلم علٰی رسولہ الکریمO

''ایصال ثواب'' عربی زبان کا لفظ ہے' اس کا معنی ہے: کسی کی روح کو ثواب پہنچانا۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اپنے کسی نیک عمل کے ذریعہ فائدہ وثواب پہنچانا۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں: مثلاً کسی مرحوم کے لیے پانی کا کنواں کھدوا دینا' قرآن خوانی کا اہتمام کرنا' ذکر الٰہی ونعت خوانی کرنا' صدقات وخیرات دینا' غرباء' فقراء اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا' طلب علم کے لیے گھر سے نکلنے والوں کی مدد کرنا' کسی مریض کے علاج کی ذمہ داری لینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام کام درحقیقت ''ایصال ثواب'' ہی کی مختلف صورتیں ہیں' اگرچہ ان کا اپنا کوئی بھی نام ہو۔ جیسے: کسی کے انتقال پر سوئم' چہلم' برسی اور فاتحہ خوانی وغیرہ کی محافل منعقد کی جاتی ہیں' فی الواقع یہ تمام محافل بھی ایصالِ ثواب ہی کا حصہ ہیں۔ زمانہ کے بدلنے سے اگر کسی جائز چیز کا نام بدل جائے تو اس سے اس چیز کے جائز ہونے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ عموماً مخالفین یہی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ عہد رسالت یا عہد صحابہ میں فاتحہ خوانی یا برسی وغیرہ نہیں ہوتی تھی' اس لیے یہ ناجائز ہے۔ حالانکہ غور کرنا چاہیے کہ فاتحہ خوانی اور برسی وغیرہ کا مقصد ایصالِ ثواب ہے (یعنی مرحوم کو ثواب پہنچانا) اور ثواب پہنچانے کا عمل عہد رسالت میں بھی رائج تھا اور عہد صحابہ وتابعین

میں بھی رائج تھا۔ لہٰذا یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ناموں میں تبدیلی آ گئی' لیکن اسے ناجائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مخالفین کا بات بات پر شرک و بدعت کا فتویٰ

قبل اس کے کہ "ایصال ثواب" کے جائز اور مستحب ہونے پر قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے دلائل پیش کیے جائیں' ہم یہ چاہتے ہیں کہ مخالفین کے نظریۂ بدعت کو مختصر اور جامع انداز میں واضح کریں:

فی زمانہ بعض لوگوں نے یہ بات بہت عام کر دی ہے کہ فلاں چیز بدعت ہے' فلاں چیز بدعت ہے' حضور کے زمانے میں نہیں تھی' صحابہ کے زمانے میں نہیں تھی' فلاں نے نہیں کیا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ باتیں سن کر عام آدمی اپنے جائز کاموں میں شک و شبہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان باتوں میں دھوکا اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کام کے جائز اور ناجائز ہونے کے لیے شریعت نے یہ معیار رکھا ہی نہیں ہے کہ وہ کام حضور کے زمانے میں یا صحابہ کے زمانے میں ہوتا تھا یا نہیں۔ بلکہ معیار یہ ہے کہ وہ کام شرعی قوانین اور اسلامی اصول کے دائرے میں ہے یا نہیں؟ اگر قوانینِ شریعت کے دائرے میں ہو تو وہ جائز ہے' خواہ وہ کسی بھی زمانے میں ہو۔ حتیٰ کہ حضور کے زمانے میں اور صحابہ کے زمانے میں نہ ہوا ہو' تب بھی جائز ہے۔ اور اگر شرعی قوانین کے دائرے سے باہر ہو' یعنی شریعت سے متصادم ہو تو وہ ناجائز ہے۔ مخالفین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ "جو کام حضور کے اور صحابہ کے زمانہ میں نہیں ہوا' وہ ناجائز ہے"۔ حالانکہ اگر یہ بات درست مان لی جائے تو بہت سارے دینی معاملات (جو مختلف مکاتب فکر کے باہمی اتفاق سے انجام پا رہے ہیں) معطل ہو جائیں گے۔ بلکہ جدید دنیا کی ساری جدتیں اور اضافے بیکار قرار پائیں گے۔ سب سے پہلے قرآن مجید کے اعراب (زبر' زیر' پیش اور تشدید و جزم) وغیرہ غلط قرار پائیں گے۔ کیونکہ یہ کام عہد رسالت اور عہد خلافت کے بعد (حجاج بن یوسف کے زمانے میں) ہوا ہے۔ اسی طرح مساجد میں مینار اور محرابیں غلط قرار پائیں گی۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کا زمانہ اس سے خالی تھا اور جب مینار وغیرہ غلط قرار پائیں گے تو سب سے پہلے حرمین طیبین کے میناروں کے متعلق سوال ہو گا۔ کیونکہ حرمین شریفین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خود گنبد خضراء (جو عین

قبر رسول ﷺ پر تعمیر ہے) کا معاملہ بھی معرضِ خطر میں ہوگا۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث کا وجود بھی ناقابل تسلیم قرار پائے گا۔ کیونکہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں ان کتب کا (مخصوص ترتیب کے ساتھ) وجود نہیں تھا۔ اس طرح اگر دیکھتے چلے جائیں تو بے شمار چیزیں ایسی سامنے آئیں گی جو عہد رسالت اور عہد صحابہ میں نہیں تھیں، لیکن اب ان پر مسلمان بہت فراخ دلی سے عمل پیرا ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عقل مند ان چیزوں کو ناجائز یا ان کو ختم کرنے کا قول نہیں کرے گا۔

ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں کہ ہر مکتب فکر کی مسجد میں ایک مخصوص وقت پر جماعت قائم ہوتی ہے اور یہ وقت گھڑی کی مدد سے متعین کیا گیا ہے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں جماعت کے لیے اوقات متعین نہیں تھے۔ اس کے باوجود اس عمل کو کوئی ناجائز نہیں کہتا۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے زمانہ اقدس میں عام معمول یہ تھا کہ صحابۂ کرام مساجد میں صرف فرض نماز ادا کرتے تھے اور سنن و نوافل اپنے اپنے گھر میں ادا کرتے تھے یا ادا کر کے آتے تھے۔ (سنن ابوداود: ۱۰۴۴) جبکہ فی زمانہ صحابہ کرام کا یہ طریقہ تمام مکاتب فکر کی مساجد میں متروک ہو چکا ہے اور اب حال یہ ہے کہ تقریباً تمام ہی لوگ فرائض کے ساتھ سنن و نوافل بھی مسجد میں ادا کرتے ہیں۔

فاتحہ اور سوئم کو بدعت کہنے والے بتائیں کہ وہ اپنی عوام کو روزانہ پانچ مرتبہ مسجد کے اندر یہ بدعت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں منع کیوں نہیں کرتے! اسی طرح دینی مدارس میں بالخصوص دیوبندیوں کے مدارس میں تعلیمی سال کے اختتام پر ختم بخاری شریف کی تقریب منعقد ہوتی ہے، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں نہ بخاری شریف تھی اور نہ اس کا ختم ہوتا تھا۔ (قرآن خوانی اور فاتحہ کو بدعت کہنے والے اس کا جواب دیں!) یوم سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر سپاہ صحابہ کا جلوس، بارہ ربیع الاوّل کی شب جامعہ بنوریہ میں عالمی محفل حسن قرأت کا اہتمام، ربیع الاوّل کے ایام میں ''سیرت کانفرنس'' کے عنوان سے جماعت اسلامی کے جلسے، مختلف علماء کے ایصال ثواب کے لیے دارالعلوم بنوری ٹاؤن میں بڑے پیمانے پر اجتماعی قرآن خوانی کا انعقاد، یہ سب وہ کام ہیں جو علماء دیوبند کے باہمی محبت و اتفاق سے عرصۂ دراز سے انجام پا رہے ہیں اور کوئی ان کو بدعت کہہ کر ختم کرنے کی بات نہیں کرتا۔

ہاں! اگر کہیں فاتحہ یا برسی کی محفل منعقد ہو جائے یا دوسرا شخص کوئی بھی نیا کام کر لے تو اسے بدعت اور نہ جانے کیا کچھ کہہ کر روکنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ مخالفین کی یہ دوہری پالیسی سمجھ سے بالاتر ہے!

مخالفین کا ایک فریب یہ بھی ہوتا ہے کہ "ہر بدعت اور نئی چیز بُری ہے"۔ حالانکہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ ہر بدعت بُری نہیں ہوتی' بلکہ بعض بُری ہوتی ہیں اور بعض اچھی۔ اچھی بدعت پر اجر و ثواب ہے اور بُری بدعت پر گناہ۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من سنّ فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیء ومن سنّ فی الاسلام سنة سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شیء"

(ترجمہ) جس نے دین اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اسے اس ایجاد کا اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والے تمام لوگوں کا اجر و ثواب ملتا رہے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ (جب کہ وہ شخص) جس نے دین میں بُرا طریقہ رائج کیا تو اس پر اس ایجاد کا اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والے تمام لوگوں کا بوجھ رہے گا اور عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کمی نہیں ہوگی۔ (اس حدیث کو امام مسلم' امام ترمذی' امام نسائی اور امام احمد نے روایت کیا ہے) (حوالہ کے لیے دیکھئے: صحیح مسلم: ۱۰۱۷' سنن نسائی: ۲۵۵۴' مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۰۔ ص ۳۳)

اس حدیث میں واضح طور پر دین اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرنے پر اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہر نیا طریقہ اور ہر بدعت اسلام میں ممنوع ہوتی تو نبی اکرم ﷺ اجر و ثواب بیان نہ فرماتے۔ معلوم ہوا کہ ہر بدعت کو بُرا سمجھنا محض نادانی اور شریعت سے بے خبری ہے۔

ہماری اب تک کی گفتگو سے جو باتیں سامنے آئیں' وہ حسب ذیل ہیں:

★ ہر نیا طریقہ اور ہر بدعت بُری نہیں ہوتی ★ بدعت کی دو قسمیں ہیں: اچھی بدعت اور بُری بدعت ★ اچھی بدعت باعثِ ثواب ہے اور بُری بدعت باعثِ گناہ۔

★ قرآن مجید اور حرمین طیبین بھی بدعت اور جدّت سے خالی نہیں ہیں ★ ہر سال ختم بخاری کی محفل کر کے اور روزانہ پانچ نمازیں (مخصوص وقت پر) ادا کر کے خود دیوبندی حضرات بھی بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں ★ اجتماعی قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کا اہتمام خود دیوبندی اداروں میں ہوتا ہے۔

★ ہر بدعت کو بُرا کہنے والے خود کئی بدعتوں کا ارتکاب کرتے ہیں ★ کسی کام کے جائز اور ناجائز ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں وہ کام ہوتا تھا یا نہیں۔ یہ معیار مخالفین نے عوام کو دھوکا دینے کے لیے مقرر کیا ہے ★ اپنی ذات میں جو کام جائز ہو وہ نام کے بدلنے سے ناجائز نہیں ہو جائے گا۔

اس تمہیدی اور ضروری گفتگو کے بعد اب ہم ایصالِ ثواب کی حقیقت پر کلام کریں گے اور قرآن وسنت کی روشنی میں یہ واضح کریں گے کہ اپنے مرحومین کے لیے ایصالِ ثواب کی محافل منعقد کرنا' قرآن وسنت کی رو سے جائز اور باعث ثواب ہے۔

ایصالِ ثواب (قرآن حکیم کی روشنی میں)

ہم شروع میں یہ بات بیان کر چکے کہ ''ایصالِ ثواب'' کا معنی ہے: ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اپنے کسی نیک عمل کے ذریعہ فائدہ پہنچانا۔ فاتحہ' برسی اور قرآن خوانی وغیرہ میں چونکہ یہی مقصد ہوتا ہے' اس لیے یہ تمام کام ''ایصالِ ثواب'' ہی کی صورتیں ہیں۔ اگرچہ زمانے کے گزرنے سے ناموں میں تبدیلی آ گئی۔ اور ہم بتا چکے کہ ناموں کے بدلنے سے اصل کام کے جائز ہونے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان سب کے پیچھے بنیادی چیز ''ایصالِ ثواب'' ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر زندوں اور مردوں کو فائدہ پہنچانے کا تذکرہ آیا ہے:

(۱) ارشادِ ربانی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝	آپ یوں عرض کیجئے: اے میرے پروردگار! تو ان دونوں (ماں باپ) پر رحم فرما' جیسا کہ ان دونوں نے مجھے بچپن میں پالا ۝

(بنی اسرائیل: ۲۴)

اس آیت میں والدین کے لیے ایصالِ ثواب کرنے اور انہیں نفع پہنچانے کا ثبوت

موجود ہے' چونکہ فاتحہ' چہلم اور قرآن خوانی وغیرہ میں بھی دعائے خیر کے ذریعہ مرحومین کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے' اس لیے یہ تمام محافل جائز ہیں۔ اگر کسی کی روح کو فائدہ پہنچانا بدعت ہوتا تو اس آیت میں والدین کے لیے دعاء رحمت کا حکم نہ دیا جاتا!

(۲) ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ○ رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ○ (ابراہیم: ۴۰-۴۱)

اے میرے پروردگار! مجھے نماز کے حقوق ادا کرنے والا بنا' اور میری اولاد میں سے بھی۔ اے ہمارے پروردگار! میری دعا قبول فرما! اے ہمارے پروردگار! میری' میرے ماں باپ کی اور تمام اہل ایمان کی مغفرت فرما! جس دن حساب قائم ہوگا۔

اس دعا میں صرف والدین کے لیے ہی نہیں' بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لیے مغفرت کی درخواست کی گئی ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ انتقال کرنے والوں کو ذکر واذکار اور دعاؤں کا فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں ان مسلمانوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو پیدا نہ ہوئے ہوں' تو جو لوگ پیدا ہو کر مر جائیں' وہ زیادہ حق دار ہیں کہ ان کے لیے نفع کا اہتمام کیا جائے اگر دین میں ''ایصال ثواب'' کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا نہ کرتے اور نہ قرآن کریم میں اس کو ذکر کیا جاتا اور نہ ہمیں اپنی نمازوں میں اس کے پڑھنے کی اجازت ہوتی!

(۳) اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کی دعا ذکر فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ جَآؤُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ. (الحشر: ۱۰)

صحابہ کے بعد آنے والے (تمام مسلمان) عرض کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی بخشش فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔

اس آیت مبارکہ میں گزرے ہوئے لوگوں کے لیے ایصال ثواب اور ان کی روح کو نفع

پہنچانے کا واضح ثبوت ہے۔ لہٰذا یہ کام ناجائز اور بدعت نہیں ہیں۔

(۴) قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے بھی ایصال ثواب کرتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا. (الغافر:۷)

وہ (فرشتے) جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے گرد (محوِ طواف) ہیں وہ اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہ بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ اہل ایمان کے لیے فرشتے بھی نفع پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ فاتحہ، چہلم وغیرہ میں بھی چونکہ مرحومین کی روح کو نفع پہنچایا جاتا ہے اس لیے ان تقریبات کا انعقاد جائز اور مستحسن ہے۔ نام بدلنے سے کام ناجائز نہیں ہو جاتا۔

ایصالِ ثواب (احادیث مبارکہ کی روشنی میں)

قرآن مجید سے استدلال کے بعد اب ہم احادیث مبارکہ کی روشنی میں ایصال ثواب کی حقیقت بیان کریں گے اور یہ واضح کریں گے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس کس طریقہ سے اپنے مرحومین اور مرحومات کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کرتے تھے بلکہ خود رسول اللہ ﷺ نے کس طریقہ سے امت مرحومہ کو ثواب پہنچایا ہے۔ تفصیل کے لیے سطور ذیل کا بغور مطالعہ فرمائیں:

(۱) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے (قربانی والے دن) سینگوں والا ایک مینڈھا لانے کا حکم دیا۔ وہ مینڈھا لایا گیا تاکہ آپ اس کی قربانی کریں۔ پھر آپ نے فرمایا: اے عائشہ! چھری لاؤ۔ پھر فرمایا: اس چھری کو پتھر سے تیز کرو انہوں نے اس چھری کی دھار تیز کی پھر آپ نے اس چھری کو پکڑ کر مینڈھے کو گرایا پھر اس کو ذبح کیا اور یہ دعا کی: "بسم اللّٰہ اللھم تقبل من محمد ﷺ

وال محمّد ﷺ ومن امة محمّد ﷺ " اے اللہ! اس کو محمد، آلِ محمد اور امتِ محمد ﷺ کی طرف سے قبول فرما! (صحیح مسلم: ۱۹۶۷، سنن ابوداؤد: ۲۷۹۲)

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے وقت صرف اپنا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ اپنی اولاد اور امت کا بھی تذکرہ فرمایا۔ اور یوں آپ نے قربانی کے ثواب میں اپنے ساتھ سب کو شریک فرمایا۔ ایصالِ ثواب کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے عمل کا ثواب پہنچاتا ہے، اور یہی کچھ قرآن خوانی اور فاتحہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے ایصالِ ثواب کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے اور اس کا انکار کرنا بدعت ہے۔ اگر اپنے عمل کا ثواب پہنچانا کسی کو جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ایک ہی جانور کی قربانی میں اپنی آل اور امت کا تذکرہ نہ فرماتے۔

(۲) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے پانی کا کنواں کھدوایا۔

حدیث میں ہے کہ انہوں نے پہلے رسول اللہ ﷺ سے آ کر پوچھا: کون سا صدقہ زیادہ بہتر ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے (وقت کی ضرورت کے مطابق) فرمایا: پانی کا صدقہ۔ چنانچہ حضرت سعد نے کنواں تیار کیا اور کہا: "هذه لامّ سعد" (یہ کنواں سعد کی والدہ کے لیے ہے) یعنی اس کا ثواب ان کی روح کے لیے ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۱۶۸۱)

اس حدیث کے مطابق حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کو نہ صرف یہ کہ پانی کے ذریعہ نفع پہنچانے کا اہتمام کیا بلکہ آخر میں یہ جملہ بھی کہہ دیا کہ "اس کا ثواب سعد کی والدہ کے لیے ہے"۔ فی زمانہ بھی یہی کیا جاتا ہے کہ کسی کے انتقال پر لوگوں کے لیے کھانے پینے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور دعا میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس طعام اور محفل کا ثواب فلاں مرحوم یا مرحومہ کے لیے ہے۔ اور بعض جگہ پانی کی سبیل بنوا کر اس پر "برائے ایصالِ ثواب فلاں مرحوم" لکھوا دیا جاتا ہے، ان سب کا جواز اسی حدیث سے ثابت ہے، لہٰذا ان چیزوں کو بدعت ٹھہرانا صحابیٔ رسول ﷺ پر الزام لگانا ہے۔

یہاں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ایک اور حدیث ہم ذکر کرنا

چاہتے ہیں، جس سے یہ واضح ہو گا کہ حضرت سعد نے اپنی والدہ کے لیے صرف پانی کا اہتمام نہیں کیا بلکہ کھانے کا بھی اہتمام کیا تھا، ملاحظہ فرمائیں:

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد کی والدہ کا انتقال ہو گیا، وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ پھر انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میری ماں کا انتقال ہو گیا اور میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا ان کو اس کا نفع پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! انہوں نے کہا: بے شک میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرا ''مِخرَاف'' نامی کھجوروں کا باغ ان کے لیے صدقہ ہے۔ (اس حدیث کو امام بخاری، امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

(صحیح بخاری: ۲۷۵۶۔ ۲۷۶۲، ترمذی: ۶۶۹، سنن ابوداؤد: ۲۸۸۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کھجوروں کا پورا باغ صدقہ کر کے غرباء کے لیے کھانے کا اہتمام کیا اور والدہ کی روح کو ثواب پہنچانے کا اہتمام کیا۔ ایصال ثواب بھی یہی ہے کہ اپنے عمل خیر سے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچایا جائے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مرحومین کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کرنا صحابہ کرام کی سنت ہے۔ اور اس کو بدعت ٹھہرانا صحابہ کرام کی توہین ہے!

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''**اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له**'' (ترجمہ) جب آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے: ایک صدقہ جاریہ، دوسرا وہ علم جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہو، اور تیسرا نیک بیٹا جو اس کے لیے دعا کرے۔

(صحیح مسلم: ۱۶۳۱، سنن ترمذی: ۱۳۷۶، سنن ابوداؤد: ۲۸۸۰، سنن نسائی: ۳۶۵۱، مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۲)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نیک اولاد کی دعاؤں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرحوم والدین کے لیے ان کے ورثاء اور لواحقین اپنی استطاعت کے مطابق قرآن خوانی، اجتماعی دعا یا انفرادی دعا، فاتحہ خوانی اور برسی وغیرہ کا انعقاد کرتے ہیں، ان سب

کا ثواب مرحوم کو پہنچتا ہے۔ اگر ان چیزوں سے مرحومین کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ایسی بات ارشاد نہ فرماتے۔

(۵) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص قبرستان سے گزرا اور اس نے گیارہ مرتبہ "قل هو الله احد" پڑھی، پھر اس کا اجر و ثواب اس قبرستان کے مردوں کو بخش دیا تو اس قبرستان کے جتنے مردے ہیں، ان کی مقدار اسے پڑھنے کا ثواب ملے گا۔

(جمع الجوامع للسیوطی: ۲۳۱۵۲، التذکرہ للقرطبی ج۱ ص۱۲۸)

اس حدیث میں مردوں کو سورۂ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب بخشنے کا ثبوت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ جب سورۂ اخلاص کا ثواب مردوں کو پہنچ جاتا ہے تو قرآن خوانی، ذکر و اذکار اور دیگر اعمالِ خیر کا ثواب بھی یقیناً پہنچتا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ سوئم اور برسی وغیرہ کا کوئی فائدہ نہیں، محض جاہلانہ خیال ہے۔ لہٰذا ایسی گمراہ کن باتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ اگر مرحومین کے لیے فاتحہ اور قرآن خوانی وغیرہ بیکار چیزیں ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ اس حدیث میں سورۂ اخلاص کا ثواب بخشنے کا تذکرہ نہ فرماتے۔

(۶) مشہور صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ اپنے لیے نوافل کا اہتمام کروایا اور اس کا ثواب خود اپنی روح کو بخشوایا۔ حدیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت صالح بن درہم (تابعی) بیان کرتے ہیں: ہم (اپنی جماعت کے ساتھ) حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک شخص نے ہم سے کہا کہ یہاں (بصرہ میں) تمہارے قریب ایک بستی ہے، جس کا نام "اُبُلّہ" ہے؟ ہم نے کہا: ہاں! تو اس شخص نے کہا: تم میں سے کون مجھے اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اس بستی کی ایک مسجد جس کا نام عشار ہے، اس میں میرے لیے دو یا چار رکعت نماز ادا کرے گا اور (اللہ کی بارگاہ میں) یوں کہے گا کہ "هذه لابی هريرة" (اس نماز کا ثواب حضرت ابوہریرہ کے لیے ہے)۔ (الحدیث) اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۴۳۰۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۴۳۴۔ ص ۴۶۸)

اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

★ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ عقیدہ تھا کہ زندہ شخص کو بھی ایصال ثواب کرنا جائز ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے لیے نوافل پڑھوائے اور جب زندہ کے لیے ایصال ثواب جائز ہے تو مردہ کے لیے جائز ہونے میں کلام نہیں ہونا چاہیے۔

★ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے عمل کا ثواب پہنچا سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے لیے نفل نماز نہ پڑھواتے۔

★ ایصال ثواب کے لیے شریعت میں کوئی مخصوص طریقہ نہیں ہے' بلکہ اس میں لوگوں کے لیے وسعت رکھی گئی ہے۔ اگر کوئی طریقہ مخصوص ہوتا تو تمام صحابہ اسی کو اختیار کرتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ میں سے کسی نے کنواں کھدوا کر ایصال ثواب کیا' کسی نے حج کر کے اور کسی نے نوافل پڑھوا کر ایصال ثواب کیا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کروالے یا نعت خوانی یا کوئی نیک کام کروالے تو اسے ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جب شریعت مطہرہ نے ایصال ثواب میں پابندی نہیں لگائی تو بعد کا کوئی شخص کسی جائز طریقہ کو ناجائز یا بدعت ممنوعہ کیسے قرار دے سکتا ہے!

★ زیر بحث حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تلقین کی کہ میرے لیے نوافل پڑھ کر یہ کہنا کہ اس کا ثواب ابو ہریرہ کو پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن ختم کر کے یا فاتحہ پڑھ کے اس کا ثواب مرحومین کو بھیجنا اور دعا میں مرحومین کا تذکرہ کرنا اور ان کی روح تک پہنچنے کی دعا کرنا' یہ سب اس حدیث کے عین مطابق ہے۔ ختم پڑھنا اور چہلم یا برسی وغیرہ میں مرحوم کا نام لکھنا یا اس کا تذکرہ کرنا ممنوع ہوتا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنا نام ذکر نہ کرواتے اور (حدیث نمبر ۲ کے مطابق) حضرت سعد رضی اللہ عنہ کنواں کھود کر اپنی والدہ کا ذکر نہ کرتے۔ لہٰذا مروّجہ فاتحہ اور ختم شریف بالکل درست ہے۔ اور اس کا انکار دورِ حاضر کی بدعت ہے۔

موضوع کی مناسبت سے یہاں ایک اور اہم حدیث ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث کو عمدۃ المحدثین علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی علیہ الرحمہ نے اپنی معروف کتاب ''عمدۃ القاری شرح بخاری'' میں ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

(۷) ''عن انس رضی اللہ تعالٰی عنہ انہ قال سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقلت انا

لندعو لموتانا ونتصدّق عنهم ونحجّ فهل يصل ذلك اليهم؟ فقال انّه ليصل اليهم ويفرحون به كما يفرح احدكم بالهدية"۔ (ترجمہ) حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ ہم اپنے انتقال کرنے والوں کے لیے دعا کرتے ہیں' ان کی جانب سے صدقہ خیرات کرتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔ کیا ان چیزوں کا ثواب ان کو پہنچتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انہیں ان اعمال کا ثواب بھی پہنچتا ہے اور وہ ان چیزوں سے اس طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح تم آپس میں تحفہ تحائف سے خوش ہوتے ہو۔

(عمدۃ القاری شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۵' مطبوعہ دار الحدیث' ملتان)

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ مرنے والوں کو مختلف اعمال کا ثواب پہنچتا ہے اور وہ ایصال ثواب کرنے والوں سے خوش ہوتے ہیں' وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت میں ایصالِ ثواب کا کوئی مخصوص طریقہ نہیں ہے۔ اپنی مرضی سے کسی بھی جائز عمل کا ثواب بھیجنا جائز ہے۔ خواہ وہ مرحوم کی طرف سے قربانی کی صورت میں ہو یا حج کی صورت میں یا صدقہ و خیرات کی صورت میں یا قرآن خوانی اور برسی وغیرہ کی صورت میں۔ لہٰذا کسی جائز طریقے کو اپنی جانب سے ناجائز قرار دینا خود ایک نئی شریعت گھڑنے کے مترادف ہے' اس لیے اس طرح کے جاہلانہ فتووں سے بچنا واجب ہے۔ اور عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ گمراہ کرنے والوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اياكم واياهم لا يضلّونكم ولا يفتنونكم" (تم اپنے آپ کو ان بدمذہبوں سے اور ان کو اپنے آپ سے دور رکھو' ورنہ تمہیں یہ لوگ گمراہ کر دیں گے اور فتنہ میں ڈال دیں گے)۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰)

ایصالِ ثواب کی تائید میں دیوبندی اور غیر مقلّد علماء کی عبارات

مشہور بات ہے کہ ماننے والے کے لیے ایک دلیل بھی کافی ہوتی ہے اور نہ ماننے والے کے لیے دفتر کے دفتر ناکافی ہوتے ہیں۔ گزشتہ سطور میں ہم نے قرآن و سنت کے جو دلائل بیان کیے ہیں' ان کے بعد مزید کلام کی حاجت نہیں رہتی' لیکن بعض لوگ قرآن و سنت میں بھی حجت بازی کرتے ہیں اور صرف اپنے مطلب کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم خود ان کے اپنے علماء کی کچھ عبارات پیش کر رہے ہیں' تا کہ ایصال ثواب

کرنے پر بدعت اور ناجائز کا جو فتویٰ لگانا ہو تو وہ ان کے اپنے علماء کی طرف لوٹ جائے۔
تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) دیوبندیوں کے مشہور عالم اشرف علی تھانوی صاحب لکھتے ہیں:
ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے عمل کا ثواب مردہ یا زندہ کو دے دے، جس طرح مردہ کو ثواب پہنچتا ہے اسی طرح زندہ کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ (التذکیر حصہ سوم ص ۹۵)

(۲) ایک اور عالم رشید احمد گنگوہی صاحب کا قول ہے کہ:
احادیث سے نفع پہنچانا محقق (ثابت) ہے اور جمہور صحابہ وائمہ کا یہی مذہب ہے۔
(تذکرۃ الرشید ص ۲۶)

(۳) صراطِ مستقیم میں ایک جگہ اسماعیل دہلوی صاحب لکھتے ہیں:
جو عبادت مسلمان سے ادا ہوئی ہو اس کا ثواب اپنے گزرے ہوؤں میں سے کسی کی روح کو پہنچائے اور اس دعائے خیر کے پہنچانے کا طریقہ جناب الٰہی کے ذریعہ ہے تو یہ خود البتہ بہتر اور مستحسن ہے اور اگر وہ شخص کہ جس کی روح کو ثواب پہنچتا ہے اس کے اہل حقوق سے ہے تو اس کے حق کی مقدار کے موافق اس ثواب کے پہنچانے کی خوبی بہت زیادہ ہوگی۔ پس وہ اُمور جو میت کے لیے مروّج ہیں مثلاً فاتحہ عرس اور نذر و نیاز ان سب کی خوبی میں شک نہیں ہے۔ (صراطِ مستقیم ص ۵۵) لہٰذا ایصالِ ثواب کے یہ مختلف طریقے ''بدعت'' نہیں ہیں بلکہ ان کا انکار کرنا بدعت ہے۔

(۴) دیوبندیوں کے مشہور عالم شبیر احمد عثمانی صاحب نے اپنی کتاب ''فتح الملہم فی شرح مسلم'' میں ایصالِ ثواب کے ثبوت میں مفصل بحث کی ہے۔ اس میں انہوں نے ایصالِ ثواب کے جواز پر متعدد کتابوں سے احادیث پیش کی ہیں اور اس کے بعد لکھا کہ:
ان احادیث و آثار کے علاوہ بہ کثرت احادیث و آثار ہیں جو حدِ تواتر تک پہنچتے ہیں اور ان سے ایصالِ ثواب ثابت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی عبادات کا ثواب دوسروں تک پہنچاتا ہے اس سے دوسروں کو نفع ہوتا ہے اور یہ چیز تواتر (تسلسل) سے ثابت ہے۔ (فتح الملہم فی شرح مسلم ج ۳ ص ۳۹)

غیر مقلدین (اہل حدیث) کے پیشوا احمد ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب مجموعۃ الفتاویٰ

میں ایصال ثواب کے موضوع پر بہت مفصل بحث کی ہے اور قرآن و سنت سے کئی دلائل پیش کر کے اس کا جواز ثابت کیا ہے۔ اور یہاں تک لکھا ہے کہ ایصالِ ثواب کی مخالفت کرنے والے بدعتی ہیں۔ ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

ائمہ اسلام اس پر متفق ہیں کہ میت کو ان چیزوں سے نفع پہنچتا ہے اور اس پر کتاب' سنت اور اجماع سے دلائل موجود ہیں اور جو اس کی مخالفت کرے' وہ اہل بدعت سے ہے۔ (ایک جگہ لکھتے ہیں:) ''الحمد للہ رب العالمین ''مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنے کا میت کو نفع ہوتا ہے اور اس کے متعلق نبی کریم ﷺ سے احادیث صحیحہ مروی ہیں۔ ان میں سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے' جس میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر لیں' اسی طرح میت کو اس کی طرف سے حج کرنے اور اس کی طرف سے قربانی کرنے' غلام آزاد کرنے اور دعا و استغفار سے بھی نفع ہوتا ہے۔

ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص ستر ہزار مرتبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ''پڑھے اور اس کا ثواب میت کو پہنچا دے تو اس سے میت کو دوزخ سے نجات ملے گی یا نہیں؟

انہوں نے جواب میں لکھا کہ جب کوئی انسان ستر (۷۰) ہزار مرتبہ یا اس سے کم یا زیادہ مرتبہ ''لا الہ الا اللہ'' پڑھے گا اور میت کو اس کا ثواب ہدیہ کرے گا تو اس میت کو اس کا ثواب پہنچے گا۔ (ابن تیمیہ کی اس بحث کو ملاحظہ کرنے کے لیے مطالعہ فرمائیں: مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲۴ ص ۱۷۰ تا ۱۸۰' مطبوعہ بیروت)

غیر مقلدین کے ایک اور مشہور عالم نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے بھی ایصالِ ثواب پر تفصیل سے لکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اپنے عمل سے فائدہ پہنچانا جائز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

زندہ انسان اپنی نماز' روزہ' تلاوتِ قرآن' حج اور دیگر عبادات کا جو ثواب میت کو ہدیہ کرتا ہے' وہ میت کو پہنچتا ہے اور زندہ انسان کا اپنے فوت شدہ بھائی کے لیے یہ عمل نیکی' احسان اور صلہ رحمی کے قبیل سے ہے۔ اور تمام مخلوقات میں جس کو نیکی اور احسان کی سب

سے زیادہ ضرورت ہے' وہ میت ہے جو تحت الثریٰ (زمین کے نیچے) رکھا ہوا ہے اور اب نیک عمل کرنے سے عاجز ہے۔ پھر اپنے فوت شدہ بھائی کے لیے عبادات کا ہدیہ پیش کرنا ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے۔ لہٰذا جو شخص میت کے لیے ایک دن کے روزے یا قرآن مجید کے ایک پارے کی تلاوت کا ہدیہ پیش کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کو دس روزوں اور دس پاروں کا اجر عطا فرمائے گا اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنی عبادات کو دوسرے کے لیے ہدیۂ پیش کرنا' اس سے بہتر ہے کہ انسان ان عبادات کا اپنے لیے ذخیرہ کر لے۔

(مزید لکھتے ہیں:) اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ سلفِ صالحین (بزرگانِ دین) نے ایصال ثواب نہیں کیا تھا تو اس سے ایصال ثواب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ یہ مستحب (ایک نیک کام) ہے' واجب نہیں ہے اور ہمارے لیے ایصالِ ثواب کے جواز کی دلیل موجود ہے' خواہ ہم سے پہلے کسی نے ایصال ثواب کیا ہو یا نہ کیا ہو!

(السراج الوھاج فی شرح مسلم ابن الحجاج ج ۲ ص ۵۵' مطبوعہ بھوپال)

[واضح رہے کہ علمائے دیوبند اور علماء غیر مقلدین کی مذکورہ تمام عبارات اور ان کے حوالہ جات ہم نے چار کتابوں کے مجموعہ سے اخذ کیے ہیں: (۱) تبیان القرآن ج ۱۱ ص ۵۰۷ (۲) شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۵۰۷ (۳) نصرة الاصحاب لاقسام ایصال الثواب (علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ) ص ۲۶ (۴) سیرت غوث الثقلین ص ۲۱۸' مطبوعہ سیالکوٹ]

مذکورہ تمام عبارات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ''ایصال ثواب'' ایک مسلّمہ حقیقت ہے اور مرحومین و مرحومات کو نفع پہنچانے کے لیے صدقہ و خیرات' قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کی صورت میں جو جو اعمال کیے جاتے ہیں' وہ سب دراصل ''ایصالِ ثواب'' ہی ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فاتحہ اور قرآن خوانی وغیرہ کی محافل منعقد کرنا بدعت نہیں ہے۔ بلکہ ان محافل سے انکار کرنا اور ان سے منع کرنا ''بدعت'' ہے۔ (جیسا کہ ابن تیمیہ کی عبارت میں صراحت گزر چکی) لہٰذا ایصال ثواب سے روکنے والے غور کر لیں کہ بدعتی کون ہیں!!!

یہاں ہم موضوع کی مناسبت سے دو ابحاث مزید رقم کرنا چاہتے ہیں' تا کہ گفتگو تکمیل کے قریب ہو جائے اور مخالفین کے اہم اعتراضات کا جواب ہو جائے۔ یہ ابحاث ہم دو مستقل عنوانات کے تحت اختصار کے ساتھ رقم کریں گے۔ پہلے عنوان کے تحت یہ بیان کریں

گے کہ ایصالِ ثواب کے لیے سوئم یا چہلم وغیرہ کے نام سے دن معین کرنا شرعاً جائز ہے اور دوسرے عنوان کے تحت یہ بیان کریں گے کہ ایصالِ ثواب اور دعا کے وقت نیاز کا کھانا سامنے رکھنا مستحب اور مستحسن ہے۔ یعنی باعث ثواب اور باعث برکت ہے۔ تفصیل سطورِ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

ایصالِ ثواب کے لیے مخصوص ناموں کے ساتھ دن معین کرنے کی شرعی حیثیت

وہ تمام نیک کام جن کے لیے شریعت مطہرہ نے کوئی وقت متعین نہ کیا ہو اور نہ کسی خاص وقت میں ان کو ممنوع قرار دیا ہو ان کو ادا کرنے کے لیے بندوں کا اپنی مرضی سے کوئی خاص وقت مقرر کر لینا شرعاً جائز ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی تلاوت کرنا ایک ایسا عمل ہے، جس کے لیے ۲۴ گھنٹوں میں کوئی وقت ممنوع نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مرضی سے روزانہ فجر کے بعد دو پارے تلاوت کرنے کی عادت بنا لے تو اسے کوئی ممنوع قرار نہیں دے سکتا۔ جیسے حفاظ کرام اپنی منزل کے لیے دن یا رات کا کوئی ایک وقت مخصوص کر لیتے ہیں۔ اور عوام الناس بھی مختلف نمازوں کے بعد تلاوتِ قرآن کے لیے اپنا وقت مخصوص کر لیتے ہیں۔ حفاظ اور عوام کے اس طرزِ عمل کو ممنوع یا بدعت اس لیے نہیں قرار دیا جا سکتا کہ تلاوتِ قرآن ہر وقت جائز ہے اور جو کام ہر وقت جائز ہو اس میں اگر لوگ اپنی آسانی کے لیے کوئی وقت مخصوص کر لیں تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

''ایصالِ ثواب'' کا معاملہ بھی یہی ہے کہ شریعت نے نہ اس کے لیے کوئی وقت خاص کیا ہے اور نہ کسی مخصوص وقت میں اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے مرحوم کے لیے تیسرے دن فاتحہ کا اہتمام کرتا ہے اور اسے سوئم کا نام دیتا ہے یا چالیس دن بعد فاتحہ کرتا ہے اور اسے چالیسویں کا نام دیتا ہے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا یہ تعین ''تعین عرفی'' ہے اور جن کاموں میں شریعت نے گنجائش رکھی ہو اس میں زمانہ اور عرف کے مطابق تخصیص و تعیین اور اضافہ جائز ہے۔ اس کی واضح مثال ''علم دین حاصل کرنا'' ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حصولِ علم کا جو طریقہ رائج تھا، وہ آج کے جدید طریقوں سے بہت مختلف تھا۔ اصحابِ صُفّہ (صحابہ کرام) جس انداز سے رسول اللہ ﷺ سے سیکھتے تھے وہ انداز ہمارے درمیان موجود نہیں رہا۔ تمام مکاتب فکر کے مدارس نے علم کے اوقات

مخصوص کیے ہوئے ہیں اور قوانین مرتب کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ دن رات میں کسی بھی وقت علم حاصل کرنا جائز اور عبادت ہے' لیکن اس کے باوجود اوقات اور طریقے مخصوص کیے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا یہ طریقۂ تعلیم جب صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے تو کیسے جائز ہو گیا؟ کیا یہ دین میں اضافہ اور بدعت نہیں ہے؟ غیر مقلدین اور دیوبندی علماء اس سوال کا جو بھی جواب دیں' ہمارے نزدیک بہرحال اس کا جواب وہی ہے کہ جن کاموں کے لیے شریعت نے نہ کوئی وقت مقرر کیا ہو' نہ کسی مخصوص وقت میں ان کو ممنوع قرار دیا ہو' ان میں اپنی مرضی سے کوئی وقت مقرر کر لینا شرعاً جائز ہے۔ غیر مقلدین اور دیوبندی علماء کا طریقۂ تعلیم میں بدعتوں کا ارتکاب کرنا اور دوسری طرف ایصالِ ثواب میں عوام کو بدعتی قرار دینا سوائے دوہری پالیسی کے کچھ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں شروع میں ہم کہہ چکے ہیں کہ فی زمانہ ہر مکتب فکر کی مسجد میں ایک مخصوص اور معین وقت پر جماعت قائم ہوتی ہے حالانکہ صحابہ کرام اس طرح نہیں کرتے تھے اور نہ ہی قرآن و حدیث میں جماعت قائم کرنے کے اوقات معین کیے گئے ہیں۔ فاتحہ کے لیے دن اور وقت معیّن کرنے کو بدعت کہنے والے بتائیں کہ روزانہ پانچ نمازوں کے لیے جماعت کے اوقات معیّن کرنا بدعت ہے یا نہیں؟ اگر بدعت ہے اور یقیناً بدعت ہے تو باقاعدہ اپنی مرضی سے معیّن وقت پر اذان دلوا کر مذکورہ جماعت کی طرف بلانا بدعت کی طرف بلانا ہے یا نہیں؟ پھر کیا یہ ستم بالائے ستم نہیں کہ مہینے میں ایک مرتبہ کسی معیّن وقت پر فاتحہ ہو جائے تو وہ بدعت ٹھہرے اور عین خدا کے گھر میں روزانہ پانچ مرتبہ معیّن وقت پر جماعت قائم کر کے بدعتوں کا ارتکاب کیا جائے تو وہ باعث ثواب ٹھہرے!!

دن معیّن کرنے کے ثبوت میں احادیث

مختلف اعمال کے لیے اپنی مرضی سے ایام کا تعین کرنا متعدد احادیث سے بھی ثابت ہے' ذیل میں ہم اس سلسلہ کی چند احادیث پیش کر رہے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

''کان النبی ﷺ یاتی مسجد قباء کل سبت ماشیا و راکبا'' (ترجمہ) نبی اکرم ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قباء تشریف لاتے تھے' کبھی پیدل اور کبھی سوار ہو کر۔ حدیث کے آخری الفاظ ہیں: ''و کان عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ عنہ یفعلہ'' حضرت

ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی طرح کرتے تھے۔ (اس حدیث کو امام المحدثین حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ نے روایت فرمایا ہے) (صحیح بخاری۔ کتاب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ رقم الحدیث: ۱۱۹۳)

اس حدیث سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ وہ نیک اعمال جن کے لیے شریعت مطہرہ نے کوئی وقت مقرر نہ فرمایا ہو ان میں اپنی مرضی اور اختیار سے اپنی آسانی کے مطابق دن اور رات کا تعین کرنا جائز ہے۔ مسجد قُباء (مدینہ منورہ) کی زیارت ایک بہترین عمل اور عبادت ہے۔ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں پر کوئی وقت اور کوئی دن واجب نہیں فرمایا' بلکہ اپنے لیے آپ نے اپنی سہولت کے مطابق ہفتہ کا دن معین فرمایا اور آپ کی اتباع میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی طرح کرتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے مرحوم اور مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی اور فاتحہ کا کوئی دن معین کر لے تو اسے ممنوع اور بدعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) بخاری شریف ہی کی ایک حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے اجتماع کے لیے ایک دن معین فرمایا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں کچھ خواتین نے آ کر عرض کی کہ آپ کے پاس (حصولِ علم میں) مرد ہم پر سبقت لے گئے ہیں "فاجعل لنا یوما من نفسک" (اس لیے آپ اپنی جانب سے ہمارے لیے ایک دن مخصوص فرمائیں) رسول اللہ ﷺ نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمایا' جس میں آپ نے انہیں نصیحت اور تبلیغ فرمائی۔ (صحیح بخاری: ۱۰۱)

ہمارے زمانے میں مختلف تنظیمیں اور ادارے اپنے اپنے مقصد کے لیے اجتماع کرتے ہیں اور اس کے لیے دن اور وقت معیّن کرتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی اس کو ناجائز قرار نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ مسجد میں پانچ نمازوں کے علاوہ جمعہ اور عیدین کے اجتماع کے لیے اوقات کا تعیّن ہوتا ہے اور اسے بھی کوئی خلافِ شرع نہیں سمجھتا۔ بس اسی طرح فاتحہ خوانی اور ایصالِ ثواب کے لیے بھی ایام اور اوقات کا تعیّن جائز ہے کیونکہ اس تعیّن سے شرکاءِ محفل کو آسانی ہوتی ہے اور مثلاً جو شخص جنازہ میں شرکت نہیں کر پاتا' اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر میں تیسرے دن

(سوئم کی) فاتحہ ہو گی یا ۴۰ ویں دن (چہلم کی) فاتحہ ہو گی' لہٰذا وہ اپنی آسانی کے مطابق وقت نکال کر تعزیت میں شرکت کر لیتا ہے۔ اور یہی آسانی شریعت میں چونکہ مطلوب ہے' اس لیے سوئم اور برسی کے عنوان سے فاتحہ خوانی کرنا شرعاً بالکل جائز اور درست ہے۔

(۳) بخاری شریف ہی کی ایک حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ لوگوں کو وعظ و نصیحت اور درس دیا کرتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے اپنی مرضی اور اختیار سے جمعرات کا دن معیّن کر رکھا تھا۔ حضرت ابووائل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کے دن لوگوں کو درس دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے عرض کی: اے ابوعبدالرحمٰن! میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں روزانہ درس دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: روزانہ درس دینے سے جس چیز نے مجھے روکا ہے' وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو اکتانا نہیں چاہتا' میں درس دینے میں تم لوگوں کے وقت کا اسی طرح لحاظ کرتا ہوں' جس طرح نبی اکرم ﷺ ہمارے وقت کا لحاظ فرماتے تھے' اس خدشہ سے کہ کہیں ہم اُکتا نہ جائیں۔ (صحیح بخاری: ۷۰)

اس حدیث کی روشنی میں بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایصال ثواب کرنے میں لوگوں کی آسانی کے لیے کسی وقت اور دن کو معین کر لینا شرعاً کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔ بعض لوگ مزارات پر حاضری کے لیے جمعرات یا کسی اور دن کو خاص کر لیتے ہیں یا درود شریف کے لیے جمعہ کے بعد کا وقت خاص کر لیتے ہیں' یہ سب کچھ اسی حدیث کے تحت جائز ہے۔

(۴) سنن ترمذی کی ایک حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پیر اور جمعرات کا دن روزہ رکھنے کے لیے خاص فرمایا ہوا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تعرض الاعمال یوم الاثنین والخمیس فاحبّ ان یعرض عملی وانا صائم'' (ترجمہ:) پیر اور جمعرات کے دن (اللہ کی بارگاہ میں) اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل اس حال میں پیش کیا جائے کہ میں روزہ سے ہوں۔

(سنن ترمذی: ۷۴۷' سنن ابن ماجہ: ۱۷۴۰)

نفلی روزے پیر اور جمعرات کے علاوہ کسی اور دن بھی رکھے جا سکتے ہیں' لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس کے لیے پیر اور جمعرات کا دن خاص فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفلی اور مستحب کام (جیسے ایصالِ ثواب) کے لیے دن اور وقت مخصوص کرنا جائز ہے۔ اس حدیث میں زیادہ جو غور طلب بات ہے' وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دو دنوں کو خاص کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ان میں بندوں کے اعمال بارگاہِ الٰہی میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یعنی اللہ عزوجل نے فرشتوں کو اس بات کا پابند فرمایا ہے کہ وہ پیر اور جمعرات کے دن بندوں کے اعمال پیش کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل بھی اپنے کاموں کے لیے دن اور وقت کی تخصیص فرماتا ہے۔ ورنہ وہ چاہے تو فرشتے کسی بھی دن اس کے پاس اعمال لے کر حاضر ہو جائیں۔ اس قدرت اور اختیارِ مطلق کے باوجود اس نے پیر اور جمعرات کا دن خاص فرمایا ہوا ہے' لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دن اور وقت خاص کرنا صرف رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت نہیں ہے بلکہ اللہ کا بھی یہی طریقہ ہے۔ اگر اپنے اعمال کے لیے اوقات اور ایام معیّن کرنا جائز نہ ہوتا تو رسول اکرم ﷺ پیر اور جمعرات کا دن روزے کے لیے خاص نہ فرماتے۔

مذکورہ تمام احادیث سے یہ بات بالکل بے غبار ہو گئی کہ فاتحہ شریف اور قرآن خوانی کے لیے سوئم' چہلم اور برسی وغیرہ کے عنوان سے ایام کی تخصیص کرنا شرعاً جائز ہے۔ بلکہ اگر اس کو اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اس میں لوگوں کے لیے آسانی اور سہولت مقصود ہوتی ہے تو یہ "تعیّن" مستحب (باعث ثواب) قرار پاتا ہے۔ اور یہ بات ہم شروع میں کہہ چکے ہیں کہ زمانے کے گزرنے سے کسی جائز چیز کا نام بدل جائے تو اس سے اس کے جائز ہونے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

فاتحہ کے موقع پر کھانا سامنے رکھ کر دعا کرنے کی شرعی حیثیت

ایصالِ ثواب کے لیے جو محافل ہوتی ہیں' ان میں اختتام پر جب دعا و فاتحہ کی جاتی ہے تو کھانے پینے کی چیزیں سامنے رکھی جاتی ہیں۔ یہ اگرچہ شرعاً واجب اور ضروری نہیں ہے' تاہم اس کے باعث ثواب اور باعث برکت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ باعث برکت اس لیے کہ جہاں اللہ عزوجل کا ذکر ہوتا ہے' وہاں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ سو

جب دعا اور فاتحہ کے وقت کھانا سامنے رکھا جائے گا تو اس میں اللہ عزوجل کی خصوصی رحمت اور برکت شامل ہوگی۔ اور یہ عمل باعث ثواب اس لیے ہے کہ اس میں سنت رسول ﷺ کی اتباع ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے یہ عمل ثابت ہے کہ آپ نے کئی مواقع پر کھانے کی چیزیں سامنے رکھ کر دعا فرمائی ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلہ کی چند احادیث پیش کر رہے ہیں:

(۱) صحیح مسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ پھلوں کو اپنے سامنے رکھ کر دعا فرماتے تھے:

''**عن ابی هريرة رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال كان النّاس اذا رأوا اوّل الثمرة جاؤا به الی النبی ﷺ فاذا اخذه ' قال اللّٰهم بارك لنا فی ثمرنا وبارك لنا فی مدينتنا وبارك لنا فی صاعنا وبارك لنا فی مدّنا**'' (الخ) (ترجمہ:) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب موسم کا پہلا پھل لگتا تھا تو صحابہ کرام سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ اس پھل کو لے کر مختلف دعائیں فرماتے تھے۔ ان میں سے چند جملے یہ ہیں: اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے پھلوں میں برکتیں ڈال دے! ہمارے لیے ہمارے اس شہر مدینہ میں برکتیں ڈال دے اور ہمارے ناپ تول کے پیمانوں میں برکتیں ڈال دے!

حدیث کے آخر میں یہ جملہ ہے کہ ''**ثم يدعوا صغر وليد له ' فيعطيه' ذالك الشمر**'' پھر آپ ﷺ کسی چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل اسے دے دیا کرتے تھے۔

(اس حدیث کو امام مسلم کے علاوہ امام ترمذی' امام ابن ماجہ' امام مالک' امام احمد اور امام دارمی نے بھی روایت کیا ہے)

(صحیح مسلم: ۱۳۷۳' سنن ترمذی: ۳۴۵۴' سنن ابن ماجہ: ۳۳۲۹' سنن دارمی: ۲۰۷۲' موطأ امام مالک: ۲۔ من کتاب المدینہ' مسند احمد ج ۲ ص ۳۳۰' مشکوٰۃ: ۲۷۳۱۔ ص ۲۳۹)

(۲) صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں غزوۂ خندق سے پہلے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا تفصیلی واقعہ موجود ہے۔ جس میں خاص طور پر یہ تصریح ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے گھر میں کھانا سامنے رکھ کر برکت کی دعا فرمائی۔ حدیث میں حضرت جابر رضی

اللہ عنہ کے روایت کردہ الفاظ یہ ہیں:

"فقال رسول اللہ ﷺ لا تنزلنّ برمتكم ولا تخبزنّ عجينكم حتّى اجيئى وجاء فاخرجت له عجينًا فبصق فيه وبارك ثم عمد الٰى برمتنا فبصق وبارك" (ترجمہ:) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک میں تمہارے گھر نہ آ جاؤں اس وقت تک چولہے سے ہانڈی نہ اُتاری جائے اور نہ آٹے سے روٹی بنائی جائے۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ تشریف لائے تو میں آپ کے سامنے گندھا ہوا آٹا لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اس میں اپنا لُعاب دہن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر ہماری ہانڈی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں اپنا لُعاب دہن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔

(صحیح بخاری: ۴۱۰۱۔ ۴۱۰۲، صحیح مسلم: ۲۱۳۹، سنن دارمی: ۴۲، مشکوٰۃ: ۵۸۷۷۔ ص ۵۳۲)

(۳) صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے جانے کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ اس میں بھی یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں طعام لایا گیا، آپ نے اس پر برکت کی دعا فرمائی۔ (صحیح مسلم: ۲۰۴۰، مشکوٰۃ: ۵۹۰۸)

(۴) صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر کھانے پینے کی ایک قلیل مقدار پر برکت کی دعا فرمائی۔

اس کا واقعہ اس طرح ہے کہ غزوۂ تبوک کے سفر میں صحابہ کرام کو بہت تنگی کا سامنا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! لوگوں کے پاس جو بچا کھچا کھانے پینے کا سامان ہے، وہ ان سے منگوالیں اور اس طعام پر ان کے حق میں خیر و برکت کی دعا فرمادیں۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قبول فرمائی اور لوگوں کے پاس جو بھی کھانے پینے کی چیز بچی ہوئی تھی، وہ منگوالی۔ (تنگی کا عالم یہ تھا کہ) کوئی شخص ایک مشت مکئی لا رہا تھا، کوئی شخص ایک مشت کھجوریں لا رہا تھا اور کوئی روٹی کے ٹکڑے لا رہا تھا۔ حتیٰ کہ دسترخوان پر تھوڑا سا سامان جمع ہوسکا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پر برکت کی دعا فرمائی۔ اور صحابہ کو حکم دیا کہ اسے اپنے برتنوں میں بھر لو۔ (دعائے نبوی کی برکت کا عالم یہ تھا کہ) لشکر میں جتنے برتن تھے، سب بھر گئے اور

سب نے سیر ہو کر کھایا' مگر آخر میں وہ طعام باقی بچ گیا۔

(صحیح مسلم: ۲۷' مشکوٰۃ: ۵۹۱۲۔ص ۵۳۸)

(۵) ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں کچھ کھجوریں لے کر حاضر ہوئے اور عرض کی: "**یا رسول اللّٰہ! ادع اللّٰہ فیھنّ بالبرکۃ فضمھنّ ثمّ دعا لی فیھنّ بالبرکۃ**" (ترجمہ:) اے اللہ کے رسول! آپ ان کھجوروں پر اللہ عزوجل کی بارگاہ میں برکت کی دعا فرمادیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کھجوروں کو آپس میں ملایا اور پھر ان پر برکت کی دعا فرمائی۔

(سنن ترمذی: ۳۸۳۹' مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۲' مشکوٰۃ: ۳۹۳۳)

ان تمام احادیث سے واضح ہو گیا کہ فاتحہ شریف اور دعا کے وقت کھانا سامنے رکھنا بدعت نہیں ہے' بلکہ عین حدیث کے مطابق ہے۔

ایصالِ ثواب کے حوالہ سے ضروری باتوں پر ہم نے قدرے تفصیل سے کلام کر دیا ہے' تاکہ مخالفین کے شکوک وشبہات زائل ہوں اور موافقین کو تقویت اور تائید حاصل ہو۔ اس قدر تفصیل کے بعد بھی اگر کوئی اپنی ضد پر قائم رہے اور ایصالِ ثواب کے رائج طریقہ کو ناجائز بتائے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ہم اپنی گفتگو اس دعا پر ختم کرتے ہیں:

"**اللّٰھم ارنا الحق حقّا وارزقنا اتّباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ**"

(اے اللہ! ہم پر حق کی حقانیت منکشف فرما اور ہمیں اس کی اتباع کرنے کی توفیق عطا فرما اور ہم پر باطل کا بطلان واضح فرما اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق وسعادت عطا فرما!)

آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

بدعت کا شرعی تصور اور سنن دارمی کی ایک روایت کا جواب

سوال:

ایک صاحب نے اہل سنت کے معمولات (میلاد وغیرہ) کو بدعت قرار دیتے ہوئے

سنن دارمی کی ایک حدیث پیش کی، جس میں ایک صحابی نے کچھ لوگوں کو مسجد میں حلقہ بنائے ہوئے کنکریوں پر تسبیح اور تکبیر پڑھتے ہوئے دیکھا، تو اُنہیں سختی سے ایسا کرنے سے روکا اور اُن کو گمراہ قرار دیا۔ صحابیٔ رسول کی اس تردید اور انکار سے واضح ہوتا ہے کہ نئے نئے کام ایجاد کرنا (اگرچہ بظاہر وہ کام اچھے ہوں) شرعاً قابل گرفت اور سخت ناپسندیدہ عمل ہیں۔ لہٰذا میلاد شریف اور گیارہویں شریف وغیرہ سب کا یہی حکم ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ کوئی نیا اور اچھا کام لوگوں میں عام کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور سننِ دارمی کے حوالہ سے جو حدیث بیان کی گئی ہے، اُس کی کیا حقیقت ہے؟ [سائل: محمد سلیمان، لیاقت آباد]

جواب:

لفظ ''بدعة'' کا لغوی معنی ہے: کوئی بھی نیا کام، یا کسی کام کا نیا انداز اور طریقہ۔ جب کہ شرعی نقطہ نظر سے اس کا معنی ہے: ''احداث ما لم یکن فی عهد رسول اللّٰه ﷺ'' ایسا کام ایجاد کرنا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہ ہوا ہو۔

(تہذیب الاسماء واللغات ج۱ص۲۲)

یہ اور اس سے ملتی جلتی تعریفات کرنے کے بعد تقریباً تمام ہی علماء نے لکھا ہے کہ بدعت (نئی چیز) دو طرح کی ہوتی ہے: اچھی اور بُری۔ اچھی سے مراد ایسی چیز ہے جو قرآن و سنّت اور مقاصدِ شریعت کے خلاف نہ ہو، اس کو بدعتِ حسنہ کہتے ہیں۔ اور بُری سے مراد ایسی چیز ہے جو دلائلِ شریعت اور مقاصدِ شریعت کے خلاف ہو، اس کو بدعتِ سیئہ کہتے ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر، علامہ قرطبی، علامہ زرکشی، علامہ بدرالدین عینی، علامہ سخاوی، علامہ علی قاری حنفی، علامہ نووی، امام سیوطی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ قسطلانی، علامہ ابن حجر ہیتمی، علامہ زرقانی، علامہ شامی، معروف دیوبندی عالم زکریا کاندھلوی، مشہور غیر مقلد عالم قاضی شوکانی اور دیگر کئی علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں بدعت کی یہ دونوں قسمیں تحریر کی ہیں۔ (تفصیلی حوالہ جات کے لیے مفسّرِ قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ کی تفسیر تبیان القرآن ج۱۱ص۷۴۹ تا۷۵۴ کا مطالعہ فرمائیں)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کسی کام کے بدعت ہونے سے یہ لازم نہیں کہ وہ کام بُرا

بھی ہو۔ کیونکہ ہر بدعت یا ہر نیا طریقہ بُرا نہیں ہوتا' بلکہ بعض بدعتیں اچھی اور بعض بدعتیں بُری ہوتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''من سنّ فی الاسلام سنّة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شيء ومن سنّ في الاسلام سنّة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من غير ان ينقص من اوزارهم شيئا''۔

(ترجمہ:) جس نے دین اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اُسے اس ایجاد کا اور اس کے بعد اُس پر عمل کرنے والے تمام لوگوں کا اجر و ثواب ملتا رہے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ (جبکہ وہ شخص) جس نے دین میں بُرا طریقہ رائج کیا تو اس پر اس ایجاد کا اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والے تمام لوگوں کا بوجھ رہے گا اور عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کمی نہیں ہوگی۔

(صحیح مسلم: ۱۰۱۷' سنن نسائی: ۲۵۵۴' مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۹' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۰)

اس حدیث میں واضح طور پر نئے طریقہ کی دو قسمیں بیان فرمائی گئی ہیں: ایک اچھا اور ایک بُرا۔ لہٰذا ہر نئے طریقہ کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا اس حدیث کے خلاف ہے۔ البتہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''کلّ بدعة ضلالة'' کہہ کر ہر نئے طریقہ کو گمراہی قرار دیا ہے' اس سے ہر وہ نیا طریقہ مراد ہے جو بُرائی پر مشتمل ہو۔ بعض مخالفین اس تقسیم کے قائل نہیں ہیں' وہ ہر نئے طریقہ کو بُرا کہتے ہیں (خواہ وہ طریقہ اچھا ہو یا بُرا) اور اپنی تائید میں ''کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ'' کا جملہ پیش کرتے ہیں اور یہ غور نہیں کرتے کہ اس سے اوپر صحیح مسلم کی حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نئے طریقہ کی دو قسمیں بیان فرما رہے ہیں اور نہ صرف دو قسمیں بلکہ اچھا طریقہ ایجاد کرنے کو باعثِ ثواب اور بُرا طریقہ ایجاد کرنے کو باعثِ گناہ قرار دے رہے ہیں۔ اور پیغمبر کا کلام تضاد سے پاک ہوتا ہے' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جانب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نئے اچھے طریقہ کی حوصلہ افزائی فرمائیں اور دوسری طرف اس کو گمراہی قرار دیں! لامحالہ ماننا ہوگا کہ جس حدیث میں ''کلّ بدعة ضلالة'' کہہ کر ہر نئے طریقہ کو گمراہی قرار دیا گیا ہے' اُس سے وہ نئے طریقے مراد ہیں' جو بُرے ہوں۔ (دیکھئے: مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱

ص ۳۶۸) خدانخواستہ اگر اچھا طریقہ ایجاد کرنا بھی گمراہی میں شامل ہو تو پھر دو احادیث میں تضاد لازم آئے گا' جو کہ نبی کے کلام میں ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک سننِ دارمی کی اُس روایت کا تعلق ہے جس کا سوال میں تذکرہ کیا گیا ہے' تو اوّلاً اس سے استدلال کرنا ہی درست نہیں ہے' کیونکہ یہ سند کے اعتبار سے ضعیف روایت ہے اور اکابر علماء نے اس کو ناقابلِ استدلال قرار دیا ہے۔ علامہ سیّد محمود آلوسی حنفی بغدادی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"وما ذكر في الواقعات عن ابن مسعود من انه رأى قوما يهلّلون برفع الصّوت في المسجد فقال ما أراكم الّا مبتدعين حتّى أخرجهم من المسجد لا يصحّ عند الحفّاظ من الائمة المحدّثين"۔

یعنی واقعات میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے جو مذکور ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو مسجد میں بلند آواز سے "لا الٰه الّا اللّٰه" کا ورد کرتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اُن کو بدعتی قرار دیا اور اُنہیں مسجد سے نکال دیا' حُفّاظِ حدیث کے نزدیک یہ روایت سندِ صحیح کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ (تفسیر روح المعانی' سورۂ طٰہٰ : ۷)

(اس روایت کی حقیقت پر مزید کلام کے لیے مفسّرِ قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدّ ظلّہ کی تصنیف "ذکر بالجہر" ص ۱۵۶ تا ۱۶۱ کا مطالعہ فرمائیں۔)

اور اگر بالفرض یہ روایت کسی درجہ میں ثابت ہو' تب بھی اِس سے بدعتِ حسنہ کے خلاف استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اِس میں صحابیٔ رسول نے جن لوگوں کو گمراہ قرار دیا ہے' وہ خارجی لوگ تھے اور خارجی فرقہ وہ ہے جس کے بظاہر اچھے کام بھی لوگوں کو اپنے قریب لانے اور اپنے نظریہ کا پرچار کرنے کے لیے ہوتے تھے' حالانکہ اس طرح کے گمراہ فرقوں کی پہلے سے خبر دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیا تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: "ايّاكم واياهم لا يضلّونكم ولا يفتنونكم" "تم ان سے دور رہنا اور انہیں اپنے آپ سے دور رکھنا' کہیں یہ تمہیں گمراہی اور فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ (صحیح مسلم' ج ۱ ص ۱۰)

تو صحابیٔ رسول کا اُن کے خلاف سختی سے کلام کرنا اور حلقہ بنا کر تسبیح پڑھنے سے روکنا اُن

لوگوں کے خارجی اور گمراہ ہونے کی بناء پر تھا' تاکہ لوگ اُن کے ظاہری اچھے عمل کو دیکھ کر اُن کے دامِ فریب میں نہ آ جائیں۔ چنانچہ دارمی کی اس روایت کے آخری کلمات ملاحظہ فرمائیں:

صحابیٔ رسول ان لوگوں کا خارجی ہونا ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''انّ رسول اللّٰہ ﷺ حدثنا انّ قوما یقرؤن القرآن لا یجاوز تراقیھم وایم اللّٰہ ما ادری لعلّ اکثرھم منکم ثمّ تولّی عنھم'' یعنی رسول اللہ ﷺ ہمیں پہلے ہی بتا چکے تھے کہ ایک قوم آئے گی جو قرآن مجید کی تلاوت کرے گی' لیکن وہ اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا' (پھر قسم کھا کر اُن لوگوں سے فرمایا:) خدا کی قسم! میں جانتا ہوں کہ شاید اُن کی اکثریت تم ہی میں سے ہے۔ یہ کہہ کر صحابیٔ رسول وہاں سے چلے گئے۔ عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ اُن میں سے اکثر کو ہم نے نہروان والے دن (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں) خارجیوں کی جماعت میں دیکھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔

(سنن الدارمی: ۲۰۴' مطبوعہ بیروت)

ان کلمات سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ تسبیح کے نام پر حلقہ بنانے والے یہ لوگ خارجی تھے اور اسی لیے صحابیٔ رسول نے ان کو بدعتی اور گمراہ قرار دیا۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صحابیٔ رسول نے ان کو خارجی ہونے کی بناء پر نہیں' بلکہ تسبیح پڑھنے کا نیا طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے گمراہ قرار دیا تھا تو یہ دعویٰ درست نہیں ہوگا' کیونکہ پیچھے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نیا اچھا طریقہ ایجاد کرنے کو نبی اکرم ﷺ نے باعثِ ثواب قرار دیا ہے' تو اس طرح قولِ رسول اور قولِ صحابی میں ٹکراؤ لازم آئے گا (رسول اچھا طریقہ ایجاد کرنے کی اجازت دیں اور صحابی اُس سے منع کریں) اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی صحابیٔ رسول پیغمبر کے فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کرے۔ لہٰذا دارمی کی اس روایت کو نیا اچھا طریقہ ایجاد کرنے کے خلاف استعمال کرنا درحقیقت قولِ رسول ﷺ کے خلاف استعمال کرنا ہے اور یہ کسی صاحبِ ایمان کی جرأت نہیں ہوسکتی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اہل سنت کے مخالفین عام طور پر بدعتِ حسنہ کو رد کرنے کے شوق میں دارمی کی مذکورہ روایت بیان تو کر جاتے ہیں' لیکن خود اس پر عمل نہیں کر پاتے اور صبح

سے شام تک بہت ساری بدعات کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً

(۱) اپنے مدارس میں مختلف درجات کی ترتیب اور نصاب کی خاص مقدار کے مطابق تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں نہ درجات کی ترتیب، نہ نصاب کا تعین اور نہ مروّجہ طریقۂ تعلیم تھا۔ اس کے باوجود یہ تمام کام دارمی کی روایت کے خلاف نہیں ہیں!!

(۲) یہ سب لوگ فرض نماز کے ساتھ سنتیں اور نوافل بھی مسجد ہی میں ادا کرتے ہیں، حالانکہ صحیح احادیث کے مطابق نبی اکرم ﷺ کی تعلیم اور ترغیب یہ تھی کہ فرض کے سوا دیگر نماز گھر میں ادا کی جائے۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی حضور نے یہی تربیت فرمائی۔

(اس کی تفصیل صحیح بخاری: ۱۱۸۷، صحیح مسلم: ۷۷۸، سنن ابوداؤد: ۱۰۴۴، سنن ترمذی: ۴۵۰، سنن ابن ماجہ: ۱۳۷۸ وغیرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

صحابہ کرام کے اس طرزِ عمل کے برخلاف ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ اختیار کرلیا گیا کہ لوگ فجر سے لے کر عشاء تک کی تمام سنتیں عموماً مسجد ہی میں ادا کرتے ہیں۔ سننِ دارمی کی روایت پر خوش ہونے والے بتائیں کہ فجر سے عشاء تک مسجد میں پانچ مرتبہ روزانہ ہونے والی یہ بدعت کون سی قسم سے تعلق رکھتی ہے؟ اور اس بدعت کے خلاف جہاد کرنا سنن دارمی کی رو سے واجب ہے یا نہیں؟

(۳) تعلیمی سال کے آخر میں ''ختم بخاری'' کے عنوان سے باقاعدہ (بینر، پوسٹر اور طعام وغیرہ) کے ساتھ مدارس میں یہ لوگ محفل کا انعقاد کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ نے ایسا کوئی ختم شریف منعقد نہیں کیا۔ سنن دارمی کی روایت پڑھ پڑھ کر قرآن خوانی اور میلاد کا ردّ کرنے والے بتائیں کہ ختم بخاری کے لیے جمع ہونا بلکہ (مخصوص ترتیب کے ساتھ) صحیح بخاری کا خود اپنا وجود بدعت کی کون سی قسم میں شمار کیا جائے گا؟ اور سنن دارمی کی رُو سے ختمِ بخاری کی بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کا کیا حکم ہوگا؟

اسی طرح قرآن مجید پر زبر زیر پیش، قرآن مجید کی ۳۰ پاروں میں تقسیم، مساجد میں محراب و مینار کی تعمیر، نمازِ باجماعت کے لیے اوقات کا تعین، ربیع الاوّل کے ایام میں ''سیرت کانفرنس'' کے نام سے مخالفین کے جلسے، اہل حدیث کانفرنس کے نام سے جلسوں کا انعقاد،

فتاویٰ اہل حدیث کے نام سے مخصوص کتاب کی طباعت، حُسنِ قرأت کے عنوان سے عالمی اور ملکی محافل کا انعقاد اور اس جیسے کئی ایسے کام جو نہ رسول اللہ ﷺ نے کیے نہ صحابۂ کرام نے اس کے باوجود یہ سب کام مخالفین کے یومیہ یا سالانہ معمولات میں شامل ہیں۔ اور ان بدعات (یعنی نئے کاموں) کے ارتکاب کے وقت مخالفین کو نہ ''کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ'' کا سبق یاد آتا ہے نہ سنن دارمی کی مذکورہ روایت یاد آتی ہے۔ اور جہاں کسی غریب نے محفل میلاد یا گیارہویں شریف کا انعقاد کر لیا تو کفر و شرک اور بدعت کے تمام فتووں کا رخ فوراً اُدھر ہو جاتا ہے اور اُس غریب کو صحیح بخاری اور سنن دارمی کا نام لے کر مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے نزدیک بدعت کے معاملہ میں صحیح نظریہ (جو صحیح مسلم کی حدیث: ۱۰۱۷ سے ثابت ہوتا ہے) وہ یہ ہے کہ کسی کام کے جائز اور ناجائز ہونے کے لیے اُس کا عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں ہونا یا نہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ معیار یہ ہے کہ اگر وہ کام شریعت سے متصادم نہ ہو تو وہ جائز ہے، خواہ وہ کسی بھی زمانے میں ہو (جیسے مدارس کا تعلیمی نصاب، مساجد میں سنتوں کی ادائیگی، ختمِ قرآن و ختم بخاری اور میلاد و فاتحہ وغیرہ) اور اگر شرعی قوانین سے وہ کام متصادم ہو تو وہ ناجائز ہے، خواہ کسی زمانے میں ہو۔

مخالفین کو اگر یہ معیار تسلیم نہیں ہے اور اُنہیں اس پر اصرار ہے کہ جو کام عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں نہ ہوا ہو، وہ ناجائز ہے (جیسا کہ دارمی کی روایت سے اُنہیں دھوکا لگا ہے) تو پھر مخالفین ''اجتماع ختم بخاری'' اور اس جیسی دیگر بدعات کا ارتکاب کر کے قوم کو دھوکا نہ دیں۔ اور دارمی کی روایت پر خود بھی ایمان لے آئیں۔ اور اپنے مدارس اور مساجد میں ہونے والی یومیہ، ماہانہ اور سالانہ بدعتوں سے علی الاعلان توبہ کا اہتمام کریں۔ اس کے بعد فاتحہ اور میلاد وغیرہ کے خلاف دارمی کی روایت کی تلاوت فرمائیں۔ لیکن اس تلاوت سے قبل صحیح مسلم کی پیش کردہ حدیث کا بھی ضرور مطالعہ فرمائیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اجتماعی قرآن خوانی کے جواز پر دلائل

سوال:

ایک شخص جو کہ اپنے آپ کو بہت بڑا عالم دین کہتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اجتماعی قرآن

خوانی بدعت ہے' اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اور قرآن خوانی کے بعد جو ماحضر پیش کیا جاتا ہے' وہ حرام ہے۔ اس شخص کا یہ بھی کہنا ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی کی کوئی دلیل احادیث سے ثابت نہیں ہے۔ اجتماعی قرآن خوانی کو صحیح قرار دینے والے تمام علماء سے مناظرہ کرنے کو تیار ہوں کہ اجتماعی قرآن خوانی قطعاً بند ہونی چاہیے کیونکہ یہ بڑی بدعت ہے۔ رہنمائی فرمایئے۔ [سائل: فاروق احمد' گلشن اقبال]

جواب:

اجتماعی قرآن خوانی کا معنی ہے: لوگوں کا کسی جگہ جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا' اور اس کا جائز ہونا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ امام مسلم اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم الا نزلت علیھم السکینة وغشیتھم الرحمة وحفتھم الملائکة وذکرھم اللہ فیمن عندہ''۔ (صحیح مسلم: ۲۶۹۹۔ ج ۲ ص ۳۴۵)

(ترجمہ:) اللہ کے گھروں میں سے کسی بھی گھر میں لوگ جب جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں قرآن مجید ایک دوسرے کو سکھاتے ہیں تو اُن پر قلبی سکون اُترتا ہے' رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور اللہ عزوجل انہیں اس جماعت میں یاد فرماتا ہے جو اُس کے پاس ہوتی ہے۔

اس حدیث میں واضح طور پر اجتماع اور تلاوتِ کتاب اللہ کا لفظ آیا ہے اور جمع ہو کر قرآن پڑھنے والوں کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے' لہٰذا اجتماعی قرآن خوانی کو ناجائز کہنا قطعاً غلط اور حدیث کا انکار کرنا ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اور حدیث جو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' اس سے بھی اجتماعی قرآن خوانی کا واضح ثبوت ملتا ہے' وہ فرماتے ہیں:

''خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ونحن نقرء القرآن وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرء وافکلّ حسن وسیجیء اقوام یقیمونہ کما یقام القدح یتعجلونہ ولا یتاجلونہ''۔ (سنن ابوداؤد: ۸۳۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۰۶)

(ترجمہ) رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم سب قرآن مجید پڑھ رہے تھے ہم میں دیہات اور عجم کے لوگ بھی موجود تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے (ہمیں یوں مل کر قرآن مجید پڑھتے ہوئے دیکھ کر) فرمایا: (تم میں) سب کے سب قابل تعریف ہیں اور عنقریب کچھ ایسے لوگ آئیں گے جو تلاوت کو (تکلف کے ساتھ) اس طرح درست کر کے پیش کریں گے جیسے تیر سیدھا کیا جاتا ہے یہ لوگ دنیا میں اس کا فائدہ لے لیں گے لیکن آخرت کے لیے کچھ نہ رکھیں گے۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام ایک جگہ جمع ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھ کر منع نہیں فرمایا' اگر اجتماعی قرآن خوانی ناجائز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ صحابہ کے اس فعل کی اصلاح فرماتے اور انہیں علیحدہ علیحدہ تلاوت کا حکم دیتے۔ لیکن آپ نے منع کرنے کے بجائے ''فَكُلٌّ حَسَنٌ'' کہہ کر سب کی تعریف فرمائی۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ اپنے کسی حجرہ سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے' اس وقت مسجد میں دو حلقے لگے ہوئے تھے' ایک حلقہ کے لوگ قرآن مجید کی تلاوت اور اللہ عزوجل سے دعا کرنے میں مشغول تھے اور دوسرے حلقے کے لوگ علم کی باتیں سیکھنے اور سکھانے میں مشغول تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ منظر دیکھ کر ارشاد فرمایا: **''کل علی خیر ھؤلاء یقرأون القرآن ویدعون اللّٰہ ' فان شاء اعطاھم وان شاء منعھم وھؤلاء یتعلمون ویعلمون وانّما بعثت معلمًا''** یعنی (ان دونوں حلقوں کے) تمام ہی لوگ خیر پر قائم ہیں' ایک حلقے والے قرآن مجید کی تلاوت اور اللہ عزوجل سے دعا کرنے میں مشغول ہیں' سو اللہ تعالیٰ چاہے گا تو انہیں عطا فرمائے گا اور چاہے گا تو عطا نہیں فرمائے گا اور دوسرے حلقے والے علم کی باتیں سیکھنے اور سکھانے میں مشغول ہیں اور میں بھی معلّم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ اس دوسرے حلقے والوں کے ساتھ تشریف فرما ہو گئے۔

(سنن ابن ماجہ: ۲۲۹۔ کتاب السنۃ۔ باب: ۱۷)

اس حدیث میں صحابہ کرام کا نہ صرف اجتماعی قرآن خوانی کرنے کا ذکر ہے بلکہ مل کر دعا

کرنے کا بھی ذکر ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر منع نہیں فرمایا' بلکہ ''کُلٌّ عَلٰی خَیْرٍ'' کہہ کر ان کی تعریف فرمائی۔ اس سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی شرعاً جائز اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ لہٰذا اجتماعی قرآن خوانی بدعت نہیں ہے بلکہ اس کا انکار کرنا بدعت ہے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی کو بدعت کہنے والے خود بہت شوق اور اہتمام (بینر' پوسٹر اور طعام وغیرہ) کے ساتھ ہر سال اپنے مدارس میں ''ختم بخاری شریف'' کے عنوان سے اجتماعی محفل کا اور حسن قرأت کی اجتماعی محفل کا انعقاد کرتے ہیں۔ اور اس موقع پر انہیں بدعت کا سبق یاد نہیں آتا اور نہ یہ فتویٰ یاد آتا ہے کہ صحابہ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اور جب اہل سنت کی طرف سے اجتماعی قرآن خوانی اور میلاد شریف وغیرہ کا انعقاد ہوتا ہے تو بدعت سے لے کر کفر و شرک تک تمام فتووں کا رخ اہل سنت کی طرف ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی ناجائز ہے تو ختم بخاری شریف کے لیے لوگوں کو جمع کرنا اور باقاعدہ جلسہ کا انعقاد کرنا کس دلیل سے جائز ہے! بلکہ مستند اخبارات کی رپورٹ کے مطابق مخالفین کا خود اپنے علماء کے لیے اجتماعی قرآن خوانی کرنا ثابت ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی دو خبریں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جامعہ علوم اسلامیہ' علامہ بنوری ٹاؤن کے ناظم اور قاری محمد اقبال کے مطابق ممتاز علماء کرام مفتی محمد جمیل خان اور مولانا نذیر احمد تونسوی کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی پیر کو جامعہ علومِ اسلامیہ' بنوری ٹاؤن میں صبح ۱۱ بجے ہوگی۔

(روزنامہ جنگ' کراچی' ص16 '25 شعبان 1425ھ/11 اکتوبر 2004ء)

(۲) عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی رہنماؤں مفتی محمد جمیل خان اور مولانا نذیر احمد تونسوی کے ایصالِ ثواب کے لیے بنوری ٹاؤن میں صبح ۱۱ بجے قرآن خوانی ہوئی۔ اس موقع پر مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری اور ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر نے ہزار سے زائد شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے مفتی محمد جمیل اور تونسوی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ (روزنامہ امت' کراچی' ص1 '26 شعبان/12 اکتوبر 2004ء)

بحمدہٖ تعالیٰ اجتماعی قرآن خوانی کے ثبوت میں احادیث مبارکہ سے دلائل پیش کرنے

کے ساتھ ساتھ ہم نے اتمامِ حجت کے لیے خود مخالفین کے اپنے عمل سے بھی سند پیش کر دی ہے۔ لہٰذا اجتماعی قرآن خوانی کو بدعت قرار دینے والوں میں سے کسی کو اگر ذکر کردہ احادیث پر اطمینان نہ ہو تو وہ اپنے پیشوا علماء کے فعل میں غور کر کے اپنی اصلاح کا سامان کرے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

اللہ تعالیٰ کو کسی جگہ کی طرف نسبت دینے اور ''اللہ میاں'' کہنے کا شرعی حکم

سوال:

(۱) اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ظرف (جگہ) ثابت کرے یا اسے اوپر والا کہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(۲) اور اللہ عزوجل کو ''اللہ میاں'' کہنا کیسا ہے؟ [سائل: محمد آزر حسین، کراچی]

جواب:

(۱) مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان سے پاک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور زمان و مکان مخلوق ہیں۔

علامہ علی بن سلطان محمد القاری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں؛

''انہ سبحانہ لیس فی مکان ولا فی زمان من الازمنۃ لان الزمان والمکان من جملۃ المخلوقات وھو سبحانہ کان موجودا فی الازل ولم یکن معہ شیء من الموجودات''

اللہ عزوجل کسی معیّن جگہ اور زمانہ کے ساتھ متصف ہونے سے پاک ہے، کیونکہ زمانہ اور جگہ مخلوق میں سے ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ازل سے ہے یعنی اس وقت سے جب زمانہ اور جگہ اور کوئی بھی چیز موجود نہیں تھی۔ (شرح الفقہ الاکبر، ص ۳۵)

علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''لمّا ثبت انتفاء الجسمیّۃ بالمعنی المذکور ثبت انتفاء لوازمھا فلیس سبحانہ

بذی لون ولا رائحة ولا صورة ولا شکل ولا متناه ولا حالّ فی شیء ولا محلّ"۔

جب اللہ تعالیٰ کا جسم سے پاک ہونا ثابت ہو گیا تو جسم کے لوازمات سے پاک ہونا بھی ثابت ہو گیا لہٰذا اللہ عزوجل کسی قسم کی رنگت' مہک اور شکل و صورت سے پاک ہے' نہ اس کی کوئی انتہاء ہے اور نہ کسی چیز کے اندر حلول کیے ہوئے ہے اور نہ وہ کسی معیّن جگہ سے متصف ہے۔ (المعتقد المنتقد' ص ۶۵)

ہمارے زمانے میں لوگ اللہ عزوجل کے لیے عموماً ''اوپر والا'' کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں (مثلاً کہتے ہیں کہ اوپر والا دیکھ رہا ہے) یا اللہ عزوجل کے کسی قول کو بیان کرتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا فریاد اور دعاء کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں' ان تمام صورتوں میں لوگوں کا عقیدہ اور مقصود' اللہ عزوجل کی بلندی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اگر واقعۃً ایسا ہی ہو تو یہ کفر نہیں ہے۔ ورنہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی ممنوع ہو جائے گا۔

علامہ فضل رسول قدس سرہ لکھتے ہیں:

آسمان اگرچہ بلندی کی ایک جگہ ہے' لیکن لوگ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس لیے دعاء کرتے ہیں کہ وہ دعاء کا قبلہ ہے' جس طرح کعبۃ اللہ شریف نماز کا قبلہ ہے' جب کہ جس کی عبادت ہو رہی ہے اور جس سے دعاء کی جا رہی ہے وہ کعبۃ اللہ میں متمکن ہونے یا آسمانوں میں ٹھہرنے سے پاک ہے۔ (المعتقد المنتقد' ص ۶۶)

لہٰذا محض کسی شخص سے یہ سن کر کہ ''اس نے اللہ عزوجل کو عرش یا آسمان کی طرف نسبت دی ہے'' کافر قرار نہیں دیا جا سکتا' جب تک کہ اس بات کی تحقیق نہ ہو جائے کہ آدمی نے اپنے اس جملہ سے کیا مراد لیا ہے۔

حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی باندی لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے' آپ نے اس کے ایمان کی تحقیق کے لیے اس سے پوچھا: أین اللہ (اللہ کہاں ہے؟) اس نے کہا: فی السماء (آسمان میں) آپ نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: أنت رسول اللہ (آپ اللہ کے رسول ہیں) آپ نے حضرت معاویہ سے فرمایا: اعتقہا فانھا مؤمنۃ (اس کو آزاد کر دو یہ مسلمان ہے۔) (سنن ابو داؤد رقم الحدیث ۹۳۰)

اس حدیث میں ''فی السماء'' سے باندی کا مقصود جہت اور جگہ کا تعین نہیں تھا' بلکہ یہ بتانا تھا کہ زمین کی طرح آسمان میں بھی اسی کی عبادت کی جاتی ہے۔ چونکہ اس کا مقصد جگہ کا تعیّن نہیں تھا اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے مسلمان قرار دیا۔

ہاں اگر کسی شخص کا مقصود اللہ عزوجل کے لیے جگہ کو ثابت کرنا ہوتو ایسے شخص کو توبہ اور تجدیدِ ایمان کا حکم دیا جائیگا۔ حضرت صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ فتاوی قاضی خان کے حوالہ سے لکھتے ہیں: خدا کے لیے مکان (جگہ) ثابت کرنا کفر ہے' کہ وہ مکان سے پاک ہے۔ یہ کہنا کہ اوپر خدا ہے' نیچے تم' یہ کلمہ کفر ہے۔ (بہارِ شریعت' حصہ ۹ ص ۸۶)

(۲) اللہ تعالیٰ کو ''اللہ میاں'' کہنا درست نہیں ہے' علماء نے اس سے بہت ممانعت فرمائی ہے۔ (کذا فی الفتاوی الامجدیہ ۴: ۲۱۸) کیونکہ میاں کا ایک معنی شوہر بھی ہے اور اللہ عزوجل کی طرف ایسے لفظ کی نسبت کرنا درست نہیں ہے جس میں اللہ عزوجل کی شان کے نامناسب معنی کا شائبہ موجود ہو۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصّواب

غیر اللہ کے آگے سجدۂ تعظیمی کرنے کا شرعی حکم

سوال:

(۱) کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ تعظیمی کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) بندگی صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے یا تعظیماً کسی اور کی بندگی بھی ہوسکتی ہے؟

[سائل: سید محمد احمد' لانڈھی]

جواب:

(۱) سجدہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ غیر اللہ کے لیے اگر بطور عبادت ہو تو کفر ہے اور بطور تعظیم ہو تو حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لو کنت 'امر احدا ان یسجد لاحد لامرت المرء ۃان تسجد لزوجھا''۔ (ترمذی ج ۱ ص ۲۹۸' مشکوٰۃ شریف ۲۸۱) یعنی اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنیکا حکم دیتا تو عورت کو ضرور حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

حدیثِ مذکور کے تحت علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"وفی ھذا غایۃ المبالغۃ لوجوب اطاعۃ المرءۃ فی حق زوجھا فان السجدۃ لا تحل لغیر اللہ. قال قاضیخان ان سجد للسلطان ان کان قصدہ التعظیم والتحیۃ دون العبادۃ لا یکون ذالك کفرا". (مرقات شرح مشکوٰۃ ج ۶ ص ۴۰۲)

یعنی حدیثِ مذکور میں انتہائی مبالغہ ہے اس بات کا کہ عورت پر شوہر کی اطاعت واجب ہے اور سجدہ غیر اللہ کے لیے حرام ہے' امام قاضی خان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کو محض تعظیم و تکریم کی غرض سے سجدہ کرتا ہے نہ کہ عبادت کی غرض سے تو یہ کفر نہیں ہوگا۔

علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ نے شرح فقہ اکبر' ص ۱۸۷ میں بھی صراحت فرمائی ہے کہ:

"السجدۃ حرام لغیرہ سبحانہ" (غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے)۔

(۲) اردو عربی دونوں زبانوں میں "بندگی" کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ جہاں بندگی کا معنی عبادت کرنا یا پوجنا ہے' وہاں اس کا معنی غلامی اور خدمت گزاری بھی آتا ہے۔ (قائد اللغات ص ۲۰۶)

اسی طرح عربی زبان میں بندگی کو "عبودیۃ" یا "عبدیۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے' اس کا معنی بھی جہاں عبادت و پرستش ہے وہاں اس کا معنی "الاسترقاق للاسیاد" (غلامی) اور "الطاعۃ" (فرمانبرداری) بھی ہوتا ہے۔ (المنجد فی اللغۃ ص ۴۸۳)

اس تفصیل کے بعد واضح ہے کہ بندگی بمعنی عبادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ جب کہ بندگی بمعنی غلامی اور خدمت گزاری غیر اللہ کے لیے ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود قرآنِ کریم میں وارد ہوا کہ: "وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ"۔ تم میں جو بے نکاح ہیں اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں جو نیک ہیں ان کا نکاح کراؤ"۔ (النور: ۳۲) مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیتِ مبارکہ میں (عبادکم) بمعنی غلام وارد ہوا ہے۔ (مدارک ج ۲ ص ۱۲۶) اس سے مزید واضح ہو گیا کہ بندگی غیر اللہ کے لیے بھی ہو سکتی ہے مگر بایں معنی کہ اس سے غلامی اور خدمت وغیرہ مراد لیا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

سجدۂ تعظیمی کی شرعی حیثیت

سوال:

سجدۂ تعظیمی شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیلی دلائل درکار ہیں؟ [سائل: خرم احمد خان' اسلامک سینٹر]

جواب:

سجدہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ غیر اللہ کے لیے اگر بہ طور عبادت ہو تو کفر ہے اور اگر بہ طور تعظیم ہو تو حرام ہے۔ قرآن مجید میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''. کیا کوئی بھی بشر جس کو اللہ تعالیٰ کتاب' حکم اور نبوت عطا کرے وہ تمہارے مسلمان ہونے کے بعد تمہیں کفر کا حکم دے گا؟''۔ (آل عمران: ۸۰)

اس آیت کی تفسیر میں متعدد مفسرین نے لکھا ہے کہ صحابۂ کرام نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کی اجازت چاہی کہ ہم آپ کو سجدہ کریں تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ کیا نبی تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے؟

قاضی ناصر الدین بیضاوی علیہ الرحمہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: **''دلیل علی ان الخطاب للمسلمین و هم المستاذنون لان یسجدوا له''**۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ خطاب ان مسلمانوں سے ہے جنہوں نے حضور کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ (تفسیر بیضاوی مع حاشیۂ الشہاب للخفاجی ج ۳ ص ۷۸)

علامہ جار اللہ زمخشری حنفی لکھتے ہیں: **''و قیل قال رجل یا رسول الله نسلم علیك كما یسلم بعضنا علی بعض افلا نسجد لك قال لا ینبغی ان یسجد لاحد من دون الله ولكن اكرموا نبیكم و اعرفوا الحق لاهله''**۔

یعنی آیت مذکورہ کا شان نزول یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ جس طرح لوگ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں ہم بھی آپ کو سلام کرتے ہیں۔ تو کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں! اپنے نبی کی تعظیم کیا کرو اور حق والے کے حق کو پہچانو۔

پھر علامہ زمخشری آخر میں لکھتے ہیں: "دلیل علی ان المخاطبین کانوا مسلمین وهم الذین استأذنوه ان یسجدوا له" یعنی آیت کے آخری الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ اس آیت میں خطاب مومنین سے ہے اور وہ وہی مسلمان ہیں جنہوں نے حضور کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ (کشاف ج ۱ ص ۴۰۵)

علامہ ابوالبرکات نسفی حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "یدل علی ان المخاطبین کانو ا مسلمین وهم الذین استاء ذنوه ان یسجد و اله"۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ خطاب مسلمانوں سے ہے اور یہ وہی مسلمان ہیں جنہوں نے حضور کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ (مدارک التنزیل ج ۱ ص ۱۸۶)

اسی طرح اور دیگر کئی مفسرین نے اپنی تفاسیر میں یہی فرمایا ہے۔ (حوالہ کے لیے دیکھئے: تفسیر کبیر للامام الفخر الرازی ج ۳ ص ۲۷۳، تفسیر الثعالبی للامام عبد الرحمٰن الثعالبی المالکی ج ۲ ص ۶۶، تفسیر المظہری ج ۲ ص ۸، روح البیان للامام اسمٰعیل الحقی الحنفی ج ۲ ص ۶۸)

احادیث میں بھی سجدۂ غیر اللہ کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ ذیل میں اس سلسلے کی دو احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "لو کنت امر احدا ان یسجد لاحد لامرت المرء ة ان تسجد لزوجها"۔ اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو ضرور حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ (ترمذی ج ۱ ص ۲۹۸، رقم: ۱۱۵۹، مشکوٰۃ ص ۲۸۱)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: اس حدیث میں اس بات کی بہت تاکید ہے کہ عورت پر شوہر کی اطاعت واجب ہے اور اللہ عزوجل کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ امام قاضی خان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کو محض تعظیم وتکریم کی غرض سے سجدہ کرتا ہے نہ کہ عبادت کی غرض سے تو یہ کفر نہیں ہوگا (بلکہ حرام ہوگا)۔ (مرقات ج ۶ ص ۴۰۲، فتاویٰ قاضی خان ج ۴ ص ۳۷۸)

علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے شرح فقہ اکبر، ص ۱۸۷ میں بھی صراحت فرمائی ہے: "السجدة حرام لغیره سبحانه" غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔

(۲) حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں حیرہ شہر گیا' میں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے بڑے بہادر کو سجدہ کرتے ہیں تو میں نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ حقدار ہیں اس بات کے کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ چنانچہ میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں حیرہ گیا تھا' میں نے وہاں لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے بڑے بہادر کو سجدہ کرتے ہیں۔ تو آپ ﷺ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

''ارءیت لو مررت بقبری اکنت تسجد لہ؟ فقلت لا فقال لا تفعلوا۔ لو کنت امرا احدا ان یسجد لاحد لامرت النساء ان یسجدن لازواجھن لما جعل اللہ لھم علیھن من الحق''۔

(سنن ابوداؤد' کتاب النکاح: ۲۱۴۰' مسند احمد ج ۴ ص ۳۸۱' مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۲)

سوچو! اگر تم میری قبر انور کے پاس سے گزرو تو کیا اس کو تم سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا: تو پھر سجدہ نہ کرو۔ اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے شوہروں کا ان پر حق رکھا ہے۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضرت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

اس کلام کا مقصد یہ ہے کہ سجدہ اسے لائق ہے جس کو نہ موت آئے نہ اس کی قبر ہو' ہمیشہ زندہ رہے اور وہ صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے۔ بندہ آج زندہ ہے اور زمین پر ہے' کل بعد وفات زمین میں ہوگا۔ جب بعد موت قبر کو سجدہ نہیں ہوسکتا تو زندگی میں بھی سجدہ بندے کو نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبر کو سجدہ کرنا حرام ہے' اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ (پھر فرماتے ہیں کہ:) اگر سوائے خدا کے کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرتی' کیوں کہ خاوند کے حقوق عورت پر بہت ہیں اور احسانات بھی زیادہ۔ جب عورت خاوند کو سجدہ نہیں کرسکتی تو اور کوئی بھی کسی بندے کو سجدہ نہیں کرسکتا۔ خیال رہے کہ سجدۂ عبادت کسی دین میں بھی غیر خدا کو جائز نہ تھا۔ مگر سجدۂ تعظیمی بعض گزشتہ دینوں میں جائز تھا جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے گیارہ بیٹوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ ہمارے اسلام میں یہ سجدہ بھی حرام ہے۔ اس حدیث سے وہ جاہل پیر عبرت پکڑیں جو اپنے مریدین سے اپنے کو سجدہ کراتے ہیں۔ جب حضور ﷺ کو سجدہ حرام ہوا تو کسی کو کیسے جائز ہوگا!

(مراۃ المناجیح ج ۶ ص ۱۲۶ مطبوعہ لاہور)

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد فقہاء کرام کی عبارات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا قطعاً جائز نہیں ہے:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"من سجد للسلطان علی وجه التحية او قبل الارض بين يديه لايكفر ولكن يأثم لارتكاب الكبيرة وهو المختار وقال الفقيه ابو جعفر رحمه الله ان سجد للسلطان بنية العبادة اولم تحضره النية فقد كفر (الیٰ قوله) لا يجوز السجود الا لله تعالیٰ". (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۱۳۱۲۳، فتاویٰ شامی ج ۹ ص ۶۸ ۴، البحر الرائق ج ۸ ص ۱۹۸، فتاویٰ فیض الرسول ج ۲ ص ۵۰۰)

جس نے تعظیماً کسی بادشاہ کو سجدہ کیا اور اس کے آگے زمین کو بوسہ دیا تو وہ کافر نہیں ہوگا، البتہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔ یہی مذہب مختار ہے۔ فقیہ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے عبادت کی نیت سے بادشاہ کو سجدہ کیا یا بغیر کسی نیت کے سجدہ کیا تو وہ شخص کافر ہو جائے گا۔ اور اللہ عزوجل کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں ہے۔

صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فتاوی شامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: سجدۂ تحیت یعنی ملاقات کے وقت بطور اکرام کسی کو سجدہ کرنا حرام ہے اور اگر بہ قصد عبادت ہو تو سجدہ کرنے والا کافر ہے۔ غیر خدا کی عبادت کفر ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۷۵)

فتاویٰ امجدیہ میں فرماتے ہیں: احادیث صحیحہ بکثرت ایسی وارد ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بار ہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی اور ہمیشہ آپ نے منع فرمایا، حالانکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہر نوع کی تعظیم کرتے اور سجدہ انہوں نے کبھی نہ کیا، لہٰذا یہ سجدہ خواہ تحیۃً کیا جائے یا سجدۂ تعظیم حرام ہے۔

(فتاویٰ امجدیہ ج ۴ ص ۱۵۸)

اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "**الزبدة الزكية في حرمة سجودة التحية**" مزید دلائل و براہین اور تفصیل و تحقیق کے لیے بہت مدد و معاون ثابت ہوگا۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

کسی کے آگے تعظیم کی نیت سے جھکنا یا ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینا

سوال:

کسی کے سامنے بہ نیت تعظیم تا حد رکوع جھکنا کیسا ہے؟ اگر کوئی کسی کے ہاتھ پاؤں چومے تو جھکنا لازم آتا ہے خواہ حد رکوع یا حد سجدہ۔ اس صورت میں اس جھکنے کا کیا حکم ہے؟

[سائل: خرم احمد خان' اسلامک سینٹر]

جواب:

تعظیماً کسی کے لیے حد رکوع تک جھکنا شرعاً ممنوع ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! ''الرجل منا یلقی اخاہ او صدیقه اینحنی له قال لا''۔ یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا اپنے دوست سے ملے تو کیا اس کے آگے جھکے؟ فرمایا نہیں۔ (سنن الترمذی' کتاب الاستیذان: ۲۷۲۸' سنن ابن ماجہ' کتاب الادب: ۳۷۰۲' مسند احمد ج ۳ ص ۱۹۸' شرح السنہ للامام البغوی' کتاب الاستیذان: ۳۳۲۵' سنن البیہقی ج ۷ ص ۱۰۰' مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۰۳)

اسی حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فتاویٰ عالمگیری میں علامہ تمرتاشی کے حوالے سے یوں ہے: ''یکرہ الانحناء عند التحیة و به ورد النھی''۔ سلام کرتے وقت بہ قدر رکوع جھکنا ممنوع ہے اور حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۱ بحوالہ فیض الرسول ج ۲ ص ۵۰۲)

حدیث مذکور کی شرح میں علامہ علی قاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''فانه فی معنی الرکوع وھو کالسجود من عبادۃ اللہ سبحانه''۔ ملاقات کے وقت جھکنا رکوع کے معنی میں ہے اور رکوع سجدہ کی طرح ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

(مرقات ج ۸ ص ۳۶۱)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ملاقات کے وقت جھکنا منع ہے۔

یعنی اتنا جھکنا کہ حدِ رکوع تک ہو جائے۔ (بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۷۶) رہا یہ کہ کسی کے ہاتھ یا پاؤں چومتے وقت حدِ رکوع یا حدِ سجدہ تک جھکنا لازم آتا ہے' تو یہ شرعاً ممنوع نہیں ہے کیوں کہ احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت زارع بیان کرتے ہیں کہ جب ہم مدینہ منورہ آئے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی اترنے لگے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔

(سنن ابوداؤد' کتاب الادب: ۵۲۲۵' مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۰۲)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ نے دستِ اقدس کو بوسہ دیا۔ (سنن ابن ماجہ: ۳۷۰۴' سنن ابی داؤد: ۵۲۲۳)

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دینا جائز ہے۔ اور ان میں حدِ رکوع یا حدِ سجدہ تک جھکنا جو لازم آتا ہے وہ اسلیے قابل اعتبار نہیں کہ یہاں اصل مقصد جھکنا نہیں ہے اور ایسا جھکنا جو تعظیماً اور محض جھکنا نہ ہو بلکہ کسی کام کی غرض سے ہو وہ جائز ہے جیسے کوئی چیز نیچے گر جائے تو لوگ اسے اٹھانے کے لیے جھک جاتے ہیں۔

مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: جھکنا جب ممنوع ہے جب کہ تعظیم کے لیے ہو' اگر جھکنا کسی اور کام کے لیے ہو اور وہ کام تعظیم کے لیے ہو تو جائز ہے۔ جیسے کسی کے جوتے سیدھے کرنے یا اس کا ہاتھ یا پاؤں چومنے کے لیے جھکنا ممنوع نہیں کہ یہ جھکنا اور کاموں کے لیے ہے۔ (مراۃ المناجیح ج ۶ ص ۲۸۰' مطبوعہ لاہور)

درمختار مع تنویر الابصار میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عالم دین یا عابد و زاہد شخص سے یہ درخواست کرے کہ وہ اپنا قدم چومنے دے تو اس کے کہنے کے مطابق عالم دین یا عابد اپنا پاؤں بوسہ کے لیے اس کی طرف بڑھا سکتا ہے۔ (درمختار ج ۹ ص ۴۶۷' بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۷۵)

اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے دلیل کے طور پر المستدرک سے ایک حدیث ذکر کی ہے' جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اپنے سر اور اپنے پاؤں کے بوسہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(المستدرک ج ۴ ص ۱۷۲' فتاویٰ شامی' ج ۹ ص ۴۶۷)

لہٰذا ہاتھ اور پاؤں کو چومتے وقت جو جھکنا لازم آتا ہے وہ ممنوع نہیں ہے' ورنہ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ نہ دیتے۔ ہاں محض ایسا جھکنا جو کسی کی تعظیم کے لیے ہو وہ شرعاً جائز نہیں ہے جیسا کہ سطور گذشتہ میں احادیث اور شارحین و فقہاء کی عبارات سے واضح کیا جا چکا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خیال آنا

سوال:

(۱) توحید اور تعظیم میں کیا فرق ہے؟ کیا یہ دونوں اگر جمع ہو جائیں تو شرک ہو جاتا ہے؟

(۲) کیا یہ بات درست ہے کہ علماء دیوبند کے نزدیک نماز میں تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور تصورِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم توحیدِ الٰہی کے خلاف ہے؟ ہمارا دین اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ امید ہے قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیل سے مسئلے کو واضح فرمائیں گے۔

[سائل: محمد حامد محمود صدیق آباد کراچی]

جواب:

توحید سے مراد ہے: صرف اللہ رب کائنات کی ذات کو لائق عبادت واجب الوجود اور مستقل جاننا، اسے اس کی ذات، صفات، افعال، احکام اور اسماء میں لاشریک ماننا اور اس کے ہر ارشاد کو قابل عمل جاننا۔ اور تعظیم سے مراد ہے: اس کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء خصوصاً تاجدار کائنات سید المرسلین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بھرپور ادب و احترام اور توقیر کرنا، ان سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کو بہ نظر احترام دیکھنا اور ان کو ان کی ذات و صفات میں اعلیٰ کمالات کا حامل جاننا۔

ہو سکتا ہے اس مفہوم کو پڑھنے کے بعد توحید اور تعظیم دونوں آپس میں دو مختلف چیزیں نظر آئیں لیکن بہ نظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آپس میں قطعاً مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے درمیان لازم اور ملزوم کا رشتہ ہے۔ آسان لفظوں میں ان کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ توحید اور تعظیم کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے وہ اتنا ہی گہرا ہے جتنا کلمہ طیبہ میں ''لا الہ الا اللّٰہ'' اور ''محمد رسول اللّٰہ'' کے درمیان ہے، کہ یہ دونوں باہم دو مختلف اور مستقل حقیقتیں ہونے کے باوجود آپس میں اس قدر مربوط اور متلازم ہیں کہ ان میں سے

ایک سے انحراف دوسرے سے انحراف کو مستلزم ہے۔ اگرچہ ایک کا تعلق اس ذات سے ہے جو خالق ہے واجب ہے اور معبود ہے اور دوسرے کا تعلق اس شخصیت سے ہے جو مخلوق ہے ممکن ہے اور عابد ہے اس کے باوجود دونوں اجزاء کا وجود ایک دوسرے پر موقوف ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ توحید اور تعظیم ان ہی دو اجزاء کی تعبیر ہیں۔

بعض لوگ توحید اور تعظیم کو ایک دوسرے کے مغائر اور مخالف سمجھتے ہیں اور ہر وہ چیز جو تعظیم رسول کی مظہر ہو اس کو ''غیر اللہ کی عبادت'' کا نام دے کر ناجائز وحرام اور واجب الاجتناب قرار دیتے ہیں۔ مثلاً قیام تعظیمی صلوۃ وسلام روضہ انور کی حاضری کی غرض سے سفر روضہ انور کی طرف رخ کر کے بارگاہ الٰہی میں دعا' یہ اور ان جیسے متعدد امور جو بلاشبہ تعظیم رسول ﷺ کے عظیم شعائر ہیں ان کو وہ توحید کے خلاف قرار دے کر ناجائز اور شرک تک کا حکم لگانے سے گریز نہیں کرتے حتیٰ کہ وہ اس حد تک تعظیم سے گریزاں اور ہراساں نظر آتے ہیں کہ عبادت کے دوران تعظیم کے تصور کو بھی خلاف توحید سمجھتے ہیں۔

چنانچہ وہابیوں اور دیوبندیوں کے پیشوا اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ''تقویۃ الایمان'' میں تعظیم رسول ﷺ کے کئی شعائر اور علامات کو شرک کا نشان قرار دے کر انہیں واجب الاجتناب ٹھہرایا ہے۔ کہیں تو انہوں نے کسی کے آگے ادب سے کھڑے ہونے کو شرک قرار دیا اور کہیں یہ لکھا کہ انبیاء واولیاء جتنے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی۔ مگر اللہ نے ان کو بڑائی دی' وہ بڑے بھائی ہوئے ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم کیا ہے' ہم ان کے چھوٹے ہیں۔ سو ان کی تعظیم انسان کی سی کرنی چاہیے نہ خدا کی سی۔ (کہیں لکھا کہ:) کوئی جانور ہو کسی مخلوق کے نام کا کر دیجئے ولی کا یا نبی کا' باپ کا یا دادا کا' بھوت کا یا پری کا وہ سب حرام اور ناپاک' اور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ (اور کہیں لکھا کہ:) کسی بزرگ کی تعریف میں زبان سنبھال کر بولو اور جو بشر کی تعریف ہو سو وہی کرو سو اس میں بھی اختصار کرو اور اس میدان میں منہ زور گھوڑے کی طرح نہ دوڑو کہ کہیں اللہ کی جناب میں بے ادبی نہ ہو جائے۔ (تقویۃ الایمان' فصل رابع وخامس ص ۵۹۔۴۱ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی' سن طباعت ۱۹۷۶ء)

یہی نہیں بلکہ اپنی دوسری کتاب صراط مستقیم میں مزید آگے بڑھکر یہاں تک لکھ دیا کہ:

"از وسوسہ زنا خیال مجامعت زوجہ خود بھتر است وصرف ھمت بسوئے شیخ وامثال آں از معظمیں گو جناب رسالتمآب باشند بچندیں مرتبہ بدتر از استغراق در صورت گاؤ خر خود است" یعنی زنا کے خیال سے اپنی بیوی سے جماع کا خیال بہتر ہے اور ان جیسے معظمین خواہ جناب رسالت مآب ﷺ ہی ہوں، کی طرف اپنی توجہ کو لگا دینا اپنے بیل اور گدھے کے تصور میں ڈوبنے سے کہیں زیادہ برا ہے۔

(صراط مستقیم ص ۸۶، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۳۳۰)

ہم ان تمام قبیح و شنیع، مطرود اور گستاخانہ عبارات و نظریات سے اللہ عزوجل کی پناہ طلب کرتے ہیں اور خاتمہ بالخیر کی دعا کرتے ہیں اور ایسی توحید سے عافیت اور سلامتی طلب کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے محبوب اعظم ﷺ کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہو اور ان کی اذیت کا باعث ہو۔

مذکورہ عبارات میں بزعم خویش توحید کا پرچار کیا گیا ہے اور لوگوں کو بارگاہ الٰہی کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے لیکن پس پردہ تعظیم رسول ﷺ کے نظریہ کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ بعینہٖ اسی روش کی پیروی ہے جس کی بنیاد شیطان نے رکھی تھی کہ جب شیطان سمیت تمام فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سوائے شیطان کے تمام فرشتے جھک گئے۔ شیطان نے تکبر کیا اور جھکنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے زعم کے مطابق توحید پر قائم تھا کہ صرف خدا کے آگے جھکنا چاہیے اور فرشتے اس نظریہ پر قائم تھے کہ ہم خدائے وحدہ لاشریک ہی کے حکم سے آدم کی تعظیم کر رہے ہیں۔ اور جب خدا نے خود اپنے خلیفہ کے حضور جھکنے کا حکم دیا ہے تو یہ خلاف توحید نہیں ہو سکتا۔ سو فرشتے اپنی توحید مع التعظیم سے ہمیشہ کیلئے مقبول ہو گئے اور شیطان اپنی انفرادی توحید سے مردودِ بارگاہ اور راندۂ درگاہ ہو گیا۔

(مفاہیم یجب ان تصحح ص ۹۱)

ہماری اس گفتگو سے یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ توحید اور تعظیم دو مستقل حقیقتیں ضرور ہیں لیکن باہم ایک دوسرے کے منافی اور مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ توحید بغیر تعظیم کے اور تعظیم بغیر توحید کے ناتمام اور نامکمل ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ توحید کے کیسے عظیم داعی اور علم بردار تھے "والذین امنوا اشد حبا للہ" کے

کیسے بے مثال مظہر تھے اور مشرکین سے اور ان کے شرک سے کس قدر عداوت رکھنے والے تھے اس کے باوجود وہ اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کی کس قدر تعظیم و توقیر اور ادب و احترام کیا کرتے تھے اس کا اندازہ صلح حدیبیہ کے موقع پر رونما ہونے والے مناظر سے کیا جا سکتا ہے جن کی عکاسی حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے قریش کے سامنے ان الفاظ میں کی:

''أی قوم! واللّٰہ لقد و فدت علی الملوك ووفدت علی قیصر و کسری والنجاشی. واللّٰہ ان رأیت ملکا قط یعظمه اصحابه ما یعظم اصحاب محمد ﷺ محمدا ان تنخم نخامة الا وقعت فی کف رجل منهم فدلك بهاوجهه واذا امرهم ابتدروا امره واذا توضا کادوا یقتتلون علی وضوئه واذا تکلم خفضوا اصواتهم عنده وما یحدون الیه النظر تعظیما له''.

(صحیح البخاری: ۱: ۳۷۹)

اے میری قوم! خدا کی قسم میں کئی بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں خصوصاً قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں لیکن بخدا! میں نے کسی بادشاہ کے دربار میں ایسی تعظیم نہیں دیکھی جیسی تعظیم (سیدنا) محمد ﷺ کے اصحاب اپنے نبی کی کر رہے تھے۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ جب (سیدنا) محمد ﷺ تھوکتے تو وہ کسی نہ کسی صحابی کے ہاتھ میں گرتا تھا جس کو وہ اپنے چہرے اور جلد پر مل لیا کرتا۔ اور جب بھی وہ اپنے اصحاب کو کسی کام کا حکم دیتے تو حکم بجالانے میں سب ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور جب وہ وضو کرتے تو سب ان کے وضو کے بچے ہوئے پانی پر جھپٹ پڑتے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو مار ڈالنے کے قریب ہو جاتے۔ اور جب وہ گفتگو فرماتے تو سب اپنی آوازیں ان کے سامنے پست کر لیتے' اور تعظیم کی وجہ سے کوئی انہیں آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔

اس عبارت سے یہ بات بالکل عیاں اور بیاں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آقائے دو جہاں ﷺ کی بے حد تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے اور ان پر ہمہ وقت تعظیم کا غلبہ رہتا تھا۔ حتیٰ کہ ہر وہ چیز جس کو سرکار سے نسبت ہوتی تھی اس کو وہ اپنی جان پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن کسی وقت بھی انہوں نے اس تعظیم کو عقیدۂ توحید کے معارض یا منافی یا اس سے متصادم نہ سمجھا' بلکہ ہمیشہ اس کو ایمان کا مدار اور اساس جان کر اپنی زندگی کا حصہ اور معمول بنائے رکھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جہاں خالص عقیدۂ توحید کے اظہار کیلیے نماز یا اور اس جیسی دیگر عبادات کا موقع آتا تھا وہاں بھی وہ تعظیم رسول ﷺ ترک نہیں کرتے تھے اور عین توحید کے ساتھ عین تعظیم کا عملی نمونہ پیش کرتے تھے۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایام مرض میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امامت کیلیے مقرر فرمایا۔ اس میں ایک دن جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت میں محوِ نماز تھے، سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے حجرۂ مبارکہ سے پردہ اٹھایا اور اپنے جانثاروں کی جماعت کو دیکھنے لگے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور ایسا لگ رہا تھا جیسے قرآن کریم کا ورق ہو۔ (یعنی آپ کا چہرہ بہت زیادہ دمک رہا تھا اور آپ بے حد مسرور تھے) پھر رسول اللہ ﷺ مسکرانے لگے۔ سرکار کے دیدار سے ہماری خوشی کی کیفیت یہ ہوگئی کہ ہم نے نماز توڑنے کا ارادہ کرلیا (لیکن ہم نماز میں مشغول رہے) پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مصلی امامت سے پیچھے ہٹنے لگے لیکن سرکار نے اشارہ فرمایا کہ اپنی نماز مکمل کرو۔ پھر آپ نے پردہ گرادیا اور اسی دن آپ کا وصال ہوا۔

(صحیح بخاری: ۶۸۰، صحیح مسلم: ۴۱۹)

مقام غور ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو عبادت میں محویت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے انہوں نے اپنی نماز میں کس طرح محسوس کرلیا کہ رسول اللہ ﷺ پردہ اٹھا کر انہیں دیکھ رہے ہیں، جب کہ سرکار کا حجرہ مبارکہ قبلہ کی بائیں جانب ہے۔ پھر نماز کے دوران صحابہ کرام کا خوشی اور مسرت میں اس قدر خود رفتہ ہونا کہ نماز توڑنے کا ارادہ کرلینا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو یقیناً تمام صحابہ میں سب سے زیادہ محویت کا مقام رکھتے تھے ان کا مصلی امامت سے پیچھے ہٹنا، یہ تمام باتیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس طرح عام حالات میں تعظیم رسول ﷺ کے مجسم پیکر نظر آتے تھے اسی طرح نماز میں بھی ان کی توجہات کا مرکز و محور سرکار ہی کی ذات ہوتی تھی۔ وہ اپنی نمازوں میں سرکار کی تعظیم اور ادب و احترام کو عبادت اور توحید کا حصہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے سرکار نے صحابہ کی وارفتگی اور شوق دید کو جب بڑھتے ہوئے دیکھا تو صرف اس بات کا اشارہ فرما کر

تشریف لے گئے کہ "اتموا صلاتکم" (اپنی نماز مکمل کرو) اگر صحابہ کرام کی دوران نماز وارفتگی اور تعظیم رسول (العیاذ باللہ) شرک ہوتی یا نماز کے فاسد ہونے کا باعث ہوتی تو آپ "اتموا" کا اشارہ نہ دیتے بلکہ فرماتے: "اعیدوا صلاتکم" (اپنی نماز دوبارہ پڑھو) لیکن سرکار نے نماز کے اس حصہ کو جس میں عملاً تعظیم رسول کا مظاہرہ ہوا اس کو بر قرار رکھا اور ہمیشہ کیلیے اس بات کی توثیق فرمادی کہ تعظیم توحید کے خلاف یا اس سے متصادم نہیں ہے۔

مذکورہ جو واقعہ ذکر کیا گیا اس سے چند روز قبل اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اس میں یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ دو صحابہ کے سہارے چلتے ہوئے مصلی امامت کی طرف تشریف لائے۔ کیفیت وہی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت میں محوِ نماز تھے۔ جب سیدنا صدیق اکبر نے آپ کے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو مصلی سے پیچھے ہٹنے لگے۔ نبی ﷺ نے انہیں اپنی جگہ پر قائم رہنے کا اشارہ فرمایا' پھر آپ تشریف لائے اور حضرت ابوبکر کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔ اب منظر یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر۔ اور حضرت ابوبکر آپ کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے اور صحابہ کرام حضرت ابوبکر کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے۔

(صحیح بخاری' رقم الحدیث ۷۱۳' صحیح مسلم' رقم الحدیث ۴۱۸' مشکوٰۃ المصابیح' رقم الحدیث ۱۱۴۰ ص ۱۰۲)

شارح مشکوٰۃ حضرت مفتی احمد یار خان نعیمی قدس سرہ العزیز اس واقعہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان نمازوں میں تمام صحابہ خصوصاً صدیق اکبر کا منہ کعبہ کی طرف تھا اور دل حضور ﷺ کی طرف۔ زبان قرآن میں مصروف تھی اور کان جناب مصطفیٰ علیہ السلام کی طرف۔ اس سے ان کی نماز زیادہ کامل ہوئی۔ ورنہ نماز کے خشوع میں کسی کی آہٹ کیسے سنی جا سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ صدیق اکبر عین نماز میں خصوصاً حضور ﷺ کا ادب کرتے تھے کہ ادباً پیچھے ہٹ کر مقتدی بننے لگے کہ یہ ادب شرک نہ تھا بلکہ کمال توحید۔

(مرآۃ المناجیح ج ۲ ص ۱۹۶)

ہماری اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ توحید اور تعظیم کا کسی جگہ بھی حتی کہ نماز میں' جمع ہو جانا شرک نہیں ہے۔ حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی

امامت میں اپنے تہجد کی نماز کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی آپ نے اس نماز میں اتنا طویل قیام فرمایا کہ میں نے ایک بری بات کا ارادہ کیا کہ حضور کو قیام میں چھوڑ کر بیٹھ جاؤں۔ (لیکن میں نے ایسا نہیں کیا)۔ (صحیح بخاری رقم الحدیث ۱۱۳۵ ' صحیح مسلم رقم الحدیث ۷۷۳)

مستند و معتمد شارحین نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا دوران نماز نہ بیٹھنا رسول اللہ ﷺ کے ادب اور احترام کے پیش نظر تھا۔ (تفصیل کیلیے دیکھیے: شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۳۱) لہٰذا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فعل سے بھی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ توحید اور تعظیم قطعاً ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عین توحید کے ساتھ عین تعظیم کو جمع کرنا صحابیٔ رسول ﷺ کا طریقہ ہے۔ لہٰذا اس کو شرک یا خلاف توحید قرار دینا دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات پر طعن کرنا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

رسول اللہ ﷺ کی بشریت اور نورانیت کے منکر کا حکم

سوال:

زید نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ کی بشریت کا انکار کرنے پر کفر لازم آتا ہے مگر نورانیت کا انکار کرنے پر کفر لازم نہیں آتا؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی رو سے مفصل طور پر بیان فرمائیں کہ ایسا کہنا درست ہے یا نہیں؟ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے جیسا بشر کہنا کیسا ہے؟ [سائل: محمد زاہد اسکاؤٹ کالونی]

جواب:

یہ بات درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بشریت کا انکار کفر ہے' لیکن ظاہر ہے کہ کوئی صاحب ایمان اس کا انکار نہیں کرتا۔ اہلِ ایمان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات میں نورانیت اور بشریت دونوں کا اجتماع ہے وہ آیات مبارکہ جن میں نبی اکرم ﷺ کے بشر ہونے کا ذکر ہے ان کی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ کو اپنے جیسا بشر کہنا گستاخی اور بے ادبی ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ کو اپنے جیسا بشر کہنا

کافروں اور منکروں کا طریقہ ہے۔ ذیل میں ہم چند آیات کا ذکر کر رہے ہیں:

سورۂ ھود میں فرمایا کہ کافروں نے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے جیسا بشر کہا: ''فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا''۔ نوح کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ ہم تو آپ کو اپنے ہی جیسا بشر سمجھتے ہیں۔ (ھود: ۲۷) سورۃ المومنون میں فرمایا کہ کافروں نے حضرت ھود علیہ السلام کو اپنے جیسا بشر کہا: ''مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ''۔ (کافر سرداروں نے قوم کے لوگوں سے کہا کہ ھود) تم جیسا ایک بشر ہے جو کچھ تم کھاتے ہو وہ بھی کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہ بھی پیتا ہے۔ (المومنون: ۳۳) سورۃ الشعراء میں فرمایا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کو منکرین نے اپنے جیسا بشر کہا: ''وما انت الا بشر مثلنا''۔ (اے شعیب) آپ ہم جیسے بشر ہیں۔

(الشعراء: ۱۸۶)

اس طرح کئی آیات میں قرآن کریم نے اس حقیقت کو بیان فرمایا کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے ساتھ کافروں اور مشرکوں کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ وہ انہیں اپنے جیسا بشر اور اپنی مثل انسان قرار دیتے ہیں جب کہ اہلِ ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ فقط بشر کہتے ہیں، نہ اپنی مثل بشر کہتے ہیں بلکہ افضل البشر اور خیر البشر کہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کریم میں جو کہلوایا گیا کہ ''قل انما انا بشر مثلکم'' (آپ کہیے کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں) اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے علم و قدرت کے چند معجزات دکھائے، مردے زندہ کیے، مٹی سے پرندے بنائے تو عیسائیوں نے ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہہ دیا جب کہ ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''ما کان و ما یکون'' (گزشتہ و آئندہ) کی خبریں دیں۔ آپ کی برکت سے درخت میں جان پڑ گئی اس نے آپ کے پاس آ کر آپ کی رسالت کی گواہی دی، چاند دو ٹکڑے ہوا، ڈوبا سورج پلٹ آیا، جانوروں نے کلام کیا، اس طرح کے بے حد و حساب معجزات آپ سے صادر ہوئے اس لیے خطرہ تھا کہ فرطِ عقیدت میں آپ کی امت بھی آپ کے بارے میں غیر معتدل اور باطل نظریئے کا شکار نہ ہو جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ اپنی زبان سے خود کہہ دیں کہ میں صرف بشر ہوں (یعنی خدا نہیں ہوں) اس سے یہ سمجھنا کہ معاذ اللہ نبی اکرم

ﷺ ہم جیسے بشر ہیں اور ہماری مثل ہیں یہ قطعاً درست نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا: ''لست کاحد منکم'' میں تم میں سے کسی کی مثل نہیں ہوں' ایک روایت میں فرمایا: ''ایکم مثلی ؟'' تم میں سے کون شخص میری مثل ہوسکتا ہے؟' ایک روایت میں فرمایا: ''انی لست کھیئتکم'' میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری: ۱۹۶۱۔ ۱۹۶۵۔ ۱۹۶۳' صحیح مسلم: ۱۱۰۴)

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مخلوق میں کسی کو برابری حاصل نہیں ہے۔ اور جہاں فرمایا کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں وہاں تواضع اور عاجزی کے طور پر یا یہ بتانے کے لیے کہ میں بشر ہوں خدا نہیں ہوں۔ لہٰذا نبی پاک ﷺ کو اپنی مثل بشر ٹھہرانا کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے البتہ جو شخص سرے سے نبی ﷺ کی بشریت کا منکر ہو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور جو آپ ﷺ کی نورانیت کا منکر ہو وہ شدید گمراہ ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

رسول اللہ ﷺ کو دُرِّ یتیم کہنے کا حکم

سوال:

رسول اللہ ﷺ کو دُرِّ یتیم کہنا جائز ہے یا نہیں؟ [سائل: فرحان احمد قادری' لانڈھی]

جواب:

حضور پرنور سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ کو دُرِّ یتیم کہنا شرعاً جائز ہے۔ ''دُرّ'' موتی کو کہتے ہیں اور ''یتیم'' ایسی چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ذات میں منفرد' یکتا اور بے مثال ہو۔ علامہ قرطبی مالکی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''اصلہ الانفراد یقال صبی یتیم ای منفرد من ابیہ و بیت یتیم ای لیس قبلہ ولا بعدہ شئی من الشعر ودرۃ یتیمۃ لیس لھا نظیر''۔ یعنی یتیم کا لفظ یُتم سے ماخوذ ہے' اس کا بنیادی معنی ہے: منفرد اور یکتا ہونا۔ جو بچہ اپنے باپ سے جدا ہوجائے اسے یتیم کہا جاتا ہے اور ایسا منظوم کلام جس کے آگے پیچھے مزید اشعار نہ ہوں اس کو بیتِ یتیم کہتے ہیں اور ایسا موتی جو بے مثال ہو اس کو دریتیم کہتے ہیں۔ (تفسیر القرطبی' البقرۃ: ۸۳)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''الیتم وھو الانفراد ومن

هنا یطلق علی کل شئی عزّ نظیره ومنه الدرة الیتیمة"۔ یعنی یتیم "یُتْم" سے ماخوذ ہے اس کا بنیادی معنی ہے: منفرد اور یکتا ہونا۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جس کی مثال کا ملنا دشوار ہو۔ جیسے بے مثال موتی کو درِ یتیم کہا جاتا ہے۔
(روح المعانی، النساء: ۲)

ان عبارات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دُرِ یتیم میں یتیم کا لفظ بے مثال کے معنی میں ہے، یعنی ایسا موتی جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو درِ یتیم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار اور ہر جہت سے مخلوق کے ہر ہر فرد پر بے مثالی کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے فرمایا: "لست کاحد منکم" "میں تم میں سے کسی کی مثل نہیں ہوں۔ (صحیح البخاری: ۱۹۶۱)

بے مثالی کے اس بلند و بالا مرتبہ کی وجہ سے آپ کو دُرِ یتیم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ علامہ صاوی مالکی علیہ الرحمۃ کمالِ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں: "الیتم وهو لغة الانفراد ومنه الدرة الیتیمة بمعنی عدیمة المثیل ومنه یتم سید الکائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم"۔ یتیم کا لغوی معنی منفرد اور یکتا ہونا ہے، اسی معنی میں بے مثال موتی کو درِ یتیم کہتے ہیں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی اسی بے مثالی کی وجہ سے یتیم کی صفت سے متصف کیا جاتا ہے۔ (تفسیر صاوی، النساء: ۲) واللّٰہ ورسوله اعلم بالصواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم پر مخالفین کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

سوال:

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اعلان نبوت سے پہلے کتاب اور ایمان کی معرفت نہیں تھی۔ ان کا استدلال اس آیت مبارکہ سے ہے کہ "ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان" "آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔
(الشوریٰ: ۵۲)

اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی

فرمائیں۔ [سائل: عابد سلطانی، گلشن اقبال، کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو اعلان نبوت سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں پر اس کا کھلا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب نبوت کا اعلان کیا جاتا ہے۔

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی المالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**الصواب انهم معصومون قبل النبوة من الجهل بالله وصفاته والتشكك في شئ من ذالك**"۔ صحیح بات یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام قبل نبوت بھی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کو نہ جاننے اور اس میں شک کرنے سے معصوم ہوتے ہیں۔ (تفسیر القرطبی ج ۱۶ ص ۳۷)

رہی یہ بات کہ قرآن کریم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے فرمایا "**ما كنت تدرى ما الكتاب ولا الايمان**" سو جاننا چاہیے کہ اس آیت کی علماء مفسرین نے کئی توجیہات کی ہیں۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر میں کم و بیش دس توجیہات ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں ایک توجیہ یہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں تفصیلات کا نہ جاننا مراد ہے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کے اعلان سے قبل کتاب اور ایمان کو جانتے تھے لیکن ان کی تفصیلات کا علم آپ کو بعد میں عطا کیا گیا۔ ایک توجیہ یہ ذکر کی ہے کہ اس آیت کا معنی ہے: "**ما كنت تدرى ما الكتاب لولا انعامنا عليك ولا الايمان لولا هدايتنا لك**" اگر ہمارا انعام آپ پر نہ ہوتا تو آپ کتاب کو نہ جانتے اور ہماری جانب سے آپ کے لیے رہنمائی نہ ہوتی تو آپ ایمان کو نہ جانتے (لیکن چونکہ آپ پر ہمارا انعام بھی ہے اور ہماری رہنمائی بھی اس لیے آپ کتاب اور ایمان دونوں سے باخبر ہیں)۔

آخر میں علامہ قرطبی اپنا موقف اور مزید ایک قول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"**الصحيح انه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كان مؤمنا بالله عزوجل من حين نشأ الى حين بلوغه على ما تقدم. وقيل ما كنت تدرى ما الكتاب ولا الايمان اى كنتم قوم اميين لا يعرفون الكتاب ولا الايمان.**

(تفسیر قرطبی ج ۱۶ ص ۳۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

صحیح بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پیدائش سے لیکر بلوغ تک کے پورے عرصہ میں اللہ عزوجل کی ذات پر ایمان والے رہے۔ اور ایک قول کے مطابق ''ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان'' کا معنی یہ ہے کہ (اے محبوب ﷺ!) آپ ایسی ان پڑھ قوم میں تھے جو نہ کتاب کو جانتی تھی نہ ایمان کو۔

یعنی نبی اکرم ﷺ کتاب اور ایمان سے واقف تھے' آپ کی قوم واقف نہیں تھی۔

بعض دیگر علماء نے زیر بحث آیت پر یوں تحقیق فرمائی ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''ماکنت تعلم'' آپ کتاب اور ایمان کا علم نہیں رکھتے تھے' بلکہ فرمایا ''ماکنت تدری'' آپ کتاب اور ایمان کی درایت نہیں رکھتے تھے۔ درایت کا معنی ہے: کسی چیز کو اپنی عقل سے جاننا۔ (دیکھئے تاج العروس وغیرہ) اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ (اے محبوب ﷺ) آپ از خود یہ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ اس ترجمہ کی صورت میں نبی اکرم ﷺ کے علم پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی بھی شخص از خود کسی چیز کو نہیں جانتا۔ جس کو جو علم ہوتا ہے وہ اللہ عزوجل کی عطاء سے ہوتا ہے۔ اس لیے جب مذکورہ آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ ''آپ از خود نہیں جانتے تھے'' تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ اللہ کی عطاء سے جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس میں دعا کے ذریعہ تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟

سوال:

لوحِ محفوظ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو دعا کے ذریعے تبدیل کرنا ممکن ہے کہ نہیں؟ [سائل: تاج الدین سعیدی' کراچی]

جواب:

علی العموم علماء ومفسرین کا رجحان اس طرف ہے کہ لوحِ محفوظ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس میں تبدّل وتغیّر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''یمحو اللہ مایشاء

ویثبت وعندہ امّ الکتاب"۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور برقرار رکھتا ہے اور امّ الکتاب (اصل لکھا ہوا) اسی کے پاس ہے۔ (الرعد:۳۹)

علامہ علاؤالدین خازن البغدادی علیہ الرحمۃ اس آیت مبارکہ کے تحت "ام الکتاب" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اصل الکتاب وهو اللوح المحفوظ الذی لایغیر ولایبدّل. وسمّی اللّوح المحفوظ امّ الکتاب لان جمیع الاشیاء مثبتة فیه وقال ابن عبّاس: هما کتا بان کتاب یمحو اللّٰه منه مایشاء ویثبت مایشاء وامّ الکتاب الذی لایغیّر شیء منها". (تفسیر الخازن ج ۳ ص ۲۴ 'الرعد:۳۹)

آیت مبارکہ میں امّ الکتاب کا معنی ہے: اصل لکھا ہوا۔ مراد اس سے لوح محفوظ ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لوح محفوظ کو اللہ نے ام الکتاب اس لیے قرار دیا کہ اس میں تمام چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کتابیں دو قسم کی ہیں' ایک وہ جس میں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے اور دوسری کتاب ام الکتاب ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔

بعض مفسرین نے یہ قول فرمایا ہے کہ لوح محفوظ میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ (تفسیر القرطبی' الرعد:۳۹) اس کی تائید ان واقعات سے ہوتی ہے جن میں لوح محفوظ کا اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے پیش نظر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ڈاڑھی منڈے کو دیکھ کر "کلّا سوف تعلمون" پڑھنا

سوال:

زید نے کسی ڈاڑھی منڈے شخص کے لیے کہا کہ وہ "کلّا سوف تعلمون" ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کے ان کلمات پر شرعاً کیا حکم ہے؟ یہ کفر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو تجدید ایمان کے ساتھ ساتھ تجدیدِ نکاح و بیعت بھی کرنی ہوگی یا نہیں؟ جواب شافی عنایت

فرما کر ممنون فرمائیں۔[سائل: مجیب الرحمٰن نوری، لانڈھی]

جواب:

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام ہے۔اس کی ہر ہر آیت، اپنے تمام الفاظ و حروف سمیت نہایت قابلِ احترام اور لائقِ تعظیم ہے۔اپنے نزول کا مقصد خود قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا: ''هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ'' (آل عمران:۱۳۸) یعنی یہ کتابِ مقدس لوگوں کے لیے واضح بیان اور متقین کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔دوسرے مقام پر فرمایا: ''كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ'' (ص:۲۹) اس کتاب مبارک کو رحمتِ کائنات ﷺ پر اس لیے نازل فرمایا تا کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں۔

فی زمانہ یہ وباء عام ہو چکی ہے کہ کلام الٰہی کی آیتوں میں غور و فکر کرنے اور ان سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے لوگ آیتوں کے ذریعے ہنسی مذاق اور مسخرہ پن کرتے ہیں۔اور انہیں محض ہنسنے ہنسانے کے لیے بے موقع و بے محل استعمال کر دیتے ہیں۔نہ صرف یہ بلکہ منع کرنے پر بلا جھجک کہہ دیتے ہیں ''اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارا ارادہ یہ تھا ہی نہیں'' وغیرہ وغیرہ۔گویا ایک خرابی تو یہ ہوئی کہ قرآن کریم کی آیت کو ذریعۂ مذاق بنایا اور دوسرا یہ کہ آیت کو غلط مقام پر استعمال کر کے کلام الٰہی میں معنوی تبدیل و تحریف سے کام لیا۔اس پر مستزاد یہ کہ آیت کے ذریعے مذاق کو اس قدر ہلکا جانا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔قرآن حکیم ان تمام باتوں کی ممانعت کرتا ہے۔ارشاد ربانی ہے: ''وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا'' (البقرۃ:۲۳۱) یعنی اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ''اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ'' (النساء:۱۴۰) یعنی جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو۔

علامہ قرطبی مالکی علیہ الرحمۃ اس آیت مبارکہ کے تحت لکھتے ہیں:

''كان المنافقون يجلسون الى احبار اليهود فيسخرون من القرآن (الى قوله) فدل بهٰذا على وجوب اجتناب اصحاب المعاصي اذا ظهر منهم منكر لان من لم يجتنبهم فقد رضي فعلهم والرضا بالكفر كفر''.

(تفسیر القرطبی ج ۵ ص ۳۹۷ وھکذا فی حاشیۃ الشہاب علی تفسیر البیضاوی ج ۳ ص ۳۷۵)

منافقین علمائے یہود کے ساتھ بیٹھ کر قرآن حکیم کے ساتھ مسخرہ پن کیا کرتے تھے۔ (آگے فرماتے ہیں:) پس یہ آیت دلیل ہے اس بات پر کہ نافرمانوں کی صحبت سے بچنا واجب ہے اس وقت جب کہ ان سے کوئی برائی ظاہر ہو۔ اس لیے کہ جو ان سے نہیں بچے گا تو گویا وہ ان کے فعل (کفر) سے راضی ہوا اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

علامہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ آیات قرآنیہ کو مذاقاً استعمال کرنا کفر ہے۔ اس لیے کہ آیات کو مذاقاً استعمال کرنے سے ان کا استخفاف (ہلکا سمجھنا) لازم آتا ہے۔ اور قرآن کریم کی کسی بھی آیت کو ہلکا جاننا یقیناً اس آیت کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ علامہ عبدالعزیز پرہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''**الاستحلال او الاستخفاف ان حملا علی ظاھرھما فھما عین التکذیب**''۔ کسی چیز کو حلال یا ہلکا جاننے سے اگر ظاہری معنی مراد لیا جائے تو یہ دونوں چیزیں در حقیقت عینِ تکذیب ہیں۔ (النبراس شرح العقائد النسفیہ ص ۲۷۲)

اسی طرح اعلیٰ حضرت امام اہل سنت نور اللہ مرقدہ' ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: اگر عیاذاً باللہ استخفاف و تحقیر کی نیت ہو تو صریح کفر ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۲۴۴)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں قائل کا ڈاڑھی منڈے کو دیکھ کر قرآن کریم کی آیت ''**کلا سوف تعلمون**'' پڑھنا آیت مبارکہ کے ساتھ مذاق اور اس کے غلط استعمال کی نشاندہی کرتا ہے' جو کہ کفر ہے۔ چنانچہ خلیفہ اعلیٰ حضرت علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''قرآن کی کسی آیت کو عیب لگانا یا اس کی توہین کرنا یا اس کے ساتھ مسخرہ پن کرنا کفر ہے۔ مثلاً ڈاڑھی منڈانے سے منع کرنے پر اکثر ڈاڑھی منڈے کہہ دیتے ہیں ''**کلا سوف تعلمون**'' جس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ''کلا'' صاف کرو۔ یہ قرآن مجید کی تحریف و تبدیل بھی ہے اور اس کے ساتھ مذاق اور دل لگی بھی۔ اور یہ دونوں باتیں کفر۔ اسی طرح اکثر باتوں میں قرآن مجید کی آیتیں بے موقع پڑھ دیا کرتے ہیں اور مقصود ہنسی کرنا ہوتا ہے''۔

(بہار شریعت حصہ ۹ ص ۸۷)

مندرجہ بالا تمام اقتباسات کی روشنی میں قائل پر اپنے فعل سے توبہ' تجدید ایمان اور (اگر شادی شدہ ہے تو) تجدید نکاح لازم ہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرے تو لوگوں پر

لازم ہے کہ وہ اس کا مکمل بائیکاٹ کریں۔ "کما صرح بہ علماء اهل السنة فی اسفارهم". واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

نماز کے علاوہ درودِ ابراہیمی پڑھنے کا شرعی حکم

سوال:

زید کہتا ہے کہ درودِ ابراہیمی نماز کے علاوہ پڑھنا مکروہِ تحریمی و ناجائز ہے کیونکہ فقط درودِ ابراہیمی بغیر سلام کے پڑھنا قرآن مجید و حدیث کے خلاف ہے۔ اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے زید نے کئی دلائل دیئے ہیں۔ زید کا موقف یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے درود و سلام کا حکم صیغہ امر سے دیا ہے اس لیے درود بغیر سلام کے پڑھنا گناہ ہے۔ درود پڑھنا بھی واجب ہے اور سلام پڑھنا بھی واجب۔ نیز زید یہ کہتا ہے کہ بغیر سلام والا درود شریف پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے' کیونکہ بغیر سلام کے صرف درود شریف پر اقتصار کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔ فتاویٰ شامی ج ۱ ص نمبر ۲۰۰ پر ہے کہ مطلقاً مکروہ سے مراد ہمیشہ مکروہ تحریمی ہوتا ہے۔ اور نماز کے باہر درودِ ابراہیمی پڑھنا اس لیے منع ہے کہ اس درودِ ابراہیمی سے دو نقص پیدا ہوئے۔ (۱) ترکِ واجب لازم آیا کہ "سلموا" کے حکمِ وجوبی پر عمل نہ ہوا۔ (۲) یہ کہ آدھی آیت پر عمل ہوا' آدھی پر نہ ہوا' یہ حرکت کفار کی نشانی ہے۔ غرض یہ ہے کہ اصولی طور پر زید کی یہ گفتگو صحیح ہے یا نہیں؟ نیز درج ذیل سوالات کے جوابات قرآن و سنت کی روشنی میں تفصیل سے عنایت فرمائیں۔

(۱) کیا درود و سلام پڑھنا سورہ احزاب کی آیت کی رو سے واجب ہے یا نہیں اور اگر واجب ہے تو عمر میں ایک مرتبہ یا روز یا ہر وقت؟ (۲) کیا درودِ ابراہیمی ناقص ہے؟ (۳) کیا مطلقاً مکروہ سے مراد ہمیشہ مکروہِ تحریمی ہوتا ہے؟ (۴) کیا درودِ ابراہیمی نماز کے علاوہ پڑھنا ناجائز ہے؟

براہِ کرم جواب جلد از جلد روانہ فرمائیں تاکہ ذہنی خلجان دور ہو۔

[سائل: محمد ظفر رضوی' حیدر آباد]

جواب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر دو یا دو سے زائد احکامات ایک ساتھ

بیان فرمائے ہیں' لیکن ان میں کہیں بھی احناف یہ موقف اختیار نہیں کرتے کہ ان احکامات پر بیک وقت عمل کرنا واجب ہے اور اس کے خلاف کرنا مکروہِ تحریمی یا حرام ہے۔ احناف کا اصول یہ ہے کہ واؤ مطلق جمع کے لیے آتا ہے۔ یعنی جب دو چیزوں کو واؤ کے ذریعہ ایک ساتھ بیان کیا جائے تو ان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان دونوں پر ایک ساتھ عمل کیا جائے' بلکہ علیحدہ علیحدہ عمل کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ'' (البقرۃ:۴۳) نماز قائم کرو اور زکوۃ دو' نیز فرمایا: ''اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًاO وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا'' (الاحزاب:۴۱۔۴۲) کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرو۔

مذکورہ دونوں آیات میں کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ نماز اور زکوۃ کو ایک ساتھ ادا کرنا ضروری ہے اور اللہ عز و جل کا ذکر اور تسبیح (صبح و شام) ایک ساتھ کرنا ضروری ہے۔ سو اسی طرح الاحزاب کی آیت ۵۶ میں جو حکم دیا گیا کہ ''صلوا علیه وسلموا تسلیما'' اس میں بھی یہی کہا جائے گا کہ نبی ﷺ پر درود اور سلام دونوں پڑھو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کو ایک ساتھ ادا کرو۔ اگر کوئی شخص ایک وقت میں صلوٰۃ پڑھتا ہے اور دوسرے وقت میں سلام پڑھ لیتا ہے تو شرعاً یہ ممنوع نہیں ہے۔ اگر آیت مذکورہ (الاحزاب:۵۶) میں یہ صراحت ہوتی کہ درود اور سلام دونوں کو ایک ساتھ پڑھو تو پھر کہا جاتا کہ ان کو علیحدہ کرنا حکمِ قرآن کے خلاف ہے' لیکن آیت میں اس طرح کی نہ کوئی صراحت ہے نہ اشارت' لہٰذا احناف کے اصول کے مطابق ''صلّوا'' اور ''سلّموا'' کے حکم پر علیحدہ علیحدہ عمل کرنا جائز ہوگا۔

علامہ ابوالفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی حنفی بغدادی متوفی ۱۲۷۰ھ الاحزاب:۵۶ کی تفسیر میں زیر بحث مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وعندی ان الاستدلال بالایة علی کراهة الا فرار حسبما سمعت فی غایة الضعف اذ قصاری ما تدل علی ان کلا من الصلٰوة والتسلیم مامور به مطلق ولا تدل علی الامر بالاتیان بهما فی زمان واحد کان یؤتی بهما مجموعین معطوفا احدهما علی الاخر فمن صلّی بکرة وسلّم عشیا مثلا فقد

امتثل الامر فانها نظير قوله تعالٰی :"اقيموا الصلٰوة واٰتوا الزكٰوة" "واذكروا الله ذكرا كثيرا وسبحوه" الى غير ذالك من الاوامر المتعاطفة نعم درج اكثر السلف على الجمع بينهما فلا استحسن العدول عنه مع ما فى ذكر السلام بعد الصلٰوة من السلامة من توهم لايكاد يعرض الا للاذهان السقيمة كما لايخفى". (تفسیر روح المعانی' الاحزاب:۵۶' تبیان القرآن ج۹ ص۵۴۹)

یعنی الاحزاب:۵۶ سے یہ استدلال کرنا کہ "صلوۃ اور سلام کو علیحدہ پڑھنا مکروہ ہے" میرے نزدیک بہت ضعیف استدلال ہے۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ اس آیتِ مبارکہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ صلوۃ اور سلام دونوں کو پڑھنے کا مطلقاً حکم ہے۔ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ دونوں کو بیک وقت پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس طرح کہ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ لہٰذا جس شخص نے مثلاً صبح "صلوۃ" پڑھی اور شام کو "سلام" پڑھا تو یقیناً اس نے بھی آیتِ مبارکہ کے حکم پر عمل کیا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو" نیز یہ ارشاد کہ "کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور اس کی تسبیح بیان کرو" اور اس طرح کے دیگر احکامات جو ملا کر (ایک ساتھ) دیئے گئے ہیں۔ البتہ چونکہ اکثر بزرگانِ دین اس طرف گئے ہیں کہ صلوۃ اور سلام دونوں کو ایک ساتھ ادا کیا جائے اس لیے میں اس سے عدول کو اچھا نہیں سمجھتا خصوصاً اس لیے بھی کہ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ سلام پڑھنے میں ان شکوک وشبہات سے سلامتی مل جاتی ہے جو بیمار ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس عبارت سے ثابت ہوا کہ الاحزاب:۵۶ سے یہ استدلال بہت کمزور ہے کہ صلوٰۃ اور سلام کو علیحدہ پڑھنا مکروہ ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صلوۃ اور سلام کو ایک ساتھ پڑھنا چاہیے علیحدہ کر کے پڑھنا بہتر نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک بھی صحیح قول یہی ہے کہ صلوٰۃ اور سلام کو علیحدہ پڑھنا خلافِ اولیٰ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دونوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے۔ جن علماء نے اپنی کتب میں کراہت کا قول کیا ہے اس سے مراد بھی خلافِ اولیٰ ہے نہ کہ مکروہِ تحریمی۔ چنانچہ اسی بحث میں علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ امام نووی کا قول (یعنی صلوۃ اور سلام کو علیحدہ کر کے پڑھنا مکروہ ہے) کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ذكر العلامة ابن حجر الهيتمى ان الحق ان المراد بالكراهة

خلاف الاولٰی اذا لم یوجد مقتضیھا من النھی المخصوص ‘‘یعنی علامہ ابن حجر ہیتمی نے ذکر فرمایا ہے کہ کراہت کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ اس سے خلاف اولیٰ مراد ہوتا ہے جب کہ کسی خاص نہی سے کراہت ثابت نہ ہو۔

زیر بحث مسئلہ میں بھی صلوٰۃ اور سلام کو علیحدہ پڑھنے کی کراہت یا ممانعت کسی دلیلِ جلی و خفی سے ثابت نہیں ہے۔ اس کے باوجود علماء نے اس کو مکروہ لکھا ہے' لہٰذا اس سے خلافِ اولیٰ مراد لیا جائے گا' نہ کہ مکروہ تحریمی۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ صلوٰۃ اور سلام کو ایک ساتھ پڑھنا واجب اور لازمی نہیں ہے' بلکہ علیحدہ علیحدہ بھی پڑھا جاسکتا ہے تو یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نماز کے علاوہ درودِ ابراہیمی پڑھنا جائز ہے۔ البتہ یوں کرنا زیادہ بہتر ہے کہ نماز کے علاوہ جب درودِ ابراہیمی پڑھا جائے تو اس میں صلوٰۃ کے ساتھ سلام کے الفاظ بھی بڑھا دیئے جائیں۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوگیا کہ درودِ ابراہیمی بھی ایک درود ہے' اس کو ناقص نہیں کہنا چاہیے۔ اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ نماز کے علاوہ بھی درودِ ابراہیمی پڑھ سکتے ہیں۔ (تاہم اس بارے میں بعض مخالفین کی یہ روش بھی غلط ہے کہ وہ فقط ''درود ابراہیمی'' ہی کو درود قرار دیتے ہیں اور درود و سلام کے دیگر کلمات سے لوگوں کو منع کرتے ہیں' حالانکہ درود ابراہیمی کے علاوہ دیگر درود شریف (مثلاً درود تاج' درود تنجینا' درود رضویہ وغیرھا) پڑھنا بھی جائز ہیں اور بزرگان دین سے ثابت ہیں)۔

باقی رہا یہ کہ درود شریف پڑھنا کب واجب یا فرض ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی میں ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ اور جس مجلس میں سرکار ﷺ کا نام اقدس بار بار لیا جائے اس میں ایک مرتبہ درود شریف پڑھنا واجب ہے اور بار بار پڑھنا مستحب ہے۔

تنویر الابصار اور درمختار میں ہے: ''وھی فرض مرۃ واحدۃ فی العمر واختلف الطحاوی والکرخی فی وجوبھا کلما ذکر ﷺ والمختار عند الطحاوی تکرار الوجوب کلما ذکر ولو اتحد المجلس والمذھب استحباب التکرار و علیہ الفتوٰی''۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۲ ص ۱۹۹-۲۰۲)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں: عمر میں ایک بار درود

شریف پڑھنا فرض ہے۔ اور ہر جلسۂ ذکر میں درود شریف پڑھنا واجب' خواہ خود نام اقدس لے یا دوسرے سے سنے اور اگر ایک مجلس میں سو بار ذکر آئے تو ہر بار درود شریف پڑھنا چاہیے۔

(بہارِ شریعت حصہ ۳ ص ۵' مطبوعہ لاہور)

رہی یہ بات کہ مکروہ سے کیا مراد ہوتا ہے؟ سو علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

''اذا ذکروا مکروھا فلا بد من النظر فی دلیله فان کان نھیا ظنیا یحکم بکراھة التحریم الا لصارف للنھی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نھیا بل کان مفیدا للترك الغیر الجازم فھی تنزیھیة''۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹' تبیان القرآن ج ۷ ص ۸۲۵)

یعنی فقہاء جب مکروہ کا ذکر کریں تو اس کی دلیل میں غور کرنا ضروری ہے۔ اگر اس کی دلیل ظنی ممانعت ہو اور ممانعت کے خلاف پر کوئی قرینہ نہ ہو (مثلاً حضور ﷺ کا اس کام کو کرنا) تو وہ مکروہِ تحریمی ہے اور اگر کراہت کی دلیل میں کوئی صریح ممانعت نہ ہو بلکہ وہ دلیل اس فعل کے ظنی ترک کرنے کا فائدہ دے تو وہ مکروہِ تنزیہی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بلند آواز سے نعت خوانی کرنے کا شرعی حکم

سوال:

قرآن کریم کے پارہ ۲۶ سورۃ الحجرات: ۲ میں اہل ایمان کو حکم ہے کہ'' اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند نہ کیا کرو اور ان کے حضور اس طرح زور سے نہ بولا کرو جس طرح تم ایک دوسرے کے ساتھ زور سے بولتے ہو کہ کہیں (اس بے ادبی سے) تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے''۔

ایک طرف آیتِ مبارکہ ہے' دوسری طرف اہل سنت و جماعت کا معمول ہے کہ جب نعت شریف پڑھتے ہیں تو بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ حاضر و ناظر ہیں۔ کیا بلند آواز سے نعتیں پڑھنا مذکورہ آیت کی خلاف ورزی میں تو نہیں آتا؟ [سائل: محمد شہزاد قادری' لیاقت آباد]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الحجرات کی ذکر کردہ آیت میں اللہ عزوجل کا جو ارشاد ہے کہ "نبی کی آواز پر اپنی آوازیں بلند نہ کیا کرو اور ان کے حضور زور سے نہ بولا کرو" اس سے مراد ایسی آواز ہے جو نبی اکرم ﷺ کے لیے باعثِ اذیت اور موجبِ تکلیف ہو۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کو کسی بھی طرح تکلیف پہنچانا حرام اور گناہ ہے۔ اگر سورۃ الحجرات کی اس آیت کا مطلب یہ نکالا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کے حضور کوئی بھی کلام بلند آواز سے کرنا ممنوع ہے خواہ وہ باعثِ تکلیف ہو یا نہ ہو تو پھر پنج وقتہ نمازوں کی اذانیں، جمعہ کا خطبہ و خطاب، مختلف محافل میں نبی اکرم ﷺ کی عظمت کی تقاریر حتیٰ کہ قرآن کریم کی تلاوت و ترجمہ اور تفسیر و تشریح اور اس طرح کے تمام معاملات کو بلند آواز سے انجام دینا ممنوع اور ناجائز ہو جائے گا، حالانکہ کوئی معمولی عقل رکھنے والا بھی اس کا قائل نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں آیتِ مذکورہ کا یہی معنی لینا ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کے حضور وہ کلام بلند آواز سے ممنوع ہے جو آپ ﷺ کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لم يتناول النهي ايضا رفع الصوت الذى لايتأذى به رسول الله ﷺ وهو ما كان منهم فى حرب او مجادلة معاندا او أرهاب عدوا و ما اشبه ذالك ففى الحديث انه قال عليه السلام للعباس بن عبد المطلب لما انهزم الناس يوم حنين: اصرخ بالناس و كان العباس اجهر الناس صوتا".

(تفسیر قرطبی، ج ۱۶ ص ۲۰۲ مطبوعہ بیروت)

آیتِ مذکورہ میں جو ممانعت ہے وہ اس آواز کو شامل نہیں ہے جو نبی اکرم ﷺ کے لیے باعثِ اذیت نہ ہو کیونکہ جنگ میں یا دشمن سے لڑتے ہوئے یا اور دیگر مقامات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلند آواز سے کلام کیا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں ہے کہ غزوہ حنین کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے حضرت عباس سے فرمایا کہ تمام لوگوں کو آواز دیکر بلاؤ، اور حضرت عباس بہت بلند آواز والے تھے۔

علامہ اسماعیل حقی الحنفی، علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اور علامہ جار اللہ زمخشری نے بھی

اپنی تفاسیر میں یہی لکھا ہے۔

(روح البیان' ج ۹ ص ۷۷' روح المعانی ج ۱۳ ص ۴۰۳' الکشاف ج ۴ ص ۳۵۴)

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
بارگاہِ رسالت میں اگر کوئی اس طرح اونچا بولے گا جس سے خاطرِ عاطر کو اذیت پہنچے تو یہ منع ہے' لیکن ضرورت کے وقت بلند آواز سے بولنا منع نہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی موجودگی میں بلند آواز سے اذان دیتے تھے۔ جنگ میں بلند آواز سے نعرے لگائے جاتے' جنگ حنین میں حضور ﷺ نے حضرت عباس کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو بلائیں۔ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کی موجودگی میں بلند آواز سے اپنے قصائد سناتے تھے۔ الغرض نیت پر انحصار ہے۔ اسی پر بلند آواز سے مل کر درود شریف یا کوئی نعت پڑھنے کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (ضیاء القرآن' ج ۴ ص ۵۸۰)

مذکورہ عبارت میں جو کہا گیا کہ جنگ میں بلند آواز سے نعرے لگائے جاتے تھے' اس کی دلیل یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں صحابہ کرام مل کر یہ نعرہ لگاتے تھے: ''یا محمداہ''۔ امام ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر نے اسی طرح لکھا ہے۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۲۴۶' البدایہ والنھایہ ج ۶ ص ۳۲۴' بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۸۴)

سرکارِ دو عالم ﷺ کو بلند آواز کے ساتھ پکارنے پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک مرتبہ پیر سُن ہو گیا۔ ان سے کسی نے کہا کہ جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہو اس کو یاد کیجئے۔ ''فصاح یا محمداہ فانتشرت''۔ تو انہوں نے بلند آواز سے کہا: ''یا محمداہ''۔ ان کا پیر فوراً ٹھیک ہو گیا۔

(الشفاء ج ۲ ص ۱۸ بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۹۹۸)

ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ بلند آواز سے نبی اکرم ﷺ کو پکارنا' آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کرنا' نعتیں پڑھنا اور اس طرح کے تمام امور جائز ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سنت ہے۔ سورۃ الحجرات میں جو ممانعت ہے وہ اس کلام سے ہے جو نبی اکرم ﷺ کے لیے باعثِ تکلیف ہو۔ جہاں تک سائل کی اس بات کا تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ حاضر و ناظر ہیں اس کے باوجود بلند آواز سے نعتیں پڑھی جاتی ہیں' تو جاننا چاہیے کہ

''حاضر و ناظر'' سے یہ مراد نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جسم انور ہر جگہ ہر آن موجود ہے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ عطائے الٰہی سے اپنے روضۂ انور ہی میں پوری کائنات کو ملاحظہ فرماتے ہیں اور کائنات کے مختلف احوال کو آپ پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ اپنی کرم نوازی سے کسی مقام پر تشریف لے جانا چاہیں تو اس کے ممکن ہونے میں کلام نہیں ہے' جیسا کہ معراج کی شب انبیاء سابقین کا اپنی اپنی قبور سے نکل کر مسجد اقصیٰ میں جمع ہونا اور بعض انبیاء کا مختلف آسمانوں میں جلوہ گر ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی اپنی قبور سے کسی مقام پر حاضر ہو سکتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے: تبیان القرآن ج ۷ ص ۵۸۲' ج ۱۱ ص ۷۷ ۲) **واللہ و رسولہ اعلم بالصواب**

مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں افضل کون؟

سوال:

مکۃ المکرمۃ اور مدینۃ المنورۃ دونوں میں سے کون افضل ہے؟ زید کہتا ہے کہ عرشِ معلّٰی سے بھی افضل محبوب کا روضہ ہے؟ براہِ کرم اس مسئلے پر قرآن وسنت کی رو سے روشنی ڈالیں تا کہ دل میں جو وسوسہ پیدا ہوا ہے اس کو دور کر سکوں' اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا؟

[سائل: محمد صدیق' نیو کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ اس بات پر تمام علماء امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ روضۂ اقدس کا وہ حصہ جو نبی اکرم ﷺ کے جسم اطہر سے ملا ہوا ہے وہ شہرِ مکہ بلکہ کعبۃ اللہ اور عرشِ اعلیٰ سے بھی افضل ہے۔ اور بلدین (مکہ و مدینہ) کے ایک دوسرے سے افضل ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ اور جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ شہرِ مکہ' شہرِ مدینہ سے افضل ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک ٹیلہ پر کھڑے ہو کر کعبۃ اللہ سے) فرمایا: ''**واللّٰہ انک لخیر ارض اللّٰہ واحب ارض اللّٰہ الی اللّٰہ**'' خدا کی قسم! اللہ کی سرزمین میں ضرور تو سب سے بہترین ہے اور اللہ کی زمین میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ (سنن ترمذی: ۳۹۲۵)

علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''فیہ تصریح بان مکة افضل من المدینة کما علیه الجمهور الا البقعة التی ضمت اعضاءہ علیه الصلوٰة والسلام فانها افضل من مکة بل من الکعبة بل من العرش اجماعا''۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۵ ص ۶۰۲)

اس حدیث میں اس پر واضح دلیل ہے کہ شہرِ مکہ شہرِ مدینہ سے افضل ہے جیسا کہ اکثر علماء کا موقف ہے۔ لیکن وہ جگہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسمِ اطہر سے ملی ہوئی ہے وہ مکہ بلکہ کعبۃ اللہ اور عرشِ اعلیٰ سے بھی افضل ہے اور اس پر تمام علماء امت متفق ہیں۔

علامہ بدر الدین عینی اور علامہ ابن حجر عسقلانی علیہما الرحمۃ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(حوالہ کے لیے دیکھئے: عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۲۳۶، ج ۷ ص ۲۷۴، فتح الباری شرح بخاری ج ۴ ص ۵۸۶)

تحقیق مقام کے لیے آخر میں علامہ شامی علیہ الرحمۃ کی عبارت ملاحظہ ہو' آپ فرماتے ہیں:

'' اجمعوا علی ان افضل البلاد مکة و مدینة زادهما الله تعالٰی شرفا و تعظیما واختلفوا ایهما افضل فقیل مکة وهو مذهب الائمة والمروی عن بعض الصحابة. والخلاف فیما عدا موضع القبر المقدس فما ضم اعضاءہ الشریفة فهو افضل بقاع الارض بالاجماع''۔ (فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۴۷)

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام شہروں میں مکہ اور مدینہ سب سے افضل شہر ہیں (اللہ ان دونوں شہروں کی عظمت کو مزید بلند فرمائے) لیکن اس میں اختلاف ہے کہ دونوں میں کون افضل ہے؟ مکہ یا مدینہ؟ تو ہمارے ائمہ کرام اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک شہرِ مکہ افضل ہے۔ اور یہ اختلاف اس جگہ کے بارے میں نہیں ہے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبرِ انور ہے۔ کیونکہ وہ جگہ جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسمِ اطہر سے ملی ہوئی ہے وہ بالاتفاق روئے زمین کی ہر جگہ سے افضل ہے۔

اور درمختار میں ہے کہ جو جگہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسمِ اطہر سے ملی ہوئی ہے وہ کعبۃ اللہ اور عرش و کرسی سے بھی افضل ہے۔ (درمختار ج ۴ ص ۴۷)

واللّٰہ ورسوله اعلم بالصواب

ڈاکٹر فرحت ہاشمی کی گمراہ کن تبلیغ اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی تردید

سوال:

ڈاکٹر فرحت ہاشمی اپنی بیان کردہ تفسیر قرآن بنام ''فہم القرآن'' کیسٹ نمبر 1 'سورۂ بقرہ میں آیت نمبر 33 تا 38 میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق کہتی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں آنے سے پہلے دنیا کی تمام چیزوں سے مانوس کردیا' سب چیزوں کے نام سکھادیئے۔ پہلا علم دنیا کی چیزوں کا علم تھا۔ اس علم کولیکر حضرت آدم علیہ السلام شیطان کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ لہٰذا جب ان کو جنت میں بھیجا گیا تو شیطان ان کو بہکانے لگا اور ان کو جنت سے نکلوادیا۔ جب وہ جنت سے نکلے تو اس کے بعد ان کو دنیا میں بھیجا گیا۔ بھیجنا تو پہلے بھی تھا مگر وہ شعر ہے۔ ع: (بڑے بے آبرو ہوکر تیرے کوچے سے ہم نکلے) تو وہ عزت سے نکلنا تھا' لیکن یہاں اللہ کی ناراضگی کے ساتھ نکلے''۔

کیا حضرت آدم علیہ السلام جو اللہ کے پیغمبر اور ابو البشر ہیں ان کے متعلق مذکورہ کلام جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ پیغمبر کی شان میں بے ادبی نہیں؟

[سائلہ: اسماء منیر' خواتین اسلامک یونیورسٹی' کراچی]

جواب:

شریعتِ مطہرہ کی رو سے ہر مسلمان پر یہ بات لازم اور ضروری ہے کہ اپنے قول و فعل اور تحریر و تقریر میں اللہ عزوجل اور اس کے جملہ محبوبین و مقربین خصوصاً حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جلالتِ شان اور عظمتِ مقام کا بھرپور اہتمام اور لحاظ رکھے۔ ایسا کوئی بھی کلام یا جملہ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر یا اس کے محبوبین و مقربین کی ذات پر حرف آتا ہو اور ان کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو اس کا استعمال سخت حرام بلکہ بعض صورتوں میں دائرہ اسلام سے خروج کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں لفظِ ''راعنا'' کہنے سے اسی لیے منع کیا گیا

کہ اس میں بے ادبی اور گستاخی کا پہلو موجود تھا اور اس کے استعمال کو یہودیوں اور کافروں کا طرزِ عمل قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

''مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ''۔ (النساء:۴۶)

یہودیوں میں سے کچھ لوگ اللہ کے کلمات کو ان کے مقامات سے پھیر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی (اور آپ سے کہتے ہیں) سنیے! آپ کو سنائی نہ دے اور اپنی زبانیں مروڑ کر دین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے ''راعنا'' کہتے ہیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ''راعنا'' کہنے سے منع کرتے ہوئے بہت واضح لفظوں میں ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ ''اے ایمان والو! (اپنے رسول سے) ''راعنا'' نہ کہو بلکہ یوں عرض کرو کہ ہم پر نظر فرمائیے اور پہلے ہی توجہ سے سن لیا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ (البقرۃ:۱۰۴)

مذکورہ دونوں آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں جہاں یہ معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں مشکوک اور مشتبہ الفاظ کا استعمال یہودیوں اور کافروں کا طریقہ ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی نبی کی شان میں ایسے الفاظ کا استعمال بھی قطعاً جائز نہیں ہے جس سے بے ادبی اور توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ اور جب بے ادبی کا شائبہ رکھنے والے الفاظ و کلمات کا استعمال جائز نہیں ہے تو جو الفاظ واضح طور پر بے ادبی اور توہین کے مفہوم پر مشتمل ہوں ان کا استعمال کس قدر حرام اور ناجائز ہوگا! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کو انتہائی اعزاز اور مقام و مرتبہ عطا فرمایا ہے اور ان سب کو ہر قسم کے نقص و عیب اور تنقید و اعتراض سے منزہ اور پاکیزہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ''وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ'' بلاشبہ وہ سب ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے اور پسندیدہ (پیغمبر) ہیں''۔ (ص:۴۷) اس آیت مبارکہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنا منتخب اور پسندیدہ قرار دیا ہے اور یقیناً جو رب عزوجل کا منتخب اور پسندیدہ ہو وہ کسی بھی قسم کے قابلِ طعن قول و فعل سے مبرا اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ اسی آیت مبارکہ کی بناء پر انبیاء کرام علیہم السلام کو معصوم اور معزز و محترم قرار

دیا جاتا ہے۔ اگر بتقاضائے بشریت کسی پیغمبر سے کوئی ناپسندیدہ بات صادر ہوتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بہت شایان شان طریقے سے نہ صرف یہ کہ معافی عطا فرماتا ہے بلکہ جہاں بھی ان کی ناپسندیدہ بات کا ذکر فرماتا ہے وہاں ساتھ ہی اپنی مغفرت اور لطف وعنایت کا بھی اعلان فرماتا ہے۔ اور ایسا وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ بعد میں کسی بھی شخص کو ان کی ذوات مقدسہ پر طعن وتشنیع یا بے ادبی کے انداز میں اس کے ذکر کا موقع نہ ملے۔

ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے اس میں ڈاکٹر فرحت ہاشمی نامی ایک خاتون کی تفسیر قرآن بنام ''فہم القرآن'' (کیسٹ نمبر ۱ 'البقرہ: ۳۴ تا ۳۸) سے حضرت سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ایک عبارت پیش کی گئی ہے جسے پڑھ کر ڈاکٹر صاحبہ کی ذہنی وفکری آزادی کا بھی پتا چلا اور ساتھ ہی نہایت افسوس بھی ہوا کیونکہ اس میں ڈاکٹر صاحبہ نے اللہ کے معصوم پیغمبر سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق جو کلام کیا ہے وہ موصوفہ کی زبان درازی بلکہ بدزبانی اور بے ادبی کی بھرپور آئینہ دار ہے۔ اس میں شیطان کو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلے میں کامیاب قرار دیا گیا ہے پھر شعر کا ایک مصرعہ لکھ کر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف بے آبرو ہونے کی نسبت کی گئی ہے اس کے بعد جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے نکلنے کو ناراضگی کے ساتھ نکلنا قرار دیا گیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جنت سے نکلنا معاذ اللہ عزت کے ساتھ نہیں تھا۔

ڈاکٹر فرحت ہاشمی کی ذہنیت پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے' کیونکہ انہوں نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں وہ زبان استعمال کی ہے جس کا کسی صاحب ایمان سے تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلے میں شیطان کو جو کامیاب قرار دیا ہے وہ ڈاکٹر صاحبہ کی کھلی جہالت ہے یا پھر ایک تاریخی حقیقت کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش ہے۔ کیونکہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہ ظاہر جنت سے نکلوادیا' لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تقدیر الٰہی کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کا جنت میں عارضی قیام تھا اور اب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں اپنے فرائض نبوت کو پورا فرمانے کے بعد دائمی قیام کے لیے جنت میں جائیں گے اور شیطان ان کے بالمقابل دائمی قیام کے لیے جہنم میں جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیطان حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تنہا وجود

کو برداشت نہیں کر سکا اور ان کو جنت سے نکلوا دیا۔ لیکن اب دنیا میں آنے کے بعد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام دوبارہ جب جنت میں تشریف لے جائیں گے تو تنہا نہیں ہوں گے بلکہ ان کے ساتھ ان کی بے شمار ذریت اور اولاد ہو گی۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شیطان کو حضرت آدم علیہ السلام پر کامیابی ملی بلکہ درحقیقت حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دنیا میں آنا ان کی اپنی عظیم کامیابی کا پیش خیمہ اور شیطان کی رسوائی کا آغاز تھا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جنت سے نکلنے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرحت ہاشمی کا یہ مصرعہ پیش کرنا کہ: "بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے" یہ بھی حضرت سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان اقدس میں دریدہ دہنی اور بے ادبی کا انتہائی شرمناک مظاہرہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے عوام الناس کو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جنت سے نکلنا (معاذ اللہ) عزت کے ساتھ نہیں تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء ورسل اور جملہ مقربینِ بارگاہ کو انتہائی عزت وحشمت اور وجاہت سے سرفراز فرمایا ہے' جیسا کہ اس سے پہلے سورہ صٓ کی آیت ۴۷ سے واضح کیا جا چکا ہے۔ اور بالخصوص سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن مجید اعلان فرماتا ہے کہ: "اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ"۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم' نوح' آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے۔ (سورہ آل عمران: ۳۳) مقام غور ہے کہ قرآن مجید سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے عالمی فضیلت ومرتبہ کا اعلان فرما رہا ہے جب کہ ڈاکٹر صاحبہ اپنی زبان بے لگام کو استعمال کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف بے آبرو ہونے کی نسبت کر رہی ہے۔ اس کھلے تضاد سے جہاں ڈاکٹر صاحبہ کی قرآن فہمی اور علمیت آشکارا ہوتی ہے وہاں ان کی ذہنیت اور آزادیٔ فکر بھی اجاگر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا یہی مصرعہ کسی موقع پر اگر خود ڈاکٹر صاحبہ کے لیے پڑھ دیا جائے تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پڑھنے والے کو اس پر کتنا خراجِ تحسین پیش کریں گی۔

ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی قرآن فہمی اور زورِ علم کے مطابق حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جنت سے نکلنے پر جہاں اور بہت سارے آزادانہ تبصرے بلکہ عصمتِ نبوت پر ناپاک حملے کیے ہیں وہاں ایک مذموم حملہ یہ بھی کیا ہے کہ معاذ اللہ" حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام

جنت سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لے کر نکلے‘‘ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں بے ادبی کا یہ بھی انتہائی حیا سوز مظاہرہ ہے۔ ہمارے نزدیک حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے انتہائی معزز، معظم اور محترم و محتشم نبی ہیں اور جنت سے ان کا نکلنا مکمل اعزاز کے ساتھ تھا نہ کہ رب کی ناراضگی کے ساتھ۔ کیونکہ رب تعالیٰ کی ناراضگی گناہ کے کاموں پر ہوتی ہے اور نبی کا مقدس دامن ہر قسم کے گناہ کی آلودگی سے پاک اور صاف ہوتا ہے۔ اہل علم کے نزدیک ’’گناہ‘‘ حکم کی ایسی خلاف ورزی کو کہتے ہیں جس میں آدمی کا اپنا قصد اور ارادہ شامل ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے گناہ کی اس حقیقت سے بے خبری کا مضحکہ خیز مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خدا تعالیٰ کے درمیان ناراضگی کا رشتہ جوڑ دیا اور پس پردہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو گناہ گار قرار دینے کی مذموم کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کوشش سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر تو کوئی حرف نہیں آیا اور نہ آ سکتا ہے۔ البتہ اس مذموم کوشش سے ڈاکٹر صاحب کی علیمت کا پردہ ضرور چاک ہوا ہے۔

ہم بیان کر چکے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جنت سے نکلنا رب تعالیٰ کی ناراضگی کے ساتھ نہیں تھا بلکہ مکمل اعزاز و اکرام اور احتشام کے ساتھ تھا کیونکہ رب تعالیٰ کی ناراضگی گناہ پر ہوتی ہے اور گناہ اس وقت گناہ کہلاتا ہے جب وہ قصد اور ارادے کے ساتھ پایا جائے جب کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو عمل صادر ہوا تھا وہ محض نسیان اور بھولنے کی بنیاد پر تھا، اس عمل میں ان کے قصد و ارادے کا دخل ہرگز نہیں تھا۔ قرآن کریم خود اس کی گواہی دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ’’وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا‘‘۔ بے شک اس سے پہلے ہم نے آدم سے یہ عہد لیا تھا (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائیں) تو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا کوئی قصد و ارادہ نہیں پایا‘‘۔

(سورہ طٰہٰ: ۱۱۵)

اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شجر ممنوعہ سے قصداً اور ارادۃً نہیں کھایا تھا بلکہ بھول کر کھایا تھا اور ظاہر ہے کہ بھول چوک سے جو کام ہو اس کو نہ گناہ کہا جاتا ہے نہ اس سے انسان کے اعزاز و وقار میں کمی آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام جنت سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لیکر نکلے یا شیطان کے مقابلہ میں کامیاب

نہ ہو سکے یا (معاذ اللہ) بے آبرو ہو کر نکلے یہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معصوم و مقدس ذات پر نہ صرف بہتان و الزام ہے بلکہ ان کی شان میں بے ادبی کی بھی ناپاک جسارت ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کسی بھی نبی پر طعن کرنا یا ان کے متعلق بے ادبی کا مظاہرہ کرنا در حقیقت اللہ تعالیٰ کی عطا اور نوازشات پر طعن کرنا ہے۔ خصوصاً جب رب تبارک و تعالیٰ کسی کے لیے معافی کا اعلان فرما دے تو کسی اور کی کیا مجال کہ اس پر اپنا تبصرہ اور رائے زنی کرے۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنی دینی اور اسلامی غیرت و حمیت کا تحفظ کریں اور ڈاکٹر فرحت ہاشمی اور اس جیسے جملہ زہر آفریں مقررین جو در حقیقت ایمان کے لٹیرے اور فہم القرآن کے نام پر قرآن سے منحرف کرنے والے ہیں ان سے سخت اجتناب کریں۔ خود بھی بچیں اور اپنی ماؤں، بہنوں کو بھی بچائیں۔ اسی میں ایمان کی سلامتی اور عافیت ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شجرۂ بیعۃ الرضوان کی حقیقت اور مزاراتِ اولیاء کی حاضری

سوال:

۶ ہجری میں جس درخت کے نیچے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بیعت لی تھی، اُس درخت کے متعلق سنا ہے کہ اُس کو حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کٹوا دیا تھا۔ اس خدشہ کی بنا پر کہ کہیں لوگ اُس کے ذریعے کسی قسم کے شرک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو پھر آج کل مزارات پر جو خلافِ شرع اُمور در آئے ہیں اُن کی وجہ سے مزارات کو گرانا یا لوگوں کو زیارت کے لیے جانے سے روکنا جائز ہوگا یا نہیں؟ یا جو لوگ مزارات پر جانے کو شرک و بدعت سمجھتے اور لوگوں کو جانے سے روکتے ہیں، اُن کا یہ فعل درست ہوگا یا نہیں؟ برائے کرم تفصیلی اور تحقیقی جواب عنایت فرمائیں؟

[سائل: محمد اسماعیل اشرف، کراچی]

جواب:

سوالِ مذکور متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے:

اوّلاً: عام طور پر یہ مشہور ہے یا مشہور کر دیا گیا ہے کہ جس درخت کے نیچے بیعۃ الرضوان ہوئی تھی اُس درخت کو حضرت سیّدنا عُمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کٹوادیا تھا۔ حالانکہ یہ محض حضرت سیّدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات پر الزام ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں متعدد روایات موجود ہیں جن میں یہ بات نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ بیعۃ الرضوان کے اگلے سال ہی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جب اُس درخت کے قریب پہنچے تو وہ درخت موجود نہیں تھا بلکہ قدرتی طور پر غائب ہوگیا تھا یا صحابہ کرام کو اُسکی جگہ بھلادی گئی تھی۔ اِس سلسلے میں شیخین (امام بخاری وامام مسلم علیہما الرحمۃ) کی روایت کردہ احادیث ملاحظہ ہوں:۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

(۱) **عن سعید بن المسیب عن ابیه قال لقد رأیت الشجرة ثم اتیتها بعد فلم اعرفها قال محمود ثم انسیتها بعد.**

(۲) **عن طارق بن عبد الرّحمن قال انطلقت حاجّا فمررت بقوم یصّلون قلت ما هٰذا المسجد؟ قالوا هذه الشجرة حیث بایع رسول اللهﷺ بیعة الرضوان فاتیت سعید بن المسّیب فاخبرته فقال سعید حدثنی ابی انه کان فیمن بایع رسول اللهﷺ تحت الشجرة قال فلما خرجنا من العام المقبل نسیناها فلم نقدر علیها فقال سعید ان اصحاب محمد ﷺ لم یعلموها وعلمتموها انتم فانتم اعلم.**

(۳) **عن سعید بن المسیب عن ابیه انه کان ممّن بایع تحت الشجرة فرجعنا الیها العام المقبل فعمیت علینا.**

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

(۱) **عن سعید بن المسیب قال کان ابی ممن بایع رسول اللهﷺ عند الشجرة قال فانطلقنا فی قابل حاجین فخفی علینا مکانها فان کانت**

تبینت لکم فانتم اعلم.

(۲) عن سعید بن المسیب عن ابیه انهم کانوا عند رسول اللہ ﷺ عام الشجرۃ قال فنسوھا من العام المقبل.

(۳) عن سعید بن المسیب عن ابیه قال لقد رأیت الشجرۃ ثم اتیتھا بعد فلم اعرفھا. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۹۹، صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۳۰)

مذکورہ تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت طارق بن عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کی غرض سے نکلے، آپ کا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں کچھ لوگ نماز ادا کر رہے تھے۔ طارق بن عبدالرحمٰن نے دریافت کیا: یہ کون سی نماز پڑھنے کی جگہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے بیعت لی۔ حضرت طارق کہتے ہیں کہ میں حضرت سعید بن میتب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور انہیں اس معاملے سے آگاہ کیا تو انہوں نے اپنے والدِ ماجد کے حوالے سے بتایا کہ میرے والدِ ماجد اُن لوگوں میں سے تھے جو بیعۃ الرضوان میں شامل تھے، وہ کہتے تھے کہ جب ہم اگلے سال پہنچے تو اُس درخت کی جگہ بھول گئے اور اُس درخت کو نہ پاس کے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ وہ درخت ہم سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کے بعد حضرت سعید بن میتب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ: حضور ﷺ کے صحابہ تو وہ درخت نہ جان سکے اور تم لوگوں نے جان لیا۔ تم زیادہ جاننے والے (معلوم ہوتے) ہو۔ (حضرت سعید بن میتب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جملہ سرزنش کے طور پر تھا۔ کذا فی عمدۃ القاری ج ۱۷ ص ۲۱۹، وفی فتح الباری ج ۸ ص ۲۱۷۔ ھو علی سبیل التھکم)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ذکر کردہ روایات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ درخت جس کے نیچے بیعتِ رضوان ہوئی تھی وہ قدرتِ الٰہی سے غائب ہو گیا تھا۔ کسی کے کٹوانے کا ان روایات میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے برخلاف اس بات کی صراحت ہے کہ وہ درخت اوجھل ہو گیا یا اُس کی جگہ بھلا دی گئی تھی۔

مقامِ غور ہے! کہ ایک درخت قدرتِ الٰہی سے غائب بھی ہو جائے اور اسی کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کٹوا بھی دیں! یہ کیسے ممکن ہے؟ خود سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا

موقف یہ تھا کہ وہ درخت غائب ہو گیا تھا۔ چنانچہ محدث شہیر امام بغوی علیہ الرحمۃ روایت نقل فرماتے ہیں: ''روی ان عمر مر بذالك المكان بعد ان ذهبت الشجرة فقال این کانت؟ فجعل بعضهم یقول ههنا و بعضهم یقول ههنا فلما کثر اختلافهم قال سیروا ذهبت الشجرة''۔ (معالم التنزیل للامام البغوی ج ۴ ص ۲۲۷)

یعنی حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ درخت غائب ہونے کے بعد (کسی دن) اُس جگہ سے گزرے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ درخت کس جگہ تھا؟ تو کسی نے کہا: اِس جگہ' کسی نے کہا: اس جگہ۔ جب لوگوں کا اِس سلسلے میں اختلاف بڑھ گیا تو حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: چلو چلو' وہ درخت غائب ہو گیا ہے۔

امام ابن جریر طبری اور علامہ علاء الدین خازن بغدادی نے بھی اپنی تفاسیر میں اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ (تفسیر خازن ج ۴ ص ۱۵' جامع البیان للطبری ج ۱۳ ص ۱۱۲)

ثانیاً: بعض مفسرین علیہم الرحمۃ نے یہ روایت نقل فرمائی کہ حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ لوگ ایک درخت کے پاس آتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زجر و توبیخ کے بعد اُس درخت کو کٹوا دیا۔ (البحر المحیط ج ۹ ص ۴۹۲' صاوی ج ۳ ص ۱۹۷۴' روح المعانی ج ۱۴ ص ۱۶۲' حاشیہ الشہاب علی البیضاوی ج ۸ ص ۵۲۸)

اس روایت اور صحیحین کی ذکر کردہ روایات میں بہ ظاہر تضاد نظر آتا ہے' لیکن حقیقتاً ان میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ اصلاً تو وہ درخت قدرتِ الٰہی سے غائب ہو گیا تھا لیکن لوگ کسی اور درخت کو ''شجرۂ بیعت'' سمجھنے لگے تھے' اُس کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کٹوا دیا تھا نہ کہ اصل شجرۂ بیعت کو۔

(دیکھئے تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۲ بحوالہ ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ۴ ص ۱۶۵)

علامہ محمد اسماعیل حقی حنفی علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۱۳۷ھ) بھی یہی فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''یقول الفقیر :یمکن التوفیق بین الروایتین بانهم لما عمیت علیهم ذهبوا یصلّون تحت الشجرة علی ظنّ انها هی شجرة البیعة فامر عمر رضی الله تعالٰی عنه بقطعها''. (روح البیان ج ۹ ص ۴۳)

یعنی مذکورہ (بہ ظاہر متضاد) روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ جب شجرۂ بیعت اوجھل

ہو گیا تو لوگ اپنے گمان کے مطابق ایک درخت کو شجرۂ بیعت جان کر کے اُس کے نیچے نماز کے لیے جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کو کٹوا دیا۔ (نہ کہ اصل شجرۂ بیعت کو)۔

ذکر کردہ تمام تر تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس درخت کے نیچے بیعۃ الرضوان ہوئی تھی وہ قدرتی طور پر غائب ہو گیا تھا اور لوگ (تبرک کے طور پر) ایک ایسے درخت کے نیچے نمازیں پڑھنے لگے تھے جو فی الواقع شجرۂ بیعت نہیں تھا' اُس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کٹوا دیا تھا۔

ثالثاً: شجرۂ بیعت کے غائب کیے جانے میں کیا حکمت تھی؟ اس حوالے سے علماء نے یہ توجیہ کی ہے کہ اس کا غائب کیا جانا اسلیے تھا تا کہ لوگ اُس کے ذریعے کسی قسم کی بداعتقادی اور فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔ چنانچہ علامہ صاوی مالکی (متوفی ۱۲۴۱ھ) فرماتے ہیں: ''وھذہ الشجرۃ قد اخفیت لئلا یحصل الافتتان بھا''۔ (صاوی' ج ۳ ص ۱۹۷۴)

اسی طرح علامہ بدرالدین عینی حنفی (متوفی ۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

''وکان سبب خفائھا ان لا یفتتن الناس بھا لما جری تحتھا من الخیر ونزول الرضوان فلو بقیت علی ظاھرھا معلومۃ لخیف تعظیم الجھال ایّا ھا وعبادتھم لھا فاخفاء ھا رحمۃ اللہ من اللہ تعالیٰ''. (عمدۃ القاری ج ۱۷ ص ۲۲۰)

شجرۂ بیعت کا اوجھل ہونا اسوجہ سے تھا تا کہ لوگ اس کے سبب فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ (بیعت کے سبب) اُس درخت کے نیچے خیر و برکت اور رحمت و رضوان کا نزول جاری ہو چکا تھا۔ پس اگر اُس درخت کو اُس کی ظاہری شکل پر معلوم و معین رکھا جاتا تو خدشہ تھا کہ جہلاء اس کی تعظیم و پوجا کرنے لگ جائیں گے۔ پس اُس درخت کا غائب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت تھا۔

یہی توجیہ علامہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اکمال المعلّم فی شرح مسلم'' ج ۶ ص ۲۷۲ میں' علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمۃ (متوفی ۸۵۲ھ) نے فتح الباری ج ۶ ص ۲۲۰ میں اور دیگر علماء نے اپنی تصانیفِ جلیلہ میں بیان فرمائی ہے۔ اس سے بعض مخالفین یہ غلط استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح فتنہ کے خوف سے شجرہ بیعت کو اٹھا لیا گیا اسی طرح مزارات سے بھی چونکہ عوام میں بداعتقادی پھیلنے کا خدشہ ہے اس لیے مزارات کو بھی منہدم

کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ مخالفین کی محض مغالطہ آفرینی اور دھوکہ دہی ہے۔ وہ درحقیقت اس کے ذریعہ عامۃ المسلمین کو مزارات اولیاء پر حاضری سے روکنا چاہتے ہیں۔ اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مزارات پر حاضر ہونے اور وہاں دعائیں کرنے میں شرک کا خطرہ ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں شرک کا خطرہ نہیں تھا' جیسا کہ خود فرمایا: ''واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی''۔ خدا کی قسم مجھے تم پر اس بات کا خدشہ نہیں کہ تم میرے بعد شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۵۱) لہٰذا مخالفین کے یہ خدشات اور خطرات محض عوام الناس کو اولیاء کرام سے منحرف کرنے کی ایک سازش ہے۔

علامہ محمد اسماعیل حقی حنفی علیہ الرحمۃ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ''کشف النور'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'' اما قول بعض المغرورین باننا نخاف علی العوام اذا اعتقدوا ولیاً من الاولیاءِ وعظموا قبرہ والتمسوا البرکۃ والمعونۃ منہ ان یدرکھم اعتقاد ان الاولیاء توٴثر فی الوجود مع اللہ فیکفرون ویشرکون باللہ تعالٰی فننھاھم عن ذالک ونھدم قبور الاولیاء لوکانوا موٴثرین فی الوجود مع اللہ تعالٰی لدفعوا عن انفسھم ھذہ الاھانۃ التی نفعلھا معھم فاعلم ان ھذا الصنیع کفر صراح ماخوذ من قول فرعون علیٰ ماحکاہُ اللہ لنا فی کتابہ القدیم: وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المؤمن:۲۶) وکیف یجوز ھذا الصنیع من اجل الامر الموھوم ومعہ خوف الضلال علی العامّۃ''. (روح البیان ج ۹ ص ۴۳' کشف النور ۱۷)

بعض فریب خوردہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب لوگ کسی ولی سے اعتقاد رکھیں گے' اُن کی قبر کی تعظیم کریں گے اور اُس سے برکت و مدد حاصل کریں گے تو ہمیں خطرہ ہے کہ لوگ کہیں یہ اعتقاد نہ کر بیٹھیں کہ اللہ کے ساتھ اولیاء بھی موٴثر فی الوجود ہیں' نتیجۃً لوگ کفر و شرک میں مُبتلا ہو جائیں گے۔ پس ہم انہیں اس سے روکیں گے' اولیاء کی قبور کو گرائیں گے' ان پر بنی ہوئی عمارت ہٹائیں گے' اُن سے غلاف اور پردے اتاریں گے اور ''بہ ظاہر'' اولیاء کی توہین کے مرتکب ہوں گے تا کہ جاہل عوام کو پتا چل جائے کہ اگر اللہ تعالٰی کے ساتھ ساتھ یہ اولیاء

بھی مؤثر فی الوجود ہوتے تو اس توہین کو روک دیتے۔ سو جان لیجئے کہ یہ فعل (توہین قبور وغیرہ) صریح کفر ہے اور یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے فرعون نے کہا تھا کہ مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کردوں اور وہ (اپنی مدد کے لیے) اپنے رب کو بلالیں' بیشک مجھے تو ڈر ہے اس بات کا کہ کہیں وہ تمھارے دین کو تبدیل نہ کردیں اور ملک میں فساد نہ پھیلا دیں (سُورۃ المؤمن : ۲۶) اور یہ فعل (توہینِ قبور وغیرہ) محض ایک امرِ موہوم کی بنا پر کیونکر درست ہوسکتا ہے جب کہ اس میں عوام النّاس پر گمراہی کا خدشہ کرنا بھی موجود ہے۔

عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ عامۃُ المسلمین پر کفر و شرک کا خدشہ ظاہر کرکے اُنھیں زیارتِ قبور اور مزارات پر حاضری سے روکنا یا مزارات کو منہدم کرنا ایسا ہی ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تبدیل دین اور فساد پھیلانے کا خدشہ ظاہر کرکے انھیں قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ نیز علامہ اسماعیل حقی علیہ الرحمۃ نے سورۃُ الفتح میں شجرۂ بیعت کے مسئلے پر گفتگو کرنے کے بعد عبارتِ مذکورہ کو نقل فرما کر یہ واضح کردیا کہ شجرۂ بیعت کے غائب ہونے یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کٹوا دینے سے متعلق ذکر کردہ حکمت کو مزارات کے خلاف بنیاد بنانا درست نہیں ہے۔

اسی طرح علامہ صاوی مالکی علیہ الرحمۃ "وابتغوا الیه الوسیلة" کے تحت لکھتے ہیں:

"وابتغاء الوسيلة ما يقربه اليه مطلقاً ومن جملة ذالك محبة انبياء الله و اولياءه والصدقات وزيارت احباب الله وكثرة الدعاء وصلة الرحم وكثرة الذكر وغيرذالك. فالمعنى كل ما يقربكم الى الله فالزموه واتركوا مايبعدكم عنه. اذا علمت ذالك فمن الضلال البيّن والخسران الظاهر تكفير المسلمين بزيارة اولياء الله زاعمين ان زيارتهم من عبادة غير الله كلا بل هي من جملة المحبة في الله التي قال فيها رسول الله ﷺ الا لا ايمان لمن لا محبة له".

(تفسیر صاوی ج ۱ ص ۴۹۷)

یعنی وسیلہ تلاش کرنے سے مراد وہ چیز تلاش کرنا ہے جو بندے کو مطلقاً اللہ تعالیٰ کے قریب کردے مثلاً انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی محبت' صدقات' اللہ تعالیٰ کے محبوبین کی زیارت' دعا کی کثرت' صلہ رحمی اور کثرت ذکر وغیرہ۔ پس مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ

تعالی کے قریب کردے اس سے چمٹ جاؤ اور جو رب سے دور کردے اس کو چھوڑ دو۔ جب تم نے یہ جان لیا تو (اب یہ سمجھ لو کہ) کھلی گمراہی اور کھلا خسارہ ہے ان لوگوں کے لیے جو مسلمانوں کو زیارت اولیاء کی بنیاد پر محض یہ گمان کر کے کافر قرار دیتے ہیں کہ "زیارت اولیاء غیر اللہ کو پوجنے کی قبیل سے ہے"۔ ہرگز ایسا نہیں! بلکہ یہ تو محبۃ فی اللہ (اللہ کی خاطر محبت) کا مظاہرہ ہے جس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: خبردار! اس شخص کا ایمان نہیں جس کے اندر محبت نہیں۔

علامہ صاوی علیہ الرحمۃ کی عبارت سے معلوم ہوگیا کہ مزارات پر حاضری کو غیر اللہ کی عبادت یعنی شرک سمجھنا اور اس بنیاد پر مسلمانوں کو کافر قرار دینا خود کھلی گمراہی اور خسارہ ونقصان ہے۔ یہ وہی علامہ صاوی ہیں جن کے حوالہ سے شجرۂ بیعت کے غائب ہونے کی حکمت ہم بیان کر چکے کہ "لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں"۔ شجرۂ بیعت سے متعلق یہ حکمت سپردِ قلم فرمانے کے باوجود دوسری جانب آپکا یہ فرمانا کہ "زیارت اولیاء کی بنیاد پر مسلمانوں کو کافر قرار دینا کھلی گمراہی اور خسارۂ ظاہر ہے" اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شجرۂ بیعت سے متعلق بیان کردہ حکمت کو مزارات کے خلاف بنیاد بنانا درست نہیں ہے۔

رابعاً: شجرۂ بیعت سے متعلق ذکر کردہ حکمت کو اگر مزارات کے خلاف بنیاد بنانا درست ہوتا تو فقہاء کرام وعلماء اعلام اپنی کتب جلیلہ میں مزارات کے احترام اور حاضری کی قطعاً ترغیب نہ فرماتے۔ لیکن علماء وفقہاء علیہم الرحمۃ نے اپنی مصنفات میں اولیاء وصالحین تو درکنار "عام اہل ایمان کی قبور" کا وہ ادب واحترام بیان فرمایا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد ادنی فہم رکھنے والا بھی بآسانی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ مزارات کو شجرۂ بیعت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

"واما الاولياء فانهم متفاوتون فى القرب من الله تعالٰى ونفع الزائرين بحسب معارفهم واسرارهم. قال ابن حجر فى فتاواه ولا تترك لما يحصل عندها من منكرات و مفاسد كاختلاط الرجال بالنساء وغير ذالك لان القربات لاتترك لمثل ذالك بل على الانسان فعلها وانكار البدع بل وازالتها ان امكن".

(شامی ج ۳ ص ۱۴۱ مطبوعہ بیروت)

اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے قرب اور زائرین کو نفع پہنچانے میں اپنے معارف و اسرار کے اعتبار سے مختلف درجات رکھتے ہیں۔ علامہ ابن حجر اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ زیارت میں مختلف بدعات پیدا ہونے کے سبب زیارت کو ترک نہیں کیا جائے گا۔ اسلیے کہ عبادتیں اس طرح کی بنیادوں پر ترک نہیں کی جاتیں بلکہ انسان پر لازم ہے کہ اس طرح کی عبادتوں کو کرتا رہے اور جو خرابیاں پیدا ہوں ان کا انکار ورد کرتا رہے بلکہ ممکن ہو تو ازالہ بھی کر دے۔

عبارتِ مذکورہ کا مستفاد یہ ہے کہ فی زمانہ مزارات پر اگر چہ مختلف خرابیوں نے جنم لے لیا ہے لیکن ان خرابیوں کی بنا پر حاضری کو ترک نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان حاضری بھی دیتا رہے، ساتھ ہی ساتھ خرابیوں کا رد کرتا رہے اور ممکن ہو تو خرابیوں کا ازالہ بھی کرتا رہے۔ عبارت مذکورہ اس اعتبار سے بھی قابل غور ہے کہ شجرۂ بیعت تو (بقول علماء و محدثین) محض بداعتقادی کے خدشہ کی بنا پر غائب ہو گیا تھا جب کہ مزارات پر (جہلاء کی بدولت) فی الواقع خرافات در آئی ہیں، اس کے باوجود علامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ تصریح فرماتے ہیں کہ "یہ ایک عبادت ہے اور عبادت کو کسی خرابی کے پیدا ہونے کے سبب ترک نہیں کرنا چاہیے"۔

خود علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے ایک اور مقام پر یہاں تک تصریح فرمائی ہے کہ کوئی کام اگر چہ فی نفسہ بدعت ہو لیکن اس کو اس لیے کرنا تا کہ اس سے صاحب مزار کی عظمت ظاہر ہو تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ایسی "بدعت" کا جواز اور اس کی اصل قول فقہاء سے ثابت ہے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"وضع الستور والعمائم والثياب على قبور الصالحين والاولياء كرهه بعض الفقهاء حتى قال فى فتاوى الحجة وتكره الستور على القبور ولكن نحن الان نقول ان كان القصد بذالك التعظيم فى اعين العامة حتى لايحتقروا صاحب القبر الذى وضعت عليه الثياب والعمائم ولجلب الخشوع والادب لقلوب الغافلين الزائرين لان قلوبهم نافرة عند الحضور فى التادّب بين ايدى اولياء الله تعالىٰ المدفونين فى تلك القبور كما ذكرنا من حضور

روحانیتهم المبارکة عند قبورهم فهو امر جائز لاینبغی النهی عنه لان الاعمال بالنیات ولکل امرئ ما نوٰی فانه وان کان بدعةعلی خلاف ما کان علیه السلف ولکن هو من قبیل قول الفقهاء فی کتاب الحج انه بعد طواف الوداع یرجع القهقری حتی یخرج من المسجد لان فی ذالك اجلال البیت حتی قال فی منهاج السالکین ومایفعله الناس من الرجوع القهقری بعد الوداع فلیس فیه سنةمرویّة ولا اثر محکی وقد فعل اصحابنا"۔ (فتاویٰ شامی ج۹ ص ۴۴۲)

یعنی اولیاء اور بزرگانِ دین کی قبور پر غلاف' عمامے اور چادریں وغیرہ ڈالنے کو بعض فقہاء نے مکروہ جانا ہے یہاںتک کہ فتاویٰ الحجہ میں فرمایا کہ" قبور پر غلاف ڈالنا مکروہ ہے"۔ لیکن اب ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر اس فعل سے مقصود یہ ہو کہ عوام کی نظر میں (قبورِ صالحین کی) عظمت اجاگر ہوگی' اس کے سبب وہ صاحب قبر کو معمولی نہیں سمجھیں گے' بلکہ ایسے زائرین جو غافل ہوتے ہیں ان کے دلوں میں خشوع اور ادب پیدا ہوگا (کیونکہ لوگوں کے دل اولیاء کرام کی بارگاہ میں حاضری کے دوران ادب کے معاملے میں پیچھے ہوتے ہیں) تو یہ (سب کچھ) جائز ہے۔ اس سے روکنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہوتا ہے جو وہ نیّت کرتا ہے۔ پس بلا شبہ یہ کام اگر چہ بدعت اور اسلاف کے معمول کے خلاف ہے لیکن ایسے ہی ہے جیسے فقہاء کرام نے کتاب الحج میں فرمایا ہے کہ آدمی طوافِ وداع کرنے کے بعد الٹے قدم واپس ہو حتیٰ کہ مسجد سے باہر آجائے۔ کیونکہ اس میں بیت اللہ کی عظمت کا اظہار ہے۔ حتیٰ کہ" منہاج السالکین" میں فرمایا کہ طواف وداع کے بعد کا یہ فعل اگر چہ نہ تو رسول کریم ﷺ سے ثابت ہے نہ صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لیکن ہمارے اصحاب نے اس کو ادا کیا ہے۔

(بعینہ یہی عبارت علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے فتاویٰ" تنقیح الحامدیہ" ج ۲ ص ۳۵۷ پر اور قدوۃُ المحققین علامہ عبدالغنی نابلسی علیہ الرحمۃ نے اپنے رسالہ" کشف النور عن احوال القبور" میں ص ۱۴ پر نقل فرمائی ہے)۔

عبارت مذکورہ میں علامہ شامی علیہ الرحمہ نے مزارات کو بیت الحرام پر قیاس فرمایا۔ یعنی جس طرح عہد نبوی اور عہد صحابہ وتابعین میں طواف وداع کے بعد اُلٹے پاؤں لوٹنا رائج

نہ تھا' بعد میں اسلیے رائج ہوا تا کہ لوگوں پر بیت الحرام کی عظمت کا اظہار کیا جائے اسی طرح مزارات پر بھی مختلف طرق سے صاحب مزار کی عظمت کو ظاہر کرنا چاہیے۔علامہ شامی کی پہلی عبارت میں ابن حجر کے حوالے سے اس بات کی صراحت تھی کہ مزارات پر خرابیوں کے پیدا ہونے کے باوجود حاضری کو ترک نہ کیا جائے اور اس عبارت میں خود علامہ شامی علیہ الرحمہ مزارات کو بیت الحرام پر قیاس فرما کر مزید ادب اور محبت کی ترغیب فرما رہے ہیں۔ بہر صورت عبارتِ مذکورہ کو نقل کرنے کے بعد یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ مزارات کو شجرۂ بیعت پر قیاس کرنا چاہیے یا بیت الحرام پر؟ علامہ شامی علیہ الرحمۃ کا مزارات کو بیت الحرام پر قیاس فرمانا اس طرف واضح اشارہ ہے کہ مزارات شعائر اللہ اور قابل احترام ہیں۔ ''وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ''۔(اور جو شخص اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ تعظیم دلوں کا تقویٰ ہے)۔(الحج:۳۲) اگر قابل انہدام ہوتے تو علامہ شامی علیہ الرحمۃ بیت الحرام پر قیاس نہ فرماتے۔سو واضح ہوا کہ مزارات کو شجرۂ بیعت پر قیاس کرنا درست نہیں۔

اسی طرح علامہ ابن الحاج مکی علیہ الرحمۃ قبور اولیاء پر حاضری کی ترغیب فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ومن اراد حاجة فليذهب اليهم ويتوسل بهم فانهم الواسطة بين الله تعالى وخلقه و قد تقرر في الشرع وعلم ما لله تعالى بهم من الاعتناء و ذالك كثير مشهور ومازال الناس من العلماء والاكابر كابرا من كابر مشرقا ومغربا يتبركون بزيارة قبورهم ويجدون بركة ذالك حسًّا ومعنًى وقد ذكر الشيخ الامام ابو عبد الله ابن النعمان رحمه الله في كتابه المسمى بسفينة النجاء لاهل الالتجاء في كرامات الشيخ ابى النجاء في اثناء كلامه على ذالك ماهذا لفظه تحقق لذوى البصائر والاعتبار ان زيارة قبور الصالحين محبوبة لاجل التبرك مع الاعتبار فان بركة الصالحين جارية بعد مماتهم كما كانت في حياتهم والدعاء عند قبور الصالحين والتشفع بهم معمول به عند علمائنا المحققين من ائمة الدين''. (المدخل ج ۱ ص ۲۵۵)

یعنی جس شخص کو کوئی کام درپیش ہو وہ صالحین کی قبور کی طرف جائے اور ان کے وسیلہ

سے دعاء کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان وہ واسطہ ہیں اور یہ چیز شریعت میں ثابت ہے اور تمام دنیائے اسلام میں شرق سے لیکر غرب تک تمام علماء اور اکابر مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کرتے ہیں ان سے برکت حاصل کرتے ہیں اور ان کی برکات سے ظاہری اور باطنی طور پر فیض یاب ہوتے ہیں۔ علامہ ابن الحاج لکھتے ہیں کہ شیخ ابوعبداللہ بن نعمان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''سفینۃ النجاء لاہل الالتجاء'' میں فرمایا کہ: حصول برکت کے لیے صالحین کی قبروں کی زیارت مستحب ہے۔ کیونکہ صالحین کی برکات جس طرح ان کی زندگی میں فیض رساں ہوتی ہیں اسی طرح ان کی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہیں اور صالحین کی قبروں کے پاس دعا کرنا اور ان سے شفاعت طلب کرنا ائمہ دین اور علماء محققین کا معمول رہا ہے۔

عبارت مذکورہ میں ''والدعاء عند قبور الصالحین والتشفع بھم معمول بہ عند علمائنا المحققین من ائمۃ الدین'' کے الفاظ نہایت قابل غور ہیں۔ ان الفاظ سے علامہ ابن الحاج مکی علیہ الرحمہ نے یہ واضح فرمادیا کہ ''مزارات پر جانا اور وہاں جاکر ان کے وسیلے سے اللہ کی بارگاہ میں دعاء کرنا ائمہ دین اور علماء محققین کا معمول رہا ہے''۔ اگر مزارات کو شجرۂ بیعت پر قیاس کرنا درست ہوتا تو علماء محققین وہاں حاضری دینے کی بجائے خود بھی اور عامۃ الناس کو بھی اس سے منع فرماتے، لیکن اس کے برعکس علماء محققین نے حاضری کو اپنا معمول بناکر درحقیقت لوگوں کو اس کی ترغیب فرمائی ہے۔ سو یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہوگئی کہ مزارات کو شجرۂ بیعت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ علماء و مشائخ علیہم الرحمۃ کے معمول کے مطابق مزارات پر ادب و احترام کے ساتھ حاضری کو لازم رکھا جائے اور جو خرابیاں در آئی ہیں ان کا رد اور ممکن ہو تو ازالہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ مطلقاً حاضری کو ترک کیا جائے یا دوسروں کو روکا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت سے پہلے بتوں کی وجہ سے کعبہ نہ چھوڑا بلکہ جب موقع ملا تو بت نکال دیئے۔ آج بھی نکاح میں لوگ ناجائز حرکتیں کرتے ہیں مگر اس کی وجہ سے نہ نکاح بند کیے جاتے ہیں نہ وہاں کی شرکت۔ نکاح بھی سنت مطلقہ ہے اور زیارت قبور بھی سنت مطلقہ۔ (مرآۃ المناجیح ج ۲ ص ۵۲۲) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نقشِ نعلین اور موئے مبارک کی حقیقت

سوال:

آج کل نعلین شریفین کا جو نقش لوگوں میں معروف ہے' شرعی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت کیا ہے؟ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ قبریں پکی نہ بناؤ' تصاویر نہ بناؤ' گویا کوئی ایسی نشانی نہ رکھو جو تمہیں اپنے آباؤ واجداد کی یاد دلائے' ماسوا ان کے نیک اعمال کے۔ ایسی صورت میں کیا صحابۂ کرام' تابعین' تبع تابعین یا ان کے بعد آنے والے علماء و اکابرین نے مجوزہ نعلین شریفین کو پشت در پشت محفوظ رکھا ہوگا؟ کیا نعلین شریفین کا یہ نقش اصلی ہے؟ کیا اس سے عقیدت و محبت (چومنا' متبرک سمجھنا وغیرہ) جائز ہے یا نہیں؟ [سائل: عبدالرحمٰن' نیو کراچی]

جواب:

مذکورہ سوال کے جواب میں کچھ روز قبل ہمیں دار العلوم بنوری ٹاؤن (دیوبند) کا ایک فتویٰ موصول ہوا۔ جس میں مروجہ نقشِ نعلین شریفین اور موئے مبارک کو غیر معتبر' نا قابل احترام اور فتنہ عظیمہ کا سبب قرار دیا گیا۔ دیوبند کے مرکزی ادارے سے جاری ہونے والا یہ گمراہ کن اور اذیت ناک فتویٰ اس قابل تو نہ تھا کہ اس کی تردید اور جواب کی طرف توجہ دی جاتی۔ تاہم ناموسِ رسالت کے تحفظ اور عوامِ مسلمین کی تسکین و تشفی کے لیے درج ذیل معروضات رقم کی جا رہی ہیں:

نعلین شریفین کے موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سائل (عبدالرحمٰن) کے اندازِ سوال پر کچھ کلام کیا جائے:

سائل نے اپنے سوال میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر کیا ہے کہ قبریں پکی نہ بناؤ' تصاویر نہ بناؤ۔ اگر سائل صرف اس حدیث کو ذکر کرنے پر اکتفاء کرتا تو کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن سائل نے اس کے بعد جو تبصرہ سپردِ قلم کیا ہے اس سے سائل کی جہالت سامنے آ گئی۔ کیونکہ سائل نے لکھا کہ ''کوئی ایسی نشانی نہ رکھو جو تمہیں اپنے آباؤ اجداد یا بزرگوں کی یاد دلائے ماسوا ان کے نیک اعمال کے''۔ حدیث کا یہ مفہوم نہایت من گھڑت' خود ساختہ اور قرآن و سنت کے بالکل برخلاف ہے۔ قرآن و سنت سے بزرگوں کی نشانیاں رکھنا اور ان نشانیوں

سے برکتیں حاصل کرنا ثابت ہے: کچھ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے طالوت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ". (البقرۃ:۲۴۸)

یعنی ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے ان تبرکات کا ذکر ہے جو برسہا برس ایک صندوق میں بنی اسرائیل کے پاس محفوظ رہے۔ اور جب بھی بنی اسرائیل پر مشکل آتی تو اس صندوق کے وسیلہ سے بارگاہِ الٰہی میں وہ دعائیں کرتے اور دشمن پر فتح حاصل کرتے۔ (مزید تفصیل کے لیے کتب تفسیر ملاحظہ فرمائیں!)

(۲) ارشادِ ربانی ہے: "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى" (اے لوگو!) جس جگہ حضرت ابراہیم کھڑے ہوتے تھے اس جگہ کو تم نماز کی جگہ بنالو۔ (البقرۃ:۱۲۵)

اس آیت مبارکہ میں مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ "مقام ابراہیم" وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات ہیں۔ اگر بزرگوں کی نشانیاں محفوظ رکھنا ناجائز ہوتا تو حضرت ابراہیم کے نشانِ قدم آج محفوظ نہ ہوتے اور خاص وہاں نماز کا حکم فرما کر اس مقام کی عزت اور احترام کو بیان نہ کیا جاتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ حضرت ابراہیم کے قدموں کے نشانات محفوظ رہیں اور تاجدارِ انبیاء ﷺ کی کوئی نشانی محفوظ نہ رہے!!! یہاں ان حضرات کے لیے لمحۂ فکر ہے جو بات بات پر تعظیم اور احترام کو بدعت قرار دیتے ہیں!

(۳) اللہ عزوجل کا ارشاد پاک ہے: "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" بے شک صفا اور مروہ (دونوں) اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ (البقرۃ:۱۵۸)

اس آیت مبارکہ میں صفا اور مروہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی قرار دیا ہے۔ "صفا اور مروہ"

حرم مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ بی بی ہاجرہ علیہا السلام نے پانی کی تلاش میں دوڑ لگائی تھی۔حضرت بی بی ہاجرہ کے قدموں کی اس نسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دونوں پہاڑیوں کو محفوظ فرمادیا اور انہیں اپنی نشانی قرار دیا۔بلکہ تا قیام قیامت مسلمانوں پر اس مقام کی حاضری واجب فرما کر ہمیشہ کے لیے اس کو یادگار اور تاریخ کا حصہ بنادیا۔لہٰذا ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نیک بندوں کے نشانات و تبرکات اور یادگار کو محفوظ رکھنا خود رب ذوالجلال کی سنت ہے۔لہٰذا جو شخص یہ کہے کہ ''کسی نشانی اور تبرک کو محفوظ نہیں رکھنا چاہیے'' اسے یہ ضرور سوچ لینا چاہیے کہ اللہ عزوجل کے اس فعل کا کیا حکم ہوگا!!!

(۴) ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند موئے مبارک محفوظ تھے۔جب کوئی شخص بیمار ہوتا تو لوگ بڑے برتن میں پانی بھر کر حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجتے۔حضرت ام سلمہ اس پانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موئے مبارک ہلا دیتیں۔اور پھر وہ پانی بیمار آدمی کو پلا دیا جاتا۔

(صحیح بخاری شریف ج ۲ ص ۸۷۵:۵۸۹۶)

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالوں کے وسیلہ سے شفاء ملتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ تبرکات کو محفوظ رکھنا صحابۂ کرام اور صحابیات سے ثابت ہے۔لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط اور جہالت ہے کہ ''سوائے نیک اعمال کے کسی نشانی کو محفوظ نہیں رکھنا چاہیے۔''

(۵) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک عالی شان جبۂ مبارکہ محفوظ تھا۔ایک موقع پر حضرت اسماء نے فرمایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جبہ ہے پہلے یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا۔ان کے انتقال کے بعد یہ میری ملکیت میں آیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو زیب تن فرمایا کرتے تھے اور ہم اب اس کو پانی میں ڈال کر بیماروں کے لیے اس کے ذریعہ شفاء حاصل کرتے ہیں۔(صحیح مسلم شریف: ۲۰۶۹، سنن ابوداؤد: ۴۰۵۴)

اس حدیث شریف میں بھی وسیلہ اور تبرکات کی حفاظت کا ثبوت واضح طور پر موجود

ہے۔لہٰذا یہ کہنا بہت بڑی نادانی ہے کہ ”سوائے نیک اعمال کے کسی نشانی کو محفوظ نہیں رکھنا چاہیے۔“

(۶) امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک عورت خوبصورت بُنے ہوئے کناروں والی چادر لیکر حاضر ہوئی اس نے عرض کیا کہ یہ چادر میں نے خود بُنی ہے اور آپ کی خدمت میں پہننے کے لیے پیش کر رہی ہوں۔رسول اللہ ﷺ نے بہت خوشی سے اس کو قبول فرمایا اور پھر تہ بند کی صورت میں پہن کر باہر تشریف لائے تو سیدنا عبدالرحمٰن ابن عوف یا سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی یہ چادر کتنی اچھی ہے ! مجھے عطا فرمادیجئے۔اس سوال پر حاضرین نے کہا کہ تم نے اچھا نہیں کیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ چادر خود اپنے لیے پسند فرمائی تھی اور تمہیں یہ معلوم ہے کہ آپ ﷺ کسی سائل کو مایوس نہیں فرماتے اس کے باوجود تم نے سوال کیا؟انہوں نے جواب دیا کہ:”انی واللہ ماسئلتہ لالبسھا وانما سالتہ لتکون کفنی قال سھل فکانت کفنہ“یعنی خدا کی قسم !رسول اللہ ﷺ سے میں نے یہ چادر پہننے کے لیے طلب نہیں کی ہے بلکہ اس لیے طلب کی ہے تاکہ یہ میرے انتقال کے وقت میرا کفن بن جائے۔راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ چادر مبارک اس صحابی کے کفن میں استعمال ہوئی۔

(صحیح بخاری' کتاب الجنائز ج ا ص ۱۷۰)

(۷) حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس وہ خوشبو محفوظ تھی جو رسول اللہ ﷺ کے جسد اقدس سے وصال مبارک کے وقت بچ گئی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی کہ میرے انتقال کے وقت اس کو خوشبو کے طور پر استعمال کیا جائے۔یعنی اس کو میرے جسم پر مَل دیا جائے۔(امام نووی نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔)(المستدرک ج ا ص ۳۶۱)

(۸) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کا ایک کرتا مبارک' ناخن شریف اور موئے مبارک محفوظ تھے۔آپ نے وصیت فرمائی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو قمیص مبارک کو میرے کفن میں جسم سے متصل رکھنا اور موئے مبارک و ناخن

شریف کو میرے منہ میں اور آنکھوں میں اور پیشانی پر اور دیگر اعضاءِ سجدہ پر رکھ دینا۔

(الاستیعاب علیٰ حاشیہ الاصابہ علامہ ابن عبد البر ج ۳ ص ۳۹۹)

(۹) خادم رسول ﷺ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی ایک چھڑی شریف اور موئے مبارک محفوظ تھے۔ آپ کو جب کفن دیا گیا تو وصیت کے مطابق چھڑی شریف کو آپ کے سینہ پر رکھا گیا اور موئے مبارک کو آپ کی زبان کے نیچے رکھا گیا اور اسی حالت میں آپ کو دفن کیا گیا۔

(الاصابہ ج ا ص ۲۷ ' ابن عساکر ج ۵ ص ۷۵)

(۱۰) حضرت سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کے کچھ موئے مبارک موجود تھے جو انہوں نے اپنی ٹوپی میں محفوظ کئے ہوئے تھے۔ اور آپ جب بھی کسی جنگ میں شرکت فرماتے تو اس ٹوپی کو ضرور پہن لیتے۔ ائمہ تاریخ بیان فرماتے ہیں کہ کسی جنگ میں ان کی وہ ٹوپی سر سے گر گئی تو وہ کافی دیر تک کسی چیز سے اس کو باندھنے میں لگے رہے۔ اس دوران جو مسلمان شہید ہوئے اس پر صحابہ کرام نے حضرت خالد بن ولید کے سامنے ناراضگی کا اظہار کیا۔ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''لم افعلها بسبب القلنسوة بل لما تضمنته من شعره ﷺ لئلا اسلب بركتها وتقع في ايدی المشركين'' جنگ کے دوران اس ٹوپی کے باندھنے میں میں صرف اس لیے لگا ہوا تھا کہ اس ٹوپی میں سید عالم ﷺ کے موئے مبارک محفوظ تھے' مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ٹوپی مشرکین کے ناپاک ہاتھوں میں چلی جائے اور میں اس کی برکتوں سے محروم ہو جاؤں۔ (الشفاء مع شرح العلامہ علی القاری الحنفی ج ۲ ص ۹۹ 'مطبوعہ بیروت لبنان)

یہ روایت بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ ﷺ کے تبرکات کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور قدم قدم پر ان تبرکات کی حفاظت اور عزت و توقیر کرتے تھے۔ بلکہ خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے نعلین شریفین کو محفوظ رکھنے کی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ چنانچہ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عیسیٰ بن طہمان نے بیان کیا کہ حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہمارے پاس دو جوتے پہن کر تشریف لائے' ان جوتوں میں دو تسمے تھے۔ (امام بخاری فرماتے ہیں) ثابت البنانی نے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے نعلین شریفین ہیں۔

(صحیح بخاری' کتاب اللباس' باب ۴۱)

امام بخاری کتاب الخمس میں پھر عیسیٰ بن طہمان کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ہمارے پاس دو جوتے پہن کر تشریف لائے جن پر کوئی بال نہیں تھا۔ ثابت البنانی نے بعد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بتایا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے نعلین شریفین تھے۔ (صحیح البخاری' کتاب الخمس' باب ۵' الترمذی فی الشمائل' باب ۱۰)

ان تمام روایات سے یہ بات بالکل روشن ہوگئی کہ تبرکات کی تعظیم اوران کا احترام' یا تبرکات کے وسیلہ سے بارگاہِ الٰہی میں دعاء کرنا یا شفاء وصحت اور مغفرت کی امید رکھنا ۱۴ ویں صدی کی بدعت نہیں ہے بلکہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سنّت اور طریقہ سے ثابت ہے۔ تبرکات کی تعظیم اور مقدس نشانیوں کی حفاظت کرنا اگر شرعاً جائز نہ ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سرکار دو عالم ﷺ کے کسی تبرک کی قطعاً حفاظت نہ فرماتے۔ اب اگر ان واضح دلائل کے باوجود کوئی شخص تبرکات کی حفاظت کو عقل کے خلاف سمجھے اور ناجائز بتائے تو یقیناً ایسا شخص آیاتِ قرآنیہ' احادیث نبویہ اور صحابہ کرام کے طریقہ سے منحرف ہے۔ بالفاظ دیگر ایسا شخص تبرکات کی حفاظت کو خلافِ شریعت قرار دے کر صحابہ کرام کی مقدس شخصیات پر زبانِ طعن دراز کرنے کا مرتکب ہے۔ ایسے شخص کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے!!!

سائل کے انداز کلام پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد اب ہم یہ بیان کریں گے کہ اہل اسلام کے درمیان رسول اللہ ﷺ کے نعلین شریفین کا جو نقش معروف ہے وہ کسی کا خود ساختہ اور ایجاد کردہ نہیں ہے' بلکہ امّت کے مستند اور معتمد ائمہ و اکابرین (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے ثابت ہے۔ جن میں امام ابونعیم صاحب حلیۃ الاولیاء' امام ابن جوزی' امام ابن عساکر' امام علی بن احمد سمہودی' صاحب دلائل الخیرات امام جزولی' امام ابن حجر مکّی' امام محمد بن عبدالباقی زرقانی' حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی' امام سخاوی اور امام جلال الدین سیوطی کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ ان تمام اکابرین واسلاف امّت کی علمی' فکری

اور فقہی حیثیت پر اہلسنت اور دیوبند کے علماء سب متفق ہیں۔ان شخصیات کی کتب اور تحقیقات سے جملہ مکاتبِ فکر میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے ائمہ و مشائخ کی اتنی عظیم جماعت کسی جھوٹ پر جمع نہیں ہو سکتی' چہ جائیکہ وہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقشِ نعلین کا ہو۔اور یہ معاملہ اس قدر نازک ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف جھوٹ کی نسبت کی وہ صحیح احادیث کے مطابق آتشِ دوزخ کا مستحق اور شدید قابلِ مذمت ہے۔اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے امت کے اکابرین اور ائمہ دین کا نعلین شریفین کے نقش پر متفق ہونا اور اپنی کتب میں اس کی برکات کو بیان کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نعلین شریفین کا نقش بالکل برحق اور درست ہے۔پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اب چودہویں صدی میں آ کر کچھ لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے' ورنہ اس سے پہلے تمام اکابر محدثین و محققین اور جمیع عالم اسلام کا اس بات پر اتفاق رہا کہ معروف نقشِ نعلین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کے نعلین شریفین کا نقش ہے اور اس سے برکات حاصل کرنا جائز ہے۔اور ترمذی و ابن ماجہ کی صحیح حدیث کے مطابق امت مسلمہ کا گمراہی پر متفق ہونا ممکن نہیں۔سو جس نقش کو امت کے اکابرین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا اور سب نے متفقہ طور پر اسے قبول کیا اس کو گمراہی کیونکر کہا جا سکتا ہے؟

نقش نعلین شریفین کے متعلق بطور مثال چند علماء امت کی تحقیقات

☆ مشہور اور مستند مؤرخ حافظ امام ابن کثیر دمشقی اپنی معروف اور معتبر کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھتے ہیں:

۶۰۰ھ اور اس کے بعد کے زمانے میں یہ بات لوگوں میں معروف ہوئی کہ ابن ابی الحدرد نامی تاجر کے پاس ایک نعل (جوتا) ہے جس کے متعلق اس کا بیان یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعل شریف ہے۔چنانچہ ملک اشرف موسیٰ بن الملک العادل ابوبکر بن ایوب نے اس سے ایک بہت بڑی رقم کے عوض وہ نعل شریف خریدنا چاہی تو اس تاجر نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔اتفاق سے کچھ عرصے بعد اس تاجر کا انتقال ہو گیا اور وہ نعل شریف مذکورہ بادشاہ کے پاس پہنچ گئی۔اس نے اس نعل شریف کی بہت تعظیم و توقیر کی اور جب اس نے دارالحدیث اشرفیہ تعمیر کروایا تو نعل شریف کو اس کے خزانے میں محفوظ کر دیا اور باقاعدہ

اس پر ایک خادم مقرر کیا جس کی ماہانہ تنخواہ اس نے چالیس درھم مقرر کی۔ (امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ) وہ نعل شریف اب تک اس مذکورہ مکان میں موجود ہے۔

(تاریخ ابن کثیر ج ۶ ص ۸ 'مطبوعہ بیروت لبنان)

☆ عالم اسلام کے نہایت معروف اور مستند سیرت نگار امام احمد بن محمد القسطلانی علیہ الرحمہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''المواھب اللدنیہ'' میں نقش نعلین شریفین کے متعلق اپنی تحقیق رقم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وقد ذكر ابو اليمن بن عساكر تمثال نعله الكريمة عليه افضل الصلوة والسلام في جزء مفرد رويته قراءة وسماعا. وكذا افرده بالتاليف ابو اسحاق ابراهيم بن محمد بن خلف السلمي المشهور بابن الحاج من اهل المرية بالاندلس وكذا غيرهما. ولم اثبتها هنا اتكالا على شهرتها وصعوبة ضبط تسطيرها الا على حاذق. ومن بعض ما ذكر من فضلها وجرب من نفعها وبركتها ماذكره ابو جعفر احمد بن عبد المجيد وكان شيخا صالحا قال بحذوت هذا المثال لبعض الطلبة فجاء نى يوما فقال لى رأيت البارحة من بركة هذا النعل عجبا. اصاب زوجي وجع شديد كاد يهلكها فجعلت النعل على موضع الوجع وقلت اللهم ارني بركة صاحب هذا النعل فشفاها الله للحين. وقال ابو اسحاق: قال ابو القاسم بن محمد ومن ما جرب من بركته ان من امسكه عنده متبركا به كان له اما نا من بغي البغاة وغلبة العداة وحرزا من كل شيطان مارد وعين كل حاسد وان امسكته المرأة الحامل وقدا شتد عليها الطلق تيسر امرها بحول الله وقوته''.

(المواھب اللدنیہ ج ۲ ص ۴۶۶ '۴۶۷ 'مطبوعہ ہندوستان)

یعنی حافظ ابوالیمن ابن عساکر نے ایک علیحدہ رسالے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین شریفین کا نقش نقل کیا ہے۔ اسی طرح علامہ ابن الحاج نے بھی اس پر ایک مستقل رسالہ تالیف فرمایا ہے۔ نعلین شریفین کا یہ نقش بہت مشہور و معروف ہے اور جس شخص کو نقشہ اور تصویر نقل کرنے میں مہارت نہ ہو اس کے لیے یہ کام دشوار ہے' اس لیے میں نے اپنی اس کتاب میں

اس نقش کو نقل نہیں کیا۔ البتہ اس نقش کے فضائل اور تجربات سے جو اس کے فوائد و برکات ثابت ہیں ان کو امام ابو جعفر احمد بن عبدالمجید جو کہ بہت نیک بزرگ تھے' نے ذکر فرمائے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک طالب علم کو نعلین شریفین کا نقش دیا' اس نے مجھے ایک دن آ کر بتایا کہ گذشتہ رات میں نے اس نقش کی عجیب و غریب برکت دیکھی۔ ہوا یہ کہ میری زوجہ کو شدید تکلیف اٹھی' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی اس تکلیف سے مر جائے گی۔ میں نے نعلین شریفین کا یہ نقش تکلیف کی جگہ پر رکھ دیا اور اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کی: اے اللہ! مجھے اس نقش والے کی برکتیں دکھا۔ یہ دعا کرنے کی دیر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اس کو شفاء عطا فرما دی۔

اس عبارت کو ذکر کرنے کے بعد علامہ قسطلانی علیہ الرحمہ نے امام ابن عساکر' علامہ ابن الحاج اور علامہ ابوبکر قرطبی کے وہ اشعار اور قصیدے ذکر فرمائے ہیں جو ان بزرگوں نے رسول محتشم ﷺ کی نعلین شریفین کے نقش کی تعریف و توصیف اور فضائل و مناقب میں تحریر فرمائے ہیں۔ (تفصیل کے لیے المواہب اللدنیہ' ج ۲ ص ۴۶۷ تا ۴۷۰ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔)

☆ اہلسنت اور دیوبند کے درمیان مستند اور متفق علیہ محقق' حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معروف اور معتبر کتاب ''مدارج النبوۃ'' میں نقش نعلین شریفین کے متعلق فرماتے ہیں:

بعض علماء نے نعلین شریف کے نقشے کے بارے میں علیحدہ رسالے لکھے ہیں اور ان رسائل میں نقش نعلین سے حاصل ہونے والے فوائد اور برکتیں بیان فرمائی ہیں۔ اور مواہب لدنیہ میں اس کا تجربہ لکھا ہے کہ درد والی جگہ پر نعلین شریف کا نقشہ رکھنے سے درد سے نجات ملتی ہے اور اپنے پاس رکھنے سے سفر میں لوٹ مار سے محافظت ہوتی ہے اور شیطان کے مکر و فریب اور حاسدین کی شرارت و فساد سے امن و عافیت رہتی ہے اور مسافت طے کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کی تعریف و مدح اور اس کے فضائل میں با قاعدہ قصیدے لکھے گئے ہیں۔

(مدارج النبوۃ مترجم ج ۱ ص ۸۰۱)

☆ نعلین شریفین کے موضوع پر دسویں صدی ہجری کے بزرگ ''امام احمد المقری التلمسانی'' (علیہ الرحمہ) نے ''فتح المتعال فی مدح النعال'' کے نام سے ایک مدلل اور مبسوط

کتاب تحریر فرمائی ہے جو اب ''فضائل نعلین حضور (ﷺ) کے نام سے اردو ترجمہ کے ساتھ بازار میں دستیاب ہے۔اس میں امام تلمسانی نے معروف نقش نعلین کی مختلف تصاویر اس نقش کو نقل کرنے والے علماء امت کے نام ہر ایک کی سند نقش نعلین کی برکات اور دیگر امور پر تفصیل سے بحث کی ہے۔اس کتاب میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نعلین شریفین کا نقش امت مسلمہ کے پاس حضرت ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور آپ کی بہن حضرت ام کلثوم بنتِ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واسطہ سے پہنچا ہے۔اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جن ائمہ واکابرین نے اپنی کتابوں میں نعلین شریفین کا نقش پیش کیا ہے انہوں نے پوری سند کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ کسی کو اس میں کسی قسم کا اعتراض اور شبہ نہ رہے۔

☆نعلین شریفین کے نقش اور اس سے برکتوں کے حصول پر اعلیٰ حضرت امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان نے بھی ایک مبسوط اور مدلل رسالہ تحریر فرمایا ہے۔(یہ رسالہ ''شفاء الوالہ فی صور الحبیب ومزارہ ونعالہ'' کے نام سے فتاویٰ رضویہ ج ۲۱ میں موجود ہے۔) اس میں آپ نے پوری تحقیق سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ نعلین شریفین کا نقش ۱۴ ویں صدی کی ایجاد نہیں ہے بلکہ اس نقش کا انکار کرنا اور اس کے خلاف زبانِ طعن دراز کرنا اس صدی کی بدعت ہے۔آپ نے اپنے اس رسالہ میں ۸۰ علماء ومشائخ اور ائمہ دین کے نام پیش کئے ہیں جنہوں نے نعلین شریفین کا نقش بنوایا بنوا کر اسے آگے پہنچایا اس کی تعریف میں قصیدے لکھے اس سے برکتیں حاصل کرنے بوسہ دینے اور سر آنکھوں پر لگانے کا درس دیا۔اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا یہ رسالہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

اسی طرح مسلک دیوبند کے پیشوا شیخ اشرف علی تھانوی نے بھی نقش نعلین شریفین کے فضائل وبرکات کے موضوع پر ''نیل الشفاء بنعل المصطفیٰ'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا تھا جس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ اپنی مشہور کتاب ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب'' (ﷺ) میں لکھتے ہیں کہ: رسالہ نیل الشفاء مؤلفہ احقر میں حضور ﷺ کے نقشہ نعل شریف کے برکات وخواص مذکور ہیں۔جب صرف ان الفاظ میں جو کہ آپ کے معنی ومدح کے صورت ومثال ہیں اور پھر ان نقوش میں جو کہ ان الفاظ پر دال ہیں اور اس ملبوس میں جو کہ آپ کی نعال ہیں اور پھر ان نقشوں میں جو کہ ان نعال کی تمثال ہیں سو خود آپ کی ذات مجمع الکمالات واسماء

جامع البرکات سے توسل حاصل کرنا اور اس کے وسیلے سے دعا کرنا کیا کچھ نہ ہوگا!

(نشر الطیب ص ۲۶۸ 'مطبوعہ دار الاشاعت کراچی)

بانی دیوبند کی اس عبارت میں نہ صرف نعلین شریفین کے نقش کی تعریف و توصیف ہے بلکہ اس کی برکات کا بھی ذکر ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وسیلے کے جائز ہونے کے بارے میں یہ عبارت تھانوی صاحب کے پیروکاروں پر واضح حجت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ نعلین شریفین کا جو نقش امّت مسلمہ کے درمیان معروف اور رائج ہے وہ امام تلمسانی علیہ الرحمہ اور دیگر محققین کی تحقیق کے مطابق حضرت سیّدہ عائشہ اور آپ کی بہن حضرت امّ کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا صدقہ ہے۔ اور تاریخ میں ہمیشہ اس نقش کی حیثیت 'مسلّم اور غیر متنازع رہی ہے۔ اب بدقسمتی سے کچھ ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں جو اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و توقیر سے بہت کتراتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو مٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہم ابتداء میں وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا کس قدر احترام اور حفاظت کرتے تھے۔ اور "الحمد لله علیٰ احسانه" "اہل سنّت و جماعت" صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس ورثہ کے امین ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ امت مسلمہ کو ایمان کی حلاوت اور ادب و احترام کی توفیق دے۔ بے ادبی اور بے ادبوں سے محفوظ رکھے۔ آمین واللّٰه ورسوله اعلم بالصواب

خلفاءِ ثلاثہ اور سیدہ عائشہ صدیقہ کو لعن طعن کرنے والے کا شرعی حکم

سوال:

جو شخص حضرات خلفاء ثلاثہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو (معاذ اللہ) برا بھلا کہتا اور گالیاں دیتا ہو' ایسے شخص کے بارے میں جمہور علماء کا کیا حکم ہے؟ نیز ایسے شخص سے رشتہ داری' دوستی اور اس کی مجلس میں شرکت اور معاشرتی معاملات رکھنا درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی اس مسئلے کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل فرما کر عند اللہ

ماجور ہوں؟ [سائل: گل زمان طاہر، آزاد کشمیر]

جواب:

نبی اکرم نور مجسم ﷺ اور آپ کے جملہ اصحاب کرام، ازواجِ مطہرات اور اولاد امجاد واہل بیتِ اطہار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی تعظیم و توقیر اور عزت و احترام ہمارے ایمان کی اساس اور بنیاد ہے۔ جو شخص نبی پاک ﷺ کے اصحاب کرام پر لعن طعن کرتا ہے یا حضرت ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو برا بھلا کہتا ہے وہ سخت بد مذہب، بدعقیدہ، ملعون اور انتہائی گمراہ ہے۔ حضرت قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

"سب آل بیته و ازواجه و اصحابه ﷺ و تنقصهم حرام ملعون فاعله قال ﷺ لا تسبّوا اصحابی فانه یجئ قوم فی اخر الزمان یسبّون اصحابی فلا تصلّوا علیهم ولا تصلّوا معهم ولا تناکحوهم ولا تجالسوهم وأن مرضوا فلا تعودوهم". (الشفاء باحوال المصطفیٰ ﷺ ج ۲ ص ۵۵۱، مطبوعہ بیروت)

یعنی نبی اکرم ﷺ کے اہل بیت، آپ کی ازواجِ پاک اور صحابہ کرام پر لعن طعن کرنا اور ان کی عظمت گھٹانا حرام ہے اور ایسا شخص ملعون ہے۔ (یعنی قابلِ ملامت و مذمت ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہ کو گالی نہ دینا۔ آخرِ زمانہ میں میرے صحابہ کو گالیاں دینے والے پیدا ہوں گے۔ تم ان کا نہ جنازہ پڑھنا، نہ ان کے ساتھ نماز پڑھنا، نہ ان سے شادی بیاہ کرنا، نہ ان کی صحبت اور مجلس اختیار کرنا، اگر وہ بیمار پڑیں تو ان کی عیادت بھی نہ کرنا۔

صاحبِ شفاء کی مذکورہ عبارت سے واضح ہوا کہ نبی پاک ﷺ کے اصحاب کرام کو سبّ و شتم اور لعن طعن کرنے والا شخص قابلِ لعنت و مذمت ہے اور اس کے ساتھ اپنی استطاعت کے مطابق کسی بھی قسم کی تعلق داری جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اس کی تائید اللہ عزوجل کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جس میں فرمایا: "فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ"۔ نصیحت آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔ (الانعام: ۶۸)۔ ایک اور مقام پر فرمایا: "وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ"۔ یعنی ظالموں کی طرف نہ جھکو ورنہ تمہیں (بھی) آگ چھوئے گی۔ (ھود: ۱۱۳) (یہاں ظالم کے لفظ میں تمام کفار و مرتدین اور بدعقیدہ لوگ داخل ہیں)۔

مذکورہ آیات مبارکہ سے بھی واضح ہے کہ بد مذہب اور بد عقیدہ کی ہم نشینی اور اس سے تعلق داری شرعاً جائز نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ایسا شخص جو نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کرام کو یا آپ کی کسی بھی زوجہ مطہرہ کو سب و شتم کرنے والا ہو اس سے رشتہ داری وغیرہ جائز نہیں ہے۔

واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں حضرات شیخین (سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو سب و شتم کرنے والے کو علماء نے کافر قرار دیا ہے' اسی طرح جو شخص سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو قذف کرے (یعنی بدکاری کی تہمت لگائے) اس کو بھی دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ (کذا فی الدر المختار ج۶ ص ۲۸۶' الفتاویٰ الھندیہ ج۲ ص ۲۶۴' الفتاویٰ الرضویہ ج ۱۴ ص ۲۴۸) واللّٰہ و رسولہ اعلم بالصواب

تصرفاتِ اولیاء کی شرعی حیثیت

سوال:

بزرگوں کے عرس یا اس کے علاوہ دیگر مواقع پر عورتیں مزار پر جاتی ہیں' پاکی ناپاکی کی حالت میں بھلائی کی طلب اور حاجت براری کے لیے۔ اور وہاں بیٹھتی ہیں۔ تو اس طرح ان کا ٹھہرنا وہاں (قبرستان میں) جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو بزرگ صاحبِ مزار میں روکنے کی قوت اور تصرف کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟ جو لوگ تصرفِ اولیاء کے انکار اور مخالفت میں یہی دلیل لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ تصرف کر سکتے ہوتے تو جو رنڈیاں گاتی بجاتی ناچتی ہیں' عورتیں ہوتی ہیں' ان کے بچے پیشاب کرتے ہیں' یہ بزرگ کیوں نہیں روکتے؟ یہ بھی بتا دیں کہ بزرگانِ دین کی قبور پر آنے والے ان کے مہمان ہوتے ہیں' یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

[سائل: محمد ارشد منہاس' میٹرو ول]

جواب:

یہ بات دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطاء سے اولیاء کرام اپنی حیات میں بھی اور بعد از وصال اپنی قبور میں تصرف کا اختیار رکھتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں حضرت سیدنا سلیمان علیہ السلام کے امتی حضرت آصف بن برخیا کا واقعہ موجود ہے کہ انہوں نے ایک آن میں بلقیس کا شاہی تخت پندرہ سو میل کی مسافت سے لا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں

حاضر کر دیا۔ (النمل: ۴۰) اس آیت کے تحت اکابر مفسرین کرام نے اولیاء کرام کی کرامات اور تصرفات پر بحث فرمائی اور ثابت کیا کہ اولیاء کرام سے ایسے امور کا صادر ہونا برحق اور ثابت ہے جو ہماری عقل کے خلاف ہوتے ہیں۔ (حوالہ کے لیے دیکھئے: تفسیر قرطبی ج ۱۳ ص ۱۸۵، تفسیر بیضاوی مع حاشیۃ الشہاب للخفاجی ج ۷ ص ۲۴۷، روح البیان ج ۶ ص ۳۴۸)

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ سورۃ الکہف' آیت: ۱۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وکذالك العبد اذا واظب علی الطاعات بلغ الی المقام الذی یقول الله کنت له سمعا و بصرا فاذا صار نور جلال الله سمعا له سمع القریب والبعید واذا صار ذالك النور بصرا له رأی القریب و البعید واذا صار ذالك النور یدا له قدر علی التصرف فی الصعب والسهل والبعید والقریب". (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۴۳۶)

یعنی بندہ جب نیکیوں پر پابندی اختیار کرتا ہے تو (بالاخر) اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس بندے کے کان اور آنکھ بن جاتا ہوں پس جب جلالِ الٰہی کا نور اس بندے کی سماعت میں جلوہ گر ہو جاتا ہے' تو بندہ قریب کی بھی سنتا ہے اور دور کی بھی سن لیتا ہے اور جب جلالِ الٰہی کا نور بندے کی بصارت میں جلوہ گر ہو جاتا ہے تو بندہ قریب کو بھی دیکھ لیتا ہے اور دور کو بھی۔ اور جب یہی نور اس کے ہاتھ میں روشن ہوتا ہے تو بندہ ہر مشکل اور آسان معاملہ میں اور ہر قریب و بعید میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی ذکر کردہ آیت' اس کی تفاسیر اور خصوصاً امام رازی کی اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اولیاء کرام تصرف کرنے پر قادر ہوتے ہیں' اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جو دلائل سے بے خبر اور جاہل ہو۔ رہا یہ کہ اولیاء کرام عورتوں کو یا دیگر خرابیوں کو روکتے کیوں نہیں؟ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اولیاء کرام تصرف کرنے سے عاجز ہیں۔ اس طرح تو مسجد میں بندہ ناپاکی کی حالت میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس وقت داخل ہونے سے نہیں روکتا! کیا اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تصرف کرنے سے عاجز ہے؟ (العیاذ باللہ تعالیٰ) ہرگز ایسا نہیں ہے۔ پھر اولیاء کرام کے تصرفات کے خلاف ایسی جاہلانہ دلیلیں قائم کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ شرعی اعتبار سے ناپاک مرد یا عورت صرف مسجد میں نہیں جا سکتے' قبرستان میں یا مزار پر اس حالت میں جانا خلافِ ادب تو ہے لیکن حرام نہیں ہے۔ نیز یہ کہنا

بھی درست ہے کہ بزرگانِ دین کی قبور پر آنے والے ان کے مہمان ہوتے ہیں۔ الضیف هو النازل عند غیره دعی او لم یدع. (القاموس الفقہی ص ۲۲۶) مہمان ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کے پاس ٹھہرے۔ خواہ اسے بلایا گیا ہو یا نہ بلایا گیا ہو۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

(تنبیہ:) زیرِ نظر سوال کے جواب میں فتوی جاری کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ سائل مذکور نے یہ سوال فتاوی رضویہ (ج ۹ ص ۵۳۵) سے نقل کر کے ہمیں ارسال کیا ہے۔ حالانکہ بغیر حوالہ دیئے اس طرح کی حرکت انتہائی نامناسب اور غیر شائستہ ہوتی ہے۔ اب ہم یہاں وہ جواب پیش کر رہے ہیں جو اعلیٰ حضرت امام اہل سنت علیہ الرحمۃ والرضوان نے تحریر فرمایا ہے:

عورتوں کو مقابرِ اولیاء و مزاراتِ عوام دونوں پر جانے کی ممانعت ہے۔ اصحاب مزارات دار تکلیف میں نہیں' وہ اس وقت محض اہل تکوینیہ کے تابع ہیں۔ سیکڑوں ناحفاظیاں لوگ مسجدوں میں کرتے ہیں' اللہ عزوجل تو قادر مطلق ہے' کیوں نہیں روکتا؟ حاضرانِ مزار مہمان ہوتے ہیں مگر عورتیں ناخواندہ مہمان۔ (فتاوی رضویہ ج ۹ ص ۵۳۶ 'مطبوعہ لاہور)

جنازے کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھنے کا شرعی حکم اور مُردوں کی قوتِ سماعت پر دلائل

سوال:

میت کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور جو کلمات ہم پڑھتے ہیں وہ مردہ سنتا ہے یا نہیں؟ [سائلہ: مس شبانہ نقشبندی' اورنگی ٹاؤن]

جواب:

میت کے ساتھ بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھنا شرعاً جائز اور باعث ثواب ہے۔ قرآن و سنت میں اس سے کہیں منع نہیں کیا گیا۔ اور جس سے قرآن و سنت منع نہ فرمائیں اس کو کوئی شخص اپنی ذاتی رائے سے منع نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جب کہ کلمہ طیبہ کے ورد کو مسلمان اچھا سمجھتے ہیں تو یہ عمل جائز ہونے کے ساتھ ساتھ باعثِ ثواب بھی ہے۔ ذیل میں اس پر دو دلیلیں

ملاحظہ فرمائیے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ''۔ (سنن ترمذی:۱۷۲۶'سنن ابن ماجہ:۳۳۹۷'مشکوۃ المصابیح:۴۲۲۸)

حلال وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا اور جس کام کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی وہ جائز ہے۔

دوسری دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ: ''ما رأى المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن'' جس عمل کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ (عزوجل) کے نزدیک بھی اچھا ہے۔ (المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۷۸)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ ''الحدیقۃ الندیّہ'' (للامام عبدالغنی نابلسی قدس سرہ) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: سیدی علی خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب جنازہ کے ساتھ چلنے والوں کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ لغو سے باز نہ آئیں گے اور دنیا کی باتوں میں مشغول رہیں گے تو انہیں ''لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' (ﷺ) پڑھنے کا حکم دینا چاہیے' کیونکہ ایسی حالت میں اسے پڑھنا' نہ پڑھنے سے افضل ہے۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم کسی کو ایسے کام سے روکنے کی اجازت نہیں دیں گے جسے مسلمانوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کے لیے ایجاد کیا ہو اور اسے اچھا جانتے ہوں۔ خصوصاً ایسا کام جس کا تعلق خدا تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ہو' جیسے: جنازہ کے آگے ''لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ﷺ'' پڑھنا اور اس کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کرنا یا اور اس جیسے دوسرے کام۔ جو شخص ان کاموں کو حرام کہے اسے شریعت کی سمجھ نہیں ہے۔ اگر تمام شرکاء جنازہ باآواز بلند ''لا الہ الا اللّٰہ'' (یعنی کلمہ طیبہ) کہیں تو اس پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس کی ممانعت میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد وارد نہیں ہے۔ اگر جنازے میں ذکرِ الٰہی ممنوع ہوتا تو کسی نہ کسی حدیث میں یہ حکم وارد ہوتا۔ اور جس چیز سے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابتدائے اسلام میں منع نہ فرمایا ہو وہ بعد میں آکر ہمارے دور میں ممنوع نہیں ہو سکتی۔

(فتاویٰ رضویہ ملخصا ج ۹ ص ۱۴۲)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جنازہ کے ساتھ جو کلمات پڑھے جاتے ہیں ان کو مردہ سنتا ہے یا نہیں؟ سو اس بارے میں جاننا چاہیے کہ مردہ اپنی تجہیز و تکفین سے لیکر نماز جنازہ اور تدفین و بعد تدفین تک کے جملہ معاملات کو دیکھتا سنتا اور پہچانتا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''ان المیت یعرف من یحمله و من یغسله و من یدلیه فی قبره''۔ یعنی مردہ اپنے اٹھانے والوں کو نہلانے والوں کو اور قبر میں اتارنے والوں کو پہچانتا ہے۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۳) ایک روایت کے مطابق پہچاننا سننا تو درکنار مردہ کلام بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا کہ اگر وہ نیک ہو تو کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو اور اگر نیک نہ ہو تو افسوس کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم لوگ جنازہ کہاں لے جا رہے ہو؟ مردہ کی اس آواز کو سوائے انسان کے ہر چیز سنتی ہے اگر انسان اس کی آواز سن لے تو بیہوش ہو جائے۔

(صحیح البخاری و مسند احمد مشکوٰۃ المصابیح ۱۶۴۷)

اسی طرح دفنائے جانے کے بعد مردہ کا سننا متعدد روایات سے ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا: دفنانے والے جب واپس جانے لگتے ہیں تو مردہ ان کے جوتوں کی آہٹ کو سنتا ہے۔ (صحیح البخاری: ۱۳۳۸، صحیح مسلم: ۲۸۷۰) ایک روایت میں فرمایا کہ: ''ما من احد مر بقبر اخیه المؤمن کان یعرفه فی الدنیا فسلم علیه الا عرفه و رد علیه السلام''۔ جو شخص بھی کسی مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جو کہ دنیا میں اس سے واقف تھا اور اسے سلام پیش کرتا ہے تو قبر والا اس کو پہچانتا بھی ہے اور سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔ (ذکرہ العلامۃ ابن عبد البر المالکی فی الاستذکار: ۱۸۵۸، ج ۲ ص ۱۶۵) مذکورہ تمام احادیث میں اس بات کا ثبوت ہے کہ مردہ اپنے مرنے کے بعد بدستور چیزوں کو پہچانتا اور سنتا ہے۔ لہٰذا جنازہ کے ساتھ جو کلمات پڑھے جاتے ہیں ان کو بھی وہ سماعت کرتا ہے اور راحت و سکون پاتا ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

شبِ معراج اور شبِ براءت منانے کی شرعی حیثیت

سوال:

شب معراج اور شب براءت میں جاگنا اور خصوصی دعا وغیرہ کا اہتمام کرنا کیسا ہے؟

[سائل: عبدالحسیب، کراچی]

جواب:

اسلام میں کسی رات جاگنے اور عبادت کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ ہر رات عبادتِ الٰہی کے لیے بیدار رہنا بلاشبہ مشروع اور جائز ہے۔ لیکن مسلمانوں میں چند مخصوص راتیں جاگنے اور نوافل و استغفار کے حوالہ سے معروف ہوگئی ہیں۔ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

مذہب اسلام کا قانون یہ ہے کہ جو کام عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں نہ ہوا ہو اور بعد میں اسے لوگ رائج کردیں تو وہ کام شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ شریعت میں اس کی ممانعت نہ آئی ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها**" جس نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا اسے اس کا اجر و ثواب ملے گا اور جتنے لوگ اس طریقہ پر چلیں گے ان کا ثواب بھی اسے ملتا رہے گا۔ (صحیح مسلم: ۱۰۱۷)

علاوہ ازیں سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: "**وما سکت عنه فهو مما عفا عنه**" جس چیز سے شریعت خاموشی اختیار فرمائے وہ جائز ہے۔

(سنن ترمذی: ۱۷۲۶، سنن ابن ماجہ: ۳۳۹۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۲۲۸)

مراد یہ ہے کہ اگر کسی جائز عمل سے شریعت نے منع نہ فرمایا ہو تو اسے کرنا جائز ہے۔ معراج کی رات یا براءت کی رات جاگنے اور نوافل پڑھنے سے شریعت نے منع نہیں فرمایا۔ لہٰذا حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ جائز ہے۔ اگر کوئی اس کو بدعت اور اضافہ سمجھتا ہے تو وہ اس سے گزشتہ حدیث میں غور کرے جس میں اچھا طریقہ رائج کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے۔ مزید اطمینانِ قلب کے لیے ہم یہاں خاص طور پر شب براءت اور اس میں عبادت کے لیے جاگنے کے ثبوت میں دو احادیث پیش کر رہے ہیں:

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کو

موجود نہ پایا' دیکھا کہ آپ ﷺ بقیع شریف (قبرستان) میں تھے۔ (وہاں سرکار نے فرمایا:) اللہ تعالیٰ پندرھویں شعبان کی رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے تو قبیلہ بنو کلب کی بکریوں سے زیادہ لوگوں کی بخشش فرماتا ہے۔

(ترمذی' ابن ماجہ' مسند احمد' مشکوٰۃ شریف ص ۱۱۴)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ شب براءت میں جاگنا اور قبرستان جانا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔

(۲) حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب پندرہ شعبان کی رات ہو تو رات میں قیام کرو (جاگ کر عبادت کرو) دن میں روزہ رکھو۔ کیونکہ اس رات میں اللہ تعالیٰ سورج ڈوبتے ہی آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: ہے کوئی معافی مانگنے والا! میں اسے بخشش عطا کروں؟ ہے کوئی روزی مانگنے والا! میں اسے روزی عطا کروں؟ ہے کوئی بیمار! میں اسے شفاء عطا کروں؟ اس طرح کی صدائیں طلوع فجر تک جاری رہتی ہیں۔ (سنن ابن ماجہ' مشکوٰۃ شریف ص ۱۱۵)

اس حدیث میں خود رسول اللہ ﷺ نے شب براءت کی عبادات اور اس میں جاگنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا یہ عمل شرعاً جائز اور احادیثِ مبارکہ کے عین مطابق ہے۔ ہاں! وہ لوگ جو اس رات جاگ کر آتش بازی کرتے ہیں' لوگوں کو اذیت دیتے ہیں وہ سخت گناہ گار اور عذاب الٰہی کے مستحق ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے اچھے اعمال کو بدعت قرار دینا سخت ناانصافی ہے۔ کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ جب کسی اچھے عمل میں لوگ برائی پیدا کردیں تو لوگوں کو اس اچھے عمل سے روکنے کے بجائے غلطی سے منع کیا جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی غلط نماز ادا کرتا ہے تو اسے نماز سے روکنے کے بجائے غلطی سے روکیں گے۔ اسی طرح اگر بعض جہلاء کسی مزار پر سجدہ کرتے ہیں تو لوگوں کو مزار کی حاضری سے روکنے کے بجائے جہلاء کو سجدہ کرنے سے منع کریں گے۔ یونہی اگر لوگ شادی اور ولیمہ کی تقاریب میں سنتِ رسول ﷺ کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو لوگوں کو شادی سے منع کرنے کے بجائے شرعی خلاف ورزی سے منع کریں گے۔ اسی طرح شبِ براءت اور شب معراج میں اگر کوئی خلاف شرع کام کرتا ہے تو اسے اس برے عمل سے روکا جائے گا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

زیادہ ہنسی مذاق، فحش گفتگو، علماء و اساتذہ کی بے ادبی کرنے اور کفریہ کلمات بکنے والے کا شرعی حکم

سوال:

زید انتہائی بدزبان ہے، فحش قسم کی گفتگو کرتا ہے، ماں بہن کی گالیاں دیتا ہے، علمائے اہلسنت کی نقل کرتا ہے، اپنے استادوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو ہنسانے کے لیے ایسے لطیفے سناتا ہے جن میں بعض اوقات صریح کفر ہوتا ہے حالانکہ اس کے سامنے قرآن و حدیث فقہ اصولِ فقہ اور دیگر کتب درس نظامی موجود ہوتی ہیں انہیں اپنے سامنے کھول کر رکھتا ہے تاکہ ڈانٹ سے بچ جائے۔ بکر ۵ ماہ سے اس کے ساتھ ہے، ہر طرح سے اسے سمجھاتا ہے لیکن وہ باز نہیں آتا۔ چند روز پہلے زید نے ملک قوم کے بارے میں یہ لطیفہ سنایا کہ ملِک قوم (برادری) جہنم میں جمع ہوگی جب ان کے رشتہ دار باہر سے گزریں گے تو یہ کہیں گے کہ کہاں جا رہے ہو؟ آؤ آؤ ہمارے پاس آؤ۔ اس پر بکر نے زید سے کہا کہ تم احتیاط کیا کرو اللہ کے عذابات کو معمولی جاننا کفر ہوتا ہے تو اس پر زید نے بڑی دلیلوں سے کہا کہ تم لوگ بات بات پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہو۔ بھلا زبان سے بھی کوئی کفر ہوتا ہے تمہیں کیا معلوم کہ میرے ایمان کی کیفیت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مختلف ہوسکتی ہے لیکن میرے ایمان کی کمیت (مقدار) حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایمان کی کمیت کے برابر ہے۔ اس دن سے بکر نے زید سے قطع تعلق کرلیا۔ برائے مہربانی قرآن و حدیث کی روشنی میں فرمائیں کہ زید کے لیے کیا حکم ہوگا؟ زید کے نکاح اور امامت کا از روئے شرع کیا حکم ہے؟ جو لوگ اس طرح کے لطیفوں کو سن کر خاموش رہتے ہیں یا ہنستے ہیں ان کے لیے کیا حکم ہے؟ اور کیا یہ کوشش زید کی غیبت تو نہ کہلائے گی؟ [سائل: عبد مصطفیٰ، گلشنِ اقبال]

جواب:

مسئلہ سوال میں جو صورتِ حال بیان کی گئی ہے اس کی رو سے زید نامی شخص کئی وجوہ سے قابلِ مذمت اور شدید مرتکبِ گناہ ہے۔ بدزبانی، گالی گلوچ اور فحش گوئی صاحبِ ایمان کی

شان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نقل اتارنا اور مذاق اڑانا کسی عام مسلمان کا بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ وہ استاذ اور صاحب علم ہو۔ زید چونکہ علی الاعلان ان سب حرکات کا مرتکب ہے اس لیے اس کے فاسق و فاجر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

پھر ان سب پر مستزاد یہ کہ زید دوسروں کو ہنسانے کے لیے کفریہ باتوں پر مشتمل لطائف بھی سناتا ہے (مثلاً گفتگو میں عذابِ جہنم کو بطور مذاق استعمال کرتا ہے) ایسے لطائف سنانا نہ صرف گناہ بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ یہ عذابِ الٰہی کا استخفاف ہے۔ اور ''استخفاف'' کے متعلق علامہ شامی قدس سرہ فرماتے ہیں: ''ما کان دلیل الاستخفاف یکفر وان لم یقصد الاستخفاف''۔ ہر وہ بات جس سے استخفاف ثابت ہو وہ موجب کفر ہے، اگرچہ قائل نے استخفاف کا ارادہ نہ کیا ہو۔ (فتاویٰ شامی ج ۶ ص ۲۷۰)

لہٰذا جنت یا دوزخ وغیرہ کو موضعِ مذاق میں استعمال کرنا اگرچہ استخفاف کے ارادہ سے نہ ہو، تاہم ''موضعِ مذاق'' چونکہ دلیلِ استخفاف ہے اس لیے اس کو کفر قرار دیا جائے گا۔

زید کا وہ جملہ جس میں اس نے اپنے ایمان کی کمیت کو رسول اللہ ﷺ کے ایمان کی کمیت کے مساوی قرار دیا ہے، اس کے متعلق اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ جو شخص کفریہ لطائف سناتا ہو پہلے وہ اپنا ایمان ثابت کرے اس کے بعد کمیت اور مقدار کی باتیں کرے۔ کیونکہ ایمان اصل ہے اور کمیت وصف۔ جب ''اصل'' کا وجود معرضِ خطر میں ہو تو وصف کے پیچھے دوڑنا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں۔

الحاصل زید پر لازم ہے کہ تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جملہ بدگوئیوں سے سچی توبہ کرے۔ اور چونکہ شرعی ضابطہ ہے کہ اعلانیہ گناہ سے اعلانیہ رجوع کیا جائے اس لیے زید پر لازم ہے کہ اسی فراخدلی کے ساتھ توبہ و تجدید کرے جس فراخدلی کے ساتھ اس نے مذکورہ جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ جو افراد زید سے کفریہ لطائف سنتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ لطائف فلاں فلاں وجہ سے کفر پر مشتمل ہیں اس کے باوجود زید کو روکنے کے بجائے ہنس کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ان سب کا بھی یہی حکم ہے۔ نیز سائل کی یہ کوشش (استفتاء و استفسار) چونکہ زید اور اس کے ہمنواؤں کو فسق و کفر سے بچانے کے لیے ہے اس لیے یہ غیبت نہیں ہے۔

شرعی حکم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد بطورِ نصیحت یہ بات ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''چرب زبانی'' علی العموم بہت خطرناک تباہی کا سبب بنتی ہے۔ بسا اوقات انسان کفریہ باتیں بھی بول جاتا ہے۔ طبیعتِ انسانی میں جب یہ صفتِ رذیلہ راسخ ہو جاتی ہے تو انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لیے کئی لوگوں کا اطمینان اور سکون برباد کر جاتا ہے۔ حتی کہ اسے نصیحتیں کڑوی معلوم ہوتی ہیں' اصلاح کرنے والے ''دشمن'' نظر آتے ہیں اور منافقین کی مثل وہ اپنے فساد کو اصلاح سمجھ بیٹھتا ہے' ہزار تاویلات کر کے وہ اپنے فِسق کو عین ایمان ثابت کر لیتا ہے۔ الغرض دماغی مریض کی مانند ایسے شخص کی حالت بھی بہت عجیب و غریب اور قابلِ رحم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک زید نامی شخص اسی عدمِ توازن کا شکار ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ زید کے لیے اس کا علم نفع بخش ثابت نہ ہوسکا۔ اور ''چرب زبانی'' کے مرض میں مبتلا کر کے شیطان نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ (والعیاذ باللہ العظیم!) رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''علیک بطولِ الصمت فانه مطردة للشیطان وعون لك علی امر دینك'' کافی کافی دیر تک چپ رہا کرو' یہ شیطان کو دور کرنے کا ذریعہ ہے اور تمہارے دینی معاملات میں تمہارے لیے مدد و معاون ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی' مشکوٰۃ المصابیح)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت خیر دے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

جمعرات کو مومنین کی ارواح کا اپنے گھروں میں آنا

سوال:

ہر جمعرات کو مؤمنین کی ارواح اپنے گھروں میں آ کر گھر والوں سے صدقہ و خیرات کے لیے ندا کرتی ہیں؟ آیا ایسا ہے یا نہیں؟ [سائل: محمد افضل قادری' کورنگی' کراچی]

جواب:

ہر جمعرات کو مؤمنین کی ارواح کا اپنے گھروں میں آ کر صدقہ و خیرات کی ندا کرنا فقہاء

کی تصریحات سے ثابت ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی نوراللہ مرقدہ نے اس پر رسالہ تصنیف فرمایا ہے اور اس میں دلائل سے زیر بحث مسئلہ کو ثابت کیا ہے۔ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''در بعض روایات آمدہ است کہ روح میّت می آید خانہ خود را شب جمعہ پس انتظار می کند کہ تصدّق می کنند از وے یا نہ'' بعض روایات میں آیا ہے کہ روح شب جمعہ کو اپنے گھر آتی ہے اور انتظار کرتی ہے کہ گھر والے ان کے ایصالِ ثواب کے لیے صدقہ کرتے ہیں یا نہیں؟ (اشعۃ اللمعات شرح مشکوۃ ج ا ص ۷۱۶۔۷۱۷)

پھر ایک رسالہ ''کشف الغطاء عما لزم للموتی علی الاحیاء'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

غرائب اور خزانہ میں منقول ہے کہ مومنین کی روحیں ہر شب جمعہ، روز عید، روز عاشوراء اور شب براءت کو اپنے گھر آکر باہر کھڑی رہتی ہیں اور ہر روح غمناک بلند آواز سے ندا کرتی ہے کہ اے میرے گھر والو! اے میری اولاد! اے میرے قرابت دارو! صدقہ کے ذریعہ ہمارے ساتھ مہربانی کرو۔ (کشف الغطاء ص ۶۶) (فتاوی رضویہ ج ۹ ص ۶۵۰، مطبوعہ لاہور)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

محرّم میں واقع ہونے والی بعض خرافات ورسومات کا حکم

سوال:

(۱) علَم یا روضۂ حسین کی شبیہ کسی جاندار چیز کے بغیر ہم گھر میں بنا سکتے ہیں؟

(۲) ایک مقام سے دوسرے مقام تک جلوس کی شکل میں اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور امام حسین کا ذکر کرتے ہوئے جا سکتے ہیں؟

(۳) کوئی شخص اپنے گھر میں یا جہاں علَم اور روضہ حسین رضی اللہ عنہ کی شبیہ ہو وہاں دعا مانگ سکتا ہے اور اگر ہم نے دعا مانگی ہو اور وہ قبول ہو گئی ہو تو اپنی خوشی سے وہاں پھول

اور نیاز دلا سکتے ہیں؟ [سائل: جعفر زیدی، النور سوسائٹی]

جواب:

ہمارے نزدیک زیر بحث فتوے میں سائل کا سوال واضح نہیں ہے۔ اگر سائل کا سوال مرّوجہ تعزیہ اور علَم وغیرہ پر ہونے والی بدعتوں کی شکل میں نکلنے والے جلوس کے متعلق ہے تو اس کا جواب ہر مسلمان کے لیے بالکل واضح ہے کہ یہ چیزیں شرعاً جائز نہیں ہیں۔ کیونکہ مرّوجہ تعزیہ کو علمائے اہلِ سنّت نے بالاتفاق بدعتِ سیئہ اور تعلیمات اسلامیہ کے خلاف قرار دیا ہے۔ (جیسا کہ عنقریب امام اہلسنّت عظیم البرکت امام احمد رضا خاں علیہ الرحمۃ والرضوان کے فتویٰ مبارکہ سے واضح ہوگا) اور اگر سائل کا سوال روضہ مبارکہ کی اس شبیہ سے متعلق ہے جو طغری کی شکل میں یا کسی کاغذ وغیرہ پر بنا کر رکھی جائے تو وہ شرعاً درست ہے۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت علیہ الرحمۃ نے تعزیہ اور علم وغیرہ کی مختلف صورتوں کے متعلق بہت مفصّل فتاوی تحریر فرمائے ہیں۔ عوام النّاس کے فائدے کے لیے کچھ اختصار اور تسہیلِ الفاظ کے ساتھ ان میں سے ایک اہم اقتباس ہم پیش کر رہے ہیں (اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:)

تعزیہ کی بنیاد اس قدر تھی کہ حضرت سیّدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ پرنور کی صحیح نقل بنا کر تبرّک کی نیت سے مکان میں رکھنا، اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں تھا۔ کیونکہ غیر جاندار چیزوں کی تصویر بنانا، رکھنا سب جائز ہے۔ (خصوصاً) ایسی چیزیں جو عظیم دینی شخصیات کی طرف منسوب ہو کر عظمت پیدا کریں ان کا نقشہ تبرّک کی نیت سے اپنے پاس رکھنا یقیناً جائز ہے۔ مگر جاہل اور بے عقل لوگوں نے اس بنیاد کو بالکل مٹا کر سیکڑوں ایسی خرافات تراش لیں جن کا شریعت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں۔ اوّل تو خود تعزیہ میں لوگوں نے روضہ مبارکہ کا اصل نقشہ ملحوظ نہیں رکھا۔ ہر جگہ نیا نمونہ اور نیا نقشہ، جس کا اصل نقشہ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جگہ جگہ اشاعتِ غم کے لیے ان کا گشت اور ان کے اردگرد ماتم اور سینہ کوبی کا شور۔ کوئی ان نقشوں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے، کوئی طواف میں مشغول ہے اور کوئی سجدہ میں گرا ہوا ہے۔ پھر باقی تماشے باجے تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل اور طرح طرح کے بیہودہ کھیل ان سب پر مستزاد ہیں۔ الغرض عشرہ محرم الحرام جو سابقہ شریعتوں سے لیکر ہماری شریعت تک نہایت بابرکت اور مرکزِ عبادت بنا ہوا تھا اس کو بیہودہ رسموں نے جاہلانہ اور

فاسقانہ میلوں کا زمانہ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ حضرات شہدائے کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے صدقے میں ہمارے بھائیوں کو نیکیوں کی توفیق بخشے اور بری باتوں سے توبہ عطا فرمائے (آمین) اب فی زمانہ تعزیہ داری مذکورہ غلط طریقوں کا نام بن چکا ہے' یہ قطعاً بدعت و ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں اگر مسلمان صرف جائز طور پر حضرات شہدائے کربلا رضی اللہ عنہم کی ارواحِ طیبہ کو ایصالِ ثواب کی سعادت پر اکتفاء کرتے تو کتنی اچھی اور پسندیدہ بات تھی۔ اور اگر محبت و عقیدت کے پیش نظر روضہ انور کا نقشہ بنانے کی بھی ضرورت تھی تو اسی جائز حد پر قناعت کی جاتی یعنی تبرک اور زیارت کی غرض سے صحیح نقشہ اپنے مکانوں میں رکھتے اور اشاعتِ غم' تصنعِ اَلَم' ماتم اور دیگر بری بدعتوں سے بچتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔ مگر اب ایسے نقشے میں بھی اہل بدعت سے ایک مشابہت اور تعزیہ داری کے الزام کا خدشہ اور آئندہ اپنی اولاد یا اہل اعتقاد و محبت کے بدعتوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''اتقوا مواضع التُّهَم'' الزام لگنے کے مقامات سے بچو۔ اس لیے حضور سیّد الشہداء کے روضہ انور کی ایسی تصویر بھی نہ بنائے بلکہ صرف کاغذ کے صحیح نقشہ پر قناعت کرے اور اس میں کسی قسم کی بدعتوں کی ملاوٹ کے بغیر تبرک کی خاطر اپنے پاس رکھے۔ جس طرح حرمین شریفین سے کعبہ معظمہ اور روضہ عالیہ کے نقشے آتے ہیں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۶۱' مطبوعہ قدیم)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

دورِ حاضر کی چند بدعات کا جائزہ

سوال:

(۱) زید ایام حج میں اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ احرام کے طور پر دو کپڑے باندھ کر اور باقاعدہ کسی مسجد میں یا اپنے پیر کے گھر کے چاروں طرف تلبیہ کہتے ہوئے سات چکر کاٹے اس کے بعد حلق کروائے اور یہ کہے کہ چونکہ حکومت نے ہمیں عمرہ یا حج کی اجازت نہیں دی اور ہم نے محبت میں اس طرح کیا ہے تاکہ دو چادروں کے باندھنے کی سنت بھی زندہ رہے اور ہمیں حج یا عمرہ کا ثواب بھی ملے' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

ایک عرض یہ ہے کہ دارالافتاء اہل سنت (جامع مسجد کنز الایمان' گرومندر' کراچی)

نے بغیر کسی مفتی کے نام' مہر و دستخط کے ایک فتویٰ شائع کیا ہے جس میں مذکورہ بالا افراد کے نیت کرنے' ننگے سر ہونے' باقاعدہ تلبیہ پڑھنے اور حلق کروانے کے از خود اعتراف کے باوجود مذکورہ بالا افعال کا ذکر نہیں کیا اور سوال میں اس کو چھپایا گیا ہے۔ تو کیا مذکورہ مسئلہ میں ان مفتیان کا اس واقعہ سے باخبر ہونے کے باوجود اب تک کی خاموشی کیا شرعاً عنداللہ مواخذہ کا سبب تو نہ ہوگی؟

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برقرار رکھے ہوئے مہینوں کے نام (جو دور جہالت سے چلے آرہے تھے) تبدیل کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۳) مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ' مدینہ کہنا کیسا ہے؟

[سائل: انجینئر اشفاق احمد' عسکری III کینٹ کراچی]

جواب:

مذکورہ مسائل میں ''سائل کے بیان کی روشنی میں'' ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ تمام مسائل شرعی حکم میں یکساں نہیں ہیں۔ بعض ان میں ایسے ہیں جو جواز کے درجہ میں ہیں بعض ایسے ہیں جو کراہت کے درجہ میں ہے اور بعض عدم جواز کے درجہ میں یا اس کے قریب ہیں۔ لیکن ہم ان تمام درجات سے قطع نظر کر کے زیر بحث مسائل پر ایک خارجی حیثیت سے غور و فکر کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر ممانعت کے حکم میں یکساں نظر آتے ہیں۔ اور وہ حیثیت یا زاویہ فکر' یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت کو دور حاضر میں ہر اعتبار سے اور ہر جانب سے گوناگوں مشکلات' اعتراضات اور چیلنجز کا سامنا ہے۔ خصوصاً عقائد و معمولات کا جو میدان ہے اس میں اہل سنت کو سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جو از قبیل خرافات ہیں اور جاہل عوام نے ان کو وضع کر کے عبادت و تقدس کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ یا اگر کچھ چیزیں بدعتِ حسنہ کے طور پر رائج ہوتی ہیں تو رفتہ رفتہ عوام الناس ان چیزوں کو بدعت سیۂ بنا دیتے ہیں اور یہ صورتِ حال مخالفین کے اعتراضات میں اضافہ اور تقویت کا باعث ہوتی ہے۔

اندریں حالات کسی بھی بدعت حسنہ کو رائج کرنے سے پہلے اس کی ''عاقبت'' پر نظر کر لینی چاہیے۔ بلا سوچے سمجھے محض فرطِ محبت و عقیدت میں کوئی نئی چیز ایجاد کرنا درحقیقت اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے اور اپنی بنیاد کو کمزور کرنا ہے۔ کسی چیز کا جائز ہونا علیحدہ ہے اور

اس کو عملاً نافذ کرنا ایک علیحدہ چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر وہ چیز جو جائز ہو وہ ہر دور میں ہر جگہ قابل عمل بھی ہو۔ کئی جائز چیزیں ایسی ہیں جو کسی خارجی سبب کی بنیاد پر ممنوع ہو جاتی ہیں یا ممنوع قرار دیدی جاتی ہیں۔ "خارجی اسباب" بہت ساری چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اندیشہ ہو کہ فتنہ انگیزی ہوگی یا تہمت لگ جائے گی یا خطرہ ہو کہ عوام الناس کے اعتقاد میں فساد پیدا ہوگا' یا ان کی رغبت کم ہو جائے گی اور ان میں تنفر پیدا ہوگا یا خوف ہو کہ لوگوں کو ضرر اور اذیت پہنچے گی وغیرہ وغیرہ' یہ تمام "اسبابِ خارجیہ" احکام میں تبدیلی اور تغیر کا باعث ہیں۔ مثلاً:
(۱) ولد الزناء کی امامت فی نفسہ جائز ہے لیکن تقلیلِ جماعت اور تنفیرِ عوام کے پیش نظر فقہاء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ (ردالمحتار مع الدر المختار ج ۲ ص ۲۵۷ طبع جدید) (۲) حجرِ اسود کا استلام سنت ہے لیکن بھیڑ ہونے کی صورت میں اذیت اور ضرر کے وقت اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ہدایہ اور دیگر کتب فقہ میں ہے:

"واستلمه ان استطاع من غير ان يؤذى مسلما لما روى ان النبى ﷺ قال لعمر رضى الله تعالىٰ عنه انك رجل ايد تؤذى الضعيف فلا تزاحم الناس على الحجر ولكن ان وجدت فرجة فاستلمه والا فاستقبله وهلل و كبر و لان الاستلام سنة والتحرز عن اذى المسلم واجب".

(ہدایہ اولین ص ۲۶۰' تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۳ ص ۴۴۶)

یعنی حاجی کو اگر طاقت ہو تو کسی مسلمان کو ایذاء پہنچائے بغیر حجر اسود کا استلام کرے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم بہت مضبوط آدمی ہو' کمزور لوگوں کو تم سے تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا حجر اسود پر تکبیر و تہلیل کر لیا کرو۔ ایذاء کے وقت استلام کو ترک کرنے کی عقلی وجہ یہ ہے کہ استلام سنت ہے اور کسی مسلمان کو تکلیف دینے سے بچنا واجب ہے۔
(۳) اسی طرح عرفہ والے دن لوگوں کا اپنے شہر یا اپنے علاقے کے کسی میدان میں جمع ہو کر حاجیوں کی مشابہت اختیار کرنا اپنی ذات میں حرج نہیں رکھتا' لیکن فقہاء کرام نے اس خطرہ کے پیش نظر اس کو مکروہ اور ممنوع قرار دیا ہے کہ کہیں اس سے عوام میں بداعتقادی نہ پھیل جائے۔ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین علی بن ابی بکر الفرغانی الحنفی (متوفی

۵۹۳) لکھتے ہیں:

''التعریف الذی یصنعه النا س لیس بشیء وھو ان یجمع الناس یوم عرفة فی بعض المواضع تشبیھا بالواقفین بعرفة لان الوقوف عرف عبادة مختصة بمکان مخصوص فلا یکون عبادة دونه کسائر المناسك''.

(ہدایہ اولین' باب العیدین ص ۱۸۵)

یعنی عرفہ والے دن لوگ حاجیوں کی مشابہت کرتے ہوئے بعض مقامات پر جو جمع ہوتے ہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیونکہ ''وقوف عرفہ'' ایک ایسی عبادت ہے جو ایک مخصوص جگہ کے ساتھ خاص ہے لہٰذا کہیں اور یہ ''عبادت'' متصور نہیں ہوگی۔ جیسے دیگر مناسک حج (طواف اور سعی وغیرہ' کہ یہ تمام عبادات ایک مخصوص جگہ کے ساتھ خاص ہیں' لہٰذا یہ اعمال کہیں اور ''عبادت'' متصور نہیں ہوں گے)۔

شارح ہدایہ علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفی علیہ الرحمۃ عبارتِ مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**الأولٰی الکراھة للوجه المذکورو لأن فیه حسما لمفسدة اعتقادیة تتوقع من العوام**'' زیادہ بہتر قول یہ ہے کہ عرفہ والے دن حاجیوں کی مشابہت میں کسی جگہ جمع ہونا مکروہ ہے' کیونکہ وقوف عرفہ ایسی عبادت ہے جو ایک مخصوص جگہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور دوسری وجہ یہ کہ اس فعل کو مکروہ قرار دینا اس لیے اولیٰ ہے کہ اس فعل سے عوام الناس میں جو بد اعتقادی ہوگی اس کا خاتمہ ہوگا۔ (یعنی اس فعل کو مکروہ قرار دینا اس لیے بہتر ہے تاکہ عوام الناس میں اس فعل سے بد اعتقادی نہ پھیلے۔) (فتح القدیر ج ۲ ص ۸۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

فتح القدیر کے حوالہ سے اس عبارت کو علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے: ردالمحتار ج ۳ ص ۵۶' طبع جدید)

مذکورہ تمام مثالوں سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ ہر جائز کام کا ہر دور میں اور ہر جگہ قابل عمل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ کئی جائز چیزیں خارجی اسباب کی بناء پر ممنوع ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا سائل نے سوالِ مذکور میں جن باتوں کے حوالہ سے استفتاء کیا ہے' اولاً ان سب کا شرعی حکم یکساں نہیں ہے۔ ثانیاً اگر تمام باتیں جائز اور مستحب بھی ہوں تب بھی ان سے اس لیے بچنا چاہیے کہ یہ مخالفین کے لیے تقویت اور اہل سنت کے لیے مزاحمت میں

شدت کا باعث ہیں۔ پھر اضافاتِ جدیدہ کی صورت میں یہ نئے نئے امتیازات عوام الناس کو نہ صرف بدعتِ سیئہ کی طرف لے جانے والے ہیں بلکہ انہیں مذہبِ حق سے متنفر کرنے کا بھی قوی ترین سبب ہیں۔ (کما ھو واقع فی زماننا ھذا من غیر ان یخفی علی الجاھلین فضلا عن الفاضلین)

رہا سائل کا دار الافتاء کنز الایمان کے حوالہ سے جزوی سوال' اس کے بارے میں ہمیں حقیقت حال معلوم نہیں ہے لہٰذا اس کی تحقیق ان ہی سے کی جائے۔ بالفرض انہوں نے کتمانِ حق کیا ہے یا کوئی بھی ایسا کرتا ہے تو وہ قرآن حکیم کے درج ذیل حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے: ''ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتمو االحق وانتم تعلمونO'' (البقرۃ: ۴۲) اور تم حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

پھر سائل کا یہ سوال کہ حاجیوں میں مشابہت کے مسئلہ پر عوام اہل سنت کا کچھ نہ کرنا اور علماء کرام کا اس واقعہ سے باخبر ہونے کے باوجود خاموشی اختیار کرنا شرعاً عند اللہ مؤاخذہ کا باعث ہوگا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ جب بغیر کسی وجہ سے ترک کیا جائے تو شرعاً یہ قابلِ مؤاخذہ جرم ہے۔ اور اگر کسی معقول وجہ کی بناء پر اس فریضہ کو ترک کیا جائے تو شرعاً قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے۔ مثلاً معلوم ہو کہ یہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا' یعنی لوگ نہیں مانیں گے تو ایسی صورت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہے۔ اسی طرح معلوم ہو کہ یہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا خطرناک ثابت ہوگا یعنی تہمتیں اور الزامات لگیں گے یا پٹائی ہو جائے گی یا فتنہ و فساد ہوگا اور لڑائی ٹھن جائے گی تو ان صورتوں میں بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ترک کر سکتے ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۵۳' بہار شریعت جزء ۱۶ ص ۱۴۹)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کوّا کھانے کا شرعی حکم

سوال:

بعض حضرات کوّے کو جائز اور حلال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فتاویٰ رشیدیہ میں رشید

احمد گنگوہی صاحب نے جائز لکھا ہے۔اس بارے میں آپ فتویٰ صادر فرمائیں اور ہماری رہنمائی فرمائیں۔[سائل: شیراز احمد، شیر شاہ، کراچی]

جواب:

رشید احمد گنگوہی صاحب نے کوّے کو صرف جائز قرار نہیں دیا بلکہ اس کا کھانا باعثِ ثواب قرار دیا ہے۔(حوالہ کے لیے دیکھئے: فتاوٰی رشیدیہ ص ۵۹۸، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی) گنگوہی صاحب کا یہ فتویٰ قرآن کریم، حدیثِ رسول ﷺ، اقوالِ صحابہ کرام اور فقہائے کرام کی تحقیقات کے بالکل خلاف ہے۔اس فتوی پر عمل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔دلائل کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

قرآن وحدیث سے عام کوّے کے حرام ہونے کا ثبوت

اللہ عزّ وجل نے قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کا منصب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:"ویحرّم علیھم الخبائث" یہ رسول ﷺ لوگوں پر خبیث چیزوں کو حرام فرمائیں گے۔(الاعراف: ۱۵۷) کوّا بھی خبائث میں شامل ہے یعنی ایک خبیث جانور ہے۔لہٰذا آیت مبارکہ کی رو سے وہ حرام ٹھہرا۔کوّے کے خبیث ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں اسے "فاسق" قرار دیا ہے۔ارشاد فرمایا کہ: پانچ جانور فاسق ہیں، انہیں حرم بھی میں قتل کر دیا جائے: بچھو، چوہا، چیل، کوّا اور کاٹنے والا کتا۔
(صحیح بخاری: ۱۸۲۹، صحیح مسلم: ۱۱۵۸)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے پانچ جانوروں کے متعلق فاسق کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ یہ جانور خبیث اور موذی ہیں۔چنانچہ لغتِ حدیث کی معروف کتاب نہایہ (ج ۳ ص ۲۲۶)، مجمع بحار الانوار (ج ۳ ص ۷۸)، فقہ حنفی کی معروف کتاب البحر الرائق (ج ۳ ص ۳۳)، عنایہ (ج ۳ ص ۳) اور مشکوٰۃ شریف کی معروف شرح مرقات (ج ۵ ص ۸۸۷) میں لکھا ہوا ہے کہ مذکورہ جانوروں کے فاسق ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ سب جانور خبیث اور موذی ہیں۔لہٰذا کوّا بھی خبیث اور موذی جانور ہے۔اور قرآن مجید میں خبیث چیزوں کا حرام ہونا بیان کر دیا گیا۔

یوں قرآن مجید اور حدیث رسول ﷺ دونوں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کوّا

کھانا جائز نہیں ہے۔

کوّا کھانے کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان

حضرت ام المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: "انی لاعجب ممّن یأکل الغراب وقد اذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی قتلہ للمحرم وسمّاہ فاسقاً واللہ ما ھو من الطیّبات" جو شخص کوّا کھائے اس پر مجھے حیرت اور تعجب ہے! کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالتِ احرام میں بھی اسے مار ڈالنے کی اجازت دی ہوئی ہے اور آپ نے اسے فاسق قرار دیا ہے۔ اللہ کی قسم کوّا حلال اور پاکیزہ چیزوں میں سے نہیں ہے۔

(سنن بیہقی ج ۹ ص ۳۱۷)

حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا تو قسم اٹھا کر فرما رہی ہیں کہ کوّا حلال اور پاکیزہ نہیں ہے۔ جب کہ فتاویٰ رشیدیہ میں اس کے کھانے کو ثواب قرار دیا جا رہا ہے!!!

کوّا کھانے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فرمان

جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں کہ: "من یاکل الغراب وقد سمّاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاسقاً واللہ ماھو من الطیّبات" کوے کو کون کھا سکتا ہے؟ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فاسق قرار دیا ہے۔ اللہ عزّ وجلّ کی قسم! کوّا حلال اور پاکیزہ نہیں ہے۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۳۴، سنن بیہقی ج ۹ ص ۳۱۷)

قرآن وحدیث، اقوال صحابہ اور ائمہ دین کے حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ معروف کوّا ایک خبیث جانور ہے اور اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ (مزید تحقیق وتفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے: شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۵۳ تا ۳۵۷، فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۴۲۴ تا ۴۳۵)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اپنے کافر ہو جانے کی قسم اٹھانے کا شرعی حکم

سوال:

ایک شخص نے چرس پی (۱) بیوی کے سامنے قرآن کریم اٹھا کر کہا کہ آئندہ نہ پیوں گا۔ (۲) دوسری مرتبہ اپنی والدہ کے سامنے تین مرتبہ کلمہ پڑھ کر کہا: آئندہ اگر پیوں تو کافر

ہو کر مروں دونوں ہی بار اس نے اپنے قول کی خلاف ورزی کی۔ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ [سائل: عقیل قادری، اورنگی ٹاؤن]

جواب:

قائل کا پہلا جملہ جو کہ اس نے قرآن کریم اٹھا کر کہا، وہ شرعاً قسم نہیں بلکہ محض ایک وعدہ ہے۔ قائل کا اپنے اس جملے کی خلاف ورزی کرنا وعدہ خلافی ضرور ہے، جس سے توبہ واستغفار لازم ہے لیکن چونکہ قسم نہیں ہے اس لیے اس کے توڑنے پر کفارہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں: مصحف شریف ہاتھ میں لے کر یا اس پر ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہی، اگر لفظاً حلف وقسم کے ساتھ نہ ہو حلف شرعی نہ ہوگا، مثلاً کہے: میں قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ ایسا کروں گا اور پھر نہ کیا تو کفارہ نہ آئے گا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۳ ص ۵۷۵، مطبوعہ لاہور)

جہاں تک دوسرے جملہ کا تعلق ہے کہ "آئندہ اگر پیوں تو کافر ہو کر مروں" قائل نے اگر اس جملہ کو کفر سمجھ کر استعمال کیا تھا یعنی قائل کے علم میں یہ جملہ کفر تھا تو قولِ مختار کے مطابق اس پر کفر کا حکم اُس وقت لاگو ہوگا جب وہ اپنے جملہ پر عمل کرے گا یعنی قسم کی خلاف ورزی کرے گا۔ (جیسا کہ شرح فقہ اکبر اور المبسوط کے حوالہ سے اس کی تفصیل آرہی ہے) جب کہ بعض علماء کے نزدیک یہ جملہ کہتے ہی قائل پر کفر کا حکم لاگو ہو چکا کیونکہ اُس نے ایک ممکن چیز (شراب پینے) پر اپنا کفر ہونا معلق کیا۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۶ ص ۵۸۲) حضرت صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: جو شخص اس قسم کی جھوٹی قسم کھائے، اس کی نسبت حدیث میں فرمایا: وہ ویسا ہی ہے جیسا اُس نے کہا۔ (صحیح بخاری: ۱۳۶۳، صحیح مسلم: ۱۱۰، مشکوٰۃ: ۳۴۱۰) یعنی یہودی ہونے کی قسم کھائی تو یہودی ہو گیا۔ (بہار شریعت حصہ ۹ ص ۱۳) بہر صورت احتیاط اس میں ہے کہ قائل کلمہ پڑھے اور تجدید نکاح کرے۔ اور اگر قائل نے اس جملہ کو قسم جان کر استعمال کیا تھا تو اس صورت میں حکم کفر لاگو نہیں ہوگا، بلکہ قائل کے علم کے مطابق اس جملہ کو قسم ہی سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں قائل پر لازم ہے کہ وہ کفارہ ادا کرے یعنی دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلا دے یا انہیں کپڑے مہیا کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے۔ چنانچہ علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

"واذا قال هو يهودی او نصرانی او مجوسی او بریٔ من الاسلام وما اشبه ذالك ان فعل كذا علی امر فی المستقبل فهو يمين عندنا والمسئلة معروفة فان اتی بالشرط وعنده انه يكفر كفر وان كان عنده انه لا يكفر متیٰ اتی بالشرط لا يكفر متیٰ اتی به فعليه كفارة اليمين ای لاغير و يكون قصده بذالك الكلام المبالغة عن امتناعه وتقبيحه لذالك المرام". (شرح فقہ اکبر ص۱۹۱)

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر میں یہ کروں تو یہودی یا نصرانی یا مجوسی یا اسلام سے بیزار یا اس جیسا کوئی جملہ کہے تو یہ ہمارے نزدیک قسم ہے۔ لہٰذا اگر کہنے والا اپنے جملے کو کفر سمجھتا تھا اور پھر عمل کیا تو کافر ہو جائے گا اور اگر وہ اس جملے کو کفر نہیں جانتا تھا تو پھر اس کے توڑنے پر کفارۂ قسم دے گا یعنی اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ کیونکہ (اس صورت میں) اپنے جملے سے اس کا مقصد اپنے آپ کو باز رکھنے میں مبالغہ اور اس کام کی قباحت بیان کرنا ہے۔

اسی طرح شمس الائمہ علامہ سرخسی حنفی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

"الاصح انه ان كان عالما يعرف انه يمين فانه لا يكفر فی الماضی والمستقبل وان كا ن جاهلا وعنده انه يكفر بالحلف يصير كافرا فی الماضی والمستقبل لانه لما اقدم علیٰ ذالك الفعل وعنده انه يكفر فقد صار راضيا بالكفر". (المبسوط ج۸ ص۱۴۲)

یعنی زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اگر اس کو علم تھا کہ یہ قسم ہے تو وہ اس سے کافر نہیں ہوگا خواہ قسم کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے اور اگر اس کو یہ پتا نہیں تھا کہ یہ قسم ہے بلکہ اس کے نزدیک یہ جملہ کفر تھا تو پھر وہ کافر ہو جائے گا۔ خواہ قسم کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے کیوں کہ جو چیز اس کے اپنے نزدیک کفر تھی اس نے اس کو اختیار کیا اور یوں وہ کفر پر راضی ہوا لہٰذا وہ کافر ہو جائے گا۔

شمس الائمہ علیہ الرحمہ کے اس موقف کو تبیین الحقائق' بزازیہ' فتاویٰ عالمگیری' مجمع الانھر' خلاصۃ الفتاوی اور دیگر تمام معتبر و مستند کتب فقہ میں صحیح اور مختار قرار دیا گیا ہے۔ (حوالہ کے لیے دیکھئے: تبیین الحقائق ج ۳ ص ۴۲۷' بزازیہ علی ہامش الھندیہ ج ۶ ص ۳۲۶' فتاوی عالمگیری ج ۲ ص ۵۴' مجمع الانھر ج ۲ ص ۲۷۲' خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۸۵) واللّٰه ورسوله اعلم بالصواب

تعویذ جلا کر ان کا دھواں لینا

سوال:

ایسے تعویذ جن میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا اللہ تبارک وتعالیٰ کا اسم جلالت درج ہو' ان کو کسی عامل کے بقول تاثیر کی غرض سے جلا کر ان کا دھواں لینا شرعاً کیسا ہے؟

[سائل: قاری محمد سرور' منظور کالونی' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ قرآن حکیم کی ہر آیت بلکہ ہر ہر لفظ کا ادب اور احترام ہر مسلمان پر لازم اور ضروری ہے۔ کتب فقہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ جب قرآن حکیم بوسیدہ ہو جائے اور پڑھنے کے قابل نہ رہے تو اسے کسی محفوظ اور پاک جگہ دفن کر دیا جائے نہ یہ کہ اس کے اوراق کو جلا دیا جائے۔ (کذا فی الفتاوی الھندیہ ج ۵ ص ۳۲۳' بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۸۱) جب بوسیدہ ہو جانے کے باوجود قرآن حکیم کا احترام برقرار ہے اور اسے جلانا ممنوع ہے تو صحیح و سالم ہونے کی صورت میں (خواہ وہ تعویذ یا کسی اور کاغذ پر ہی کیوں نہ ہو) جلانا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ لہٰذا قرآن حکیم کی کسی بھی آیت یا ورق کو جلانا بلاشبہ اس کے ادب واحترام کے خلاف اور ممنوع ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

عیدین اور جمعہ میں مصافحہ و معانقہ کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

عیدین اور جمعہ میں مصافحہ و معانقہ کرنے کی شرعا کیا حیثیت ہے؟ ایک مولوی صاحب نے عید کے روز خطبہ کے دوران یہ کہا کہ یہ معانقہ بدعت ہے اور سنت کے خلاف ہے' آپ رہنمائی فرمائیں۔ [سائل: بشیر قادری' 11-J نارتھ کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کی رو سے مصافحہ و معانقہ مطلقاً سنت اور جائز ہے جس کا ثبوت متعدد احادیث میں تواتر سے ہے۔ چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت انس سے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں مصافحہ کا معمول تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ (بخاری: ۶۲۶۳، ترمذی: ۲۷۲۹) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان آپس میں ملاقات کرتے ہیں اور وہ مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے جدا ہونے سے پہلے دونوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ (ترمذی، ۲۷۲۷، ابن ماجہ، ۳۷۰۳، مسند احمد، ج ۴ ص ۲۸۹) ترمذی میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب مدینے میں آئے حضور ﷺ میرے مکان میں تشریف فرما تھے انھوں نے آ کر دروازہ کھٹکھٹایا حضور کپڑا گھسیٹتے ہوئے برہنہ یعنی فقط تہبند پہنے ہوئے چلد یئے، واللہ میں نے کبھی اس سے پہلے حضور ﷺ کو برہنہ یعنی بغیر چادر اوڑھے کسی کے پاس جاتے نہ دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی اس طرح دیکھا۔ حضور نے انھیں گلے لگالیا اور بوسہ دیا۔ (ترمذی، ۲۷۳۲، مشکوٰۃ ۴۶۸۲) حضرت شعبی سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا اور ان سے معانقہ فرمایا (گلے ملے) اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔

(ابوداؤد: ۵۲۲۰، شرح السنۃ: ۳۲۲۷)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مصافحہ سنت ہے اور اس کا ثبوت تواتر سے ہے مطلقاً مصافحہ کا جواز یہ بتاتا ہے کہ نماز فجر اور عصر کے بعد جو اکثر جگہ مصافحہ کرنیکا مسلمانوں میں رواج ہے یہ بھی جائز ہے اور بعض کتابوں میں جو اس کو بدعت کہا گیا ہے اس سے مراد بدعت حسنہ ہے۔ بعد نماز عیدین مسلمانوں میں معانقہ کا رواج ہے اور یہ بھی اظہار خوشی کا ایک طریقہ ہے یہ معانقہ بھی جائز ہے۔ (بہار شریعت، حصہ ۱۶، ص ۷۵۔۷۴)

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد وقار الدین قادری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: معانقہ کرنا جائز ہے۔ حضرت تمیم داری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے معانقہ کا مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: یہ امتوں کی تحیت (ملنے کا طریقہ) ہے اور اچھی دوستی

ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اما معانقہ اگر خوف فتنہ نہ باشد مشروع است" (اشعۃ اللمعات) یعنی اگر کسی فتنہ وغیرہ کا ڈر نہ ہو تو معانقہ (گلے ملنا) جائز ہے۔ علامہ حصکفی نے درِ مختار میں لکھا کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں: دست بوسی اور معانقہ اگر صرف تہبند وغیرہ میں ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر قمیص یا جبہ میں ہو تو اجماعاً بلا کراہت جائز ہے۔ (ج ۵ ص ۲۶۹، کتاب الحظر والاباحۃ) خوشی کے مواقع پر معانقہ کرنا حدیثِ مبارک سے ثابت ہے لہٰذا مسلمان عید کی خوشی میں جو معانقہ کرتے ہیں وہ جائز و مباح ہے۔ (وقار الفتاویٰ ملخصاً ج ۲ ص ۱۶۰) **واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب**

چاند گرہن اور سورج گرہن کے موقع پر لوگوں کے مختلف نظریات اور ان کی تردید

سوال:

چاند گرہن اور سورج گرہن کے متعلق علماء کی کیا رائے ہے۔ عام زندگی میں سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت مختلف نظریات اور خیالات بیان کئے جاتے ہیں بالخصوص سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت جو عورتیں ایام حمل سے گزر رہی ہوتی ہیں لوگوں کے خیال کے مطابق حاملہ عورتوں کو ان دونوں میں سیدھا لیٹنا چاہیے یا چلتے پھرتے رہنا چاہیے اور براہ راست سورج یا چاند کے سامنے نہیں آنا چاہیئے اور لیٹتے ہوئے کوئی کروٹ نہیں لینی چاہیے حتیٰ کہ سورج اور چاند گرہن مکمل طور پر ختم ہو جائے۔ کچھ آزاد خیال لوگ ان باتوں کو توہم پرستی تصور کرتے ہیں۔ کیا یہ نظریات حاملہ عورت یا اس کے شوہر کے بارے میں اسلامی طور پر درست ہیں یا نہیں؟ نیز حمل کے علاوہ عام دنوں میں عورت کے ساتھ (سورج یا چاند گرہن کے وقت) ہم بستری کرنا جائز ہے یا نہیں۔ وضاحت کے ساتھ جواب دے کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

[سائل: سید شاہد محمود گوجر]

جواب:

سورج اور چاند گرہن کے متعلق احادیث مبارکہ کی روشنی میں جو حقیقت واضح ہوتی ہے وہ معاشرہ عرب میں پائے جانے والے ان نظریات کا رد ہے جو سورج اور چاند کے متعلق

لوگوں کے ذہن میں راسخ تھے۔ کفار و مشرکین یہ خیال کرتے تھے کہ کسی بڑے شخص کی موت کی وجہ سے سورج اور چاند کو گرہن لگتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے واضح لفظوں میں بیان فرمایا کہ:
"ان الشمس والقمر آیتان من آیات الله لا یخسفان لموت احد ولا لحیاته فاذا رأیتم ذالك فاذکروا الله" سورج اور چاند دونوں اللہ عزوجل کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں' ان کو نہ کسی کی موت کی وجہ سے گرہن لگتا ہے نہ کسی کے زندہ رہنے کی وجہ سے' لہٰذا جب تم ان کا گرہن دیکھو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کرو۔ (صحیح البخاری: ۱۰۵۲' صحیح مسلم: ۹۰۷)

اسی طرح جب نبی اکرم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا اور اتفاقاً اس موقع پر سورج کو گرہن لگ گیا تو بعض نومسلم صحابہ نے کہا کہ آپ کے صاحبزادے کی وفات کی وجہ سے سورج کو گرہن لگ گیا! رسول اللہ ﷺ نے اس کا فوراً رد فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں' انہیں نہ کسی کی موت کی وجہ سے گرہن لگتا ہے نہ حیات کی وجہ سے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۳۵)

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ سورج اور چاند گرہن کا کسی شخص کی موت و حیات اور دیگر حوادث سے کوئی تعلق نہیں ہے' بلکہ یہ اللہ عزوجل کی قدرت کاملہ کا ایک اظہار ہے کہ چاند اور سورج جیسی بڑی بڑی طاقتیں بھی اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے اور جب وہ ان کو بے نور کرسکتا ہے تو ناتواں انسان کی اس کے حضور کیا مجال اور طاقت ہے؟ سورج اور چاند گرہن کو کسی بیماری یا نقصان اور خطرات کا باعث قرار دینا شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے طبی لحاظ سے اس کے بعض اثرات انسانی جسم اور صحت پر مرتب ہوتے ہوں لیکن شریعت مطہرہ میں گرہن کے ساتھ ان باتوں کا تصور نہیں دیا گیا۔ اسی طرح گرہن کے بارے میں یہ سمجھنا کہ شرعاً اس کے اثرات حاملہ عورتوں پر مرتب ہوتے ہیں یہ بھی محض توہم پرستی اور باطل نظریات کا حصہ ہے۔ سورج اور چاند کا گرہن شرعی نقطۂ نظر سے انسان کے معمولات زندگی میں قطعاً حائل نہیں ہے' البتہ اس وقت توبہ استغفار اور ذکر و اذکار کا حکم ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شیاطین کے اثرات پر ایک اشکال اور اس کا جواب

سوال:

رمضان المبارک میں شیطان جب قید ہوتا ہے تو عام اوقات میں رمضان کے مقابلے میں اس کی سرگرمیوں میں کس حد تک تبدیلی واقع ہوتی ہے؟ کیا انسان کے اعضاء جن میں ہاتھ، پاؤں، سر یا بسا اوقات پورا جسم اس کے کنٹرول میں ہوسکتا ہے یا ہوتا ہے؟ فدوی اس کا عملی مظاہرہ دیکھ چکا ہے جس میں اس نے فدوی کے بائیں ہاتھ کو حرکت دی اور فدوی اسے کبھی دائیں ہاتھ اور دانتوں میں دبا کر روکنے کوشش کی، کیا ایسا کنٹرول ممکن ہے یا محض غیر مرئی مخلوق کی شرارت ہے؟ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں؟

[سائل: رفیق قادری، شاہ فیصل کالونی]

جواب:

سائل نے رمضان المبارک میں شیطان کے قید ہونے کے حوالے سے جو سوال کیا ہے وہ اس سوچ اور فکر کی وجہ سے ہے کہ "رمضان المبارک میں تمام شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے" جب کہ ایسا نہیں ہے۔ بعض احادیث مبارکہ میں صراحۃً مذکور ہے کہ رمضان المبارک میں صرف سرکش شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے اور بعض احادیث میں مطلقاً آیا ہے کہ شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ ان کے متعلق علماء نے یہی لکھا ہے کہ ان احادیث میں بعض شیاطین مراد ہیں۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ج ۸ ص ۲۷)

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ بعض شیاطین کو قید کیا جاتا ہے تو یہ بھی واضح ہوگیا کہ شیاطین کی سرگرمیاں رمضان اور غیر رمضان دونوں میں جاری رہتی ہیں، فرق یہ ہے کہ ماہِ رمضان میں آدمی پر چونکہ خیر اور عبادت کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ شیطانی وساوس سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا، جب کہ عام دنوں میں خیر اور عبادت سے قلت قرب کی وجہ سے تاثیر اور تاثر زیادہ نظر آتا ہے۔

رہا یہ کہ انسانی اعضاء شیطان کے کنٹرول میں ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ سو دلائل شرعیہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شیاطین کو صرف وسوسہ اندازی، فتنہ انگیزی، اور گمراہ کرنے

کا اختیار دیا گیا ہے۔ انسانی اعضاء پر کنٹرول اور تسلط و تصرف (بایں طور کہ ہاتھ پکڑ کر گناہ کی طرف لے جایا جائے یا گناہ کروایا جائے) یہ شیاطین کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: "مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" قیامت کے دن شیطان کہے گا کہ مجھے تم پر کوئی کنٹرول نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تم کو (گناہوں کی طرف) بلایا تو تم میرے کہنے پر چلے آئے' لہٰذا تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ (ابراہیم: ۲۲)

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ شیطان کو صرف گناہ کی طرف بلانے کا اختیار دیا گیا ہے اور دیگر اعضاء پر اسے کنٹرول نہیں ہے۔ امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"أی قدرة و مكنة و تسلّط و قهر فاقهركم على الكفر والمعاصی و الجئكم اليها الا ان دعوتكم أی الا دعائی اياكم الى الضلالة بوسوستی وتزيينی. ثم ان ظاهر الاية يدل على ان الشيطان لا قدرة له على تصريع الانسان وعلى تعويج اعضائه و جوارحه و على ازالة العقل عنه كما يقوله العوام والحشوية". (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۸۵ 'مطبوعہ پشاور' لاہور)

یعنی شیطان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تم پر کوئی طاقت اور ایسا تسلط حاصل نہیں تھا کہ میں تمہیں جبراً کفر اور دیگر گناہوں کی طرف لے جاتا اور زبردستی تم سے کفر اور گناہ کے کام کرواتا' میں تو صرف وسوسہ ڈال کر اور گناہوں کو خوشنما بنا کر تمہیں گمراہی کی طرف لے جاتا تھا۔ (امام رازی فرماتے ہیں:) اس آیت کے ظاہر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیطان کو اس بات کا اختیار اور قوت حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی آدمی کو نیچے گرا دے یا اس کے اعضاء ٹیڑھے کر دے یا اس کی عقل کو زائل کر دے' جیسا کہ عوام الناس اور حشویہ (فرقہ) کے لوگ کہتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیت مذکورہ اور امام رازی کی تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ شیطان کو انسانی اعضاء پر کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ سائل نے اپنے ساتھ پیش آنے والا جو حادثہ بیان کیا ہے وہ کسی غیر مرئی مخلوق کی شرارت ہو یا نہ ہو' بہرحال شیطانی عمل دخل کا شاخسانہ نہیں ہے۔ جو کچھ پیش آیا وہ کیا تھا کیا نہیں تھا؟ اس کے لیے روحانی علاج کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر چڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟

سوال:

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو اس وقت آپ نے تمام بتوں کو نیست و نابود کر دیا مگر جب آپ بڑے بت کے پاس گئے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم میرے کندھوں پر چڑھ کر اس بت کو توڑ دو۔ کیا یہ صحیح ہے؟ [سائل: عبدالباسط' کراچی]

جواب:

جی ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ فتح فرمایا اس وقت آپ نے تمام بتوں کو نیست و نابود کر دیا اور جب بڑے بت کی باری آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ تم میرے کندھوں پر چڑھ کر اس بت کو توڑ دو۔ امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) فتح مکہ کے باب میں روایت کرتے ہیں:

"عن علی قال انطلق بی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتی اتی بی الکعبۃ فقال اجلس فجلست الی جنب الکعبۃ و صعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی منکبی ثم قال لی انہض بی فنہضت بہ فلما رای ضعفی تحتہ قال اجلس فجلست فنزل عنی وجلس لی فقال یا علی اصعد علی منکبی فصعدت علی منکبہ ثم نہض بی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلما نہض بی خیّل الیّ انی لو شئت نلت افق السماء فصعدت علی الکعبۃ و تنحّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال لی الق صنمھم لاکبر صنم قریش"۔ (الحدیث) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۶۸۹۶' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

(مزید حوالہ کے لیے دیکھیے: تفسیر مظہری ج ۱ ص ۳۶۲' مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ' کوئٹہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے خانہ کعبہ کے پاس لیکر آئے اور فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں کعبۃ اللہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے کندھے پر سوار ہو گئے اور مجھے فرمایا کہ اب مجھے اٹھاؤ۔ میں آپ کو لیکر اٹھا لیکن آپ نے میری کمزوری دیکھ کر فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا اور آپ نیچے تشریف لائے اور بیٹھ کر فرمایا

اے علی ! اب تم میرے کندھے پر چڑھ جاؤ۔ چنانچہ میں آپ کے کندھے پر چڑھ گیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھے اٹھایا' اس وقت مجھے (رسول اللہ ﷺ کی برکت سے) ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں چاہتا تو آسمان کا افق چھو لیتا۔ اس کے بعد میں کعبۃ اللہ پر چڑھ گیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ سے ہٹ کر مجھ سے فرمایا کہ ان کا بت نیچے پھینک دو (اس سے آپ کا اشارہ قریش کے بڑے بت کی طرف تھا)۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

رض رح ص یا صلعم لکھنا کیسا ہے؟

سوال:

''یا اللہ'' یا ''رضی اللہ عنہ'' یا ''رحمۃ اللہ علیہ'' یا ''محمد اور نبی'' کے ساتھ بالترتیب رض رح ص یا صلعم لکھنا کیسا ہے؟ مدلل جواب دے کر ممنون فرمائیں؟

[سائل: محمد قدرت اللہ نقشبندی' کشمیر]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ اور انبیاء علیہم السلام کے اسماء گرامی کے ساتھ بیانِ عظمت یا بہ طورِ دعا جو جملے لکھے جاتے ہیں انہیں مکمل لکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح ''رضی اللہ عنہ'' اور ''علیہ الرحمۃ'' کو مکمل لکھنا چاہیے۔ اس طرح کے کلمات اور جملوں کو مخفف اور مختصر کر کے لکھنے کو فقہاء اور مفسرین نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ اسمٰعیل حقی حنفی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''یکرہ ان یرمز للصلوۃ والسلام علی النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فی الخط بأن یقتصر من ذالک علی الحرفین ھکذا "عم" اونحو ذالک کمن یکتب "صلعم" یشیر بہ الی النبی''.

یعنی تحریر میں نبی اکرم ﷺ کے لیے درود و سلام کو مختصر کر کے لکھنا جیسے ''عم'' یا ''صلعم'' وغیرہ لکھنا یہ سب مکروہ ہے۔ (روح البیان ج ۷ ص ۲۷۱' مطبوعہ بیروت)

اسی طرح علامہ طحطاوی لکھتے ہیں: **''یکرہ الرمز بالصلوٰۃ والترضی بالکتابۃ بل**

یکتب ذالك كله بكماله''۔یعنی''صلی اللہ علیہ وسلم''اور''رضی اللہ عنہ''کو مخفف کر کے لکھنا مکروہ ہے'ان کو پورا پورا اور مکمل لکھنا چاہیے۔(حاشیۃ الطحطاوی علی الدرج ا ص ۶)

صدر الشریعۃ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ فرماتے ہیں: اکثر لوگ آج کل درود شریف کے بدلہ میں صلعم'عم' ؐ لکھتے ہیں۔یہ ناجائز وسخت حرام ہے۔یونہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ''رض'' رحمہ اللہ تعالیٰ کی جگہ''رح'' لکھتے ہیں'یہ بھی نہ چاہیے۔(بہار شریعت حصہ ۳ ص ۵۰ مطبوعہ لاہور)

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

شبِ معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عرش پر نعلین کے ساتھ تشریف لے گئے یا نہیں؟

سوال:

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر آنے کا حکم ارشاد فرمایا اور جب آپ وہاں پہنچے تو ارشاد ہوا''فاخلع نعلیك''یعنی اپنے نعلین اتار دیجئے۔اس کے ساتھ بعض لوگ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معراج پر تشریف لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نعلین پاک اتارنے لگے تو ارشاد ہوا کہ آپ نعلین پاک نہ اتاریں۔آیا یہ روایت درست ہے یا نہیں؟[سائل: غلام حسین سیال'کراچی]

جواب:

بعض صوفیائے کرام کے نزدیک یہ روایت ثابت اور درست ہے۔چنانچہ قرآن کریم کی آیت''انی انا ربك فاخلع نعلیك''کے تحت تفسیر کرتے ہوئے علامہ اسماعیل حقی علیہ الرحمہ نے روح البیان'ج ۷ میں باضابطہ اس روایت کو تحریر فرمایا ہے۔لیکن علماء محققین اور محدثین نے اس روایت کو بالکل بے اصل اور باطل قرار دیا ہے۔چنانچہ علامہ یوسف نبہانی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''قد سئل القزوینی عن وطئہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم العرش بنعلہٖ وقول الرب تقدس: لقد شرفت العرش بذالك یا محمد هل له اصل ام لا؟'فاجاب بما نصه :اما

حدیث وطی النبی ﷺ العرش بنعله فلیس بصحیح ولا ثابت (الی قوله) وکتب بعض المحدثین بعد کلام القزوینی المذکور ما ذکره القزوینی هو الصواب وقد وردت قصة الاسراء والمعراج عن نحو اربعین صحابیا لیس فی حدیث احد منهم انه علیه الصلوٰة والسلام کان فی رجلیه تلک اللیلة نعل "۔ (جواہر البحار ج ۳ ص ۵۰۰۔۴۹۹)

یعنی امام قزوینی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عرش پر نعلین لے کر تشریف لے جانے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان " اے محمد ﷺ آپ نے ان (نعلین) کے ذریعہ عرش کو شرف بخشا ہے" کے بارے میں پوچھا گیا کہ آیا اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ جہاں تک حضور ﷺ کے عرش پر نعلین لے کر تشریف لے جانے کا تعلق ہے تو یہ غلط اور غیر ثابت ہے۔ بعض محدثین نے امام قزوینی کے اس جواب کے بارے میں لکھا کہ یہی درست ہے۔ اور (یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ) معراج شریف کا واقعہ تقریباً چالیس صحابہ کرام سے مروی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کی بھی روایت میں یہ وارد نہیں کہ اس رات حضور ﷺ کے پاؤں میں نعلین تھے۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ تحریر کردہ روایت کی کوئی اصل نہیں۔ اعلیٰحضرت امام اہلسنت مولانا شاہ احمد رضا خان نور اللہ مرقدہ نے بھی احکام شریعت ص ۱۶۶ میں اس روایت کو موضوع اور غلط قرار دیا ہے۔ بہارِ شریعت میں صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: یہ مشہور ہے کہ شب معراج میں حضور اقدس ﷺ نعلین مبارک پہنے ہوئے عرش پر گئے اور واعظین اس کے متعلق ایک روایت بھی بیان کرتے ہیں، اس کا ثبوت نہیں اور یہ بھی ثابت نہیں کہ برہنہ پا تھے۔ لہٰذا اس کے متعلق سکوت کرنا مناسب ہے۔ (بہارِ شریعت حصہ ۱۶ ص ۱۶۵، مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور) واللہ ورسوله اعلم بالصواب

عبادات

☆ طہارت ☆ نماز ☆ مساجد ☆ روزہ
☆ زکوۃ ☆ حج وعمرہ ☆ قربانی وعقیقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا تمباکو کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال:

وضوء کرنے کے بعد اگر تمباکو والا پان کھالیا جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ تمباکو میں نشہ ہوتا ہے اس لیے اس سے وضوء ٹوٹ جائے گا؟ آپ مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟ [سائل: شاہ زیب لیاقت آباد]

جواب:

تمام فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ اتنا نشہ جس سے چلنے میں پاؤں لڑکھڑائیں اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ جیسا کہ بہارِ شریعت حصہ دوم میں ہے کہ ''بیہوشی اور جنون اور غشی اور اتنا نشہ کہ چلنے میں پاؤں لڑکھڑائیں ناقضِ وضوء ہیں'' (یعنی ان سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے)۔

تنویر الابصار اور درمختار میں ہے: ''**وینقضه اغماء و منه الغشی و جنون و سکر بان یدخل فی مشیه تمایل**''۔ بیہوشی، غشی، جنون اور اتنا نشہ جس سے چلنے میں لڑکھڑاہٹ آجائے، یہ سب وضو کو توڑ دیتے ہیں۔ (الدر المختار مع تنویر الابصار ج۱ ص ۲۴۶) البحر الرائق میں ہے کہ ایسا نشہ جو کسی چیز کے استعمال کرنے کی وجہ سے عقل پر غالب آجائے اور آدمی اس نشہ کے دوران کچھ کام نہ کر سکے تو وہ نشہ وضو کو توڑ دیتا ہے۔ (البحر الرائق ج ۱ ص ۴۰)

مذکورہ تمام عبارات سے معلوم ہوا کہ محض کسی نشہ آور چیز کا کھالینا وضو کو نہیں توڑتا، بلکہ جب اس سے ایسا نشہ ہو جو چلنے پھرنے اور دیگر کاموں میں خلل انداز ہو تب اس سے وضو ٹوٹتا ہے۔ لہٰذا تمباکو اگر نشہ آور چیز ہے اور اس سے ایسا نشہ ہو جائے جو آدمی کی عقل اور عمل کو متاثر کردے اور چلنے میں پاؤں لڑکھڑائیں تو وضو ٹوٹ جائے گا، ورنہ محض تمباکو یا تمباکو والا پان کھالینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

وضو، غسل، تیمّم اور نماز کے چند ضروری مسائل پر فقہ حنفی کے دلائل

سوال:

الحمد للہ میں صحیح العقیدہ سنی اور حنفی ہوں۔ مجھے طہارت کے باب میں وضوء غسل اور تیمم کے متعلق نیز عبادات کے باب میں نماز کے متعلق ضروری اور اہم باتوں پر قرآن وسنت کی روشنی میں فقہ حنفی کے دلائل اور تائیدات درکار ہیں۔ امید ہے ضرور توجہ فرمائیں گے؟

[سائل: عبدالقدوس مدنی، کراچی یونیورسٹی]

جواب:

وضوء

(۱) نیت

★ عربی زبان میں نیت کا معنی ہے: ''عزم القلب'' دل کا ارادہ (المنجد فی اللغۃ) اور یہ معنی سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ لہٰذا نیت کے لیے دل کا ارادہ کافی ہے۔ البتہ زبان سے کہنا بہتر ہے۔

★ قرآن مجید میں وضوء کے چار فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) چہرہ دھونا (۲) کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھونا (۳) سر کا مسح کرنا (۴) ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا۔ (المائدۃ:۶، پارہ ۶)

فقہ حنفی میں ان چار باتوں کے علاوہ وضوء میں جو کچھ ہے وہ سنت ہے یا مستحب۔ اس لیے نیت وضوء میں فرض نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ نیت کرنا سنت اور باعث ثواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انما الاعمال بالنیات'' بے شک اعمال (کے ثواب) کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

(صحیح البخاری:۱، صحیح مسلم:۱۹۰۷)

(۲) وضوء کا طریقہ

★ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام حمران بیان کرتے ہیں کہ انہوں

نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے برتن منگوایا اور ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈال کر انہیں دھویا۔ پھر سیدھا ہاتھ برتن میں ڈالا اور پانی لے کر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا' پھر تین مرتبہ چہرہ کو دھویا اور تین بار ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھویا۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا' پھر تین مرتبہ ٹخنوں سمیت اپنے پاؤں دھوئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے پھر اس طرح دو رکعت نماز ادا کرے کہ اس میں اپنے آپ سے باتیں نہ کرے (یعنی دنیاوی خیالات نہ لائے) تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ (صحیح بخاری:۱۵۹' صحیح مسلم:۲۲۶)

(۳) ترتیب

★ ترتیب وضو میں سنت ہے۔ فرض نہیں ہے' جیسا کہ ہم نمبر 1 میں واضح کر چکے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی سے ترتیب آگے پیچھے ہو جائے تو وضوء پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۴) ترکِ فرض

★ وضوء کا یا کسی بھی عبادت کا کوئی فرض رہ جائے تو وہ وضوء یا عبادت درست نہیں ہوگی۔ کیونکہ فرائض کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جب کہ سنت یا مستحب رہ جائے تو اس سے وضوء یا کسی بھی عبادت کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔

(۵) بسم اللہ پڑھنا

★ بسم اللہ پڑھنا وضوء میں سنت ہے' فرض نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص طہارت حاصل کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے۔ کیونکہ وہ اس کے پورے جسم کو پاک کر دے گا۔ اور جو شخص اپنی طہارت میں اللہ عزوجل کا نام نہ لے تو اس کے جسم کا صرف اتنا ہی حصہ پاک ہوگا جس پر پانی کا گزر ہوا۔ (سنن دارقطنی ج ۱ ص ۷۳' سنن بیہقی ج ۱ ص ۴۴) اگر کوئی شخص بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو وضو کے دوران جب یاد آجائے پڑھ لے۔

(۶) دعاء

★ وضوء سے پہلے بہ طور دعاء بسم اللہ شریف پڑھنی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "توضأ وا بسم اللہ" اللہ کا نام لے کر وضو کرو۔ (سنن بیہقی ج ۱ ص ۴۳' سنن کبریٰ للنسائی:

۸۴) بسم اللہ شریف کے بعد درود شریف اور کلمہ طیبہ پڑھنا بہتر ہے۔

(۷) مسواک

★ مسواک کرنا سنت ہے' فرض نہیں ہے۔ اگر کسی نے مسواک نہ کی تو وضوء پر اثر نہیں پڑے گا۔ یعنی وضوء ہو جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میری امت پر دشوار نہ گزرتا تو میں ان کو ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم فرماتا (یعنی اس کو واجب قرار دیتا)۔ (المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۲۳۸) ایک حدیث میں فرمایا: مسواک کا التزام رکھو کیونکہ وہ منہ کی صفائی اور رب تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۸)

(۸) اعضاء کو دھونا

★ اعضاء کو ایک مرتبہ دھونا فرض اور تین مرتبہ دھونا سنت ہے۔ اگر کسی نے ایک ایک مرتبہ اپنے اعضاء کو دھویا تو اس کا وضوء ہو جائے گا۔ لیکن تین تین مرتبہ چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے کسی موقع پر ایک ایک مرتبہ اپنے اعضاء مبارکہ کو دھویا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ وضوء ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز کو قبول نہیں فرماتا۔ پھر دو دو مرتبہ اپنے اعضاء مبارکہ کو دھویا اور فرمایا کہ یہ وہ وضوء ہے جس پر اللہ تعالیٰ دوگنا اجر عطا فرماتا ہے' پھر آپ نے تین تین مرتبہ اپنے اعضاء کو دھویا اور فرمایا کہ یہ میرا اور مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کا وضوء ہے اور جس نے (تین کے عدد کو سنت نہ سمجھ کر) تین میں کمی بیشی کی تو بے شک اس نے حد سے تجاوز کیا اور ظلم کیا۔ (سنن ابن ماجہ: ۴۱۹)

(۹) وضوء کے ضروری مقامات

★ نماز کے لیے وضوء کرنا' قرآن کریم کو چھونے کے لیے وضو کرنا اور بیت اللہ کے طواف کے لیے وضوء کرنا لازم ہے۔ نماز کے لیے وضوء کا لازم ہونا قرآن کی آیت سے ثابت ہے۔ (آیت مبارکہ کا حوالہ عنوان نمبر ۱ کے تحت دیکھئے۔) قرآن کریم کو چھونے کے لیے وضو کا لازم ہونا سورۃ الواقعہ کی آیت سے ثابت ہے۔ ارشاد فرمایا: "لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۝" قرآن کو سوائے پاکیزہ لوگوں کے کوئی اور نہ چھوئے۔ (الواقعہ: ۷۹' پ ۲۷)

سو جس طرح نماز کے لیے وضوء لازمی ہے اس طرح طواف کے لیے بھی وضوء کرنا

لازمی ہے۔ فرق یہ ہے کہ نماز کے لیے وضوء کرنا قرآن کریم سے ثابت ہے اس لیے نماز کے لیے وضوء فرض ہے جب کہ طواف کے لیے وضوء کرنا حدیث شریف سے ثابت کیا گیا ہے اس لیے طواف کے لیے وضوء کرنا واجب ہے۔

مذکورہ تین صورتوں کے علاوہ دیگر مقامات پر وضوء کرنا یا تو سنت ہے یا مستحب۔ کیونکہ دیگر مقامات پر وضوء کرنے کے بارے میں جو احادیث اور آثار ہیں ان کی اسناد یا ان کا اسلوبِ بیان ایسا ہوتا ہے کہ اس سے فرضیت اور وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے مذکورہ تین صورتوں کے علاوہ بعض مقامات پر وضوء کرنا سنت ہے اور بعض مقامات پر مستحب۔ مثلاً اذان واقامت کے لیے اور نبی اکرم ﷺ کے روضۂ انور کی زیارت کیلیے وضوء کرنا سنت ہے۔ اور دینی کتابیں چھونے کے لیے یا سونے کے لیے وضوء کرنا مستحب ہے۔

غسل

(۱) غسل کی فرضیت

★ غسل کا حکم یہ ہے کہ آدمی کو جب ناپاکی لاحق ہو تو غسل کرنا فرض ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا" اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاکیزگی حاصل کرو۔ (المائدۃ:۶) اس آیت میں حیض ونفاس بھی داخل ہے یعنی عورت جب اس سے فارغ ہوگی تو غسل کرے گی۔

(۲) پابندیاں

★ حالت جنابت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "انی لا احل المسجد لحائض ولا جنب" میں کسی حیض والی عورت کے لیے اور ناپاک کے لیے مسجد کو جائز قرار نہیں دیتا۔ (سنن ابوداود: ۲۳۲، صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۲۷)

حالت جنابت میں قرآن مجید کو چھونا بھی جائز نہیں ہے۔ (دلیل عنوان نمبر ۹ میں ملاحظہ فرمائیں) اسی طرح حالت جنابت میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ "میں جب حالتِ جنابت میں ہوتا ہوں تو وضوء کر کے کھا پی لیتا ہوں، لیکن جب تک غسل نہ کرلوں اس

وقت تک نہ نماز پڑھتا ہوں نہ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہوں۔ (سنن بیہقی ج ۱ ص ۸۹)

(۳) غسلِ جمعہ وعیدین

★ جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے: تم میں سے جب کوئی شخص جمعہ کی طرف آئے تو اسے غسل کر لینا چاہیے۔ (سنن بیہقی ج ۱ ص ۲۹۳) دوسری حدیث میں فرمایا: جس شخص نے جمعہ کے دن وضوء کیا تو یہ اچھی بات ہے' لیکن جس نے غسل کیا تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ (سنن بیہقی ج ۱ ص ۲۹۵) عید و بقر عید وغیرہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ جب کہ بہت سے مواقع پر غسل کرنا مستحب ہے۔ مثلاً: اسلام قبول کرنے کے بعد غسل کرنا مستحب ہے۔ کیونکہ جو کافر اسلام قبول کرنے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتا تو آپ اسے غسل کرنے کا حکم فرماتے۔ (سنن نسائی: ۱۸۲)

اسی طرح بہت سے نیک کاموں کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ کے روضۂ انور کی زیارت کے لیے' محافلِ خیر کے لیے' گناہوں سے توبہ کرنے کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔

(۴) غسل کے فرائض

★ چونکہ قرآن مجید کا حکم ہے کہ ''جب تم ناپاک ہو جاؤ تو خوب پاکیزگی حاصل کیا کرو'' (المائدۃ: ۶) اس لیے بدن میں جہاں جہاں تک پانی پہنچانا ممکن ہوگا وہ سب اس آیت میں داخل ہوگا اور پانی پہنچانا فرض ہوگا۔ علماءِ احناف نے اس کا خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ غسل کے تین فرائض ہیں: (۱) اچھی طرح کلی کرنا (۲) ناک کے ہر گوشہ تک پانی چڑھانا (۳) پورے بدن پر اس طرح پانی بہانا کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے: ہر بال کے نیچے ناپاکی (پہنچ) جاتی ہے لہٰذا تم بالوں کو گیلا کیا کرو اور جلد کو صاف کیا کرو۔ (ترمذی: ۱۰۶' سنن ابی داؤد: ۲۴۸)

(۵) غسل کا طریقہ

★ عورت اور مرد دونوں کے لیے غسل کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ پہلے دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک دھویا جائے' اس کے بعد نجاست کی جگہ کو دھویا جائے' پھر نماز کا سا وضوء کیا جائے۔ اس کے بعد سر

پر پانی ڈالا جائے اور پھر پورے بدن پر پانی بہایا جائے۔ (صحیح بخاری: ۲۵۹، صحیح مسلم: ۳۱۷)

تیمّم

(۱) تیمّم کا حکم

★ ضرورت کے وقت تیمّم کرنا جائز ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا" اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضاء حاجت سے فارغ ہو یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو اور تم پانی کو نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمّم کیا کرو۔

(المائدۃ: ٦)

حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: میرے لیے زمین کو سجدے کرنے کی جگہ اور پاک کرنے والی بنادی گئی ہے، جہاں کہیں نماز کا وقت آجاتا ہے میں تیمّم کرتا ہوں اور نماز ادا کرتا ہوں۔ (صحیح بخاری: ۵۳۳)

(۲) تیمّم کا طریقہ

★ تیمّم کا طریقہ یہ ہے کہ پاک مٹی سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا جائے۔ (المائدۃ: ٦)

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ پاک ہے: تیمّم دو ضربوں کا نام ہے، ایک ضرب چہرے کیلیے اور ایک ضرب کہنیوں سمیت ہاتھوں کے لیے۔ (ترمذی: ۱۴۴، ابوداؤد: ۳۲۷)

(۳) تیمّم اور وضوء میں یکسانیت

★ چونکہ قرآن وسنت میں پانی نہ ملنے کی صورت میں وضوء اور غسل کا نائب تیمّم کو قرار دیا گیا ہے اس لیے تیمّم کے بعد ہر وہ کام جائز ہوگا جو وضوء اور غسل سے جائز ہوتا ہے۔ اور ہر اس چیز سے تیمّم ٹوٹ جائے گا جس سے وضوء اور غسل ٹوٹ جاتا ہے۔ نیز جس شرط کی وجہ سے تیمّم کو جائز قرار دیا گیا ہے (یعنی پانی کا نہ ملنا) اگر وہ بھی مفقود ہو (یعنی پانی میسر آجائے اور استعمال کی قدرت ہو) تو تیمّم ختم ہو جائے گا۔ البتہ وضوء اور تیمّم میں فرق یہ ہے کہ وضوء کے لیے نیت کرنا سنت ہے، جب کہ تیمّم کے لیے نیت کرنا شرط ہے۔

نماز

(۱) نمازوں کی تعداد

★ پانچ نمازیں فرض ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے: ''خمس صلوات کتبھن اللہ تعالٰی علی العباد'' پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض فرمائی ہیں۔ (سنن ابوداؤد: ۴۲۵ 'سنن ابن ماجہ: ۱۴۰۱)

ایک اور حدیث ہے کہ حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو دن اور رات میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! (صحیح بخاری ج۱ ص۱۵)

(۲) نمازوں کے اوقات

★ وقتِ فجر طلوع صبح صادق سے آفتاب کی کرن چمکنے تک ہے۔ ظہر کا وقت آفتاب ڈھلنے سے اس وقت تک ہے کہ ہر چیز کا سایہ اصلی سایہ کے علاوہ دوگنا ہو جائے۔ عصر کا وقت' وقتِ ظہر ختم ہونے سے سورج کے غروب ہونے تک ہے۔ مغرب کا وقت آفتاب کے غروب ہونے کے بعد سے شفق کے غروب ہونے تک ہے اور شفق کے غروب ہونے کے بعد سے طلوع فجر تک عشاء کا وقت ہے۔

اس بارے میں جو حدیث ترمذی شریف میں ہے وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ جبریل امین نے (تعلیم امت کے لیے) نبی اکرم ﷺ کی امامت کی۔ اس میں فجر کی نماز ایک دن طلوع فجر کے وقت پڑھائی اور ایک دن اس وقت پڑھائی جب (طلوع فجر کے بعد) کچھ اجالا پھیل گیا۔ پھر ظہر کی نماز ایک دن اس وقت پڑھائی جب کہ آدمی کا سایہ اصلی پاؤں میں ہوتا ہے اور دوسرے دن اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح عصر کی نماز پہلے دن اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہوتا ہے اور دوسرے دن اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ دوگنا ہو جاتا ہے۔ پھر مغرب کی نماز پہلے اس وقت پڑھائی جب سورج غروب ہوا اور دوسرے دن (غروب ہونے کے بعد) اول وقت میں پڑھائی۔ پھر عشاء کی نماز پہلے اس وقت پڑھائی جب شفق غائب ہو گیا اور دوسرے دن اس وقت پڑھائی جب رات کا تہائی حصہ چلا گیا۔ (سنن ترمذی: ۱۴۹ 'سنن ابوداؤد: ۳۹۳)

قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ان الصلٰوۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا''۔ (البقرۃ: ۱۰۳) بے شک نماز مؤمنین پر ایک مقرر وقت میں فرض ہے۔

ہر وہ نماز جو اپنے وقت پر نہ پڑھی جائے بلکہ بعد میں پڑھی جائے وہ قضاء کہلاتی ہے' لیکن ہو جاتی ہے۔ البتہ وقت ہونے سے پہلے نماز نہیں ہوتی۔

(۳) مکروہ اوقات

★ وہ اوقات جن میں نماز کی ادائیگی ممنوع ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ ہیں: (۱) جب سورج طلوع ہو رہا ہو۔ (۲) جب سورج نصف النہار کو پہنچ جائے۔ (۳) جب سورج غروب ہو رہا ہو۔ (صحیح مسلم: ۲۹۳)

چونکہ ان تین اوقات میں نماز کی ادائیگی شرعاً ممنوع ہے لہٰذا ان میں پڑھی ہوئی نماز کو دوہرانا ہوگا۔ ہاں اگر کوئی شخص ان اوقات میں قضاء نماز شروع کر دے تو اس پر لازم ہے کہ اس کو توڑ دے اور اگر پڑھ لی تو غیر مکروہ وقت میں اُسے دوبارہ ادا کرے۔

(کذا فی فتح القدیر ج۱ ص ۲۳۲' مطبوعہ بیروت)

(۴) نماز کی شرائط

نماز کی شرائط مع دلائل درج ذیل ہیں:۔

★ طہارت: (جواب 1 میں ہم آیت کا حوالہ ذکر کر چکے ہیں) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے: ''لا تقبل صلٰوۃ بغیر طھور'' طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ (ترمذی: ۱) دوسری حدیث میں ہے کہ نماز کی کنجی طہارت ہے۔ (ترمذی: ۳' ابوداؤد: ۶۱)

★ سترِ عورت: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ'' ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہنے رہو۔ (الاعراف: ۳۱)

★ استقبالِ قبلہ: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ'' تو آپ اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف پھیر دیجئے اور اے مسلمانو! تم بھی اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کیا کرو۔ (البقرۃ: ۱۴۴)

★ وقت: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ان الصلٰوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا'' بے شک نماز مؤمنین پر ایک مقرر وقت میں فرض ہے۔ (البقرۃ: ۱۰۳)

★ نیت: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ''
لوگوں کو یہی حکم ہوا کہ وہ اللہ ہی کے لیے دین کو خالص رکھتے ہوئے اس کی عبادت کریں۔

(البینہ:۵)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''انما الاعمال بالنیات'' اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ (حوالہ عنوان نمبر 1 میں دیکھئے)

★ تکبیر تحریمہ: نبی اکرم ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی نماز کو اس وقت تک قبول نہیں فرماتا جب تک کہ بندہ طہارت کو اس کے مقام پر نہ رکھے اور قبلہ رخ نہ ہو جائے اور ''اللہ اکبر'' نہ کہہ لے۔ (سنن ابوداؤد:۸۵۸)

مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط رہ جائے تو نماز نہیں ہوگی۔ کیونکہ شرط کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔

(۵) امام کے پیچھے قراءت

★ وہابی (اہلحدیث) امام کے پیچھے قراءت کو لازمی قرار دیتے ہیں اور قراءت کرتے بھی ہیں جب کہ ہم احناف کے نزدیک امام کے پیچھے قراءت کرنا جائز نہیں ہے۔ ہماری دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ'' جب قرآن پڑھا جائے تو تم غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(الاعراف:۲۰۴)

نیز حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا'' یعنی جب امام تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

(صحیح مسلم ج ا ص ۱۷۴' ابوداؤد شریف: ۶۰۴' ابن ماجہ شریف: ۸۴۰)

مذکورہ حدیث شریف کی رو سے جہری وسری دونوں طرح کی نمازوں میں قراءت خلف الامام منع ہے۔ نیز ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: امام اس لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے' لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔ (سنن ابن ماجہ: ۸۴۶' ابوداؤد: ۶۰۴)

دوسرے مقام پر فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

(ابن ماجہ: ۸۵۰، سنن دار قطنی ج ۱ ص ۳۲۳، مسند احمد ج ۳ ص ۳۳۹)

(۶) آہستہ "آمین" کہنے کا حکم

احناف کے نزدیک نماز میں "آمین" بلند آواز سے کہنا جائز نہیں ہے۔ جب کہ وہابی (اہلحدیث) اس بات کے قائل ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں کہ نماز میں بلند آواز سے "آمین" کہنی چاہیے۔ ان کے رد میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جن احادیث میں آمین بلند آواز سے کہنے کا تذکرہ آیا ہے وہ ابتداءً سکھانے کے طور پر تھا۔ جب کہ بعد میں حضور ﷺ نے آہستہ "آمین" کہی۔ اور ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ ہمارے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو پس جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے مشابہہ ہو گئی تو اس کے تمام پچھلے (صغیرہ) گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا"۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث شریف میں فرشتوں کی طرح آمین کہنے والوں کو بخشش کی خوشخبری دی گئی ہے تو ظاہر بات ہے کہ ملائکہ آہستہ سے آمین کہتے ہیں تو ملائکہ کی طرح ہمیں آہستہ آمین کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" پڑھا تو اس کے بعد "آمین" کو آہستہ کہا یعنی "خفض بھا صوتہ" آپ نے آمین کہنے میں اپنی آواز پست رکھی)۔ (ترمذی شریف ص ۶۳)

وہابی اعتراض کرتے ہیں کہ دوسری روایت میں "مد بھا صوتھا" آیا ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ مد سے لمبا کر کے پڑھنا مقصود ہے نہ کہ آواز سے۔

(۷) عورت اور مرد کی نماز میں فرق

عورت اور مرد کی نماز میں بنیادی فرق "ستر" کا ہے۔ یعنی عورت کی نماز حتی الامکان اس طریقہ پر ہونی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ ستر ہو۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران کو دوسری ران سے ملائے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں کے ساتھ چمٹائے یہ اس کے لیے ستر کے قریب ہے۔ (کنز العمال ج ۷ ص ۵۴۹)

حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:
"یا وائل بن حجر اذا صلّیت فاجعل یدیك حذاء اذنیك والمرء ۃ تجعل یدیھا حذاء ثدییھا" اے وائل بن حجر! جب تم نماز پڑھو تو اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاؤ اور عورت اپنے دونوں ہاتھ اپنی چھاتی کے برابر اٹھائے۔

(معجم کبیر للطبرانی ج ۲۲ ص ۱۸' مجمع الزوائد: ۲۵۹۴۔ ج ۲ ص ۲۲۲۔ رقم الحدیث: ۱۶۰۰۵۔ ج ۹ ص ۶۲۴)

حضرت یزید بن ابی حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے' جو نماز پڑھ رہی تھیں' آپ نے فرمایا: "اذا سجدتما فضمّا بعض اللحم الی الارض فانّ المرء ۃ لیست فی ذالك کالرجل" جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملا لیا کرو' کیونکہ عورت نماز کے معاملہ میں مرد کی طرح نہیں ہے۔ (سنن بیہقی ج ۲ ص ۲۲۳ طبع قدیم' سنن بیہقی: ۳۲۰۱ طبع جدید' مراسیل ابی داؤد: ۸۷۔ ص ۱۱۸' مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

اس بحث میں مزید دلائل کے لیے شارح بخاری علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی کی تصنیف "نعمۃ الباری" ج ۲ ص ۷۵۳ تا ۷۵۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۸) ہاتھ باندھنے کی جگہ

★ نماز میں قیام کے وقت ہاتھ باندھنے کے بارے میں احادیث آپس میں مختلف ہیں۔ جس حدیث میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے وہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے' وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے تکبیر کے بعد اپنے سینے پر ہاتھ باندھے۔

(سنن ابوداؤد: ۷۵۹' سنن بیہقی ج ۲ ص ۳۰)

اور جن احادیث میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے وہ حضرت علی مرتضیٰ' حضرت ابوھریرہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہیں۔ اور یہ احادیث سنن ابو داؤد' مسند احمد اور سنن بیہقی میں موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نماز میں ناف کے نیچے ہتھیلی پر ہتھیلی رکھنا سنت ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۷۵۶' مسند احمد ج ۱ ص ۱۱۰' سنن بیہقی ج ۲ ص ۳۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہاتھ باندھنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے

ہیں: ''اخذ الاکف علی الاکف فی الصلوٰۃ تحت السرّۃ'' (طریقہ یہ ہے کہ) ناف کے نیچے نماز میں ہتھیلی پر ہتھیلی رکھی جائے۔ (سنن ابو داؤد: ۷۵۸) چونکہ احادیث دونوں طرح کی موجود ہیں اس لیے مردوں کے حق میں ہمارے فقہاء نے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا حکم فرمایا اور عورتوں کے لیے چونکہ زیادہ ستر اسی میں ہے کہ وہ سینے پر ہاتھ باندھیں اس لیے انہیں سینے پر ہاتھ باندھنے کا حکم فرمایا۔

طالبات کا اپنے ایام کے دوران مذہبی کتابیں چھونے اور پڑھنے کا حکم

سوال:

طالبات کے لیے دورانِ حیض مذہبی کتب کو چھونے اور پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح قرآن کریم اور احادیث مبارکہ پڑھنے اور پڑھانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

[از: طالبات اسلامک مشن یونیورسٹی]

جواب:

وہ خواتین جنہیں مذہبی کتب کی حاجت پڑتی رہتی ہے (مثلاً طالبات و معلمات) ان کے لیے کتبِ فقہ میں اس بات کی رخصت موجود ہے کہ وہ مذہبی کتب کو چھو سکتی ہیں۔ خواہ آستین کے ذریعہ ہو یا براہِ راست ہاتھ سے ہو۔ چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''یکرہ مسہ بالکم وھو الصحیح لانہ تابع لہ بخلاف کتب الشریعۃ لاھلھا حیث یرخص فی مسھا بالکم لان فیہ ضرورۃ''۔ مذہب صحیح کے مطابق قرآن کریم کو ناپاکی کی حالت میں آستین سے چھونا بھی مکروہ ہے کیونکہ آستین آدمی کے تابع ہوتی ہے۔ البتہ وہ لوگ جنہیں مذہبی کتب کی ضرورت پڑتی رہتی ہے ان کے لیے اجازت ہے کہ وہ آستین کے ذریعہ مذہبی کتابیں چھو سکتے ہیں۔ (ہدایہ اولین ص ۶۵)

صاحب فتح القدیر اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قولہ حیث یرخص فی مسھا بالکم یقتضی انہ یرخص بلا کم'' صاحب ہدایہ کا یہ فرمانا کہ ''مذہبی کتابوں

کو آستین کے ذریعہ چھونے کی شریعت میں رخصت ہے" اس کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر آستین کے (یعنی براہِ راست ہاتھ سے) چھونا بھی جائز ہے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۶۹)

علامہ شرنبلالی حنفی مراقی الفلاح میں رقمطراز ہیں:

"ویرخص لاھل کتب الشریعة اخذھا بالکم وبالید للضرورة الا التفسیر فانه یجب الوضوء لمسه والمستحب ان لا یاخذھا الا بوضوء"۔

(مراقی الفلاح ص ۷۷)

یعنی وہ لوگ جنہیں مذہبی کتب کی ضرورت پڑتی ہے ان کے لیے مذہبی کتابوں کو آستین سے چھونا جائز ہے اور ضرورت کے وقت ہاتھ سے چھونے کی بھی اجازت ہے سوائے تفسیر قرآن کے۔ (یعنی تفسیر کو بغیر طہارت کے ہاتھ نہیں لگا سکتے) کیونکہ اس کو ہاتھ لگانے کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔ بہر صورت مذہبی کتابوں کو باوضو ہو کر ہاتھ لگانا مستحب ہے۔

جہاں تک مذہبی کتب پڑھنے کا معاملہ ہے اس کے جواز میں کوئی کلام ہی نہیں۔ اس لیے کہ حالتِ حیض ونفاس میں صرف قرآن کریم کی قراءت وتلاوت ممنوع ہے۔ باقی کتب فقہ و حدیث پڑھنا جائز ہے۔ مگر یاد رہے کہ موضعِ آیت پر ہاتھ رکھنا حرام ہے۔ اسی طرح پڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ معلّمہ ایک ایک کلمہ سانس توڑ توڑ کر پڑھائے' اور ہجے کرائے تب بھی حرج نہیں۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: معلّمہ کو حیض یا نفاس ہو تو ایک ایک کلمہ سانس توڑ کر پڑھائے اور ہجے کرانے میں کوئی حرج نہیں۔ (بہارِ شریعت حصہ ۲ ص ۵۰' مطبوعہ لاہور)

ایک مقام پر صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ ناپاک مرد وعورت کے احکام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قرآن کریم دیکھنے میں ان سب پر کچھ حرج نہیں اگرچہ حروف پر نظر پڑے اور الفاظ سمجھ میں آئے اور خیال میں پڑھتے جائیں۔ ان سب کو فقہ وتفسیر وحدیث کی کتابوں کا چھونا مکروہ ہے۔ اور اگر ان کو کسی کپڑے سے چھوا اگرچہ اس کو پہنے یا اوڑھے ہوئے ہو تو حرج نہیں اگرچہ موضعِ آیت پر ان کتابوں میں بھی ہاتھ رکھنا حرام ہے۔

(بہارِ شریعت حصہ دوم ص ۲۵۔۲۶) **واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب**

اذانِ خطبہ کے دوران انگوٹھے چومنے اور کسی کی اصلاح کرنے کا شرعی حکم

سوال:

(۱) خطبہ کی پہلی اذان شروع ہوتی ہے' لوگ اس دوران انگوٹھے چومتے ہیں یا کسی کو تنبیہ کرتے ہیں۔ یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟ اذان شروع ہونے کے بعد کیا کیا پابندیاں عائد ہوتی ہیں؟

(۲) اگر کوئی شخص عشاء کی نماز سے پہلے یا اذان کے بعد سو جاتا ہے (قصداً) اس نیت سے کہ اٹھ کر نماز پڑھ لوں گا۔ تو کیا اس کی نماز عشاء ادا ہوگئی یا اس کے ذمہ ہے؟

[سائل: محمد رفیق خان' نیو کراچی]

جواب:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:" **اذا خرج الامام فلا صلوة ولا کلام وقالا لاباس اذا خرج الامام قبل ان یخطب**"۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۴۷) امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک خطیب کے منبر پر چڑھتے ہی نماز' کلام ممنوع ہوجاتے ہیں جب کہ صاحبین کے نزدیک خطبہ شروع ہونے سے پہلے یہ پابندی عائد نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے' امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک وہیں سے ہر قسم کی نماز' گفتگو اور تنبیہ وغیرہ ممنوع ہوجاتے ہیں جب کہ صاحبین کے نزدیک یہ تمام پابندیاں اس وقت عائد ہوتی ہیں جب امام خطبہ کے لیے کھڑا ہوجائے۔ بہر حال بہتر یہی ہے کہ خطیب کے منبر پر چڑھتے ہی بات چیت اور دیگر تمام امور موقوف کردیئے جائیں۔ یہی حکم اذانِ خطبہ کے دوران انگوٹھے چومنے کا ہے' کہ اس سے بھی بچنا بہتر ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

اذان خطبہ کے جواب اور اس کے بعد دعا میں امام صاحب وصاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ کا اختلاف ہے۔ بچنا اولیٰ (بہتر) اور کریں تو حرج نہیں۔ یونہی اذان خطبہ میں نام پاک پر

انگوٹھے چومنا' اس کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن خطبہ میں محض سکوت وسکون کا حکم ہے' خطبہ میں نام پاک سن کر صرف دل میں درود شریف پڑھیں اور کچھ نہ کریں' زبان کو جنبش بھی نہ دیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۲۳۸' طبع قدیم)

(۲) کوئی شخص عشاء کی اذان سے پہلے یا بعد خواہ قصداً سوئے یا سہواً' بہر حال نماز عشاء اس کے ذمہ ہے۔ محض پڑھنے کی نیت کر کے سو جانے سے نماز عشاء یا کوئی بھی نماز کیونکر ادا ہو سکتی ہے؟ لہٰذا اگر وقت کے اندر بیدار ہوگا تو اداء ورنہ قضاء لازم ہوگی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اذان واقامت کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا شرعی حکم

سوال:

اذان سے پہلے یا بعد اور اقامت سے پہلے صلوۃ وسلام پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ اگر یہ اضافہ جائز ہے تو پھر کوئی شخص ایک رکعت میں دو رکوع یا تین سجدے بھی کر سکتا ہے۔ اس کا کیا جواب ہوگا؟ علاوہ ازیں صلوۃ وسلام کا اضافہ کرنے میں نئی نسل کے گمراہ ہونے کا امکان بھی موجود ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ [سائل: عزیز احمد' ملیر' کراچی]

جواب:

اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں اپنا یہ تصور اور نظریہ کلیئر (Clear) کرنا چاہیے کہ ہر نئی چیز یا نیا کام اور اضافہ برا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس طرح بہت سارے دینی معاملات (جو مختلف مکاتب فکر کے باہمی اتفاق سے انجام پا رہے ہیں) معطل ہو جائیں گے۔ بلکہ جدید دنیا کی ساری جدتیں اور اضافے بیکار قرار پائیں گے۔ سب سے پہلے قرآن مجید کے اعراب (زبر۔ زیر۔ پیش اور تشدید و جزم) وغیرہ غلط قرار پائیں گے۔ کیونکہ یہ کام عہد رسالت اور عہد خلافت کے بعد (حجاج بن یوسف کے زمانے میں) ہوا ہے۔ اسی طرح مساجد میں مینار اور محرابیں غلط قرار پائیں گی۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کا زمانہ اس سے خالی تھا اور جب مینار وغیرہ غلط قرار پائیں گے تو سب سے پہلے حرمین طیبین کے میناروں کے متعلق

سوال ہوگا۔ کیونکہ حرمین شریفین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ خود گنبد خضراء (جو عین قبرِ رسول ﷺ پر تعمیر ہے) کا معاملہ بھی معرضِ خطر میں ہوگا۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث کا وجود بھی ناقابل تسلیم قرار پائے گا۔ کیونکہ عہد رسالت اور عہدِ صحابہ میں ان کتب کا (مخصوص ترتیب کے ساتھ) وجود نہیں تھا۔ اس طرح اگر دیکھتے چلے جائیں تو بے شمار چیزیں ایسی سامنے آئیں گی جو عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں نہیں تھیں، لیکن اب ان پر مسلمان بہت فراخدلی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند ان چیزوں کو ناجائز یا ان کو ختم کرنے کا قول نہیں کرے گا۔

اس گفتگو کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ ہر نیا کام برا نہیں ہوتا اور ہر بدعت ''سیئة'' (یعنی بری) نہیں ہوتی۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جو کام اچھا ہو وہ ہر زمانے میں اچھا ہے۔ اور جو برا ہو وہ ہر زمانے میں برا ہے۔ دین میں کسی مستحب کام کو فروغ دینا اور اس میں اضافہ کرنا شرعاً جائز اور محمود و مستحسن ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها''۔ (صحیح مسلم شریف) جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اسے اس کا اجر ملے گا اور ان تمام لوگوں کا اجر ملے گا جو اس پر عمل کرتے رہیں گے۔ اس حدیث شریف کی رو سے اگر غور کیا جائے تو درود و سلام کا اضافہ (اذان سے پہلے یا اذان کے بعد یا اقامت سے پہلے) قطعاً غلط اور بدعتِ سیئہ قرار نہیں پاتا۔ (یہاں واضح رہے کہ جن چیزوں کی مقدار شریعتِ مطہرہ نے متعین فرمادی ہے ان میں کمی بیشی جائز نہیں ہے۔ جیسے کوئی شخص دو کے بجائے تین سجدے کرنے لگ جائے یا اذان کے کلمات میں اضافہ کردے یا قربانی کے دن کم زیادہ کردے یا فرض روزوں کی تعداد بڑھادے تو یہ اضافے شرعاً ممنوع قرار پائیں گے۔)

جہاں تک رہی یہ بات کہ نئی نسل (New Generation) درود و سلام کے اضافے کو اذان و اقامت کا جزء تصور کرے گی، تو یہ بات ناقابل تسلیم ہے۔ کیونکہ اذان کے ساتھ درود و سلام کے اضافے کو ساڑھے چھ سو سال کا عرصہ گزرنے کو آیا ہے۔ لیکن آج تک کوئی بچہ بھی اس سے گمراہ نہیں ہوا۔ نہ کہیں سے ایسی خبر آئی۔ اس لیے یہ وجہ محض بے بنیاد ہے۔ اگر اس بے بنیاد وجہ کو مان لیا جائے تو کل کوئی شخص یہ اعتراض بھی کر بیٹھے گا کہ قرآن مجید کی

تلاوت کے بعد "صدق اللّٰہ العظیم" نہیں پڑھنا چاہیے کیونکہ نئی نسل اس کو قرآن مجید کا جزء تصور کرے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کی یہ بات تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس طرز میں تلاوت کی جاتی ہے اسی طرز میں "صدق اللّٰہ العظیم" پڑھا جاتا ہے اور طرز کی یکسانیت کی وجہ سے قوی امکان تھا کہ نئی نسل اس کو قرآن کا جزء تصور کرتی لیکن کسی نے اس کو جزء تصور نہیں کیا بلکہ پوری دنیا میں اس کو بالاتفاق پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ تو صلوٰۃ وسلام کا معاملہ اس سے تو بہت مختلف ہے' کیونکہ اس کی طرز اذان کی طرز سے مختلف ہوتی ہے اور درمیان میں رک کر وقفہ بھی دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں جزء ہونے کا خدشہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

اس موضوع پر سب سے زیادہ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ جس طرح شریعت میں دعا کرنے سے کسی جائز وقت میں منع نہیں کیا گیا اسی طرح درود وسلام سے بھی کسی جائز وقت میں منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ "صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" (الاحزاب:۵۶) فرما کر کھلی اجازت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا اس آیت کی رو سے اذان سے پہلے' اذان کے بعد اور اقامت سے پہلے درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

شیشے لگے ہوئے دروازوں کے سامنے نماز پڑھنے کا شرعی حکم

سوال:

مساجد میں دروازوں کے ساتھ شیشے لگے ہوتے ہیں۔ جن میں نماز کے دوران نمازی کو اپنا عکس نظر آتا ہے۔ آیا اس طرح نماز درست ہو جاتی ہے یا نہیں؟

[سائل: محمد سمیع اللہ' جوہر موڑ' کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ شیشہ میں نظر آنے والا عکس نہ تو تصویر ہے نہ تصویر کے حکم میں ہے۔ لہٰذا اس کے بالمقابل نماز ادا کرنا بلا تکلف جائز اور درست ہے۔ چنانچہ اعلیٰ

حضرت امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان "جدُّ الممتار" میں لکھتے ہیں:
"سئلت عمن صلى وامامه مرٰاة فاجبت بالجواز" (جدالممتار حاشیۂ ردالمحتار ج ا ص ۳۱۲) مجھ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز پڑھ رہا ہو اور اس کے سامنے شیشہ ہو تو میں نے جواب دیا کہ ایسے شخص کی نماز جائز ہے۔

اسی طرح صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: آئینہ سامنے ہو تو نماز میں کراہت نہیں، کہ سبب کراہت تصویر ہے اور وہ یہاں موجود نہیں۔ اور اگر اسے تصویر کا حکم دیں تو آئینہ کا رکھنا بھی مثل تصویر نا جائز ہو جائے حالانکہ بالاجماع جائز ہے۔

(فتاویٰ امجدیہ، باب مفسدات الصلوٰۃ ج ا ص ۱۸۴)

شیشے کے سامنے نماز پڑھنے کی یہ تفصیل اس لحاظ سے تھی کہ اس کے جواز میں علماء کو کلام نہیں ہے، لیکن جہاں تک تقویٰ کا تعلق ہے تو اس سے حتی الوسع اجتناب ہی بہتر ہے، تاکہ آدمی کامل خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کر سکے۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

امام کے تکبیر بالجہر نہ کہنے کی وجہ سے مقتدیوں کا بلا رکوع یا بلا سجدہ نماز ادا کرنا

سوال:

امام مسجد نے نماز کی پہلی رکعت میں رکوع وسجود میں جاتے ہوئے تکبیر بالجہر نہ کہی، بعض مقتدی اس وجہ سے رکوع یا سجدہ نہ کر سکے جب کہ دیگر نے امام کو رکوع وسجدے میں جاتا دیکھ کر انہیں ادا کر لیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ نماز ہوئی یا نہیں؟ امام مسجد نے سجدہ سہو نہیں کیا تھا ایک دوسری مسجد کے امام صاحب نے مسئلہ بتایا کہ امام کو تکبیر بالجہر کہنا واجب ہے۔ آپ سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ امام صاحب نے یہ مسئلہ صحیح بتایا یا غلط؟ اور یہ کہ سجدہ سہو واجب تھا یا نہیں؟ [سائل: محمد یامین عطاری لانڈھی]

جواب:

صورت مسئولہ میں امام کے تکبیر بالجہر نہ کرنے کے باعث جو مقتدی رکوع یا سجدہ نہ

کر سکے اور بقیہ نماز ادا کرلی ان کی نماز نہ ہوئی۔ کیونکہ رکوع اور سجود نماز میں فرض ہیں اور فرض کو ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ مقتدی جو رکوع یا سجود نہ کر سکے وہ اپنی نماز دہرائیں۔ اور جن لوگوں نے امام کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرلیا ان کی نماز درست ہوگئی' اعادہ کی حاجت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ امام کو تکبیر بالجہر کہنا واجب ہے یا نہیں؟ تو یہ واضح رہے کہ تکبیر خواہ تحریمہ کی ہو یا رکوع و سجود وغیرہ کی' سب میں جہر مسنون ہے' یعنی انہیں بلند آواز سے کہنا سنت ہے۔ اور سنت کو ترک کرنے پر نہ سجدہ سہو واجب ہوتا ہے نہ ہی نماز فاسد ہوتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں امام پر سجدہ واجب نہیں تھا۔ جس امام نے یہ بتایا کہ تکبیر بالجہر کہنا واجب ہے اس نے غلط مسئلہ بیان کیا' آئندہ احتیاط چاہیے۔

تنویر الابصار پھر درمختار اور ردالمحتار میں ہے: ''**(وسننها) جهر الامام بالتكبير للاعلام بالدخول والانتقال وكذا بالتسميع والسلام**'' نماز کی سنتوں میں سے ہے کہ امام نماز میں اپنے آغاز اور انتقالات پر لوگوں کو مطلع کرنے کے لیے بلند آواز سے تکبیر کہے۔ ''**سمع الله لمن حمده**'' اور سلام کہنے کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی ان کو بھی بلند آواز سے کہنا سنت ہے۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۲ ص ۱۵۱)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: امام کو تکبیر تحریمہ اور تکبیرات انتقال سب میں جہر مسنون ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۳ ص ۴۵) **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

امام پر مقتدیوں کی نیت کرنا لازم ہے یا نہیں؟

سوال:

اگر کسی شخص کو کسی تقریب وغیرہ میں امام بنا دیا جائے تو کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقتدیوں کی بھی نیت کرے' مثلاً یوں کہے کہ نیت کرتا ہوں میں چار رکعت فرض' واسطے اللہ تعالیٰ کے مع مقتدیوں کے' منہ میرا کعبہ شریف کی طرف اللہ اکبر۔ یا اس کا کوئی اور طریقہ ہے؟ [سائل: محمد رفیق خان' نیو کراچی]

جواب:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''الامام ینوی ما ینوی المنفرد ولا یحتاج الی نیة الامامة حتی لو نوی ان لا یؤم فلانا فجاء فلان واقتدی به جاز هکذا فی فتاوی قاضی خان''.

(عالمگیری ج ۱ ص ۶۶)

یعنی امام وہی نیت کرے جو اکیلے نماز پڑھنے والے کی ہوتی ہے' اسے امامت کی نیت کی حاجت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے یہ نیت کرلی کہ میں فلاں کا امام نہیں ہوں' پھر اس شخص نے اس کی اقتداء کی تو اس کی نماز بھی ہو جائے گی۔

عبارت مذکورسے معلوم ہوا کہ امام کے لیے مقتدیوں کی نیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی نے مقتدیوں کی نیت کیے بغیر نماز پڑھائی تو ہو جائے گی۔ ہاں البتہ اسے جماعت کا ثواب نہیں ملے گا' لہٰذا نیت کرلینا بہتر ہے۔ چنانچہ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: امام کو نیتِ امامت مقتدی کی نماز صحیح ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر امام نے یہ قصد کرلیا کہ میں فلاں کا امام نہیں ہوں اور اس نے اس کی اقتداء کی' نماز ہوگئی مگر امام نے امامت کی نیت نہ کی تو ثوابِ جماعت نہ پائے گا۔ (بہارِ شریعت حصہ ۳ ص ۳۵)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مسئلہ رفع یدین کی حقیقت اور دلائل کی روشنی میں اس پر بحث

سوال:

میں ایک دینی مسئلہ میں اپنے ایک دوست سے الجھ گیا ہوں۔ وہ مسئلہ ''رفع یدین'' کا ہے۔ میرے دوست کا کہنا ہے کہ یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ سے ہے اور ختم نہیں ہوا۔ لہٰذا آپ اس مسئلہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کریں اور بتائیں کہ یہ معاملہ کب شروع ہوا؟ اور اگر ختم ہوا تو کب؟ اور کس کے دور میں یا کس سن ہجری میں؟ [سائل: وحید احمد' کراچی]

جواب:

''رفع یدین'' کا معنی ہے: دونوں ہاتھ بلند کرنا۔ اس پر تو کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ تکبیر تحریمہ کے ذریعہ جب نماز کا آغاز کیا جائے تو دونوں ہاتھ اٹھانا سنت ہے۔ البتہ اس میں

اختلاف ہے کہ رکوع سے پہلے اور رکوع سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرنا کیسا ہے؟ اس سلسلہ میں اختلاف کی تفصیل حسب ذیل ہے:

غیر مقلّدین حضرات کا مؤقف اور ان کی دلیل

غیر مقلّدین حضرات کا کہنا ہے کہ رکوع سے پہلے اور رکوع سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرنا ایک ایسا عمل ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اس کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ بطور دلیل وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت پیش کرتے ہیں:

"رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا قام فی الصلٰوۃ رفع یدیہ حتی تکونا حذو منکبیہ وکان یفعل ذالک حین یکبّر للرکوع ویفعل ذالک اذا رفع رأسہ من الرکوع ویقول سمع اللہ لمن حمدہ' ولا یفعل ذالک فی السّجود"۔

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا جب آپ نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے حتیٰ کہ وہ شانوں کے مقابل ہو جاتے اور آپ رکوع کے لیے جب اللہ اکبر کہتے تب بھی اسی طرح ہاتھ بلند کرتے اور رکوع سے جب سر اٹھالیتے تب بھی اسی طرح کرتے اور "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے' البتہ سجدہ میں اس طرح نہیں کرتے تھے۔

(صحیح البخاری: ۷۳۶' صحیح مسلم: ۳۹۰)

غیر مقلّدین حضرات کا حیرت انگیز استدلال

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اس حدیث میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ یہ عمل کرتے رہے" اس کے باوجود غیر مقلّدین یہ کہتے ہیں کہ یہ عمل کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ یہ لوگ اگر صرف اتنی بات کرتے کہ "رفع یدین کا تذکرہ صحیح احادیث میں موجود ہے" تب تو کوئی اعتراض کی بات نہ تھی لیکن جب وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث بیان کرنے کے بعد یہ اضافہ کرتے ہیں کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام صحابہ کرام ہمیشہ اسی طرح عمل کرتے رہے" تو اس پر دلیل کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ اس پر دلیل پیش کرنے سے کتراتے ہیں! کیونکہ اس سلسلہ میں ان کے پاس کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔

عوام الناس پر چونکہ یہ باریکی پوشیدہ ہوتی ہے' اس لیے وہ ان لوگوں کی باتوں میں آ

جاتے ہیں اور محض رفع یدین کی حدیث سُن کر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہا۔ حالانکہ کسی حدیث میں کسی بات کا مذکور ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ کام ہمیشہ جاری رہا ہو۔ جب تک کہ اُس پر واضح دلیل نہ مل جائے۔

احناف کا مؤقف اور ان کا استدلال

غیر مقلدین کے برعکس حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کا مؤقف یہ ہے کہ رفع یدین ایک ایسا عمل ہے جو نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے نماز میں اختیار کیا لیکن ایک عرصہ کے بعد اس کو ترک کر دیا اور پھر ہمیشہ کے لیے یہی قرار پایا کہ رفع یدین نہ کیا جائے۔ اس پر دلیل کے طور پر کتب حدیث میں صحیح روایات موجود ہیں، جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جن احادیث میں رفع یدین کا تذکرہ آیا ہے، وہ دیگر احادیث سے منسوخ ہو چکی ہیں اور ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جس چیز کو اپنی زندگی میں منسوخ فرما دیا ہو، وہ بعد والوں کے لیے سنت نہیں ہو سکتی۔

غیر مقلدین کی پیدا کردہ ایک غلط فہمی کا ازالہ

قبل اس کے کہ ہم وہ احادیث ذکر کریں "جن سے رفع یدین کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے" ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں:

غیر مقلدین نے ایک غلط فہمی یہ پیدا کر رکھی ہے کہ "رفع یدین کرنا صحیح بخاری کی حدیث سے ثابت ہے اور صحیح بخاری کی حدیث منسوخ نہیں ہو سکتی" حالانکہ یہ محض عوام کو اُلجھانے کی ایک سازش ہے۔ کیونکہ صحیح بخاری سے زیادہ مُستند کتاب "قرآن مجید" ہے لیکن اس میں بھی ایسی آیات موجود ہیں جن کی صرف تلاوت کی جاتی ہے اور عمل کرنا منسوخ ہو چکا ہے۔ وضاحت کے لیے ہم صرف ایک مثال پیش کر رہے ہیں:

سورۃ البقرہ: ۲۳۴ میں بیوہ خاتون کی عدت "چار مہینے دس دن" بیان کی گئی ہے اور اسی پر اُمت مسلمہ کا عمل ہے۔ حالانکہ اسی سورت کی آیت: ۲۴۰ میں بیوہ کی عدت ایک سال بیان کی گئی ہے، لیکن کسی مکتب فکر میں اس آیت پر عمل نہیں کیا جاتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایک آیت سے دوسری آیت کا منسوخ ہونا جائز ہے اور جب قرآنی آیت منسوخ ہو سکتی ہے تو صحیح بخاری یا کسی بھی کتاب کی حدیث منسوخ کیوں نہیں ہو سکتی!

جو لوگ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''رفع یدین کا تذکرہ چونکہ صحیح بخاری میں آیا ہے اس لیے اُسے کوئی حدیث منسوخ نہیں کرسکتی'' وہ کیا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صحیح بخاری کا مرتبہ قرآن مجید سے بھی زیادہ ہے؟ حالانکہ کوئی مسلمان ایسا نظریہ قائم نہیں کرسکتا۔ جس طرح سورۃ البقرہ کی آیت: ۲۴۰ ہمیشہ پڑھی جاتی رہے گی اور اُس پر عمل نہیں کیا جائے گا' اسی طرح صحیح بخاری کی رفع یدین والی حدیث بھی قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی اور اُس پر (دیگر احادیث کی وجہ سے) عمل نہیں کیا جائے گا اور جس طرح سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے کوئی شخص اُمت مسلمہ پر تارکِ قرآن ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا' اسی طرح صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے احناف پر کوئی تارکِ حدیث ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا۔

رفع یدین کے منسوخ ہونے پر غیر مقلدین کے خلاف دلائل

(۱) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

''خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم کانھا اذناب خیل شمس؟ اسکنوا فی الصلوٰۃ'' (ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان تشریف لائے اور فرمایا: کیا بات ہے میں تمہیں سرکش گھوڑوں کی دُموں کی طرح رفع یدین کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ اپنی نماز میں سکون اختیار کرو۔ (صحیح مسلم: ۴۳۰)

اس حدیث میں واضح طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رفع یدین سے منع فرما دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس حدیث میں رفع یدین کا ذکر آیا ہے' وہ منسوخ ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر لوگوں سے فرمایا:

''الا اصلّی بکم صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فصلّی فلم یرفع یدیه الّا فی اوّل مرّۃ'' (ترجمہ) کیا میں تم لوگوں کو اس طریقہ سے نماز پڑھ کے نہ دکھاؤں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھتے تھے؟ پھر آپ نے نماز پڑھ کر دکھائی اور آغاز کے علاوہ آپ نے پوری نماز میں رفع یدین نہیں کیا۔

(سنن ترمذی: ۲۵۷' سنن ابوداؤد: ۷۴۸' سنن نسائی: ۱۰۲۶' مشکوٰۃ شریف: ۸۰۹۔ ص ۷۷)

امام ترمذی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"حدیث ابن مسعود حدیث حسن وبه یقول غیر واحد من اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعین وهو قول سفیان الثوری واهل الکوفة" یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث "حدیث حسن" ہے (یعنی اس کے راوی سچے ہیں اور دیگر اسانید سے بھی یہ مروی ہے)۔ نبی اکرم ﷺ کے کئی صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے اور حضرت سفیان ثوری اور اہل کوفہ (امام اعظم ابوحنیفہ) بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام ترمذی کے اس تبصرہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث لائق استدلال ہے اور چونکہ اس میں آغازِ نماز کے علاوہ دیگر ارکان میں رفع یدین کی نفی کی گئی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز میں رفع یدین کا عمل ترک فرما دیا تھا۔ بلکہ نمبر ا کے تحت ہم نے صحیح مسلم کی جو حدیث ذکر کی ہے' اس کے مطابق تو نبی ﷺ صحابہ کو بھی رفع یدین سے منع فرماتے تھے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے یہ فتویٰ دیا کہ نماز میں رفع یدین ابتداء میں جاری تھا' بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جس عمل کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں منسوخ فرما دیا ہو' وہ بعد والوں کے لیے سنت نہیں ہو سکتا۔

غیر مقلدین کے مؤقف پر ابتداء میں ہم نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت پیش کی تھی کہ نبی ﷺ نماز میں رفع یدین فرماتے تھے۔ یہاں اب یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت ابن عمر نے خود اپنی اس روایت پر عمل ترک کر دیا تھا اور بعد میں وہ اپنی اس روایت کے برخلاف یہ روایت کرتے تھے کہ نبی ﷺ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ:

(۳) حضرت مجاہد بیان کرتے ہیں:

"صلیت خلف ابن عمر رضی الله تعالٰی عنهما فلم یکن یرفع یدیه الّا فی التکبیرة الاولٰی من الصلوة" (ترجمہ:) میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز ادا کی (میں نے انہیں دیکھا کہ) وہ آغازِ نماز کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۴۵۲ طبع جدید۔ ج ا ص ۲۳۷ طبع قدیم' طحاوی شریف: ۱۳۲۳)

(۴) امام بخاری اور امام مسلم کے استاد امام حُمیدی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے

روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ آغازِ نماز (تکبیر تحریمہ) کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"عن عبد اللہ بن عمر قال رایت رسول اللہ ﷺ اذا افتتح الصلوۃ رفع یدیہ حذو منکبیہ واذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع راسہ من الرکوع فلا یرفع ولا بین السجدتین"۔

(ترجمہ:) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے کندھوں کے مقابل دونوں ہاتھ بلند فرماتے اور جب آپ رکوع میں جانے کا ارادہ فرماتے اور رکوع کے بعد سر اُٹھاتے تو ان مواقع پر آپ رفع یدین نہیں فرماتے تھے اور دو سجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں فرماتے تھے۔

(مُسند حُمیدی، ج ۲ ص ۷۷، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، مدینہ منورہ بحوالہ شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۴، مطبوعہ لاہور)

امام بخاری اور امام مسلم کا حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت فرمانا کہ "نبی ﷺ رفع یدین فرماتے تھے" اور آپ کے استاذ حُمیدی کا حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے یہ روایت فرمانا کہ "نبی ﷺ رفع یدین نہیں فرماتے تھے" کیا یہ اس بات کی کھلی دلیل نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابتداء میں رفع یدین کرتے تھے اور بعد میں آپ نے ترک فرما دیا تھا۔ خصوصاً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی پہلی روایت پر عمل ترک کر دیا تھا اور آپ رفع یدین کے بغیر نماز ادا کرتے تھے اور قاعدہ ہے کہ راوی جب خود اپنی روایت کے خلاف عمل کرنے لگ جائے تو یہ اس کی روایت کے منسوخ ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

رفع یدین کے منسوخ ہونے پر اور بھی کئی دلائل موجود ہیں، لیکن ہم اسی قدر گفتگو پر اکتفاء کرتے ہیں۔ کیونکہ ماننے والے کے لیے ایک دلیل بھی کافی ہوتی ہے اور نہ ماننے والے کے لیے دفتر کے دفتر ناکافی ہوتے ہیں۔ باقی جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ "رفع یدین کس سن ہجری میں منسوخ ہوا" تو اس کی تفصیل نظر سے نہیں گزری۔ اور اصل بحث سے اس سوال کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کئی آیات اور احادیث ایسی ہیں جو منسوخ ہیں، لیکن اُن کے متعلق کُتب تاریخ میں یہ تفصیل مذکور نہیں ہے کہ یہ کب منسوخ ہوئیں۔ لہٰذا اس طرح

کے سطحی اور غیر لازمی سوالات میں اُلجھنے کے بجائے اصل بحث پر نظر رکھنی چاہیے۔ مخالفین کا عموماً یہی وطیرہ ہے کہ وہ اس طرح کے غیر ضروری سوالات پیدا کر کے اصل مسئلہ سے لوگوں کی توجہ ہٹانا چاہتے ہیں۔

جو شخص فجر کی نماز ادا نہ کر پایا ہو اس کا نماز جمعہ یا عیدین میں شامل ہونا

سوال:

اگر کوئی شخص فجر کی نماز ادا نہ کر پایا ہو تو کیا وہ نماز جمعہ یا نماز عیدین ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس کے لیے فجر کی قضاء پڑھنا ضروری ہے؟ حالانکہ اس نے فجر کی نماز بلا عذر ترک کی ہے۔ [سائل: محمد رفیق خان، نیو کراچی]

جواب:

"کوئی شخص فجر کی نماز ادا نہ کر پایا ہو وہ جمعہ یا عیدین کی نماز ادا کر سکتا ہے یا نہیں" یہ مسئلہ ہر شخص کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف صاحب ترتیب کے لیے ہے یعنی وہ شخص جس کی زندگی میں پانچ یا اس سے کم نمازیں قضاء ہوئی ہوں، ایسے شخص کے لیے فقہاء کرام نے جمعہ کے حوالے سے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ اگر اس دن فجر کی نماز اس سے رہ جائے تو وہ اسے ادا کیے بغیر جمعہ نہیں پڑھ سکتا۔ مسئلے کی مکمل تفصیل بہارِ شریعت میں یوں ہے: جمعہ کے دن کی فجر قضاء ہوگئی، اگر فجر پڑھ کر جمعہ میں شریک ہو سکتا ہے تو فرض ہے کہ پہلے فجر پڑھے اگرچہ خطبہ ہوتا ہو۔ اور اگر جمعہ نہ ملے گا مگر جمعہ کے ساتھ وقت بھی ختم ہو جائے گا تو جمعہ پڑھ لے پھر فجر پڑھے اس صورت میں ترتیب ساقط ہے۔

(بہار شریعت حصہ ۴ ص ۳۲، فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۲۲، فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۶۳۸)

فی الدر المختار:

"الترتیب بین الفروض الخمسة والوتر اداء و قضاء لازم. وقال الشامی علیه رحمة الباری: دخل فیه الجمعة فان الترتیب بینهما و بین سائر الصلوات لازم فلو تذکر انه لم یصل الفجر یصلیها ولو کان الامام یخطب". (فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۴۵۷)

یعنی فرض نمازوں اور وتر کے درمیان ادا اور قضاء دونوں ہی صورتوں میں ترتیب لازم ہے۔ (اس عبارت کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ:) اس میں جمعہ داخل ہے' کیونکہ اس کے اور دیگر نمازوں کے مابین ترتیب لازم ہے۔ لہٰذا اگر صاحب ترتیب نے فجر نہ پڑھی تو پہلے اسے ادا کرے گا۔ اگرچہ امام خطبہ دے رہا ہو۔

واضح رہے کہ ذکر کردہ مسئلہ صرف جمعہ سے متعلق ہے۔ عیدین اس میں شامل نہیں۔

(کما صرح بہ فی المجلد الثالث من الفتاوی الرضویہ ص ۶۴۲) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بچوں کو جماعت میں صف کے اندر شامل کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

(۱) ایسے چھوٹے بچے جو سمجھ دار ہوں' حفظ قرآن میں مشغول ہوں' اُن کی عمریں سات سے دس سال تک ہوں' نماز کا سبق اچھا یاد ہو لیکن اُن کو نماز کا طریقہ نہ آتا ہو۔ ایسے بچوں کو جماعت میں صف کے اندر شامل کرنا کیسا ہے؟

(۲) جو شخص اپنے بچہ کو اس نیت سے اپنے ساتھ کھڑا کرے کہ یہ نماز سیکھ جائے اور امام مسجد بہت سختی سے اس بات کا ردّ کرے' جس کی وجہ سے وہ بچہ اور اُس کا والد مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دے اور لوگ بھی آپس میں دست و گریباں ہو جائیں تو ایسی صورت میں امام کے لیے کیا حکم ہے؟ [سائل: محمد صدیق' کراچی]

جواب:

صفیں بنانے کی جو ترتیب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے' وہ یہ ہے کہ پہلے مرد حضرات کھڑے ہوں پھر بچے۔ اور بچوں میں بھی جو سمجھ دار ہوں' اُن کو کم سمجھ والے بچوں سے آگے رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں دو احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لیلینی منکم اولو الاحلام والنّھی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم''
(جماعت میں) بالغ حضرات میرے قریب (یعنی پہلی صف میں) کھڑے ہوں، پھر جو اُن کے مثل ہوں (یعنی سمجھ دار بچے) پھر جو اُن کی مثل ہوں (یعنی کم سمجھ والے بچے)۔

(صحیح مسلم: ۴۳۲، سنن ابوداؤد: ۶۷۴)

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ان النبی ﷺ کان یجعل الرجال قدّام الغلمان والغلمان خلفھم'' یعنی نبی اکرم ﷺ مردوں کو بچوں سے آگے کھڑا کرتے تھے اور بچوں کو مردوں کے پیچھے۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۳۴۴)

ان دونوں احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مساجد میں ائمہ حضرات جماعت سے پہلے یا جماعت کے بعد لوگوں کے سامنے صفوں کی ترتیب کا جو مسئلہ بیان کرتے ہیں، وہ حدیثِ رسول ہی کی روشنی میں ہے۔ لہٰذا اس پر جذباتی ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ائمہ حضرات بھی اس کو نرمی سے بیان کریں۔

تاہم حدیث اور فقہ میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر مردوں کی صف میں ایک دو بچوں کی جگہ باقی ہو اور اُن کو شامل کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ اُس صورت میں ہے جب بچہ میں کچھ سمجھ بوجھ اور ادب موجود ہو۔ ورنہ ایسے بچے جو مسجد میں دوڑتے پھریں، شرارتیں کریں، رونے لگیں، پیشاب کریں، اُن کو مسجد میں لانا جائز نہیں ہے، جب تک کہ اُن میں کچھ تمیز اور سمجھ بوجھ نہ آ جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنّبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم'' ناسمجھ بچوں اور پاگلوں سے اپنی مسجدیں بچاؤ۔

(سنن ابن ماجہ: ۷۵۰)

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

عید الاضحیٰ یا عید الفطر جمعہ کے دن ہو تو کیا اُس دن جمعہ کی نماز معاف ہے؟

سوال:

اگر عید الاضحیٰ جمعہ کے دن ہو تو اس دن دونوں نمازیں (جمعہ و عید) اپنی شان کے ساتھ ادا کی جائیں گی یا عید کی وجہ سے جمعہ کی نماز ظہر میں تبدیل ہو جائے گی؟

[سائل: محمد ارشد حسین آرائیں]

جواب:

عید کی نماز اور جمعہ کی نماز دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دونوں کا وقت' دونوں کا طریقہ اور دونوں کا شرعی حکم بھی ایک دوسرے سے جدا ہے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو اس کے اپنے معینہ طریقہ سے ادا کیا جائے گا۔ محض عید کا آنا کوئی ایسا عذر نہیں ہے کہ اُس کی وجہ سے جمعہ کی نماز ظہر میں تبدیل ہو جائے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیدین اور جمعہ کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے۔ (آگے فرماتے ہیں:) ''**واذا اجتمع العید والجمعة فی یوم واحد یقرء بهما ایضا فی الصلاتین**'' یعنی جب عید اور جمعہ اکٹھے آ جاتے تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں نمازوں میں یہی سورتیں تلاوت فرماتے تھے۔

(صحیح مسلم: ۸۷۸' سنن ترمذی: ۵۳۳' سنن نسائی: ۱۴۲۳' سنن ابن ماجہ: ۱۲۸۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید اور جمعہ دونوں ادا فرماتے تھے۔ بعض ایسی روایتیں جن سے جمعہ کی رخصت معلوم ہوتی ہے' وہ درحقیقت اُن افراد کے لیے تھی جو دور دراز کی بستیوں سے مسجد نبوی میں حاضر ہوتے تھے' اُن کے لیے چونکہ عید کی نماز میں صبح آ کر گھر لوٹنا اور پھر جمعہ کے لیے دوبارہ حاضر ہونا اور پھر واپس جانا ایک مشکل کام تھا' اس لیے اُنہیں رخصت دی گئی' ورنہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے موقع پر قرب وجوار کے صحابہ کے ساتھ جمعہ کے وقت جمعہ ہی قائم فرماتے۔ جیسا کہ اسی طرح کے ایک موقع پر دُور کے لوگوں کو رخصت دیتے ہوئے فرمایا: جو شخص چاہے اُسے عید کی نماز کے بعد جمعہ میں آنے کی حاجت

نہیں ہے اور ہم جمعہ پڑھیں گے۔ (سنن ابوداؤد: ۱۰۷۳)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کے دن عید واقع ہوئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا:

''انّ ھذا یوم اجتمع فیہ عیدان للمسلمین فمنَ کان ھھنا من اھل العوالی فقد اذنا لہ ان ینصرف و من احبّ ان یمکث فلیمکث''۔

یعنی آج مسلمانوں کے لیے دو عیدیں جمع ہوگئی ہیں' لہٰذا جو لوگ دور دراز سے آئے ہوئے ہیں' اُن کو ہماری طرف سے جانے کی اجازت ہے اور جو ٹھہرنا چاہے وہ ٹھہر جائے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ:۵۸۳۶۔ ج ۲ ص ۷)

ہمارے دور میں چونکہ بہت کثرت کے ساتھ مسجدیں موجود ہیں اور عموماً ہر مسجد میں عیدین اور جمعہ کا اجتماع منعقد ہوتا ہے' اس لیے عید پڑھ کر جمعہ کے لیے آنا اب قطعاً مشکل نہیں ہے' اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریقہ کے مطابق یہی کہا جائے گا کہ عید اور جمعہ دونوں اپنی اپنی شان کے مطابق قائم کیے جائیں اور جمعہ کو قطعاً ظہر میں تبدیل نہ کیا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نماز کے متعلق پیش آنے والے چند ضروری مسائل کا حل

سوال:

نمازِ فجر وعصر کے بعد قضاء فرض نماز پڑھ سکتے ہیں؟

جواب:

فجر وعصر کے بعد صرف نوافل منع ہیں' لہٰذا فرائض کی قضاء جائز ہے۔

(بدائع الصنائع ج ا ص ۲۸۸)

سوال:

اذانِ فجر وعصر کے بعد فرض سے پہلے نفل نماز ادا کر سکتے ہیں؟

جواب:

اس مسئلہ میں فجر اور عصر کا حکم مختلف ہے۔ فجر کا حکم یہ ہے کہ اُس میں وقت شروع ہوتے ہی نوافل کی کراہت شروع ہو جاتی ہے جب کہ عصر میں نماز ادا کرنے کے بعد کراہت شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا فجر کی نماز کا وقت جب شروع ہو جائے تو اشراق کا وقت شروع ہونے تک کسی قسم کے نوافل پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر چہ وہ تحیۃ المسجد وغیرہ ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ عصر میں فرض نماز (تنہا یا باجماعت) ادا کرنے سے پہلے تک تحیۃ المسجد یا دیگر نوافل ادا کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ لیکن فرض ادا کرنے کے بعد مغرب تک نوافل جائز نہیں ہے۔

(بدائع الصنائع ج ا ص ۴۸۸)

فجر اور عصر کے درمیان جو فرق بیان کیا گیا' اُس کی تائید امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا صلوٰۃ بعد الغدوۃ حتی تطلع الشمس ولا بعد صلوٰۃ العصر حتّٰی تغیب'' یعنی طلوعِ فجر کے بعد سے سورج نکلنے تک کوئی نفل نماز ادا نہ کی جائے اور نمازِ عصر کے بعد سے سورج غروب ہونے تک کوئی نمازِ نفل ادا نہ کی جائے۔ (مسند امام اعظم ص ۴۴)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ ممانعت کا یہ حکم صرف نوافل کے متعلق ہے۔ اس میں فرائض کی قضاء شامل نہیں ہے۔ یعنی فجر کا وقت شروع ہونے کے بعد قضاءِ فرض جائز ہے۔ لہٰذا اگر صاحب ترتیب کی نمازِ عشاء قضاء ہو جائے تو وہ فجر کے فرائض سے پہلے اُس کو ادا کرے اور پھر فجر پڑھے۔

سوال:

فرضوں سے پہلے کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان جو وقت ہوتا ہے اُس میں کوئی قضا یا نفل نماز ادا کرنا کیسا ہے؟

جواب:

فرائض وسنن کے درمیان جو وقت ہوتا ہے' اُس میں قضاء اور نوافل ادا کرنا جائز ہے' البتہ فجر میں نوافل کی ممانعت ہم بیان کر چکے۔

سوال:

قصداً یا سہواً اذان سے پہلے (جبکہ نماز کا وقت ہو چکا ہو) سنتیں یا پوری نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب:

وقت ہونے کے بعد سنتیں ادا کرنا جائز ہے اذان ہوئی یا نہ ہوئی ہو۔ البتہ پوری نماز پڑھنا اگر اس طور پر ہو کہ اُس سے جماعت کا ترک لازم آتا ہو تو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے۔ اور اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے جماعت ترک کر کے پوری نماز پڑھی ہو تو حرج نہیں۔ البتہ دونوں صورتوں میں نماز ادا ہو جائے گی اور فرض ساقط ہو جائے گا۔

سوال:

نمازی کے آگے سے بلا حائل گزرنے کے لیے کتنا فاصلہ درکار ہے؟

جواب:

جس مسجد کا احاطہ ۶۰ گز یا اُس سے زائد ہو اُس میں نمازی کی صف کے علاوہ دو صفوں کے بعد گزرنا جائز ہے اور اگر مسجد کا احاطہ ۶۰ گز سے کم ہو تو اس میں نمازی کے آگے سے بلا حائل نہ گزرا جائے۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

ایئرلائن میں کام کرنے والوں کو جدّہ اور حرم شریف میں داخل ہونے اور نماز ادا کرنے کے حوالہ سے درپیش مسائل کا شرعی حل

سوال:

میں ایک ایئرلائن میں پائلٹ ہوں۔ اس سلسلے میں اکثر جدہ سعودی عرب مسافروں کو لے کر جانا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ جہاز کا عملہ ہوتا ہے۔ جدہ میں ہم سب کو ایک یا دو دن قیام کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے یا تیسرے دن فلائٹ بمع مسافر واپس کراچی یا دوسرے شہروں کو جانا

ہوتا ہے۔

(۱) اس صورت میں کیا ہم مسافر ہیں یا مقیم؟ ہم نماز قصر پڑھیں یا مکمل؟

(۲) اگر ہم نماز کے لیے حرم شریف (خانہ کعبہ) یا فقط نفلی طواف کے لیے سادہ لباس میں جانا چاہیں تو کیا کوئی شرعی پابندی ہے؟

(۳) (اہم سوال) ہوائی سفر سے جدہ پہنچنے سے پہلے ہی میقات کی حد پار کر چکے ہوتے ہیں اور تمام عملہ اپنے اپنے یونیفارم میں ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر عمرہ ادا کرنا ہو تو احرام جدہ سے باندھیں یا حدودِ حرم میں داخل ہو کر احرام باندھیں اور نیت کریں؟

(۴) عملے میں خواتین (Air Hostess) بھی ہوتی ہیں بغیر محرم کے ان کا حرم شریف (خانہ کعبہ) جانا کیسا ہے؟

(۵) دورانِ سفر جہاز میں نماز ادا کرنی ہو جبکہ میں جہاز چلا رہا ہوں اور وضو نہ ہو اور قبلہ رخ بھی نہ ہوں تو کیا کیا جائے؟ [سائل: سمیع اللہ خان' کراچی]

جواب:

(۱) سائل اور اس کے عملے کو جدہ میں اگر پندرہ دن سے کم قیام کرنا ہوتا ہے تو اپنی تنہا نماز یا کسی مسافر کی اقتداء میں پڑھنے کی صورت میں سب پر قصر کرنا واجب ہے۔ ہاں! اگر ان دنوں میں کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھی تو مکمل پڑھیں گے۔ اسی طرح اگر سائل اور اس کے عملے کا قیام جدہ میں پندرہ دن یا اس سے زائد ہو' تب بھی قصر کرنا جائز نہیں ہوگا' خواہ تنہا پڑھیں یا کسی مسافر کے پیچھے یا مقیم کے پیچھے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "**وان نوی الاقامة اقل من خمسة عشر یوما قصر هکذا فی الهدایه......وان اقتدٰی مسافر بمقیم اتم اربعا......ولا یزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة او قریة خمسة عشر یوما او اکثر کذا فی الهدایه**"۔ (فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص۱۳۹'۱۴۲)

(ترجمہ) اگر آدمی پندرہ سے کم دنوں کے ٹھہرنے کی نیت کرے تو اس پر قصر لازم ہے۔ البتہ اس دوران اگر وہ کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے تو پھر قصر نہ کرے۔ نیز مسافر پر سفر کے شرعی احکام اس وقت تک جاری رہتے ہیں جب تک وہ کسی شہر یا بستی

میں پندرہ یا اس سے زائد ایام کی نیت نہ کر لے۔ یعنی پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کے بعد وہ مقیم شمار ہوتا ہے۔

(۲،۳) باہر سے جو افراد سفر کر کے حرم یا حدودِ حرم کی طرف روانہ ہوتے ہیں' ان کے سفر کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں بعض افراد وہ ہیں جو اپنے گھر سے حج یا عمرہ کے ارادے سے سفر کرتے ہیں اور اسی ارادے کے ساتھ اپنے میقات پر پہنچتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جن کا بنیادی مقصد حج یا عمرہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ حدودِ حرم سے باہر کسی شہر (مثلاً جدہ میں) تجارت یا کسی دوست سے ملاقات کرنا ہوتا ہے لیکن وہ موقع ملنے کی صورت میں حرم شریف جانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں نماز یا نفلی طواف یا عمرہ کر سکیں۔

ان میں پہلی صورت کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کے ارادے سے مکہ معظمہ روانہ ہوا اسے اپنا میقات آنے سے پہلے ہی احرام باندھ لینا واجب ہے۔ ایسا شخص اگر بغیر احرام کے میقات Cross کرے گا تو اس پر دم دینا لازم ہوگا۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: ''آفاقی مسلم بالغ یرید الحج ولو نفلا او العمرة وَجاوز وقته ثم احرم لزمه دم'' یعنی باہر سے آنے والا کوئی بھی بالغ مسلمان جو حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو اور میقات سے گزرنے کے بعد وہ احرام باندھے تو اس پر دم دینا لازم ہوگا۔ (ج ۳ ص ۵۴۸ طبع جدید)

علامہ شامی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''لا یدخل الحرم ان قصد النسك الا محرما'' یعنی اگر حج یا عمرے کے ارادے سے آدمی روانہ ہو تو وہ احرام کے بغیر حدودِ حرم میں داخل نہ ہو۔ (فتاویٰ شامی ج ۳ ص ۴۲۹ طبع جدید)

اس کے برعکس دوسری صورت کہ جب آفاقی (باہر سے آنے والے آدمی) کا اپنے میقات سے گزرتے وقت اصل ارادہ یہ نہ ہو کہ وہ حج یا عمرہ کرے گا' بلکہ اس کا مقصود حدودِ حرم سے پہلے کسی شہر میں تجارت وغیرہ کرنا ہو تو ایسے شخص کے لیے یہ سہولت ہے کہ وہ احرام کے بغیر اپنا میقات Cross کر کے تجارتی شہر میں جا سکتا ہے اور اس صورت میں وہ (حج یا عمرہ کی نیت کیے بغیر) حرم میں بھی بلا احرام جا سکتا ہے اور وہاں اپنے عام لباس میں نماز' تلاوت اور نفلی طواف ادا کر سکتا ہے' البتہ ایسا شخص اپنے تجارتی

شہر (مثلاً جدہ) پہنچنے کے بعد عمرہ ادا کرنا چاہے تو اب اسے احرام کے بغیر حدود حرم میں داخل ہونا جائز نہیں ہوگا بلکہ اسے حدود حرم سے پہلے کسی بھی جگہ سے احرام باندھنا ہوگا ورنہ اس پر دم لازم ہوگا۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: ''**وحرم تاخير الاحرام عنها لمن اى لآفاقي قصد دخول مكة يعني الحرم ولو لحاجة غير الحج' اما لو قصد موضعا من الحل كخليص وجدة حل له مجاوزته بلا احرام فاذا حل به التحق باهله فله دخول مكة بلا احرام وهو الحيلة لمريد ذلك**''۔

(ترجمہ:) جو میقات بیان کیے گئے ان سے احرام باندھے بغیر گزرنا اس آفاقی (باہر سے آنے والے) کے لیے حرام ہے' جو حرم میں داخل ہونے کی نیت کر چکا ہو' اگر چہ حج کے علاوہ کسی اور ضرورت کے لیے ہو۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنے وطن سے کسی ایسے شہر کے ارادہ سے روانہ ہو' جو حدودِ حرم سے پہلے ہو' جیسے خلیص اور جدہ وغیرہ تو اس کے لیے احرام کے بغیر اپنے تجارتی شہر میں پہنچنا جائز ہے' پھر وہاں پہنچنے کے بعد چونکہ وہ وہاں کے رہنے والوں کے حکم میں ہو جائے گا' اس لیے وہاں سے اسے مکہ معظمہ میں بھی احرام کے بغیر داخل ہونا جائز ہو جائے گا (بشرطیکہ اس نے تجارتی شہر سے حج یا عمرہ کی نیت نہ کی ہو' بلکہ کسی اور کام کی نیت کی ہو) احرام کے بغیر جو لوگ حدودِ حرم میں داخل ہونا چاہتے ہیں' ان کے لیے یہ ایک تدبیر ہے۔ (تنویر مع الدرج ۳ ص ۴۲۶۔۴۲۷)

خلاصہ یہ کہ جو لوگ تجارت وغیرہ کی غرض سے سعودی عرب میں کسی ایسی جگہ جاتے ہیں جو حدودِ حرم سے باہر ہے' ان کے لیے احرام کی پابندی نہیں ہے' وہ اپنے تجارتی مرکز میں بھی بلا احرام جا سکتے ہیں اور (حج یا عمرہ کی نیت نہ ہو تو) وہاں سے حرم میں بھی بلا احرام جا سکتے ہیں اور وہاں جا کر نماز' تلاوت اور نفلی طواف بھی کر سکتے ہیں۔ ہاں! اگر وہ اپنے تجارتی شہر سے حج یا عمرہ کا ارادہ کر لیں تو اب انہیں حدودِ حرم سے پہلے کسی بھی جگہ (خواہ وہ جدہ ہو یا کوئی اور جگہ) سے احرام لازماً باندھنا ہوگا کیونکہ حج یا عمرہ کے ارادے والا شخص احرام کے بغیر حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتا۔

(۴) کوئی بھی عورت اپنے شوہر یا محرم کے بغیر شرعی مسافت (۹۸.۷۳۴ کلومیٹر) کا سفر

تنہا نہیں کرسکتی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا یحل لامرئة تومن باللہ والیوم الاخر ان تسافر سفرا یکون ثلث لیال فصاعدا الا ومعھا ابوھا او ابنھا او زوجھا او اخوھا او ذو رحم محرم''۔

یعنی جو عورت اللہ عزوجل اور یومِ آخرت پر یقین رکھتی ہو اس کے لیے اس کے باپ، بیٹے، بھائی، شوہر یا کسی محرم کے بغیر تین رات یا اس سے زیادہ کی مسافت کا سفر جائز نہیں ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۳۴۰، سنن ترمذی: ۱۱۶۹، سنن ابوداؤد: ۱۷۲۶)

''تین رات کی مسافت'' سے سفر کا ایک مخصوص فاصلہ مراد ہے اور وہ علماء کی تحقیق کے مطابق ۹۸.۷۳۴ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اگر اتنی مسافت یا اس سے زائد کا سفر مقصود ہو تو عورت کے ساتھ اس کا شوہر یا کوئی محرم ہونا ضروری ہے خواہ وہ سفر حج وعمرہ کے لیے ہو یا کسی اور مقصد کے لیے۔ لہٰذا ایئر ہوسٹس (Air Hostess) یا کسی بھی عورت کا اس قدر مسافت پر شوہر یا محرم کے بغیر روانہ ہونا شرعاً جائز نہیں ہے، عام ازیں کہ وہ اس سفر میں عمرہ کرے یا کچھ اور کرے۔

(۵) ہماری معلومات کے مطابق مسافر ہوائی جہاز میں ایک کیپٹن ہوتا ہے اور ایک پائلٹ۔ اور لمبے سفر میں بشری تقاضوں کے تحت انہیں قضائے حاجت کی ضرورت پیش آسکتی ہے، یقیناً ایسی صورت میں وہ ایک دوسرے کو Releive کرتے ہوں گے اور اتنی دیر میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا ہوگا۔ خصوصاً فی زمانہ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت فضاء میں جہازوں کی فلائنگ Automatic System کے تحت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے پائلٹس کا کام اس قدر گھمبیر نہیں ہوتا کہ انہیں اپنی اپنی نماز ادا کرنے کا موقع نہ ملے۔ اگر ہمارا یہ قیاس درست ہے تو نمازِ قصر کے لیے وہ ایک دوسرے کو باری باری Releive کرسکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ہنگامی صورتِ حال درپیش آجائے کہ وضو کے لیے بھی فراغت ممکن نہ ہو تو تیمم کے لیے کسی خاکی چیز کا انتظام اپنے ساتھ رکھ لیں اور کسی خوف یا خطرے کی صورت میں نماز کے لیے جدھر ممکن ہو رخ کرکے نماز ادا کرسکتے ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شبینہ اور نوافل کی جماعت کا شرعی حکم

سوال:

رمضان شریف میں بعض مساجد میں شبینہ ہوتا ہے' آیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی بتائیں کہ نوافل کی جماعت شرعاً درست ہے یا نہیں؟ سنا ہے کہ علامہ شامی نے اس کو مکروہِ تحریمی قرار دیا ہے؟ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ [سائل: محمد سمیع اللہ گلشن جمال]

جواب:

ایسا شبینہ جو کسی کے لیے تکلیف اور پریشانی کا باعث نہ ہو اس کے انعقاد میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی اگر لوگ اپنی خوشی سے اس میں شریک ہوں اور کسی پر زبردستی نہ کی جائے اور باہر کے اسپیکر بھی استعمال نہ کیے جائیں تو اس کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ''اذا ام احدکم الناس فلیخفف'' جب تم میں کوئی شخص لوگوں کی امامت کرے تو تخفیف سے کام لے۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۷) اس حدیثِ پاک کی روشنی میں ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ شبینہ میں حتی الامکان ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جن میں لوگوں کے لیے زیادہ آسانی ہو اور جماعت میں اضافہ ہو۔

نوافل کی جماعت شرعاً جائز اور درست ہے۔ قرآن وسنت میں کہیں اس سے منع نہیں فرمایا گیا۔ اور جس کام سے قرآن وسنت منع نہ فرمائیں اس کو کون ممنوع یا ناجائز قرار دے سکتا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: جس چیز کے بارے میں شریعت سکوت اختیار کرے، وہ جائز ہے۔ (سنن ترمذی: ۱۷۲۶' سنن ابن ماجہ: ۳۳۶۷)

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نوافل کی جماعت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور بہت اکابر دین سے جماعت نوافل بالتداعی (ایک دوسرے کو شرکت کی دعوت دینا) ثابت ہے۔ اور عوام فعلِ خیر سے منع نہ کیے جائیں گے۔ علماءِ امت وحکماءِ ملت نے ایسی ممانعت سے منع فرمایا ہے۔ حدیقہ ندیہ میں ہے کہ عوام الناس میں نوافل کی جماعت مکروہ ہونے کا فتویٰ نہ دیا جائے تاکہ نیکیوں میں ان کی رغبت اور دلچسپی کم نہ ہو۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے اور متاخرین علماء کی ایک جماعت نے اس کے جائز ہونے پر لکھا

بھی ہے۔ اور عوام الناس کو نماز سے دور کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ انہیں نماز کی طرف راغب رکھا جائے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۴۶۵ مطبوعہ لاہور)

علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے نوافل کی جماعت کو غیر مستحب اور مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے۔

آپ لکھتے ہیں: ''**والنفل بالجماعة غير مستحب لانه لم تفعله الصحابة في غير رمضان وهو كالصريح في انها كراهة تنزيه**'' نوافل کی جماعت مستحب نہیں ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رمضان کے علاوہ وتر کی جماعت نہیں کرائی۔ یہ گویا اس بات کی صراحت ہے کہ نوافل کی جماعت مکروہ تنزیہی ہے۔ (فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۴۳۷)

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ کراہت تنزیہی ہے یعنی خلاف اولیٰ کیونکہ یہ طریقہ توارث کے خلاف ہے نہ کہ تحریمی کہ گناہ اور ممنوع ہو۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۴۳۱ مطبوعہ لاہور)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ نوافل کی جماعت شرعاً ممنوع نہیں ہے اور اس سے قبل ذکر کردہ عبارت سے معلوم ہوا کہ عوام الناس میں نوافل کی جماعت کے مکروہ ہونے کا فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

صلوۃ التسبیح کی جماعت کا شرعی حکم

سوال:

(۱) زید کہتا ہے صلوۃ التسبیح کی کثیر تعداد میں اعلان کے ساتھ جماعت بلا کراہت جائز ہے۔ جو علماء و مفتی حضرات اسے مکروہ بتاتے ہیں ہم ان کو رد کرتے ہیں اور انہیں نہیں مانتے۔

(۲) زید کہتا ہے کہ سوئم، دسواں، بیسواں، چالیسواں، ششماہی اور برسی مروجہ طریقہ ایصال ثواب کے جو چنے، کھانا وغیرہ ملتا ہے اس سے دل روشن ہوتا ہے جب کہ بکر کا کہنا ہے کہ طعام میت سے دل مردہ ہوتا ہے، نیز زید اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ شرعی مسئلہ سے اس کو آگاہی ہے لیکن لوگوں کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے۔

(۳) زید کہتا ہے کہ سلسلہ نقشبندی کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کوئی سلسلہ نہیں ہے

اور نقشبندی حضرات سے عصبیت کا اظہار اور نفرت کرتا ہے۔ نیز نقشبندی حضرات کو اہل سنت و جماعت بھی نہیں مانتا جب کہ ان کا عقیدہ بھی درست ہے۔

(۴) نقشبندی سلسلہ کی ابتداء کہاں سے ہوئی نقشبندی مشائخ اس سلسلہ کو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب کرتے ہیں جب کہ زید کہتا ہے کہ سلسلہ نقشبندی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب ہے۔

مندرجہ بالا سوالات کے شافی جوابات مدلل مرحمت فرما کر عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور ہوں' نیز زید کو امام بنانا کیسا ہے؟ [سائل: محمد اکمل معین قریشی' حیدرآباد]

جواب:

(۱) ''صلوۃ التسبیح'' کا شمار شرعی نقطہ نظر سے ان عبادات میں ہوتا ہے جنہیں تطوع اور نفل کہا جاتا ہے۔ اور ایسی تمام عبادات نافلہ خواہ ان کا تعلق صدقات وعطیات سے ہو یا نماز و روزہ یا کسی اور عمل سے ہو ان کی ادائیگی کے لیے علی العموم اخفاء اور پوشیدگی کو افضل قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ''ان تبدوا الصدقات فنعما ھی وان تخفوھا و تؤتو ھا الفقراء فھو خیر لکم'' اگر تم (نفلی) صدقات و عطیات کھلم کھلا دو تو اچھی بات ہے لیکن اگر تم انہیں چھپا کر فقراء کے سپرد کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ (البقرہ:۲۷۱)

مشہور و معروف مفسر ''امام ابو عبد اللہ قرطبی مالکی'' علیہ الرحمۃ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''ذھب جمھور المفسرین الی ان ھذہ الایۃ فی صدقۃ التطوع لان الاخفاء فیھا افضل من الاظھار و کذالک سائر العبادات افضل فی تطوعھا لانتفاء الریاء عنھا ولیس کذالک الواجبات''. (تفسیر القرطبی)

یعنی جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ نفلی صدقات کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ نفلی صدقات میں اظہار اور اعلان کے بجائے پوشیدگی افضل ہے۔ اور تمام ہی نفلی عبادات کا یہی حکم ہے کہ ان میں پوشیدگی افضل ہے اور ایسا اس لیے ہے تاکہ ریاکاری پیدا نہ ہو۔ جب کہ فرائض و واجبات کا حکم اس سے مختلف ہے۔

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ نفلی عبادات میں اخفاء اور پوشیدگی افضل ہے۔ غالب یہ ہے کہ اسی بنیاد پر علماء کی ایک جماعت نے نوافل کو تنہا ادا کرنے پر زور دیا ہے اور باجماعت ادائیگی کو مکروہ قرار دیا ہے۔ تا کہ حتی الامکان پوشیدگی کا افضل ہونا ملحوظ رہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مسئلہ کی تفصیل اور تحقیق کچھ اس طرح ہے کہ کسی بھی نفلی عبادت کو کھلم کھلا یا تنہا ادا کرنے میں افضلیت اور کراہت کا دارومدار ''ماحول'' اور ''زمانہ'' پر ہے۔ نفل کی جماعت پر کراہت کا فتوی اس زمانہ اور ماحول کے اعتبار سے دیا گیا ہے جس میں حسنِ نیت' ذوقِ عبادت اور جذبۂ خیر کا بہت غلبہ تھا۔ اس زمانے میں یہی افضل تھا کہ نوافل کو بلا جماعت ادا کیا جائے' تا کہ کسی کی باطنی کیفیت دوسرے پر منکشف نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ زمانہ اس خطرہ سے بھی پاک تھا کہ تنہائی میں لوگ عبادت نہیں کر پائیں گے اور سستی کا شکار ہو جائیں گے۔ جب کہ ہمارا زمانہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب نہ لوگوں میں ذوقِ عبادت ہے' نہ جذبۂ خیر۔ بلکہ محض رسما کچھ عبادات کر لی جاتی ہیں۔ اندریں حالات اگر کسی موقع پر (یعنی سال میں کبھی کبھار) نوافل خصوصاً صلوۃ التسبیح کی جماعت مع اعلان کا اہتمام کر لیا جاتا ہے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت اور کراہت نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے اس زوال پذیر معاشرے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو افضل اور مستحب قرار دیا جائے۔ کیونکہ فقہاء کرام فرماتے ہیں: ''ان الاحکام تختلف باختلاف الامکنة والازمنة'' یعنی کئی احکام ایسے ہوتے ہیں جن میں جگہ اور وقت کے بدلنے سے تبدیلی آجاتی ہے۔ جیسا کہ اعلیٰ حضرت امام اہلسنت علیہ الرحمۃ نے قبرستان کی طرف جنازہ لے جانے کے دوران بلند آواز سے ذکر و اذکار اور نعت خوانی کو اسی بنیاد پر جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ علماء کی ایک جماعت نے اس دوران خاموشی کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: ''انصاف کیجئے تو یہ حکم (جنازہ لے جاتے وقت خاموش رہنا) اُس زمانہ خیر کے لیے تھا جب کہ ہمراہیانِ جنازہ تصورِ موت میں ایسے مستغرق ہوتے تھے گویا میت ان میں ہر ایک کا خاص اپنا کوئی جگر پارہ ہے بلکہ گویا خود ہی میت ہیں' ہم ہی کو جنازہ پر لیے جاتے ہیں اور اب قبر میں رکھیں گے' ولہذا علماء نے سکوتِ محض کو پسند کیا تھا کہ کلام اگرچہ ذکر ہی ہو اگرچہ آہستہ' اس تصور سے روکے گا یا کم از کم دل بٹ جائے گا تو اس وقت محض خاموشی ہی مناسب

تر ہے ورنہ حاش للہ ذکرِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ کسی وقت منع ہے نہ کوئی چیز اس سے بہتر۔ اب کہ زمانہ منقلب ہوا لوگ جنازے کے ساتھ اور دفن کے وقت اور قبروں پر بیٹھ کر لغویات و فضولیات اور دنیوی تذکروں بلکہ خندہ ولہو میں مشغول ہوتے ہیں تو انہیں ذکرِ خدا و رسول (جل وعلا وصلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مشغول کرنا عین صواب و کارِ ثواب ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج۹ ص ۱۴۰ مطبوعہ لاہور)

مقامِ غور ہے کہ ایک ایسا عمل جسے علماء نے ناپسند قرار دیا اسے امام اہل سنت علیہ الرحمۃ نہ صرف جائز قرار دے رہے ہیں بلکہ باعثِ ثواب فرما رہے ہیں۔ اور صرف اس وجہ سے کہ اس عمل کا ناپسندیدہ ہونا زمانہ خیر کے اعتبار سے تھا اور اب جب کہ زمانہ کا طرز تبدیل ہوا تو وہی ناپسندیدہ عمل باعثِ اجر وثواب قرار پایا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صلوۃ التسبیح کی باجماعت ادائیگی کا مکروہ (ناپسندیدہ) ہونا زمانہ خیر کے اعتبار سے تھا۔ لیکن اب ہمارے زمانہ میں وہی مکروہ عمل نہ صرف جائز بلا کراہت بلکہ مستحب قرار پائے گا۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت قدس سرہ نوافل کی جماعت کے متعلق فرماتے ہیں: مسئلہ مختلف فیہ ہے اور بہت اکابرین سے جماعت نوافل بالتداعی (اعلان کے ساتھ نوافل کی جماعت) ثابت ہے اور عوام فعلِ خیر سے منع نہ کئے جائیں گے۔ علماء امت و حکمائے ملت نے ایسی ممانعت سے منع فرمایا ہے۔ (حدیقہ ندیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:) علماء نے اگرچہ نوافل کی جماعت کو مکروہ قرار دیا ہے لیکن عوام میں یہ فتویٰ نہ دیا جائے تاکہ نیکیوں میں ان کی رغبت کم نہ ہو۔ عوام کو نماز کی طرف راغب رکھنا انہیں نفرت دلانے سے کہیں بہتر ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۴۶۵ طبع جدید)

شہزادہ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان قدس سرہ ایک سوال کے جواب میں حاشیہ دُرر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"من منع هذه الصلوٰة بالجماعة فقد اساء واجترء على تضليل الاسلاف الكرام والاخلاف الفخام فعلى الولاة منع المانعين و تعزير المعاندين"۔

(فتاویٰ مصطفویہ ص ۲۸۹)

جس نے نوافل کی جماعت سے منع کیا اس نے اپنے بزرگوں کو گمراہ قرار دینے کی

جرأت کی۔ اس لیے حکام وقت پر لازم ہے کہ ان منع کرنے والوں پر پابندی عائد کریں اور اس کے مخالفین کو سزا دیں۔

مذکورہ تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام نوافل خصوصاً صلوٰۃ التسبیح کو باجماعت اور اعلان کے ساتھ ادا کرنا جائز اور باعث ثواب ہے۔

(۲) بکر کا کہنا درست ہے کہ طعامِ میت سے دل مردہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بزرگانِ دین فرماتے ہیں: ''طعام المیت یمیت القلوب''۔ (میت کا طعام دلوں کو مار دیتا ہے) اعلیٰ حضرت امام اہل سنت علیہ الرحمۃ اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ تجربہ کی بات ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ طعام میت کے متمنی (خواہش مند) رہتے ہیں ان کا دل مرجاتا ہے۔ ذکر و اطاعت الٰہی کے لیے حیات و چستی اس میں نہیں رہتی کہ وہ اس پیٹ کے لقمہ کے لیے موتِ مسلمین کے منتظر رہتے ہیں اور کھانا کھاتے وقت موت سے غافل اور اس کی لذت میں شاغل رہتے ہیں۔

(حاشیہ فتاویٰ امجدیہ ج ۴ ص ۲۰۹)

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ ایک مقام پر سوئم وغیرہ کے چنوں کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ چیزیں غنی نہ لے' فقیر لے۔ اور وہ جو ان کا منتظر رہتا ہے ان کے نہ ملنے سے ناخوش ہوتا ہے اس کا قلب سیاہ ہوتا ہے۔ فقیر لے کر خود کھائے اور غنی لے ہی نہیں اور لے لیے ہوں تو مسلمان فقیر کو دے دے۔ یہ حکم عام فاتحہ کا ہے۔ نیازِ اولیاء کرام طعام موت نہیں' وہ تبرک ہے۔ فقیر و غنی سب لیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۹ ص ۶۱۵' طبع جدید)

(۴-۳) نقشبندی سلسلہ ان معروف سلاسل میں سے ایک ہے' جن پر امت مسلمہ کا اجماع و اتفاق ہے۔ لہٰذا اس کا انکار اور اس سے نفرت کا اظہار سوائے جہالت کے کچھ نہیں۔ کیونکہ علی العموم جہلاء کا مزاج یہی ہوتا ہے کہ وہ حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ یہ امت گمراہی کی بات پر جمع نہیں ہوسکتی۔ (ترمذی شریف) اگر سلسلۂ نقشبند کا کوئی وجود نہ ہوتا تو پوری امت ایک من گھڑت سلسلہ کو تسلیم کر کے گمراہی پر کیسے جمع ہوتی!!!

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق کس صحابی سے ہے؟ تو تحقیق کے

مطابق اس کی نسبت سیدنا امیر المؤمنین صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

گاؤں‘ دیہات میں جمعہ اور عیدین کی نماز قائم کرنے کا حکم

سوال:

ہمارا علاقہ پسماندہ ہے اور دیہات پر مبنی ہے گاؤں کا نام ”اودھے والا“ ہے۔ گاؤں کی آبادی تقریباً 85-80 گھرانوں اور تقریباً 2500 نفوس پر مشتمل ہے‘ گاؤں میں دکانیں ہیں جہاں سے ضروریات زندگی کی چیزیں باآسانی مل جاتی ہیں‘ ایک جامع مسجد ہے‘ پرائمری اسکول ہے اور مڈل اسکول بھی ہے‘ ایک ڈاکٹر ہے جو کہ اس وقت گاؤں سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر رہائش پذیر ہے‘ شہر تقریباً 16 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے‘ ذرائع آمد و رفت محدود ہیں‘ اس کے پیش نظر علاقہ کے پیر و مرشد صاحبزادہ عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ المعروف گل ابا کربوغہ شریف کوہاٹ نے نماز جمعہ جاری فرمانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی چار فرض ظہر احتیاطاً پڑھنے کا حکم فرمایا‘ اور ایک دو کلومیٹر کے فاصلے تک لوگ جو کہ ایک ایک دو دو گھرانوں کی صورت میں آباد ہیں‘ اسی مسجد میں آ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ پیر و مرشد صاحبزادہ عبدالحق کی اجازت سے تقریباً 45 سال سے نماز جمعہ ادا کی جارہی ہے‘ اور جمعہ کا قیام اس لیے ہوتا ہے تاکہ لوگوں میں تبلیغ دین ہو۔

کیا اس بات کی شرعاً گنجائش اور رخصت ہے کہ مذکورہ گاؤں میں جمعہ کا قیام ہو‘ دلائل کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔ [سائل: محمد شفیق نیازی‘ شیر شاہ کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کے جواب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ جمعہ قائم کرنے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ ان میں بنیادی اور پہلی شرط یہ ہے کہ جامع شہر ہو۔ ”جامع شہر“ کی جو تعریف سراج الامۃ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ یہ ہے:

”انہ بلدۃ کبیرۃ فیھاسکک واسواق ولھا رساتیق و فیھا وال یقدر علی

انصاف المظلوم من الظالم بحشمه و علمه او علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح"۔

(فتاوی شامی ج ۳ ص ۷، البحر الرائق ج ۲ ص ۱۴۰، فتح القدیر ج ۲ ص ۵۲، بدائع الصنائع ج ۱ ص ۴۲۷)

یعنی ایسا بڑا شہر جس کے متعدد کوچے اور بازار ہوں، اس کے اپنے مضافات ہوں، اس میں ایسا حاکم ہو جو مظلوم کو ظالم سے اپنے رعب اور اپنی علمیت یا کسی اور کے علم کے ذریعے انصاف دلا سکے اور لوگ اپنے معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتے ہوں۔ یہی تعریف زیادہ صحیح ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں کہ: جہاں یہ تعریف صادق ہو وہی شہر ہے اور وہیں جمعہ جائز ہے۔ ہمارے ائمہ ثلثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہی ظاہر الروایۃ ہے۔ (فتاوی رضویہ ج ۳ ص ۲۹۳)

فقہاء کی ان تصریحات کے پیش نظر حکم تو یہی ہے کہ گاؤں میں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ جمعہ کے لیے شہر کا ہونا شرط ہے۔ لیکن ایسا گاؤں جس میں لوگوں نے جمعہ پڑھنا شروع کر دیا ہو اس میں لوگوں کو جمعہ سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ خصوصاً سوالِ مذکور میں سائل کے بیان کے مطابق ذکر کردہ گاؤں میں تقریباً 45 سال سے نماز جمعہ ادا کی جارہی ہے، اس میں جمعہ کو ختم کرنا بہت ساری خرابیوں اور فتنہ سامانیوں کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس میں جمعہ کو ختم نہ کیا جائے۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ "جس گاؤں کے لوگ جمعہ پڑھتے ہیں انہیں منع نہ کیا جائے"۔ (فتاوی امجدیہ ج ۱ ص ۲۸۵)

مفتی محمد وقار الدین قادری رضوی علیہ الرحمۃ فقہاء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اگر دیہات میں جمعہ ہوتا ہو تو اسے بند نہ کیا جائے"۔ (وقار الفتاوی ج ۲ ص ۱۴۹)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

عوام کے بارے میں فقیر کا طریق عمل یہ ہے کہ ابتداء خود انہیں منع نہیں کرتا نہ انہیں نماز سے باز رکھنے کی کوشش پسند رکھتا ہے۔ ایک روایت پر صحت ان کے لیے بس ہے، وہ جس طرح خدا اور رسول کا نام پاک لیں غنیمت ہے۔ مشاہدہ ہے کہ اس سے روکیے تو وقتی چھوڑ

بیٹھتے ہیں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰیO عَبْدًا اِذَا صَلّٰی'' کیا تم نے اسے نہیں دیکھا جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز ادا کرتا ہے۔ (العلق:۹-۱۰) سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''شیٔ خیر من لا شیٔ'' کچھ ہونا بالکل نہ ہونے سے بہتر ہے۔ (کنز العمال) (فتاوی رضویہ ج ۸ ص ۲۷۴) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

جس امام کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد میں کمی آئے اس کی امامت کا حکم

سوال:

زید ایک مسجد میں امام ہے اور حال یہ ہے کہ نمازیوں کی اکثریت جو کہ پہلے نماز پڑھتے تھے اب زید کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور لوگوں کا اور جامع مسجد کی کمیٹی کا کہنا یہ ہے کہ امام کی وجہ سے فتنہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ زید سے بدظن ہو کر دوسری مساجد میں گئے اور بد مذہب ہو گئے' زید جمعہ میں کبھی کمیٹی کے خلاف بولتا ہے اور کبھی ان نمازیوں کے خلاف جو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اس لیے کمیٹی نے زید سے کہا کہ آپ جمعہ کا بیان نہ کریں تو انہوں نے ہامی بھر لی۔ مختصرا یہ کہ امام بہت بد اخلاق ہے اور اپنی امامت بچانے کے لیے محلے کی عورتوں کے ساتھ اجلاس کر رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے امام کی امامت جائز ہے یا نا جائز؟ [سائل: مسجد کمیٹی واہل محلّہ]

جواب:

سوال مذکور میں جو صورتحال بیان کی گئی ہے' اگر وہ درست ہے اور مبنی بر حقیقت ہے تو فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق شخص مذکور کی امامت مکروہ ہے' خاص کر اس صورت میں جب کہ اس کی بد اخلاقی اور سخت بیانات کی وجہ سے لوگ متنفر ہو کر بد مذہبیت کی طرف جا رہے ہیں اور جماعت کے افراد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ فقہ حنفی کی معتمد و مستند کتب میں اسی علت کی بنیاد پر کئی افراد کی امامت کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام برہان الدین امام ابوبکر فرغانی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''ویکرہ تقدیم العبد لانہ لا یتفرغ للتعلم والاعرابی لان الغالب فیھم الجھل والفاسق لانہ لا یھتم لامر دینہ والاعمٰی لانہ لا یتوقی للنجاسۃ وولد الزنا لانہ لیس لہ اب یثقفہ فیغلب علیہ الجھل ولان فی تقدیم ھؤلاء تنفیر الجماعۃ فیکرہ''. (ہدایہ اولین ص ۱۲۲) (مزید وضاحت کے لیے دیکھئے: الدر المنتقی علی الملتقی مع مجمع الانہر ج ا ص ۱۶۲ ' فتاوی شامی ج ۲ ص ۲۵۵ ' مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی ص ۱۶۵)

یعنی غلام کو امام بنانا مکروہ ہے' کیونکہ وہ علم حاصل کرنے کے لیے وقت نہیں پاتا' گنوار دیہاتی کو امام بنانا مکروہ ہے کیونکہ ایسے لوگوں میں اکثر جہالت غالب ہوتی ہے' فاسق کو امام بنانا مکروہ ہے' کیونکہ وہ اپنے دینی معاملہ کے لیے اہتمام نہیں کرتا' اندھے شخص کی امامت مکروہ ہے کیونکہ وہ ناپاکی سے نہیں بچ پاتا' ولدزنا کی امامت مکروہ ہے کیونکہ اس کو تعلیم دینے والا باپ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس پر جہالت غالب رہتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان تمام افراد کی امامت سے لوگ متنفر ہوتے ہیں اور دور بھاگتے ہیں' لہٰذا ان سب کی امامت مکروہ ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بقول ایسے شخص کو امام بنانے سے بچنا چاہیے جس کی امامت سے لوگ نفرت کریں اور جماعت میں کمی ہو' کیونکہ جماعت میں کمی کا ہونا مقاصدِ شرع کے خلاف ہے۔ (فتاوی رضویہ ج ۳ ص ۱۹۹' طبع قدیم)

عبارات مذکورہ کی روشنی میں زید کے لیے حکم یہی ہے کہ وہ لوگوں کی بد مذہبیت کی طرف رغبت' جماعت میں کمی اور آپس میں فتنہ انگریزی کی روک تھام کے لیے باوقار طریقہ اختیار کرے اور منصبِ امامت کو چھوڑ دے اور ہمہ وقت رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پاک کو ملحوظِ خاطر رکھے کہ: ''ثلثۃ لا تقبل منھم صلوتھم من تقدم قوما وھم لہ کارھون''۔ (ترمذی ص ۳۵۸' ابن ماجہ ص ۹۷۰' ابوداؤد ۵۹۳) یعنی تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی' ان میں ایک وہ شخص ہے جو کسی جماعت کا امام بن جائے اور لوگ اسے ناپسند کرتے ہوں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مشت زنی کرنے والے کی امامت کا حکم

سوال:

اگر کوئی امامِ مسجد مشت زنی کرتا ہو اور وہ امام ان الفاظ میں اقرار بھی کرتا ہو کہ میں ہفتے میں ایک بار تو کرتا ہوں تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا اور امام کا نماز پڑھانا شریعت کی رو سے کیسا ہے نیز واضح کیجیے کہ شریعت میں مشت زنی کرنا کیسا عمل ہے؟ (یعنی حرام ہے یا مکروہ ہے)۔ [سائل: مخدوم احمد رضا' لیاقت آباد کراچی]

جواب:

جس شخص کے پاس نکاح کرنے کے وسائل اور طاقت موجود ہو اس کا محض حصول لذت اور قضائے شہوت کے لیے مشت زنی کرنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر نکاح کرنے کے اسباب اور وسائل نہ ہوں یا وسائل موجود ہوں مگر کوئی رکاوٹ ہو جس کی وجہ سے فی الفور نکاح کرنا دشوار ہو اور دوسری جانب شہوت کا غلبہ ہو جس کی وجہ سے کاموں میں خلل آتا ہو اور آدمی مشت زنی کا ارتکاب کرے تو علماء نے لکھا ہے کہ ''امید ہے کہ اس پر وبال نہیں ہوگا''۔

شارح ہدایہ علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''فان غلبته الشهوة ففعل ارادة تسكينها به فالرجاء ان لا يعاقب به'' آدمی پر اگر شہوت غالب ہو اور وہ اسے بجھانے کی غرض سے ایسا کرے تو امید ہے کہ شرعاً اس پر گرفت نہیں ہوگی۔ (فتح القدیر ج ۲ ص ۳۳۰)

زیر بحث استفتاء میں جس شخص کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر وہ واقعۃً بلا رخصت شرعی اس کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں سچی توبہ کرے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد کرے۔ اگر شخص مذکور کے پاس شادی کے وسائل اور طاقت موجود ہو اور اس کے باوجود وہ شادی نہ کرے بلکہ آئندہ کی زندگی بھی حسب سابق گزارنے کا ارادہ ہو تو پھر اس پر لازم ہے کہ وہ امامت کے باوقار منصب سے سبکدوشی اختیار کرے اور مزید اس منصب کی توہین نہ کرے۔ اب تک جو نمازیں امام مذکور کے پیچھے ادا کی گئیں ان کے اعادہ کی حاجت نہیں ہے' البتہ آئندہ اس کی امامت جاری رہنا سچی توبہ کر لینے پر موقوف ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ضاد کو ظاء پڑھنے والے کی امامت کا حکم

سوال:

جو امام قراءت کرتے ہوئے "ولا الضالین" کو "ولا الظالین" پڑھے یا جہاں بھی ضاد ہو اس کو ظاد پڑھے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسے امام کا کیا حکم ہے؟

[سائل: شکیل قادری، مظفر آباد]

جواب:

شرعی نقطہ نظر سے ضاد کو ظاد پڑھنا جیسا کہ فی زمانہ بعض لوگوں نے اپنی پہچان بنالی ہے، جائز نہیں ہے۔ کیونکہ علم قراءت کی رو سے ہر حرف کا ایک مخرج اور طریقہ ادا ہے، جس سے انحراف ممنوع ہے۔ جو امام نماز میں تلاوت کے دوران ایسا کرتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو وہ کافر ہے۔

چنانچہ شارح مشکوٰۃ، محدث شہیر علامہ علی قاری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"وفی المحیط سئل الامام الفضلی عمن یقرء الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او یقرء اصحاب الجنة مکان اصحاب النار او علی العکس فقال لا تجوز امامته ولو تعمد یکفر". (شرح فقہ اکبر ص ۱۶۷)

یعنی محیط میں ہے کہ امام فضلی سے سوال کیا گیا کہ اس شخص کا کیا حکم ہے جو ضاد کی جگہ ظاء یا اصحاب الجنۃ کی جگہ اصحاب النار پڑھے؟ فرمایا کہ اس شخص کی امامت جائز نہیں اور اگر قصداً ایسا کرے تو کافر ہے۔

اسی طرح فقہ کی ایک اور معروف کتاب جامع الفصولین ج ۲ ص ۳۱۶ پر ہے کہ: "**من یقرء مکان الضاد (الٰی قولہ) لم تجز امامته ولو تعمد تکفر**" جو شخص ضاد کی جگہ ظاء پڑھے اس کی امامت جائز نہیں اور اگر وہ جان بوجھ کر ایسا کرے تو وہ کافر ہے۔

سند المحققین علامہ شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "**وفی خزانة الاکمل قال القاضی ابو عاصم ان تعمد ذالك تفسد**" اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

(فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۴۴۱)

مذکورہ عبارات علماء سے یہ بات واضح ہے کہ ضاد کو ظاء سے بدل کر پڑھنا جائز نہیں ہے اور جو ایسا کرے اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے اور جب اس کی اپنی نماز فاسد ہو جاتی ہے تو اس کے پیچھے پڑھنے والوں کی نماز بھی ناجائز ہوگی۔ واضح رہے کہ جن لوگوں نے ضاد کو ظاء پڑھنا اپنی پہچان بنالیا ہے وہ کسی دشواری کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے بلکہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں اور اس پر تمام علماء و ائمہ متفق ہیں کہ جو امام یا منفرد مذکورہ غلطی جان بوجھ کر کرے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ بلکہ بعض علماء نے کفر کا قول کیا ہے' جیسا کہ ہم باحوالہ بیان کر چکے ہیں۔

(تفصیل و تحقیق کے لیے ملاحظہ فرمائیں: توضیح البیان' مصنفہ مفسر قرآن حضرت علامہ غلام رسول سعیدی ص ۱۱۳ تا ۱۲۴' مطبوعہ حامد اینڈ کمپنی' لاہور) **واللّٰہ و رسولہ اعلم بالصواب**

حیلہ اسقاط اور دورِ قرآن کی شرعی حیثیت

سوال:

(۱) ہمارے علاقے میں جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی نماز جنازہ کے وقت چند نوجوان ورثاء کی طرف سے صفوں میں کچھ رقم تقسیم کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس نماز جنازہ میں امیر و غریب سب لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی اس رقم کا مستحق نہ ہو تو اس کا کیا کرنا چاہیے؟ وہاں پر علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ درست ہے۔ کیا یہ ان لوگوں کا طریقہ درست ہے؟ کیا اس طرح فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے؟ ہماری آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ اس کی قرآن و حدیث کی روشنی میں شرعی حیثیت بتائیں؟

(۲) کچھ جگہوں پر نماز جنازہ کے بعد ایک گول سا دائرہ بنا کر اس میں قرآن مجید کو گھمایا جاتا ہے اس میں کچھ رقم بھی رکھی جاتی ہے اس کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں' یہ عمل میت کے ثواب کے لیے کیا جاتا ہے یہ طریقہ کار درست ہے یا نہیں؟ [سائل: عبدالمنان' مانسہرہ]

جواب:

(۱) نماز جنازہ کے وقت ورثاء کی طرف سے جو کچھ تقسیم کیا جاتا ہے وہ اگر میت کے مال اور جائیداد میں سے ہو تو اس میں بلا تقسیم شرعی یہ تصرف جائز نہیں ہے' خصوصاً ورثاء

میں جب نابالغ بچے اور بچیاں ہوں۔ ہاں اگر اس تقسیم میں میت کا مال شامل نہ ہو بلکہ خالصۃً ورثاء کا اپنا مال یا میت کے مال سے جن بالغین کو حصہ مل چکا ہو انہوں نے وہ مال دیا ہو اور وہ میت کے ایصال ثواب کے لیے صدقہ نافلہ کے طور پر ہو تو اس کی تقسیم میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ صدقات نافلہ کے جواز پر قرآن مجید واحادیث کی بکثرت نصوص شاہد ہیں۔ خصوصاً میت کو ثواب کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لیے اس کے ایصال کے لیے تقسیم مال میں حرج نہیں ہے' مگر ان قیود وشرائط کے ساتھ جو اوپر مذکور ہوئیں۔ ''فمن ادعٰی خلاف ذالك فعليه البيان بالبرهان''۔

(۲) اسقاط کی بعض صورتیں درست ہیں اور بعض غلط۔ درست صورت یہ ہے کہ میت کا ولی کسی مستحقِ زکوٰۃ کو بنیت فدیہ ایک مخصوص رقم کا مالک بنائے (مخصوص رقم کے بجائے گندم' چاول' قرآن مجید یا کوئی بھی قیمت والی چیز بھی مقرر کی جاسکتی ہے) پھر وہ شخص ولی میت کو وہ چیز ہبہ کرے اور ولی اس کو پھر اس چیز کا مالک بنائے۔ علیٰ ہذا القیاس اس طرح کرتے رہیں تا آنکہ مرحوم کی تمام نمازوں اور روزوں کا فدیہ ہو جائے۔ اس کی ایک اور صورت یہ ہے کہ ایک فقیر کے بجائے کئی فقیروں کو بٹھایا جائے اور وہ آپس میں مرحوم کے فدیہ کی نیت سے یکے بعد دیگرے اس چیز کا مالک بنائیں حتیٰ کہ فدیہ مکمل ہو جائے۔ اسقاط کی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں خواہ رقم کے ذریعے ہوں یا قرآن مجید کے ذریعے کیونکہ قرآن مجید بھی ایک قیمت والی چیز ہے۔

اسقاط کی جو صورت ناجائز ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک مرتبہ کسی مستحق شخص یا امامِ مسجد کو فدیہ کی نیت سے دیکر یہ سمجھا جائے کہ ایک مرتبہ قرآن مجید دینے سے مرحوم کی تمام نمازوں اور روزوں کا فدیہ ہو گیا' یہ شرعاً غلط ہے۔ کیونکہ اس طرح صرف اتنا ہی فدیہ ادا ہوا جتنی مالیت کا وہ قرآن مجید ہے۔ خلاصہ یہ کہ دورِ قرآن مجید اگر مختلف فقراء کے درمیان یا فقیر اور ولی میت کے درمیان اس وقت تک کیا جائے کہ میت کی تمام نمازوں اور روزوں کا فدیہ ہو جائے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان ''مسئلہ دور'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مسئلہ دور' عامہ کتب متداولہ مذہب میں مصرح ہے۔ خود مصحف

شریف سے ہو یا کسی مال سے' مگر ہر بار کے دینے میں اتنا ہی مُجرا ہوگا کہ بازاری نرخ سے وہ مصحف شریف جتنے ہدیہ کا ہے۔ یہ جاہلانہ خیال کہ یہ تو بے بہا ہے ایک ہی دفعہ میں اگلے پچھلے سات پشت کے سب کفارے ادا ہو جائیں گے' محض جاہلانہ خیال باطل ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۱۷۵' مطبوعہ لاہور)

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی اس عبارت سے ان دونوں صورتوں کا حکم واضح ہوگیا جو اوپر ہم نے بیان کیں۔ لہٰذا جو لوگ اسقاط کے پہلے دو طریقوں میں سے کسی طریقہ پر عمل کرتے ہیں اور اس کے لیے دور قرآن کرتے ہیں وہ اپنے عمل میں درست ہیں اور جو اسقاط کی آخری صورت پر عمل کرتے ہیں انہیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ **واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب**

سسرال میں نماز قصر ادا کرنا

سوال:

ایک شخص جو گاؤں کا رہنے والا ہے' گاؤں ہی میں پیدا ہوا ہے' والدین وغیرہ گاؤں ہی میں ہیں۔ کراچی میں وہ شخص کام کے سلسلے میں عارضی طور پر اپنے بیوی بچوں سمیت کرایہ کے مکان میں مقیم ہے' سسرال اُس کا ایک دوسرے گاؤں میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب شخص مذکور اپنے گاؤں اور سسرال جائے گا تو پوری نماز پڑھے گا یا قصر کے ساتھ۔

[سائل: محمد عبدالرحمٰن' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں شخص مذکور جس گاؤں کا رہنے والا ہے' وہ گاؤں اُس کا وطن اصلی ہے۔ لہٰذا جب بھی وہاں جائے گا' خواہ ایک دن کے لیے یا اُس سے زیادہ کے لیے بہرحال پوری نماز ادا کرے گا۔

درمختار اور ردالمحتار میں ہے کہ وطن اصلی اُس وطن کو کہتے ہیں جس میں آدمی کی پیدائش ہو یا وہ جگہ جہاں شادی کر کے بیوی بچوں کے ساتھ گھر بسا لے یا وہ جگہ جہاں اس طرح قیام پذیر ہو جائے کہ اُس جگہ کو چھوڑنے کا ارادہ نہ ہو۔ (درمختار مع ردالمحتار ج ۲ ص ۵۳۵ طبع جدید)

جہاں تک مذکورہ شخص کے سسرال کا تعلق ہے تو وہاں چونکہ وہ اپنے بیوی بچوں کے

ساتھ اقامت پذیر نہیں ہے' اس لیے یہاں سے جب وہاں جائے گا اور پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہوگا تو شرعاً مسافر ہوگا اور نماز قصر کے ساتھ ادا کرے گا' اور اگر اپنے گاؤں سے سسرال جائے گا تو دیکھنا ہوگا کہ اپنے گاؤں اور سسرال کے گاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ اگر ان دونوں مقامات کے درمیان کم از کم 98.734 کلومیٹر کا فاصلہ ہو تو پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کے ارادہ سے جب اپنے سسرال جائے گا تو شرعاً مسافر ہوگا اور نماز قصر کے ساتھ ادا کرے گا۔ اگر دونوں گاؤں کے درمیان 98.734 کلومیٹر سے کم فاصلہ ہو تو اپنے گاؤں سے جب سسرال جائے گا تو خواہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے یا اُس سے زیادہ' بہر صورت نماز پوری پڑھے گا۔ **واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب**

غائبانہ نمازِ جنازہ کی شرعی حیثیت

سوال:

ایک شخص گھر سے کشمیر کی تحریک کے سلسلے میں چلا گیا' واپس گھر نہیں آیا۔ اب اس بات کا علم ہوگیا ہے کہ وہ شخص وہاں شہید ہو چکا ہے۔ اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟ اس بارے میں شرعی حکم بیان فرمائیں؟ [سائل: محمد یوسف' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ فقہاء احناف کے نزدیک نماز جنازہ کی مختلف شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ جنازہ سامنے موجود ہو۔ جیسا کہ تنویر الابصار اور درمختار میں ہے: ''**وشرطها ستة اسلام الميت وطهارته و ستر العورة وحضوره ووضعه وكونه هو او اكثر امام المصلى فلا تصح على غائب**'' نماز جنازہ کے صحیح ہونے کے لیے چھ شرائط ہیں: میت کا مسلمان ہونا' اس کا پاک ہونا' اس کے شرعاً قابل ستر مقامات کا چھپا ہونا' اس کا موجود ہونا اور اس کا پورا یا اکثر حصہ کا نمازی کے سامنے رکھا ہونا۔ لہٰذا جو میت سامنے نہ ہو اس پر نماز جنازہ صحیح نہیں ہے۔

(تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۳ ص ۹۷)

فقہاء احناف نے نماز جنازہ کے صحیح ہونے کے لیے میت کے موجود ہونے کی شرط اس

لیے لگائی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی صحابی پر غائبانہ نماز جنازہ (بایں طور کہ میت کسی طرح بھی سامنے نہ ہو) ثابت نہیں ہے' حالانکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جو انتقال کر جاتا' آپ ﷺ ان کی نماز جنازہ پڑھنے پر بہت حریص اور متمنی ہوتے حتیٰ کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''لا یموتن فیکم میت ما کنت بین اظھر کم الا اذنتمونی به فان صلاتی علیه له رحمة'' تم میں جو شخص بھی مر جائے اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں تو مجھے اس کی اطلاع دیا کرو' کیونکہ میرا اس پر جنازہ پڑھنا اس کیلیے رحمت ہے۔

(سنن ابن ماجہ: ۱۵۲۸' مسند احمد ج ۴ ص ۳۸۸: ۱۸۹۵۸' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اسی طرح ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ عزوجل ان کی قبروں کو میری نماز سے ان کے لیے روشن فرما دیتا ہے۔ (صحیح مسلم: ۹۵۶) تم مجھے اپنے جنازوں کے لیے بلا لیا کرو۔ (مسند احمد: ۱۵۲۴۶' ج ۲ ص ۴۴۵)

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے اصحاب پر نماز جنازہ کی ادائیگی کے کس قدر خواہش مند اور متمنی ہوتے تھے' لیکن اس کے باوجود معاملہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ اقدس میں مختلف مقامات پر صدہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وفات پائی لیکن کسی صحیح صریح حدیث سے ثابت نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی ہو' حتیٰ کہ واقعہ بیر معونہ جس میں رسول اللہ ﷺ کے ستر صحابہ کو دھوکہ سے شہید کر دیا گیا اور نبی اکرم ﷺ شدت الم سے پورے ایک مہینہ تک کفار کے لیے دعاء ہلاکت فرماتے رہے' ایسے جانثار صحابہ کے بارے میں بھی منقول نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کا جنازہ ادا فرمایا ہو۔ متعدد احادیث میں صرف یہی وارد ہے کہ نبی اکرم ﷺ ۳۰ دن تک کفار کے لیے دعاء ہلاکت فرماتے رہے۔

(دیکھیے: صحیح بخاری' کتاب الوتر: ۱۰۰۲' صحیح مسلم' کتاب المساجد: ۶۷۷)

باقی رہی وہ احادیث جن میں بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر غائبانہ نماز ادا کرنے کا ذکر آیا ہے' ان کی تفصیل یہ ہے کہ جب والی حبشہ نجاشی کا وصال ہو گیا تو نبی اکرم ﷺ نے (صحابہ کرام کو) اس کی موت کی خبر دی اور آپ عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے' وہاں آپ نے مسلمانوں کی صفیں بنائیں اور چار تکبیریں پڑھیں۔ (صحیح بخاری' کتاب الجنائز: ۱۲۴۵)

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ بن معاویہ مزنی رضی اللہ عنہ کا مدینہ طیبہ میں انتقال ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک میں ان کا جنازہ ادا فرمایا۔

(المعجم الکبیر: ۷۵۳۷ بحوالہ تبیان القرآن ج ۲ ص ۵۳۳)

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوگئے' یہ غزوہ ملک شام میں وقوع پذیر ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں منبر پر اس کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ جب حضرت زید بن حارثہ شہید ہوگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں ان پر نماز جنازہ ادا فرمائی اور ان کے لیے دعا کی' پھر حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بھی نماز جنازہ ادا فرمائی اور ان کے لیے دعا کی۔

(کتاب المغازی ج ۲ ص ۷۶۱ بحوالہ تبیان القرآن ج ۲ ص ۱۵۳۳)

مذکورہ تینوں واقعات سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ جائز اور مسنون ہے' لیکن حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ان تینوں واقعات کے متعلق روایات میں تصریح ہے کہ ان میں جنازے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے موجود تھے اور آپ نے ان پر نماز جنازہ ادا فرمائی۔ چنانچہ پہلا واقعہ جس میں حضرت نجاشی پر نماز جنازہ ادا کرنے کا ذکر ہے اس کے متعلق صحیح ابن حبان کی روایت میں صاف تصریح ہے کہ: ''وهم لا یظنون الا ان جنازته بین یدیه'' یعنی اس جنازہ میں صحابہ کرام کو یہی ظن تھا کہ نجاشی کا جنازہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حاضر ہے۔ (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ج ۵ ص ۴۰)

اور فتح الباری میں صحیح ابوعوانہ کے حوالہ سے اس واقعہ کے متعلق یہ صراحت ہے کہ: ''فصلینا خلفه و نحن لا نری الا ان الجنازة قدامنا'' ہم نے حضور کے پیچھے نماز پڑھی اور ہم یہی سمجھتے تھے کہ جنازہ ہمارے آگے موجود ہے۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۲۴۳) اور اسی فتح الباری میں امام واحدی کی اسباب النزول سے یہ روایت موجود ہے کہ: ''کشف للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن سریر النجاشی حتی راه و صلی علیه'' نجاشی کا جنازہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ظاہر کر دیا گیا' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا اور اس پر نماز ادا فرمائی۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۲۴۳' شرح الزرقانی علی المواهب ج ۸ ص ۸۷ بحوالہ فتاویٰ رضویہ مخرجہ ج ۹ ص ۳۴۹)

دوسرا واقعہ جس میں حضرت معاویہ بن معاویہ مزنی رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ ادا کرنے

کا ذکر ہے اس کے متعلق اسی روایت میں یہ صراحت موجود ہے کہ جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حاضر ہو کر عرض کیا:

''یارسول اللہ !ان معاویة بن المزنی مات بالمدینة اتحب ان اطوی لك الارض فتصلی علیه؟ قال نعم فضرب بجناحه علی الارض فرفع له سریره فصلی علیه وخلفه صفان من الملائکة فی کل صف سبعون الف ملك ثم رجع فقال علیه الصلوٰة والسلام بم ادرك هذا قال بحبه قل هو الله احد و قراء ته ایاها جائیا و ذاهبا وقائما وقاعدا و علی کل حال''.

(المعجم الکبیر: ۷۵۳۷ 'مرقات شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۱۴۰ 'تبیان القرآن ج ۲ ص ۵۳۳)

یعنی یارسول اللہ! معاویہ بن مزنی کا مدینہ طیبہ میں انتقال ہوگیا ہے' کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لیے زمین کو لپیٹ دوں تا کہ آپ ان پر نماز ادا فرمائیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ جبرئیل علیہ السلام نے اپنا پر زمین پر مارا اور جنازہ کو حضور کے سامنے کر دیا۔ سو آپ نے نماز جنازہ ادا فرمائی اور اس وقت آپ کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں تھیں اور ہر صف میں ستر ہزار فرشتے تھے' پھر وہ تخت واپس ہوگیا' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل سے حضرت معاویہ کی اس فضیلت کی وجہ پوچھی تو جبریل نے کہا کہ یہ سورۂ اخلاص سے محبت رکھتے تھے اور آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں اس کو پڑھا کرتے تھے۔

بعض روایات میں یوں ہے کہ جبریل نے اپنا داہنا پر پہاڑوں پر رکھا وہ جھک گئے' بایاں پر زمینوں پر رکھا وہ نیچے ہوگئیں یہاں تک کہ ہمیں مکہ و مدینہ نظر آنے لگے' اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جبریل وملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام نے ان پر نماز پڑھی۔

(مجمع الزوائد ج ۳ ص ۳۸ بحوالہ فتاویٰ رضویہ مخرجہ ج ۹ ص ۳۵۹)

تیسرا واقعہ جس میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہما پر نماز جنازہ ادا کرنے کا ذکر ہے اس کے متعلق بھی اسی روایت میں یہ صراحت ہے کہ: **''کشف له ما بینه و بین الشام فهو ینظر الی معرکتهم''** اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ملک شام کے درمیان حائل پردے اٹھا دیئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معرکہ کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔

(کتاب المغازی ج ۲ ص ۷۶۲)

مذکورہ تینوں واقعات کے متعلق جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان میں جنازہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے موجود تھا تو اب ان واقعات سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی رضی اللہ عنہ کا اس موضوع پر ایک مفصل اور مدلل رسالہ ہے جس میں آپ نے دلائل قاہرہ سے ثابت کیا ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ اس میں آپ نے ۸۶ کتابوں سے ۲۳۰ عبارات ذکر کی ہیں اور مختلف احادیث پر تحقیق اور فنی بحث ارقام فرمائی ہے۔ رسالہ کا نام ہے: ''الھادی الحاجب عن جنازۃ الغائب'' (غائبانہ نماز جنازہ سے روکنے والا رہنما رسالہ) اس کا مطالعہ قارئین کے لیے بہت مفید ہوگا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نماز جنازہ میں امام کس جگہ کھڑا ہو اور متعدد جنازے کس طرح رکھے جائیں؟

سوال:

نمازِ جنازہ میں امام میت کے سامنے کس جگہ کھڑا ہو اور اگر متعدد جنازے جمع ہو جائیں تو ان کو رکھنے کی ترتیب وسمت کیا ہوگی؟ [سائل: غضنفر بلال' کراچی]

جواب:

نمازِ جنازہ میں امام کا میت کے سینے کے سامنے کھڑا ہونا مستحب ہے۔ اس کے علاوہ میت کے کسی اور جزء کے سامنے کھڑا ہونا بھی جائز ہے۔ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:
''ویقوم الامام ندبًا بحذاء الصدر مطلقا للرجل والمراۃ والا فمحاذاۃ جزء من المیت لا بد منھا''۔ (ردالمحتار ج ا ص ۱۰۸) امام کا مرد اور عورت کے سینے کے سامنے کھڑا ہونا مستحب ہے' ورنہ میت کے کسی بھی ایک جزء کے سامنے کھڑا ہونا ضروری ہے۔

اگر کئی جنازے اکٹھے ہو جائیں تو امام کو ان کے رکھنے میں اختیار ہے چاہے تو لمبائی میں ایک ہی لائن میں رکھے اور چاہے تو قبلہ کی سمت میں ایک کے بعد ایک کو رکھے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"وهو في كيفية وضعهم بالخيار ان شاء وضعهم بالطول سطرا واحدا ويقف عند أفضلهم وان شاء وضعهم واحدا وراء واحد الى جهة القبلة".

(فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۵' فتح القدیر ج ۲ ص ۱۳۵)

یعنی امام کو جنازے رکھنے میں اختیار ہے۔ چاہے تو لمبائی میں ایک لائن میں رکھے اور ان میں سے افضل کے پاس کھڑا ہو اور چاہے تو قبلہ کی سمت میں ایک کے بعد ایک کو رکھے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کیا نماز جنازہ یا فاتحہ وغیرہ میں امام کا ہونا ضروری ہے؟

سوال:

(۱) کسی مسجد کے امام یا خطیب یا مؤذن پر کسی آدمی کے مرنے پر اس کی نمازِ جنازہ پڑھانا فرض و واجب ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کے نزدیک کسی کے مرنے پر امام یا مؤذن کو مرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھانا ضروری ہے۔ اس کام کے لیے امام یا مؤذن کو پابند کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۲) کیا سوئم کے موقع پر امام کو فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ ایک امام صاحب سے چند آدمیوں نے ان کے آرام کے وقت میں آ کر فاتحہ کا کہا تو امام صاحب نے آرام کا کہہ کر ان کو منع کر دیا۔ جس پر ان آدمیوں نے کہا کہ آپ کو فاتحہ پڑھنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ مسجد کے امام ہیں۔ شریعت کی رو سے بتائیے کہ یہ دونوں کام امام یا مؤذن پر فرض یا واجب کی طرح عائد کرنا کیسا ہے؟

[سائل: عبدالحمید نورانی' امام وخطیب جامع مسجد مدینہ' شاہ فیصل کالونی]

جواب:

فقہ حنفی کی تمام کتب میں یہ بات نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ نمازِ جنازہ پڑھانے کا سب سے پہلے بادشاہِ اسلام کو حق ہے' پھر قاضی کو اور پھر امام کو۔ ہاں! اگر میت کا ولی امام مسجد سے افضل ہو تو وہ امام کے مقابلے میں خود نماز پڑھانے کا زیادہ حقدار ہے۔ فقہ کی کسی عبارت سے یہ ثابت نہیں کہ نماز جنازہ پڑھانا امام مسجد پر واجب یا ضروری

ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف تمام فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر بادشاہِ اسلام یا اس کا نائب حاضر نہ ہو تو امام مسجد کا نماز پڑھانا مستحب اور بہتر ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام برہان الدین فرغانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"واولی الناس بالصلوٰة علی المیت السلطان ان حضر لان فی التقدم علیه ازدراء به فان لم یحضر فالقاضی لانه صاحب ولایة فان لم یحضر فیستحب تقدیم امام الحی لانه رضیه فی حال حیاته ثم الولی. (ہدایہ اولین ص ۱۸۰)

یعنی لوگوں میں نمازِ جنازہ پڑھانے کا سب سے زیادہ حقدار بادشاہ ہے، اگر وہ موجود ہو۔ اس لیے کہ اس پر کسی کو مقدم کرنے میں اس کی توہین ہے۔ اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو پھر قاضی (جج) حقدار ہے۔ اس لیے کہ وہ صاحبِ اختیار ہے۔ اگر وہ بھی حاضر نہ ہو تو پھر امامِ محلہ کا نماز جنازہ پڑھانا مستحب ہے۔ اس لیے کہ مرنے والا اپنی زندگی میں اس کے پیچھے نماز پڑھنے پر راضی تھا۔ اگر امام محلہ نہ ہو تو پھر میت کا ولی (سرپرست) حقدار ہے۔

اسی طرح علامہ علاء الدین حصکفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "ان تقدیم الولاة واجب وتقدیم امام الحی مندوب فقط" (درمختار ج ۲ ص ۱۱۳) حکام کا امامت کے لیے آگے ہونا واجب ہے، جب کہ امام کا نماز جنازہ پڑھانا فقط مستحب ہے۔ یہی وضاحت فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص ۹۲، البحر الرائق ج ۲ ص ۱۷۹، فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۵۸، فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۱۱۲، فتاویٰ رضویہ ج ۹ ص ۱۷۴، اور بہارِ شریعت حصہ ۴ ص ۸۴ میں موجود ہے۔

مندرجہ بالا تمام حوالہ جات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی فرض اور بہتر و مناسب ہی کہا جا سکتا ہے کہ امام مسجد یا مؤذن (نائب امام) نماز جنازہ پڑھائیں وگرنہ شرعاً ان پر لازم اور فرض یا واجب نہیں۔

اسی طرح سوئم وغیرہ کے موقع پر امام یا مؤذن کا فاتحہ پڑھنا شرعاً ضروری نہیں۔ کوئی بھی پڑھ لے فاتحہ ہو جائے گا۔ امام پر بلا وجہ اس کو فرض یا واجب کی طرح عائد کرنا غلط ہے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

زندگی میں اپنی قبر تعمیر کروانا

سوال:

(۱) زندگی میں اگر کوئی شخص اپنی قبر اور مزار وغیرہ تعمیر کروائے اس نیت سے کہ بعد میں لوگ توجہ دیں گے یا نہیں۔لہٰذا زندگی میں ہی اپنی شان وشوکت کا اہتمام کرلیا جائے۔ ایسے شخص کے لیے شریعتِ مطہّرہ کا کیا حکم ہے؟

(۲) اگر کوئی مسجد آباد ہو اور بعد میں کسی متولّی کے قبضے میں آنے کی وجہ سے وہ ویران ہوجائے یا بند ہوجائے تو اس کا گناہ کس کے ذمّے ہے؟ ایسے متولّی کے لیے شریعتِ مطہّرہ کا کیا حکم ہے؟ [سائل: عبدالمالک نقشبندی، گلستان جوہر]

جواب:

(۱) زندگی میں اپنے لیے قبر تیار کروانے میں شرعاً حرج نہیں ہے۔تاہم بعض فقہاء نے اس کو مکروہ اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''**وماتدری نفس بای ارض تموت**'' کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس جگہ اسے موت آئے گی۔(لقمان:۳۴) اس آیت مبارکہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پہلے سے اپنی قبر تیار کروانا شرعاً ایک غیر ضروری اور نامناسب عمل ہے۔یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ دین (علیہم الرحمۃ والرضوان) ہمیشہ موت کی تیاری کی تلقین اور تاکید فرماتے رہے۔قبر کی تیاری (یعنی اس کو پہلے سے بنانا) نہ انہوں نے خود کیا نہ اس کی تبلیغ اور ترغیب فرمائی۔جس زمانے میں ہم جی رہے ہیں اس کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگ وہ کام کرتے ہیں جن کا دینی اور اخروی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔بلکہ جو کام باعثِ نقصان یا باعثِ گناہ ہوتے ہیں ان کو ترجیحی بنیادوں پر کرتے ہیں۔حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''**من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه**'' مردِ مؤمن کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کام ترک کردے۔ (مسند احمد ج۱ ص۲۰۱) یعنی جو کام کرنا چاہیے اسی پر اکتفاء کرے۔

قرآن وسنت اور سلف صالحین کی اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ قبر کی بناوٹ اور تیاری کی بجائے موت کی تیاری کی جائے۔خصوصاً قبر کے ساتھ ساتھ اس کو مزار کی شکل دینا اور یہ سوچ

رکھنا کہ زندگی میں اپنی عزت کا اہتمام کرلیا جائے' یہ انتہائی دکھلاوا اور ریاکاری کے سوا کچھ نہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ مزارات کی تاریخ اور بزرگانِ دین کی مقدس شخصیات کو قابلِ طعن بنانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ بزرگانِ دین کا اعتماد اس نظریہ پر رہا ہے کہ عزت وذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا یہ کوشش کرنا کہ بلند وبالا مزار زندگی میں تعمیر کروا کے عزت وشوکت کا اہتمام کرلیا جائے' محض اللہ عزّ وجل کی معرفت اور عاجزی واخلاص سے دوری کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ عزت ووجاہت کا معیار قبر کا خوب صورت ہونا نہیں ہے بلکہ اللہ عزوجل کا قرب اور نیک اعمال عزت کا معیار ہیں۔ چنانچہ وہ شخصیات کہ جنہوں نے باکردار اور باعمل زندگی گزاری ہے انہیں کبھی اپنی عزت بنانے کے لیے اس طرح کے حیلے بہانوں کی ضرورت نہیں پڑی' بلکہ اللہ عزّ وجل کی طرف سے ازخود لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت ومحبت جاگزیں ہوئی ہے۔ بلند وبالا عمارات اور جبہ ودستار کی بنیاد پر عزت بنانے کی ضرورت انہی لوگوں کو پیش آتی ہے جن کا عملی کردار کچھ نہیں ہوتا' محض چند ضربیں لگا لینے کا نام عمل نہیں ہے۔ عمل سراسر ''پیکر اخلاص'' بن جانے کا نام ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جن صاحب کے متعلق سوال کیا گیا ہے ان کے لیے مفید اور شرعی مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مرنے کے بعد عزت حاصل کرنے کی نامناسب کوششوں سے باز آجائیں۔ اگر ان کا یہ عمل ریاکاری پر مبنی ہے تب تو بہت بڑی بدنصیبی ہے اور اگر ریاکاری پر مبنی نہیں ہے تب بھی اس عمل کو ترک کردیا جائے۔ کیونکہ ظاہراً اس میں ریاکاری ہی کا شبہ ہوتا ہے۔ اور ہر وہ کام جو شکوک وشبہات اور تہمت والزام کا باعث ہو اس سے بھی بچنے کا حکم ہے۔

(۲) مسجد کو ویرانی سے بچانا اور اسے آباد رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا'' اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں ذکرِ الٰہی بند کرائے اور مسجدیں ویران کرنے کی کوشش کرے؟ (البقرہ: ۱۱۴) لہٰذا ایسا متولی جو مسجد کو بند کرنے اور ویران کرنے کا سبب بنے وہ متولی رہنے کا حق دار نہیں ہے اور مسجد کو ویران کرنے کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ لہٰذا کوئی دوسرا شخص جو مسجد کو آباد کرسکتا ہے وہ پوری کوشش کرے اور جس طرح بن پڑے مسجد کو آباد کرے۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

مسجد کے تقدس اور آداب کے متعلق چند ضروری احکام

سوال:

(۱) مسجد کی چیزوں میں ان لوگوں کا دخل اندازی کرنا جن کا مسجد سے تعلق نہ ہو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ (۲) مسجد کا پانی لے جانا' مسجد میں برتن دھونا اور مسجد میں پان وغیرہ تھوک کر اسے صاف نہ کرنا کیسا ہے؟ [سائل: عبدالمالک سیفی' گلشن جمال]

جواب:

''مسجد'' کا نام جب سنا یا بولا جاتا ہے تو ذہن میں ایک انتہائی محترم اور قابل تعظیم جگہ کا تصور آتا ہے۔ اور حقیقتِ حال بھی یہی ہے کہ ''مسجد'' کو بہت ہی بلند و بالا مقام و مرتبہ اور احترام و تعظیم حاصل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسجد کو اللہ عزوجل کی ذاتِ پاک سے نسبت حاصل ہے۔ اس لیے شرعی نقطہ نظر سے ہر مسلمان پر مسجد اور مسجد سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا احترام اور لحاظ واجب ہے۔ مسجد کی کسی چیز کو کوئی شخص ذاتی استعمال میں نہیں لاسکتا۔ فقہائے کرام نے بہ طور مثال اتنا فرما دیا ہے کہ مسجد کا چراغ کوئی شخص اپنے گھر نہیں لے جاسکتا۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ مسجد کی تمام چیزوں کا یہی حکم ہے کیونکہ حکم کا دارومدار نسبتِ مسجد ہے۔ (فتاویٰ نوریہ ج اول ص ۱۵۱)

مسجد کا پانی اپنے ذاتی استعمال کے لیے بھر بھر کے باہر لیجانا ممنوع ہے۔ علماء نے ایک محدود پیمانہ پر صرف ان لوگوں کو اجازت دی ہے جو مسجد کے کرایہ دار ہوں' لیکن انہیں بھی اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ حد سے آگے نہ بڑھیں اور مسجد کی ضروریات اور قوانین کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

مسجد میں برتن دھونا شرعاً درست نہیں ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس میں مسجد کے پانی کا استعمال ہے' جس کا حکم بیان کیا جاچکا۔ دوسرا اس وجہ سے کہ اس میں مسجد کے تقدس اور احترام کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے عام حالات میں اس سے بچنا اور روکنا لازم ہے۔ اعتکاف کی حالت میں معتکفین چونکہ مجبور ہوتے ہیں اس لیے ان کا حکم اس سے مختلف ہے۔

رہا مسجد میں پان وغیرہ تھوک کر اسے صاف نہ کرنا' یہ انتہائی بدبختی اور رحمت خداوندی سے شدید محرومی کا باعث ہے۔ صاحبِ ایمان اللہ عزوجل کے گھر کا محافظ اور اس کے احترام کا پیکر ہوتا ہے۔ معمولی سے معمولی غیرت رکھنے والے مسلمان کے لیے قرآن مجید کا یہ ارشاد ہی کافی ہے کہ: ''وان المساجد للّٰہ'' مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ (الجن: ۱۸) اللہ عزوجل کے ذکر وعبادت کا مرکز اور اس کی پہچان کا ذریعہ ہیں۔ عرفِ شرع میں ایسی تمام چیزوں کو ''شعائر اللہ'' (اللہ کی نشانیاں) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم ان چیزوں کی اہمیت اور احترام بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ'' جو شخص اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو بلاشبہ یہ دل کا تقویٰ ہے۔ (الحج: ۳۲)

موجودہ زمانہ کے مختلف حادثات میں ایک حادثہ یا المیہ ''مسجد کی بے حرمتی'' بھی ہے۔ مسجدوں میں دنیاوی گفتگو' شور شرابہ' مسجد کی چیزوں کا بے دریغ استعمال مسجد کے معاملات میں من مانی یہ تمام باتیں فی زمانہ مسلمانوں کا معمول بن چکی ہیں۔ العیاذ باللّٰہ لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم. اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

مسجد کی جگہ میں مزار کی تعمیر اور دیگر ناجائز تصرفات کا حکم

سوال:

مسجد کی تعمیر کے لیے حکومت سے باقاعدہ ایک جگہ الاٹ کروا کر مسجد بنائی گئی اور تقریباً 15 سال تک اس مسجد میں پنجگانہ نماز' جمعہ' عیدین ادا کی جاتی رہیں۔ پھر مسجد کی توسیع کے لیے از سرِ نو تعمیرات کی گئیں' لیکن قدیم مسجد کو داخل تعمیر نہیں کیا گیا۔ بعد میں قدیم مسجد کی جگہ ایک مردہ دفن کر کے باقاعدہ ایک مزار و آستانہ بنا دیا گیا نیز مزید تدفین کے لیے اسی قدیم مسجد میں جگہ مخصوص کر دی گئی۔ اب اس آستانے اور مزار میں ہر ہفتہ قوالیاں بمع ڈھول' تاشے' ہارمونیم و جملہ لوازمات ہوتے ہیں۔ اس مزار میں مسجد کے فنڈ اور چندے کی مد سے

ایک خطیر رقم خرچ کی گئی ہے۔ نیز حدود مسجد میں ایک اور قبر اس طرح بنائی گئی ہے کہ مردہ کو زمین پر رکھ کر اس کے چاروں طرف چنائی کر کے بشکل تابوت قبر تیار کر دی گئی' جب کہ قرب وجوار میں قبرستان بھی موجود ہے۔ دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:

(۱) مسجد قدیم کو تعمیر نو میں داخل نہ کرنا کیسا ہے؟

(۲) پھر اس جگہ مسجد کے فنڈ وعطیات سے مزار وآستانہ بنانا کیسا ہے اور ایسا کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

(۳) قدیم مسجد کی جگہ مزید تدفین کے لیے جگہ قبل از موت مخصوص کر دی گئی' کیا وہاں تدفین جائز ہے؟

(۴) قدیم مسجد کی جگہ جو ناجائز تعمیرات ہوئیں ان کا کیا حکم ہے؟

(۵) حدود مسجد میں بشکل تابوت دفن کرنے والے کا کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح تدفین جائز ہے اب اس قبر کا کیا حکم ہے؟

برائے کرم مذکورہ مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں فرمائیں۔

[سائل: عبدالرحمن' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں برتقدیرِ صدق سائل مسجدِ قدیم کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ انتہائی قابل مذمت اور باعث افسوس ہے۔ مسجد کے ساتھ کیے جانے والے ذکر کردہ تصرفات نہ صرف یہ کہ اشد حرام ہیں بلکہ مسجد کے لیے باعث توہین ہیں۔ شرعاً ایک مرتبہ بھی جس جگہ کا مسجد ہونا ثابت ہو جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہو جاتی ہے۔ اور مسجد بننے کے بعد اس کو کسی اور مقصد کی طرف منتقل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''**لا یجوز تغییر الوقف عن هیأته**'' وقف شدہ چیز کو اس کی ذاتی حالت سے کسی اور حالت کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری ج ۲ ص ۴۹۰)

صورت مسئولہ میں مسجد قدیم کو آستانہ میں تبدیل کیا گیا ہے' یہ شریعت مطہرہ کی کھلی خلاف ورزی اور مسجد کے تقدس کو پامال کرنے کا انتہائی شرمناک اور ناپاک اقدام ہے۔ خصوصاً سائل کے بیان کے مطابق مسجد کی اس جگہ میں ہر ہفتہ ڈھول' تاشے' ہارمونیم وغیرہ

کے ساتھ قوالیاں ہوتی ہیں' یہ مسجد کی توہین بالائے توہین ہے۔ مسجد قدیم کو اس کی اصل شکل پر لوٹانا شرعاً لازم ہے۔ جنہوں نے مسجد کو آستانہ اور مزار و خانقاہ کی شکل دی ہے وہ فاسق و فاجر اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں۔ مسلمانوں پر ان فاسقوں سے اس وقت تک مقاطعہ (بائیکاٹ) لازم ہے جب تک کہ یہ اپنے فسق اور جرم سے علی الاعلان توبہ نہ کرلیں۔ نیز جنہوں نے اس آستانہ کو بنایا ہے وہ خود یا جو بھی طاقت رکھتے ہیں ان پر لازم ہے کہ اس آستانہ کو توڑ کر مسجد کی شکل میں دوبارہ تبدیل کریں اور جو مردہ دفنایا گیا ہے اس کو وہاں سے نکال کر کسی جائز مقام پر منتقل کریں یا زمین کو اس طرح برابر کردیں کہ قبر کا نشان ہی نہ رہے۔ (زیادہ بہتر یہی ہے کہ مردہ کو نکال کر منتقل کردیا جائے تاکہ قبر کے اوپر نماز وغیرہ لازم نہ آئے)۔

حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ سے پوچھا گیا کہ ایک ایسی زمین جس کو عید گاہ بنانے کے لیے وقف کیا گیا تھا اس میں زید جو کہ واقف ہے اس نے مردہ دفنایا ہے۔ آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں اور جس کو دفنایا گیا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ تو آپ نے جواباً فرمایا کہ "اس عید گاہ میں واقف (یعنی وقف کرنے والے) کو مردے دفن کرنا جائز نہیں کہ یہ تغییرِ وقف ہے اور تغییرِ وقف حرام ہے۔ (آگے فرماتے ہیں کہ:) زید نے جو مردے دفن کردیئے ہیں زید انہیں کھود کر دوسری جگہ لے جائے یا زمین برابر کردی جائے' قبور کا نشان مٹا دیا جائے"۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۳ ص ۲۰)

مقام غور ہے کہ عید گاہ جہاں سال بھر میں دو نمازیں ہوتی ہیں اس میں مردہ دفنانے کی اجازت نہیں ہے اور دفنانے کی صورت میں اس قبر کو ختم کرنا لازم ہے تو وہ جگہ جو "مسجد" ہو اور جہاں تمام نمازیں ادا کی جاتی ہوں' اس میں مردہ دفنانا بدرجۂ اتم ناجائز اور حرام ہوگا اور اس کی قبر کا خاتمہ زیادہ لازم اور ضروری ہوگا۔

لہٰذا مذکورہ آستانہ کو توڑنا اور قبر کا خاتمہ شرعاً لازم ہے۔ مسجدِ قدیم کی جگہ میں مزید تدفین کے لیے قبل از موت جو جگہ مخصوص کی گئی ہے وہاں بھی تدفین جائز نہیں ہے۔ مسجد کو مسجد ہی کی شکل میں قائم رکھنا لازم ہے۔ اسی طرح مذکورہ آستانہ اور مزار کی تعمیر میں مسجد کے فنڈ سے جو رقم خرچ کی گئی ہے وہ بھی شرعاً حرام کا ارتکاب ہے۔ جنہوں نے مذکورہ رقم خرچ کی ہے ان پر اس رقم کی ادائیگی لازم ہے۔ علاوہ ازیں حدود مسجد میں بہ شکل تابوت جو قبر بنائی گئی

ہے وہ بھی شرعاً ناجائز ہے۔

حضرت صدر الشریعہ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ: ''یہ جائز نہیں کہ میت کو زمین پر رکھ دیں اور چاروں طرف سے دیواریں قائم کر کے بند کر دیں۔ (بہار شریعت حصہ ۴ ص ۹۲)

صورت مسئولہ میں حدود مسجد میں جو قبر بنائی گئی ہے اس کا بھی وہی حکم ہے جو مسجد میں بنائی جانے والی قبر کا بتایا گیا۔ شہزادہ اعلیٰ حضرت حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: ''مسجد کا صحن تو صحن' مسجد بمعنی موضع صلوٰۃ کے علاوہ بھی مسجد کے متعلق کسی زمین میں قبر بنانا یا اور کوئی تصرف کرنا ناجائز ہے۔

(فتاویٰ مصطفویہ ص ۴۰۷) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی امام کا مسجد سے فارغ ہونے کے بعد مسجد انتظامیہ سے ناجائز مطالبات کرنا

سوال:

زید ایک مسجد کا امام تھا' مسجد والوں نے زید کو امامت سے فارغ کر دیا' زید نے مسجد کے مکان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا ہے۔

(۱) مسجد کا مکان چھوڑنے کے لیے ان کو چھ ماہ کی تنخواہ (36 ہزار روپے) بغیر کسی سروس کے دی گئی اور چھ مہینے کی رہائش بھی۔ کمیٹی والوں کا یہ 36 ہزار روپے اور دیگر سہولیات دینا اور بعضوں نے درمیان میں آ کر ڈیل کروائی' اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) زید نے مکان اب تک نہیں چھوڑا' بلکہ مزید 90 ہزار روپے کا مطالبہ کیا ہے' اور بعض علماء کرام اس مطالبہ کو پورا کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ کمیٹی والے اگر یہ رقم دیں تو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(۳) ایسے شخص کو دوبارہ مسجد کا امام بنانا کیسا ہے؟ جو لوگ دوبارہ امام بنا رہے ہیں ان کا یہ عمل کیسا ہے؟ جب کہ دوبارہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ گھر نہیں چھوڑتا؟

(۴) ایسے شخص کی توبہ کی کیا صورت ہے؟ بغیر سروس کے جو اس نے انتظامیہ سے پیسے لیے جتنا عرصہ مسجد کے مکان میں رہا (بغیر سروس کے) اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

بجلی، گیس، پانی اور مسجد کا فنڈ اس دوران جو استعمال ہوا اور انتظامیہ جو یہ سہولتیں دیتی رہی ان سب کا شرعی حکم کیا ہے؟۔ [سائل: عبد اللطیف منگی، گلشن اقبال]

جواب:

جب کسی امام کو اس کے منصب امامت سے سبکدوش کر دیا جائے تو وہ مسجد کے مکان میں رہنے، مسجد کی اشیاء استعمال کرنے اور انتظامیہ سے اضافی رقم طلب کرنے کا اہل نہیں رہتا۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت علیہ الرحمۃ والرضوان سے سوال کیا گیا کہ ایسا امام جو اکثر و بیشتر غیر حاضر رہتا ہو لیکن مجبوراً اسے پوری تنخواہ دی جاتی ہو تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے جواباً فرمایا کہ مالِ مسجد سے تنخواہ دینا اور امام کا اپنی مقررہ تنخواہ لینا دونوں حرام ہیں۔ (آگے فرماتے ہیں:) جتنے دن امام نے غیر حاضری کی اور اسے پوری تنخواہ دی گئی تو حساب کر کے حاضری کی تنخواہ کو علیحدہ کرنا ضروری ہے اور بقیہ رقم کی واپسی فرض ہے اور متولی پر اس رقم کو واپس لینا فرض ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ملخصاً ج ۱۶ ص ۴۵۷، مطبوعہ لاہور)

واضح رہے کہ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی یہ عبارت اس امام کے بارے میں ہے جو منصب امامت پر قائم ہو اور اکثر غیر حاضر رہتا ہو۔ ایسا امام اپنے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ کا مستحق نہیں ہے۔ تو جس امام کو بالکلیہ فارغ کر دیا گیا ہو وہ بغیر کسی کام کے اجرت کا مستحق کیونکر ہوگا۔ اور پھر اس کا یہ مطالبہ کہ مجھے مزید رقم دی جائے، حرام بالائے حرام ہے۔ اور وہ لوگ جو امام مذکور کو بلا استحقاق رقم دیں یا کمیٹی کو اس کی ترغیب دیں وہ سب گناہ اور حرام میں معاون ہیں۔ لہٰذا امام اہل سنت علیہ الرحمۃ کی عبارتِ مذکورہ کے مطابق امام پر لازم ہے کہ اپنی عاقبت کی فکر کرتے ہوئے اس رقم کو جلد از جلد واپس کرے جو بلا استحقاق اور بلا عمل وہ لے چکا ہے اور مزید رقم کے مطالبہ سے باز رہے۔ نیز جتنے دن بلا استحقاق مسجد کے مکان پر ناجائز قبضہ رکھا ہے اور گیس بجلی کا استعمال کیا ہے ان سب کی ادائیگی کرے۔ کہ شرعاً یہ غصب ہے اور غصب کی ادائیگی لازم ہے۔ نیز انتظامیہ پر لازم ہے کہ وہ مذکورہ واجب الاداء چیزیں امام سے فی الفور واپس لے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد کا روپیہ (بلا استحقاق) وصول کرے وہ غاصب ہے، اور مرتکب غصب مستحق غضب ہے۔ لہٰذا مہتممِ مسجد پر لازم ہے کہ اس سے پیسہ واپس لے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۶ ص ۵۶۹، بتغیر ما)

صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام نے مسجد کی اشیاء پر غاصبانہ قبضہ قائم رکھا ہے اس لیے وہ سخت گناہ گار ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس کا وہی حکم ہے جو فاسق کا ہے۔ یعنی اس کو امام بنانا گناہ ہے، تاوقتیکہ وہ توبہ کر لے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: "**لو قدموا فاسقا یأثمون**" یعنی اگر لوگوں نے فاسق کو امام بنایا تو گناہ گار ہوں گے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۲۳۸)

شخصِ مذکور کی توبہ کی صورت یہ ہے کہ جو چیزیں اس پر واجب الاداء ہیں ان سب کو ادا کرے اور سب کے سامنے اپنے گناہ کی توبہ کرے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ "**توبة السر بالسر و توبة الاعلان بالاعلان**" پوشیدہ گناہ کی توبہ پوشیدہ اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ" **کما ورد فی الحدیث عن النبی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"۔ (کتاب الزھد للامام احمد بن حنبل ص ۳۵، جمع الجوامع للامام السیوطی: ۱۹۰۱، فتاویٰ رضویہ ج ۲۱ ص ۱۴۲) **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

مسجد کی چھت پر رہائشی کمرے بنانے کا شرعی حکم

سوال:

مسجد کی چھت پر رہائشی کمرے بنانا کیسا ہے چاہے وہ کمرے معتکفین، مسافرین یا مؤذن کے لیے ہوں۔ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کو واضح فرمائیں؟

[سائل: عبدالرشید نقشبندی، کورنگی]

جواب:

مسجد کی چھت پر رہائشی کمرے اگر اس وقت بنائے جائیں جب معین جگہ کو مسجد کا درجہ نہ دیا گیا ہو تو یہ جائز ہے۔ اور اگر اس وقت بنائے جائیں جب وقف شدہ زمین میں یہ طے کیا جاچکا ہو کہ اتنا ٹکڑا مسجد ہے تو شرعاً جائز نہیں ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "**لو بنی فوقه بیتا للامام لا یضر لانه من المصالح، اما لو تمت المسجدیة ثم اراد البناء منع**" اگر مسجد کی چھت پر امام کے لیے کمرہ بنایا تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ ضروریاتِ مسجد کا حصہ ہے۔ ہاں اگر معین جگہ کو مسجد کا درجہ دیا جاچکا ہو پھر اس پر کوئی شخص رہائشی مکان بنانے کا ارادہ کرے تو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (درمختار مع ردالمحتار ج ۶ ص ۴۲۸، طبع جدید)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: مسجد کی چھت پر امام کے لیے بالا خانہ بنانا چاہتا ہے اگر قبلِ تمام مسجدیت ہو تو بنا سکتا ہے۔ اور مسجد ہو جانے کے بعد نہیں بنا سکتا' اگرچہ کہتا ہو کہ مسجد ہونے کے پہلے سے میری نیت بنانے کی تھی۔

(بہار شریعت حصہ ۱۰ ص ۴۴) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی خاص مقصد کے لیے جمع کردہ چندہ کو کسی دوسرے مصرف میں استعمال کرنا

سوال:

امسال رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ میں ختم قرآن کے سلسلے میں اہلِ محلہ اور دیگر حضرات نے مسجد انتظامیہ کے پاس جو عطیات بھیجے ان عطیات سے ستائیسویں شب ختمِ قرآن کی اوّل تا آخر تمام ضروریات بحسن وخوبی پوری کرنے کے بعد ایک معقول رقم انتظامیہ کے پاس بچی ہے۔ مسجد ہٰذا میں وضو خانہ تعمیر ہو رہا ہے۔ وضو خانے کا تعمیری کام مسلسل جاری و ساری ہے۔ ختمِ قرآن کے نام سے جمع کی ہوئی رقم سے بچی ہوئی رقم وضو خانے کی تعمیر میں استعمال کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ جاری فرمائیں۔

[سائل: صابر حسین انصاری' لانڈھی]

جواب:

کسی بھی کارِ خیر کو لوگوں کے سامنے معیّن کر کے جو چندہ کیا جائے اس کو فقط اسی مصرف میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے چندہ دیا ہے ان کی اجازت کے بغیر رقم کو کسی اور کام میں صرف نہیں کیا جا سکتا۔ (ھکذا فی الفتاویٰ الرضویہ ج ۱۶ ص ۲۰۶-۱۳۴) ہاں اگر چندہ کرتے وقت کارِ خیر کا تعین نہ کیا جائے بلکہ جمیع امورِ مسجد کے لیے کیا جائے' یا کسی خاص کام کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ "ودیگر امورِ خیر" کے الفاظ بڑھا دیے جائیں تو اب اس رقم کو مسجد کے جملہ نیک کاموں میں استعمال کر سکتے ہیں۔ چندہ کرنے میں یہی طریقہ اختیار کرنا زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ تاکہ رقم بچ جانے کی صورت میں اسے کسی دوسرے نیک کام میں استعمال کیا جا سکے اور اجازت لینے یا رقم واپس کرنے کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

زیرِ نظر سوال میں جو صورتِ حال بیان کی گئی ہے اس میں ختمِ قرآن کے عنوان سے جو رقم جمع کی گئی تھی اسے ختمِ قرآن ہی کے امور میں استعمال کرنا چاہیے۔ بچ جانے کی صورت میں اسے آئندہ سال ختمِ قرآن میں شامل کردیں۔ ہاں اگر یہ رقم ختمِ قرآن کے ساتھ ساتھ مسجد کے جملہ امورِ خیر کے لیے جمع کی گئی ہو تو اب اسے مسجد کے تمام نیک کاموں میں استعمال کرسکتے ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

رمضان المبارک کا روزہ جان بوجھ کر توڑ دینے کا کفارہ

سوال:

رمضان المبارک میں اگر کوئی شخص روزہ جان بوجھ کر توڑ دے تو اس کا کیا کفارہ ہے۔ اور کیا کفارہ کو مختلف حصوں میں اور مختلف اوقات میں دیا جاسکتا ہے؟ اگر کفارہ کی ادائیگی میں وقفہ ہوجائے تو کیا حکم ہے؟ [سائل: محمد کوثر علی اشرفی اورنگی ٹاؤن]

جواب:

صورت مسئولہ میں جان بوجھ کر روزہ توڑ دینے کی صورت میں کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے، اگر غلام نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل (بغیر وقفہ کے) روزے رکھے۔ اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلادے۔

یہ کفارہ حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے جس کو تمام ائمہ ومحدثین نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حدیث درج ذیل ہے:

''ان اعرابیا اتی النبی ﷺ فقال: یارسول اللہ ﷺ ھلکت و اھلکت فقال ﷺ ماذا صنعت؟ قال واقعت امرأتی فی نھار رمضان متعمدا. فقال اعتق رقبۃ قال لا املک الا رقبتی ھذہ. قال فصم شھرین متتابعین. قال ھل جاء نی ما جاء نی الا من الصوم قال اطعم ستین مسکینا ...... (الخ)''.

یعنی ایک اعرابی حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ

ﷺ! میں ہلاک ہوگیا۔ فرمایا: کیا ہوا؟ عرض کی: جان بوجھ کر رمضان کا روزہ توڑ دیا ہے۔ فرمایا: ایک غلام آزاد کردو۔ عرض کی: میں غلام کا مالک نہیں ہوں۔ فرمایا: دو ماہ کے مسلسل روزے رکھو۔ عرض کی: اس کی بھی طاقت نہیں۔ فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔

اب چونکہ مذکورہ حدیث میں روزوں کے لیے تتابع (مسلسل رکھنے) کی شرط لگائی گئی ہے اور کھانا کھلانے میں یہ شرط نہیں ہے اس لیے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ روزوں میں وقفہ بالکل نہیں کیا جاسکتا' مسلسل رکھنا ضروری ہے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو سہولت کے مطابق کھانا کھلایا جاسکتا ہے' خواہ ایک وقت میں ہو یا مختلف اوقات میں۔

چنانچہ اس مسئلے کو بہارِ شریعت میں درمختار اور ردالمحتار کے حوالے سے یوں بیان کیا گیا ہے: ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صبح کو کھلائے اور شام کے لیے قیمت دے دے یا شام کو کھلائے اور صبح کے کھانے کی قیمت دے دے یا دو دن صبح کو یا شام کو کھلائے یا تیس کو کھلائے اور تیس کو دیدے' غرض یہ کہ ساٹھ کی تعداد جس طرح چاہے پوری کرے اس کا اختیار ہے۔

(بہارِ شریعت حصہ ۸ ص ۶۰' ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

مقروض کو زکوٰۃ دینا اور اپنے مقروض کو زکوٰۃ کی مد میں قرض کی معافی دینا

سوال:

(۱) مقروض کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اگر قرض خواہ اپنے مقروض کو زکوٰۃ کے طور پر پیسے دے اور مقروض انہی پیسوں سے اپنے قرض خواہ کا قرض ادا کرے تو یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

[سائل: محمد حامد محمود کاغانی' صدیق آباد]

جواب:

(۱) مقروض کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں مصارف زکوٰۃ بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک مصرف ''غارمین'' بھی بیان کیا گیا ہے۔ (التوبہ: ۶۰) اور غارمین کے معنی

ہیں مقروض۔ چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''الغارم الذی علیہ الدین اکثر من المال الذی فی یدہ او مثلہ او اقل منہ لکن ما وراءہ لیس بنصاب'' غارم سے مراد وہ شخص ہے جس پر موجودہ مال سے زیادہ قرض ہو یا جتنا مال ملکیت میں موجود ہو اتنا ہی قرض بھی ہو یا قرضہ تو کم ہو لیکن اس کی ادائیگی کے بعد مال' نصاب کے مطابق باقی نہ بچتا ہو' ان تمام صورتوں میں مقروض کو زکوۃ دینا جائز ہے۔ (بدائع الصنائع ج۲ ص ۴۳)

(۲) قرض خواہ اگر اپنے مقروض کو زکوۃ کے طور پر پیسے دے اور مقروض ان پیسوں سے اپنے قرض خواہ کا قرض ادا کرے اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے' بلکہ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کو افضل قرار دیا ہے۔ اور ہمارے متقدمین علماء و مشائخ (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) اپنے محتاج اور مفلس مقروضوں کے ساتھ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج۶ ص ۳۹۱) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مختلف مقاصد کے لیے رکھے جانے والے جانوروں اور پرندوں پر زکوۃ کا حکم

سوال:

پولٹری فارمنگ کے لیے مرغیاں پالی جاتی ہیں۔ ان کے انڈے' چوزے اور مرغیاں فروخت کی جاتی ہیں۔ ان پر زکوۃ ہے یا نہیں؟ آیا یہ مال تجارت ہیں یا نہیں؟ زید ایک جید مفتی صاحب کے حوالہ سے کہتا ہے کہ چونکہ مرغیاں مال نامی نہیں ہے اس لیے ان پر زکوۃ نہیں لگے گی۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ گائے' بھینس کو دودھ کی فروخت کے لیے پالا جاتا ہے' شہد کی مکھیاں' شہد کی تجارت کے لیے پالی جاتی ہیں اور پرندوں کی فروخت کے لیے پرندوں اور جانوروں کی افزائش نسل کی جاتی ہے۔ نیز اسی طرح آج کل مچھلیوں کی بھی فروخت کرنے کے لیے فارمنگ کی جاتی ہے۔ یہ سب بھی مال نامی ہیں یا نہیں؟ اور ان پر زکوۃ ہوگی یا نہیں؟ مدلل اور مفصل جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

[سائل: محمد عارف نوری' کھارادر کراچی]

جواب:

سوال مذکور کے جواب سے قبل ایک بات یہ جاننی چاہیے کہ زکوۃ تین قسم کے اموال پر واجب ہوتی ہے:

(۱) ثمن یعنی سونا چاندی (۲) مال تجارت (۳) سوائم یعنی چرنے کے لیے چھوڑے ہوئے جانور۔

دوسری بات یہ جاننی چاہیے کہ زکوۃ واجب ہونے کے لیے مال زکوۃ کا نامی (یعنی بڑھنے والا) ہونا شرط ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں: (نویں شرط ہے) مال نامی ہونا یعنی بڑھنے والا۔ خواہ حقیقتاً بڑھے یا حکماً یعنی اگر بڑھانا چاہے تو بڑھائے۔ یعنی اس کے یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔ ہر ایک کی دو صورتیں ہیں: وہ پیدا ہی اسی لیے کیا گیا ہو' اسے خلقی کہتے ہیں جیسے سونا چاندی' کہ یہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ان سے چیزیں خریدی جائیں۔ یا اس لیے مخلوق تو نہیں مگر اس سے یہ بھی حاصل ہوتا ہے' اسے فعلی کہتے ہیں۔ سونے چاندی کے علاوہ سب چیزیں فعلی ہیں کہ تجارت سے سب میں نمو ہوگا۔ سونے چاندی میں مطلقاً زکوۃ واجب ہے جب کہ بقدر نصاب ہوں۔ اگرچہ دفن کر کے رکھے ہوں' تجارت کرے یا نہ کرے۔ اور ان کے علاوہ باقی چیزوں پر زکوۃ اس وقت واجب ہے کہ تجارت کی نیت ہو یا چرائی پر چھوٹے جانور و بس۔ (بہار شریعت ج ۵، ص ۱۱ مطبوعہ لاہور)

صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی اس عبارت میں صراحت ہے کہ "سونے چاندی کے علاوہ سب چیزیں فعلی ہیں کہ تجارت سے سب میں نمو ہوگا اور ان چیزوں میں اس وقت زکوۃ واجب ہوگی جب یہ تجارت کی نیت سے ہوں"۔

سوال مذکور میں سائل نے مچھلیوں' مرغیوں اور پرندوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کو فروخت کرنے کے لیے ان کی فارمنگ کی جاتی ہے۔ اور جب فروخت کرنے کے لیے ان کی فارمنگ کی جاتی ہے تو عبارت مذکورہ کی روشنی میں یہ سب مال تجارت اور مال نامی ہیں اور شرعاً ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔ فقہاء احناف نے اپنی کتب میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت اور خرید و فروخت کی غرض سے گدھے' گھوڑے اور خچر خریدے تو نیت تجارت کی وجہ سے یہ سب شرعاً مال تجارت ہوں گے اور ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔ (درمختار ج ۳ ص ۱۹۱) سو اسی

طرح زیر بحث مسئلہ میں بھی فروخت کرنے کے لیے لائی جانے والی مچھلیاں، مرغیاں اور پرندے بھی مال تجارت متصور ہوں گے اور ان پر زکوۃ عائد ہوگی۔

جہاں تک شہد کی مکھیوں اور گائے بھینسوں کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں سائل کی صراحت یہ ہے کہ شہد کی مکھیوں کو شہد کی تجارت کے لیے اور گائے بھینس کو دودھ کی فروخت کے لیے پالا جاتا ہے۔لہٰذا درمختار اور بہار شریعت کی ذکر کردہ عبارات کی روشنی میں ان کا حکم واضح ہے کہ شرعاً ان پر زکوۃ نہیں ہوگی، بلکہ ان سے حاصل ہونے والی منفعت اور آمدنی پر (سال گزرنے کی شرط کے ساتھ) زکوۃ واجب ہوگی۔ہاں اگر کوئی شخص شہد کی مکھیوں اور گائے بھینسوں کی تجارت کرتا ہے تو اس صورت میں یہ مال تجارت متصور ہوں گے اور ان کا بھی وہی حکم ہوگا جو مرغیوں، مچھلیوں اور پرندوں کا مذکور ہوا۔واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

حیلہ شرعیہ کے بغیر زکوۃ کی رقم استعمال کرنا اور قربانی کی کھالوں سے مدرسہ کی تعمیرات میں فائدہ اٹھانا

سوال:

(۱) زکوۃ کی رقم کو کسی بھی حوالہ سے بغیر حیلہ کے استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور کیا حیلہ کروانا ضروری ہے؟ نیز نابالغ سے حیلہ کروانا کیسا ہے؟

(۲) زکوۃ کی رقم اور چرمہائے قربانی کے پیسوں سے مدرسہ میں تعمیرات کا کام کرواسکتے ہیں یا نہیں؟ [سائل: عبدالحنان، نیو کراچی]

جواب:

(۱) تمام فقہائے احناف نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے۔یعنی کسی کو مالک بنانا ضروری ہے۔ظاہر ہے کہ مسجد وغیرہ کی عمارت کو مالک نہیں بنایا جاسکتا اس لیے ڈائریکٹ زکوۃ کا پیسہ مسجد اور مدرسہ یا دیگر رفاہی اداروں میں نہیں لگایا جاسکتا۔فتاوی عالمگیری میں ہے: **"لا یجوز ان یبنی بالزکوۃ المسجد وکل مالا تملیک فیہ"** زکوۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر جائز نہیں اور اسی طرح ہر وہ جگہ جہاں

تملیک نہ پائی جائے وہاں زکوۃ کی رقم لگانا جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۸۸) اب عموماً چونکہ مدارس میں رقم کی بہت اشد ضرورت ہوتی ہے' اور یہ ضرورت زکوۃ کی رقم سے بہت حد تک بآسانی پوری ہو جاتی ہے اس لیے کسی غریب طالب علم سے حیلہ کروایا جاتا ہے' تاکہ زکوۃ کی رقم کا استعمال مدارس میں درست ہو' بغیر حیلہ شرعیہ کے زکوۃ کی رقم کا استعمال مدارس وغیرہ میں بھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے' ان کے ہاں گوشت پک رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے گوشت طلب فرمایا تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یہ صدقہ کا گوشت ہے (یعنی آپ نہیں کھا سکتے) نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لك صدقة ولنا هدية'' تمہارے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے (یعنی جب یہ گوشت تمہاری ملکیت میں دیدیا گیا تو اب ہم اس کو کھا سکتے ہیں) (مشکوٰۃ المصابیح' باب الصدقہ ص ۱۶۱) اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''اذا تصدق علی المحتاج بشیء ملکه فله ان یهدی به الی غیره'' جب کوئی شخص محتاج کو کوئی چیز صدقہ واجبہ میں دے اور اسے اس چیز کا مالک بنادے تو وہ محتاج اس چیز کو کسی اور کی طرف ہدیہ کرسکتا ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۳۳۸) لہٰذا صورت مسئولہ میں زکوۃ کی رقم کو بغیر حیلہ شرعیہ کے مدارس وغیرہ میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ مدارس میں دی گئی زکوۃ کی رقم کے درست استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ کسی غریب مستحق زکوۃ طالب علم کو اس رقم کا مالک بنایا جائے اور وہ طالب علم اس رقم کو مدرسہ کے لیے ہدیہ کردے۔ یوں اس رقم کا استعمال مدرسہ کے متعلقہ امور (تعمیرات وطعام وغیرہ) میں جائز ہوگا۔

حیلہ شرعی نابالغ سے کروانا درست نہیں ہے۔ کیونکہ مال زکوۃ پر قبضہ کرنے کے بعد جب وہ کسی کو دے گا تو یہ ہبہ اور ہدیہ ہوگا اور نابالغ کا ہدیہ شرعاً درست نہیں ہے۔ درمختار میں ہے: ''لا تصح هبة صغیر'' نابالغ کا ہبہ درست نہیں ہے۔ (ج ۸ ص ۴۲۴) بدائع الصنائع میں ہے: ''لا تجوز هبة الصبی'' نابالغ کا کسی چیز کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے (ج ۶ ص ۱۸۴)۔

(فتاویٰ فیض الرسول ج ۱ ص ۴۹۲)

اور اس لیے بھی کہ نابالغ شرعاً مجور ہے یعنی کسی کو کچھ دینے نہ دینے اور دیگر تصرفات کا اہل نہیں ہے اس لیے شرعاً اس سے حیلہ کروانا صحیح نہیں ہے۔

(۲) چرمہائے قربانی کی رقم سے مدرسہ میں تعمیرات کا کام کروانا بلاشبہ جائز ہے اور اس کی رقم میں حیلۂ شرعیہ کی بھی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ قربانی کی کھال کا صدقہ کرنا مستحب ہے اور صدقہ مستحبہ میں تملیک شرط نہیں ہے۔ لہٰذا بغیر حیلۂ شرعیہ کے مدرسہ و مسجد وغیرہ میں اس رقم کا استعمال جائز ہے۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

ایک انتہائی مال دار عورت کا اپنے لیے زکوٰۃ وصول کرنا

سوال:

ایک بیوہ عورت جس کے پاس دنیا کی تمام سہولیات موجود ہیں کافی مقدار میں سونا ہے بینک میں پیسوں کے اکاؤنٹس کے علاوہ اس کے بیٹوں کے پاس بھی اچھی خاصی رقم موجود ہے۔ بیوہ کو گورنمنٹ سے پنشن بھی ملتا ہے علاوہ اس کے وہ کام کاج بھی کرتی ہے اور اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں غربت کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ رمضان المبارک میں زکوٰۃ لیتی ہے۔ برائے کرم قرآن و سنت کی روشنی میں بتایئے کہ اس بیوہ کا زکوٰۃ لینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے اور وہ شریعت کا حکم جاننے کے باوجود اس کا انکار کرے۔ تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

[سائل: محمد شفیع قادری رضوی ماریشش افریقہ]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ جو مرد و عورت ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ان کی مالیت کے مالک ہوں ان کے لیے صدقہ زکوٰۃ لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ التوبہ آیت ۶۰ میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ زکوٰۃ صرف مسکین، فقیر، عامل، غلام، مقروض، راہ خدا اور مسافرین کے لیے ہے اور حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "لا تحل الصدقة لغنی"

کسی مالدار کے لیے زکوۃ حلال نہیں ہے۔ (جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۴۱، سنن ابن ماجہ ص ۱۳۲) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صدقہ واجبہ مالدار کو لینا اور دینا دونوں حرام ہے اور مالدار کو دینے سے، دینے والے کی زکوۃ ادا نہ ہوگی۔

(محصلہ فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۴۷۱)

لہٰذا صورت مسئولہ میں مالدار بیوہ کا زکوۃ، صدقہ اور خیرات کی رقم لینا ناجائز اور حرام ہے، نیز اس کا حکم شریعت کو جاننے کے باوجود اس سے انکار کرنا دائرہ اسلام سے خروج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس فعل سے سچی توبہ کرے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

سسر کا اپنے داماد کو زکوۃ دینا

سوال:

سسر اپنے داماد کو زکوۃ دے سکتا ہے یا نہیں، جب کہ بیٹی کے پاس سات تولے کے قریب جہیز میں دیا ہوا زیور ہے۔ مگر داماد کمزور ہے اور کام کرتا ہے۔ گھر میں خرچہ مشکل سے چلتا ہے۔ کبھی کبھی ادھار بھی ادا نہیں کر سکتا۔ دیگر گھریلو ضرورت کا سامان گھر میں موجود ہے۔ اسی طرح بیٹی کے پاس سات تولے کے قریب جو زیورات ہیں تو اس صورت میں اس کی بہنیں یا بھائی اسے زکوۃ دے سکتے ہیں یا اپنے بہنوئی کی امداد کر سکتے ہیں یا نہیں؟

[سائل: اعجاز مغل، گلشن اقبال، کراچی]

جواب:

قرآن مجید میں زکوۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مصرف ''فقیر'' بھی ہے۔ ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ'' زکوۃ کی رقم فقیروں کے لیے ہے۔ (التوبہ: ۶۰) شرعی اصطلاح میں فقیر کس شخص کو کہا جاتا ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: فقیر وہ شخص ہے کہ جس کے پاس کچھ ہو مگر نہ اتنا کہ نصاب کو پہنچ جائے یا نصاب کی قدر ہو تو اس کی حاجت اصلیہ میں مستغرق ہو۔ (بہار شریعت حصہ ۵ ص ۳۰)

صدر الشریعہ کی اس تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں (ضروریاتِ زندگی کے علاوہ) ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار سامانِ تجارت یا رقم نہ ہو وہ فقیر ہے' یا اگر اتنی رقم موجود ہو لیکن وہ ضروریاتِ زندگی میں لگی ہوئی ہو تو وہ بھی فقیر ہے اور ایسے شخص کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

علامہ شامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''فان کان مستغرقًا بالحاجة لمالكه اباح اخذها والآحرّمهٗ وأوجب غيرها من صدقة الفطر والأضحيّة ونفقة القريب المحرم''۔ (فتاویٰ شامی ج ۳ ص ۲۵۷)

یعنی اگر کسی شخص کے پاس شرعی نصاب کی مقدار میں مال موجود ہو اور وہ اس کی ضروریاتِ زندگی میں لگا ہوا ہو تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے' ورنہ حرام ہے۔ لیکن اس قدر مال جس کے پاس موجود ہو اس پر صدقہ فطر' قربانی اور زیرِ کفالت محارم کا نفقہ باقی رہے گا۔

بہارِ شریعت اور فتاویٰ شامی کے ان حوالہ جات کی روشنی میں زیرِ نظر سوال کا جواب واضح ہے کہ اگر مذکورہ شخص کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر رقم موجود نہیں ہے یا موجود ہے لیکن وہ گھریلو ضروریات میں لگی ہوئی ہے تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اسے سسر اور بیوی کے بھائی بہن سب زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ یہی حکم مذکورہ شخص کی بیوی کا ہے' کہ اگر اس کے پاس سات تولہ زیورات کے علاوہ کوئی بینک بیلنس موجود نہیں ہے تو اسے اس کے بھائی بہن زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بہن اور بہنوئی کے ساتھ عمرہ پر جانے کا حکم اور عدت وفات ختم کرنے کا طریقہ

سوال:

(۱) کوئی جوان لڑکی اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ عمرہ کرنے جا سکتی ہے؟ اگر نہیں جا سکتی اور چلی جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲) عدت وفات ختم ہونے پر کوئی خاص عمل یا طریقہ ہے کہ جس کے کرنے سے عدت ختم ہو۔ نیز عوام میں طرح طرح کی رسمیں رائج ہیں (مثلاً عدت ختم ہونے پر لڑکی کے بھائی لڑکی کے لیے جوڑا وغیرہ لے جاتے ہیں) قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں؟

[سائل: محمد مبشر عطاری، سرجانی ٹاؤن]

جواب:

(۱) حج وعمرہ کے سفر میں عورت کے ساتھ شوہر یا کسی بھی ایسے شخص کا ہونا ضروری ہے جس سے اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو۔ اگر یہ شرط پوری نہ ہو اور عورت چلی جائے تو سخت گناہ گار ہوگی۔ صورت مسئولہ میں عورت کا عمرہ کے لیے جانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ بہنوئی غیر محرم ہے۔

(۲) عدت وفات کے ختم ہونے کا کوئی خاص طریقہ اور عمل نہیں ہے۔ فی زمانہ جو رسمیں رائج ہیں ان میں اگر کسی شرعی قباحت اور حرام کا ارتکاب نہ ہو تو ان کے کرنے میں حرج نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اگر دوران عمرہ سعی رہ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:

اگر دوران عمرہ سعی رہ جائے تو کیا حکم ہے؟ آیا دم دینا لازم ہے یا ازسر نو عمرہ ادا کرنا ضروری ہوگا؟ [سائل: محمد خضر الاسلام، کراچی]

جواب:

عمرہ میں سعی ادا کرنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر عمرہ میں سعی رہ جائے تو دم یعنی بھیڑ یا بکری حدود حرم میں قربان کرنا لازمی ہوگا۔ عمرہ ازسر نو ادا کرنا لازمی نہیں۔ جیسا کہ علامہ ابوبکر یمنی فرماتے ہیں:

"ومن ترك السعي بين الصفا والمروة فعليه الدم لان السعي من الواجبات عندنا فيلزم بتركه الدم"۔

(الجوہرۃ النیرۃ ج۱ ص ۲۱۲، فتاویٰ عالمگیری ج۱ ص ۲۴۷، حاشیۃ الطحطاوی ج۱ ص ۴۰۳)

جو صفا و مروہ کے درمیان سعی ترک کر دے تو اس پر دم لازم ہے کیونکہ ہمارے (احناف) کے نزدیک سعی، حج و عمرہ کے واجبات سے ہے۔ پس اس کے چھوڑنے سے دم لازم ہوگا۔

نوٹ: اگر ممکن ہو تو معتمر (عمرہ ادا کرنے والا) خود جا کر حدود حرم میں دم ادا کرے، اور اگر خود نہ گیا اور بھیڑ یا بکری کی قیمت دے کر کسی کو بھیج دیا اور وہاں قربانی ہو گئی، تو بھی کافی ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۷۶) واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

ایک شخص نے 15 مرتبہ عمرہ کیا اور ایک بار بھی حلق یا تقصیر نہیں کرائی......

سوال:

زید نے پندرہ مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کی مگر اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایک مرتبہ بھی اس نے حلق یا تقصیر نہیں کرایا بلکہ ویسے ہی احرام اتار کر سلے ہوئے کپڑے پہن لیے۔ اور آج تک اس کا یہ عمل جاری ہے قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر زید کی مشکل حل فرمائیں۔ اور بتائیں کہ اب زید کو کیا کفارہ دینا ہوگا؟ [سائل: محمد عامر، بلدیہ ٹاؤن]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حج میں حلق (سر منڈانا) یا تقصیر (بال کتروانا) واجب ہے اسی طرح عمرہ میں بھی حلق یا تقصیر واجب ہے۔ لیکن عمرہ میں ان چیزوں کے لیے وقت کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یعنی عمرہ میں سر منڈانا یا بال کتروانا فی الفور واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ حج میں ہے البتہ حج اور عمرہ دونوں میں حلق یا تقصیر کا حرم شریف میں ہونا ضروری ہے۔ ہدایہ اور فتاویٰ شامی میں ہے:

''التقصير والحلق فی العمرة غير موقت بالزمان بالاجماع فان لم يقصر حتی رجع و قصر فلا شیئی عليه فی قولهم جميعا معناه اذا خرج المعتمر ثم عاد. وفی الفتاویٰ الشامية تحت قول الدر لاختصاص الحلق بالحرم ای لهما بالحرم''. (ہدایہ مع فتح القدیر ج ۳ ص ۶۴، فتاویٰ شامی ج ۳ ص ۵۱۹)

یعنی عمرہ میں حلق اور تقصیر کے لیے بالاتفاق کوئی وقت خاص نہیں ہے' لہٰذا اگر عمرہ کرنے والے نے تقصیر نہ کرائی ہو اور وہ حرم سے نکل جائے اور پھر دوبارہ آ کر تقصیر کرا لے تو اس پر کچھ لازم نہیں ہے۔ اس پر بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ اور فتاوی شامی میں ہے کہ حج اور عمرہ دونوں میں حلق کا حرم میں ہونا ضروری ہے۔

ہدایہ اور شامی کی عبارت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عمرہ میں حلق کے لیے وقت کی کوئی تخصیص نہیں ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ جب عمرہ کرنے والا اپنے عمرہ کے لیے حلق یا تقصیر کرنا چاہے تو حرم ہی میں کرے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: عمرہ کا حلق بھی حرم ہی میں ہونا ضرور ہے۔ اس کا حلق بھی حرم سے باہر ہوا تو دم ہے مگر اس میں وقت کی شرط نہیں ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۶ ص ۷۹)

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ جب کوئی شخص عمرہ میں حلق یا تقصیر چھوڑ دے اور دوسرا عمرہ ادا کرے (یعنی اس کا احرام باندھ لے) تو اس پر دم (بکری یا بھیڑ کی قربانی) لازم ہے' کیونکہ عمرہ میں دوسرا احرام اسی وقت باندھا جاسکتا ہے جب پہلے کے لیے حلق یا تقصیر کرالی جائے۔ ہدایہ' فتح القدیر' عنایہ اور فتاوی شامی وغیرہ میں ہے:

"من فرغ من عمرته الا التقصير فا حرم باخرى فعليه دم لاحرامه قبل الوقت لان وقته بعد الحلق الاول وفي تنوير الابصار: ومن اتى بعمرة الا الحلق فاحرم باخرى ذبح"۔

(ہدایہ مع فتح القدیر والعنایہ ج ۳ ص ۱۲۰' تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۳ ص ۵۵۷)

یعنی جس شخص نے عمرہ ادا کیا اور تقصیر نہیں کروائی اور دوسرے عمرے کا احرام باندھ لیا تو اس پر دم دینا لازم ہے کیونکہ اس نے وقت سے پہلے احرام باندھا یعنی پہلے عمرہ کا حلق کیے بغیر دوسرے عمرہ کا احرام باندھا۔ اور تنویر الابصار میں ہے کہ جس شخص نے عمرہ ادا کیا اور حلق نہیں کروایا اور دوسرے عمرہ کا احرام باندھ لیا تو وہ دم دے۔

ہدایہ' عنایہ اور شامی وغیرہ سے ذکر کردہ عبارات کی روشنی میں سائل کے سوال کا حل یہ ہے کہ چونکہ عمرہ میں حلق یا تقصیر کے لیے وقت کی کوئی تخصیص نہیں ہے لہٰذا زید حرم شریف میں جا کر حلق یا تقصیر کروا لے کہ یہ عمرے کے واجبات میں سے ہے۔ اور حلق یا تقصیر کے بغیر جو

عمرے ادا کیے ان کی تعداد کی مناسبت سے حرم میں دم دے۔ فتاوی شامی میں ہے کہ دم خواہ شکرانہ کا ہو یا جرم کا اس کو حرم میں دینا ضروری ہے۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

عورت کا حج یا عمرہ کے لیے محرم کے بغیر سفر کرنا

سوال:

ایک بیوہ عورت عمرے کے لیے جانا چاہتی ہے اس کا ایک شادی شدہ لڑکا ہے لیکن چونکہ وہ بیروزگار ہے اس لیے وہ ان کے ساتھ نہیں جاسکتا وہ عورت اکیلے عمرے پر جاسکتی ہے؟ یا جو عمرہ گروپ وغیرہ جاتے ہیں ان کے ساتھ جاسکتی ہے؟ یا کوئی اور صورت ممکن ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

[سائل: محمد لیئق احمد قادری، شاہ فیصل کالونی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی عورت بغیر محرم یا شوہر کے تین دن سے زیادہ کی مسافت کا سفر نہیں کرسکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لا یحل لامرءۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر ان تسافر ثلاثۃ لیال الا ومعھا ذو رحم وفی روایۃ ابی سعید ان تسافر سفرا یکون ثلاث لیال فصاعدا الا ومعھا ابوھا او ابنھا او زوجھا او اخوھا او ذو رحم محرم"۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۳)

جو عورت اللہ عزوجل اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ تین راتوں کی مسافت کا سفر بغیر محرم کے کرے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے لیے اس کے باپ، بیٹے، بھائی، شوہر یا کسی اور محرم کے بغیر تین رات یا اس سے زیادہ کی مسافت کا سفر جائز نہیں ہے۔

اس حدیث کی بنیاد پر تمام فقہاء نے کہا ہے کہ کوئی بھی عورت جس کا شوہر اور محرم نہ ہو وہ تین دن کی مسافت پر نہیں جاسکتی۔ حتی کہ اپنے ان رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہیں جاسکتی جو

اس کے لیے غیر محرم ہوں۔ (فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۲۹۹، شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۶۵۴)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ عورت کو مکہ تک جانے میں تین دن یا زیادہ کا راستہ ہو تو اس کے ہمراہ شوہر یا محرم کا ہونا شرط ہے خواہ وہ عورت جوان ہو یا بڑھیا۔ (بہارِ شریعت حصہ ۶ ص ۱۰)

لہٰذا سوال مذکور میں بیوہ عورت بغیر محرم کے کسی بھی طرح عمرے پر نہیں جا سکتی۔ یہ سخت آزمائش اور امتحان ہے اور اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کی رضا اسی میں ہے کہ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ تین دن کی مسافت کا سفر عورت کیلیے بغیر شوہر یا محرم کے جائز نہیں ہے۔ اگر جائے گی تو ثواب کے بدلہ ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔ (فتاویٰ رضویہ مع تخریج ج ۱۱ ص ۷۰۴، ۷۰۷)

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی قادیانی شخص کی رقم کو حج فنڈ میں شامل کرنا

سوال:

عرض یہ ہے کہ سوئی سدرن گیس کمپنی کے افسران اپنی مرضی سے ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے نام پر اپنی تنخواہ سے کٹواتے ہیں۔ ہر سال حج کی قرعہ اندازی ہوتی ہے اور جس خوش نصیب کا نام قرعہ میں نکل آئے، اسے اس حج فنڈ سے حج پر بھیجا جاتا ہے۔

اس مرتبہ ایک ایسے افسر کا نام نکل آیا ہے جو قادیانی ہے اور ہر ماہ ایک مقررہ رقم حج کنٹری بیوشن کے لیے اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے (اور اس بارے میں ہمیں پہلے علم نہ تھا)۔

اس بارے میں شریعت اور قانون کیا کہتا ہے؟ کیا اس شخص کو حج کے لیے بھیج سکتے ہیں؟
کیا سعودی یا پاکستانی حکومت کی طرف سے ان کے حج کرنے پر کوئی قانونی پابندی ہے؟

کیا اس شخص کی رقم حج فنڈ میں شامل کی جا سکتی ہے؟

برائے مہربانی مسئلے کے حل کی جانب رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقعہ عنایت فرمائیں۔

[سائل: اشفاق احمد، سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ، ہیڈ آفس سرشاہ محمد سلیمان روڈ، گلشن اقبال، کراچی]

جواب:

قادیانی شرعاً اور قانوناً دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری نبی اور رسول ہونا اُمتِ مسلمہ کا متفقہ اور قطعی حتمی لازمی عقیدہ ہے۔ جو کہ قرآن وسنت کے بے شمار دلائل سے ثابت ہے۔ قادیانی فرقہ چونکہ اس عقیدہ سے منحرف ہے اس لیے قرآن و سنت کی رُو سے اُس پر کفر کا حکم ہے اور پاکستانی قانون کی رُو سے بھی یہ غیر مسلم ہے۔ سعودیہ عربیہ کے قانون کے مطابق ان کے لیے حج کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو حج کے لیے بھیجنا یا اُس سے کسی قسم کا تعاون حاصل کرنا، یا اُس کی رقم کو حج فنڈ میں شامل کرنا شرعاً حرام، حرام اور اشد حرام ہے۔ ایسے شخص کی رقم اُسے واپس کی جائے اور قرعہ اندازی سے بالکل خارج کیا جائے۔ بلکہ آئندہ جملہ دینی اور شرعی معاملات میں سخت احتیاط برتی جائے اور غیر مسلمین کو کسی صورت داخل نہ ہونے دیا جائے۔ دینی اور شرعی معاملات میں شمولیت کے صرف وہی افراد حق دار ہیں جو مسلمان اور صاحب ایمان ہوں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قربانی کا نصاب

سوال:

ایک بیوہ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ان کے ساتھ رہتے ہیں اور تینوں بچے اپنی اپنی روزی کما کر اپنی ماں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خانہ داری کا انتظام ماں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ بیوہ کو گورنمنٹ کے طرف سے کبھی کبھی زکوۃ کے پیسے بھی مل جاتے ہیں۔ تینوں بچوں کی خواہش ہے کہ اس سال قربانی میں ایک حصہ لیں اور گھر کے سربراہ کے حیثیت سے اپنی ماں کے نام پر قربانی کریں۔

کیا ماں صاحب نصاب ہو سکتی ہے؟ یا پھر ان چاروں میں صاحب نصاب کون ہے؟ اور کیا یہ قربانی کر سکتے ہیں؟ [سائل: محمد تنویر، مجید کالونی، لانڈھی]

جواب:

قربانی اور زکوۃ کے لیے صاحب نصاب ہونے میں فرق ہے۔ زکوۃ کے لیے صاحب نصاب ہونے کا مطلب تو یہ ہے آدمی کے پاس اپنی ضروریات سے زائد ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ان کی مقدار مالیت ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو زکوۃ واجب ہوتی ہے جب کہ قربانی کا معاملہ صدقہ فطر کی طرح ہے۔ یعنی جس کے پاس قربانی کے دنوں میں کسی بھی وقت اتنی رقم ہو جو نصاب تک پہنچ جائے تو اس پر قربانی واجب ہوتی ہے۔ مال پر سال گزرنا اس میں شرط نہیں ہے۔

عالمگیری میں ہے:

''**واما شرائط الوجوب منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكوة ......والموسر في ظاهر الرواية من له مأتا درهم او عشرون دينارا او شئ يبلغ ذالك سوى مسكنه ومتاع مسكنه و مركوبه وخادمه في حاجته التي لا يستغني عنها**''. (فتاوی عالمگیری ج ۵ ص ۲۹۲)

یعنی قربانی واجب ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط اتنا مالدار ہونا ہے جس سے کہ صدقہ فطر واجب ہو جاتا ہے' نہ یہ مراد کہ جس سے زکوۃ واجب ہو۔ اور ظاہر الروایۃ کے مطابق (اس باب میں) غنی وہ ہے جو ضروریات زندگی (مکان' اس کا ساز و سامان' سواری' خادم اور پہننے کے کپڑے وغیرہ) سے زائد دو سو درہم (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی) یا بیس دینار (یعنی ساڑھے سات تولہ سونا) یا اس مالیت کی کوئی چیز رکھتا ہو۔

اسی طرح ملتقی الابحر میں ہے: ''**هي واجبة على الحر المسلم المالك لنصاب فاضل عن حوائجه الاصلية وان لم يكنناميا وبه تحرم الصدقة وتجب الاضحية**''۔ (ملتقی الابحر علی حاشی مجمع الانہر باب صدقۃ الفطر ج ا ص ۳۳۴)

تفصیل مذکور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قربانی اس شخص پر واجب ہوتی ہے جو ضروریات زندگی سے زائد حسب نصاب مال کا مالک ہو' خواہ ایام قربانی (۱۰'۱۱'۱۲ ذی الحجہ) ہی میں یہ نصاب حاصل ہو۔ ''مالک نصاب'' کی اس تشریح کے مطابق سوال مذکور میں: جتنے بالغ افراد بھی صاحب نصاب ہیں (خواہ سب ہوں یا کوئی ایک) ان پر اپنی جانب سے

قربانی کرنا واجب ہے۔ اگر مزید استطاعت ہو تو اپنا واجب ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی اور کی جانب سے بھی قربانی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ خود رسول اکرم ﷺ کا عمل احادیث کریمہ سے ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ قربانی کا ارادہ فرماتے تو دو مینڈھے ذبح فرماتے "فذبح احدھما عن امتہ لمن شھد اللہ بالتوحید وشھد لہ بالبلاغ وذبح الاخر عن محمد وعن آل محمد ﷺ۔ (ابن ماجہ ص ۲۲۶-۲۲۵) وفی روایۃ "ان رسول اللہ ﷺ ضحی بکبشین احدھما عن نفسہ والاخر عمن لم یذبح من امتہ"۔ (اخرجہ الحاکم فی المستدرک ج ۲ ص ۳۹۱) ان دو مینڈھوں میں سے ایک اپنی جانب سے اور ایک اپنی امت کے ان افراد کی جانب سے ذبح فرماتے جو قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے' ایک روایت کے مطابق ایک مینڈھا اپنی امت کی جانب سے اور ایک اپنی اور ایک اپنی آل کی جانب سے ذبح فرماتے۔

سوال مذکور میں یہ بات بھی مرقوم ہے کہ بیوہ کو گورنمنٹ کی طرف سے کبھی کبھی زکوۃ کے پیسے بھی ملتے ہیں۔ اس حوالہ سے یہ بات واضح رہے کہ خاتون کو اس کی اولاد کی جانب سے جو رقم ملتی ہے وہ اگر اس اعتبار سے ہے کہ والدہ چونکہ سرپرست ہے لہٰذا یہ رقم ان کے پاس امانتاً رہے گی نہ کہ بطور ملکیت' نیز کوئی اور ذریعہ بھی نہیں ہے جس سے والدہ کو بقدر نصاب ذاتی ملکیت کی رقم مل جاتی ہو تو والدہ کا زکوۃ لینا درست ہے اور اگر بچے اپنی والدہ کو اپنی کمائی کا مالک بنا دیتے ہیں اور وہ کم از کم بقدر نصاب ہو تو والدہ کا زکوۃ لینا درست نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

خصّی جانور کی قربانی کرنے کا شرعی حکم

سوال:

خصی جانور کی قربانی جائز ہے یا ناجائز؟ کیونکہ زید یہ کہتا ہے کہ خصی کرنا جانور کے لیے عیب ہے اور عیب دار کی قربانی جائز نہیں۔ نیز یہ کہتا ہے کہ خصی جانور کی قربانی کہیں سے بھی ثابت نہیں۔ براہ مہربانی شریعت کی رو سے جواب مرحمت فرمائیں۔

[سائل: محمد یوسف قادری' ملیر]

جواب:

"عن جابر بن عبد الله ذبح النبی ﷺ یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین"۔(الی آخر الحدیث) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قربانی کے روز سینگوں والے دو چتکبرے خصی مینڈھے ذبح فرمائے۔(سنن ابوداؤد: ۲۷۹۵، سنن ابن ماجہ: ۳۱۲۲، سنن بیہقی: ۱۹۰۸۷، ج۹ ص ۲۷۳)

بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۸۷ میں درمختار، ردالمحتار اور عالمگیری کے حوالے سے مذکور ہے کہ: خصی جانور یعنی جس کے خصیے نکال دیے گئے ہوں یا مجبوب یعنی جس کے خصیے اور عضو تناسل سب کاٹ لیے گئے ہوں ان کی قربانی جائز ہے۔

(درمختار ج۹ ص ۳۹۱، فتاوی عالمگیری ج ۵ ص ۲۹۲، بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۸۷)

کتب احادیث میں جانوروں کے عیوب گنوائے گئے ہیں اور ان میں خصی ہونا کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا اگر یہ عیب ہوتا تو ضرور مذکور ہوتا۔ جب کہ اس کے برخلاف احادیث میں خصی جانور کی قربانی کا ذکر آیا ہے جیسا کہ اوپر حدیث میں مذکور ہوا۔ نیز عرف میں عیب اس کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے جانور کی قیمت کم ہو جائے۔(القاموس الفقہی ص ۲۶۸، التعریفات ص ۱۱۳) اور سب جانتے ہیں کہ خصی جانور کی قیمت بڑھ جاتی ہے نہ کہ کم۔ لہٰذا عرف کے اعتبار سے بھی یہ عیب نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

خنثیٰ جانور کی قربانی کا حکم

سوال:

ایک حلال جانور جو کہ تذکیر و تانیث دونوں کی خصوصیت رکھتا ہے۔ آیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی فقہ حنفی کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔[سائل: محمد جمال الدین، اورنگی ٹاؤن کراچی]

جواب:

پوچھے گئے مسئلہ میں خنثیٰ جانور کی قربانی ناجائز ہے۔ ایسے جانور جن کی قربانی کسی عیب کی وجہ سے ناجائز ہے ان کو بہار شریعت میں مصنف علیہ الرحمۃ نے بیان کرتے ہوئے

درمختار کے حوالہ سے یہ مسئلہ بیان فرمایا: جس کے دانت نہ ہوں یا جس کے تھن کٹے ہوں یا خشک ہوں اس کی قربانی ناجائز ہے' بکری میں ایک کا خشک ہونا ناجائز ہونے کے لیے کافی ہے اور گائے بھینس میں دو خشک ہوں تو ناجائز ہے۔ جس کی ناک کٹی ہو یا علاج کے ذریعے اس کا دودھ خشک کر دیا ہو۔ اور خنثیٰ جانور یعنی جس میں نر و مادہ دونوں کی علامتیں ہوں اور جلالہ جو صرف غلیظ کھاتا ہو ان سب کی قربانی ناجائز ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۸۷)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قربانی کرنے کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کرنا

سوال:

میں نے قربانی کرنے کے لیے پیسے رکھے تھے' مگر ایک ضرورت مند ہے جس کو پیسوں کی اشد ضرورت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ رقم میں اس کو دے دوں اور قربانی نہ کروں' آیا ایسا کرنے سے مجھے قربانی کا ثواب ملے گا یا نہیں اور میری قربانی ہو جائے گی یا نہیں؟

[سائل: محمد مسعود' گلشن اقبال]

جواب:

قربانی کا ثواب اور اس کی فضیلت' شرعاً اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ جانور کو ذبح کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**ماعمل ابن 'ادم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم**" ابن آدم کا کوئی عمل قربانی والے دن جانور کا خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ (ترمذی' ابن ماجہ' مشکوٰۃ ص ۱۲۸)

بہار شریعت میں صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ایام نحر میں قربانی کرنا اتنی قیمت کے صدقہ کرنے سے افضل ہے' کیونکہ قربانی واجب ہے یا سنت اور صدقہ تطوع محض (نفل) ہے لہٰذا قربانی افضل ہوئی۔ (بہار شریعت بحوالہ عالمگیری حصہ ۱۵ ص ۹۲) یہ گفتگو اس صورت میں ہے جب کہ قربانی کے دنوں میں کوئی شخص جانور ذبح کرنے کے بجائے قیمت صدقہ کرے' تو جو شخص ایام قربانی سے پہلے یا بعد قیمت کو صدقہ کرے وہ بدرجہ اولیٰ اس فضیلت اور ثواب کو نہیں پائے گا جو قربانی کرنے میں ہے اور نہ ہی اس طرح کرنے سے شرعاً قربانی ہو گی۔ لہٰذا

اگر سائل قربانی کی رقم کسی ضرورت مند کو دینا چاہتا ہے اور قربانی کا اجر و ثواب بھی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قربانی کے دنوں میں گائے یا اونٹ کے ایک حصہ کی قربانی کرلے کہ شرعاً جانور خریدنا ضروری نہیں ہے بلکہ ایک حصہ واجب ہے بشرطیکہ قربانی کے دنوں میں اس کی طاقت اور استطاعت رکھتا ہو۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

قربانی کے جانور کے متعلق چند ضروری احکامات

سوال:

(۱) قربانی کے جانور کے دانتوں کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے اس لیے کہ میں نے ایک بکرا خریدا ہے جس کے دانت مکمل نہیں، اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

(۲) قربانی کے جانور مثلاً بکرا، گائے اور اونٹ کے لیے شرع نے کیا عمر متعین کی ہے؟

(۳) قربانی کے جانور میں اگر آدمی کو عیب کا پتا چلے تو وہ کیا کرے؟

[سائل: محمد احمر، شاہ فیصل کالونی]

جواب:

(۱) جانور کے دانت اگر اس قدر ہوں کہ چارہ کھا سکتا ہو تو قربانی جائز ہے اور چارہ نہ کھا سکتا ہو تو قربانی جائز نہیں۔ اور جس جانور کے دانت سرے سے ہی نہ ہوں تو بدرجہ اولیٰ قربانی جائز نہ ہوگی خواہ وہ چارہ کھا سکتا ہو یا نہ کھا سکتا ہو۔ چنانچہ امام فخر الدین حسن بن منصور حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"والتی لا اسنان لها وهي تعتلف ولا تعتلف لا يجوز وان بقی لها بعض الاسنان ان بقی من الاسنان قدر ما تعتلف جاز والا فلا"۔

(فتاوی قاضی خان آخرین ص ۳۳۴)

یعنی اگر اتنے دانت ہوں کہ چارہ کھا سکے تو قربانی کرنا جائز ہے ورنہ نہیں اور جس جانور کے دانت ہی نہ ہوں خواہ وہ چارہ کھا سکے یا نہ کھا سکے اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔

(۲) شریعت مطہرہ نے قربانی کے لیے جانوروں کی عمریں متعین کی ہیں جن سے کم میں قربانی جائز نہ ہوگی۔ چنانچہ امام فخر الدین حسن بن منصور حنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

”فلا یجوز من الابل والبقر والمعز الا الثنی والثنی من الابل ما اتی علیه خمس سنین وطعن فی السنة السادسة والثنی من البقر ما اتی علیه سنتان وطعن فی الثالثة والثنی من الغنم والمعز ما تمت له سنة وطعن فی الثانیة ولا یجوز الجذعان الا الجذع العظیم من الضان وهو عند الفقهاء الذی اتی علیه اکثر السنة ستة اشهر وشیء من الشهر السابع فیجوز اذا کان عظیما سمینا بحیث لو راٰه انسان یحسبه ثنیاً“. (فتاویٰ قاضی خان آخرین ص ۳۳۱)

یعنی اونٹ پانچ سال مکمل کر کے چھٹے سال میں داخل ہو چکا ہو گائے دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو اور بکرا اور دنبہ ایک سال مکمل کر کے دوسرے سال میں داخل ہو چکے ہوں۔ البتہ دنبہ اور بھیڑ چھ ماہ مکمل کر کے ساتویں ماہ میں داخل ہوں اور دیکھنے میں موٹے تازے سال بھر کے معلوم ہوں تو ان کی قربانی بھی جائز ہے۔

(۳) عیب دار جانور کے عیب کا جب پتہ چلے تو اسے اختیار ہے چاہے تو اس جانور کو رکھ لے چاہے تو واپس کر کے اپنی قیمت وصول کر لے۔ چنانچہ علامہ علی بن ابی بکر فرغانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ رقمطراز ہیں: ”واذا اطلع المشتری علی عیب فی المبیع فهو بالخیار ان شاء اخذه بجمیع الثمن وان شاء رده“ جب خریدنے والے کو خریدی ہوئی چیز میں عیب کا پتا چلے تو اسے اختیار ہے چاہے تو عیب دار چیز کو رکھ لے چاہے تو لوٹا دے۔ (ہدایہ اخیرین ص ۴۰) لہٰذا قربانی کے جانور میں عیب پر مطلع ہونے کی صورت میں آدمی کو چاہیے کہ اسے واپس لوٹا دے یا پھر اس کا عیب ظاہر کر کے فروخت کر کے دوسرا جانور اتنی ہی قیمت یا زیادہ کا خرید کر قربانی کرے۔

واللہ ورسوله اعلم بالصواب

قربانی کے لیے خریدا جانے والا جانور اگر قربانی سے پہلے ہی مر جائے تو......

سوال:

میرے ایک جاننے والے نے قربانی کی نیت سے ایک بکرا پالا تھا۔ اور دل و جان سے

اس کی خدمت کرتا تھا۔ایک دن اچانک قربانی سے کچھ عرصہ قبل بکرا مر جاتا ہے تو کیا اس کو پھر سے قربانی کرنی ضروری ہے جب کہ وہ نہ تو پہلے صاحب استطاعت تھا نہ اب صاحب استطاعت ہے۔مگر اسے شوق تھا کہ اللہ کے دربار میں قربانی پیش کرے۔لوگوں کا کہنا ہے کہ کیونکہ اس نے قربانی کی نیت سے جانور پالا تھا لہٰذا اس کے باوجود کہ قربانی سے پہلے ہی مر گیا مگر اس کی قربانی ہوگئی۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا ہے۔جب کہ وہ کہتا ہے کہ اس طرح سے بھی کوئی قربانی ہوتی ہے؟اگر کوئی نماز کی نیت کر لے اور نماز نہ پڑھ سکے تو اس کی نماز ہوگئی؟ایسا نہیں ہو سکتا۔اس طرح تو ہر مسلمان نیت کرتا ہے کسی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکے تو کیا نمازیں قبول ہوتی رہیں گی؟کیونکہ اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا ہے۔برائے مہربانی اس مسئلہ کا تفصیل سے جواب دیں تا کہ وہ شخص دلائل کے ذریعہ مطمئن ہو سکے۔کیا اس پر پھر سے قربانی واجب ہے کہ وہ نیت کر چکا ہے۔[سائل:محمد عبدالصمد،پشاور]

جواب:

مسئلہ شرعیہ یہ ہے کہ جو شخص قربانی کی نیت سے جانور خریدے پھر وہ جانور قربانی کا دن آنے سے پہلے چوری ہو جائے یا مر جائے تو قربانی کا دن آنے پر دوسرا جانور ذبح کرنا لازم نہیں ہوتا' جب کہ وہ صاحب استطاعت نہ ہو۔اور پہلا جانور (جو چوری ہو گیا یا مر گیا) وہ قربانی میں شمار نہیں ہوتا۔البتہ حسن نیت پر اجر وثواب کی امید رکھنی چاہیے۔ہاں جس شخص کا جانور چوری ہو جائے یا مر جائے اور قربانی کے دنوں میں وہ شخص صاحب استطاعت ہو تو اس پر دوسرے جانور کی قربانی (یعنی کم از کم ایک واجب حصہ) لازم ہے۔صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں کہ:قربانی کا جانور مر گیا تو غنی پر لازم ہے کہ دوسرے جانور کی قربانی کرے اور فقیر (جو صاحب استطاعت نہ ہو) کے ذمہ دوسرا جانور واجب نہیں۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:''مالک نصاب نے قربانی کے لیے بکری خریدی تھی وہ گم ہوگئی اور اس شخص کا مال نصاب سے کم ہو گیا اب قربانی کا دن آیا تو اس پر یہ ضروری نہیں کہ دوسرا جانور خرید کر قربانی کرے''۔(بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۸۳)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قربانی میں جنگلی جانور ذبح کرنے کا حکم

سوال:

قربانی کے لیے صرف حلال جانور ہونا کافی ہے یا پالتو ہونا بھی ضروری ہے؟ مثلاً ہرن' نیل گائے' وغیرہ کی قربانی کا کیا حکم ہوگا۔؟ [سائل: قاری محمد حامد علی ناصر' لانڈھی]

جواب:

قربانی کے لیے جانور کے حلال ہونے کے ساتھ ساتھ مستأنس (پالتو ہونا) بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ جنگلی جانور (ہرن' نیل گائے وغیرہ) قربانی میں جائز نہیں ہے۔

''ولا یجوز فی الاضاحی شئی من الوحشی''۔

(فتاوی عالمگیری ج ۵ ص ۲۹۷' بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۱۶)

بہار شریعت میں ہے: وحشی جانور جیسے نیل گائے اور ہرن' ان کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ (حصہ ۱۵ ص ۸۶) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حلال جانور کے وہ اعضاء جن کو کھانا حرام ہے

سوال:

حلال جانور میں جو اعضاء حرام ہیں وہ کون سے ہیں؟ بیان فرمادیجئے۔

[سائل: شمس الدین' کراچی]

جواب:

امام عبدالرزاق' امام ابوداؤد اور امام بیہقی کی روایت کے مطابق ذبح شدہ حلال جانور کے سات اجزاء کا کھانا حرام ہے:

(۱) بہنے والا خون (۲) آلہ تناسل (۳) کپورے (۴) پیشاب پاخانہ کا مقام (۵) غدودیں (۶) مثانہ (۷) پتہ

(مصنف عبدالرزاق ج ۴ ص ۵۳۵' مراسیل ابوداؤد ص ۱۹' سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۷)

کلیجی، دل، گردہ اور تلی کھانا جائز ہے۔ علاوہ ازیں سری پائے کے بال جلا کر کھال سمیت پکا کر کھایا جاتا ہے اس میں بھی شرعاً حرج نہیں ہے۔ اوجھڑی کو بعض علماء نے مکروہِ تحریمی اور بعض نے مکروہِ تنزیہی قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔

(وقار الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۱۴۔ ۲۶۳۔ ۲۴۸) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قربانی کے گوشت پر فاتحہ پڑھنے کا شرعی حکم

سوال:

زید کے نانا کی برسی عید الاضحیٰ کے ایک ہفتہ بعد آئی۔ اس کے گھر پر قربانی کا جو گوشت رکھا تھا اسی پر فاتحہ دلوائی۔ آیا اس طرح ایصال ثواب درست ہوا یا نہیں؟

[سائل: محمد معراج قادری، اورنگی ٹاؤن]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ ایصال ثواب ہر اس حلال چیز کے ذریعہ جائز ہے جو آدمی کی اپنی ملکیت میں ہو۔ قربانی کا گوشت جب کسی کی ملکیت میں آجائے تو وہ اس کے ساتھ ہر جائز عمل کر سکتا ہے چاہے تو کھلا دے اور چاہے تو اس پر فاتحہ پڑھے اور ایصال ثواب کرے۔ مفتی محمد وقار الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ: قربانی کرنے کے بعد گوشت قربانی کرنے والے کی ملکیت ہوتا ہے۔ مستحب یہ ہے کہ ایک تہائی غرباء میں اور ایک تہائی رشتہ داروں میں تقسیم کریں اور ایک تہائی خود اپنے لیے رکھیں۔ اگر سب گوشت پر بھی کسی کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ دلا دیں تو بھی جائز ہے۔ (وقار الفتاوی ج ۲ ص ۴۷۷)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جو دنبہ جنت سے اتارا گیا اس کی تفصیلات

سوال:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جو دنبہ جنت سے لایا گیا، اس کا گوشت کہاں گیا اور

کیسے تقسیم کیا گیا؟ کتاب کا حوالہ بھی تحریر کریں۔[سائل: محمد گل فراز بڑا بورڈ' کراچی]

جواب:

حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں جو دنبہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ذبح فرمایا تھا' وہ کہاں سے آیا تھا؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ دنبہ جنت سے اتارا گیا تھا۔ جیسا کہ تفسیر خازن' تفسیر بغوی اور دیگر تفاسیر میں موجود ہے۔ (خازن ج ۴ ص ۳۹) رہا یہ سوال کہ اس دنبہ کا گوشت کہاں گیا یا کیسے تقسیم ہوا؟ تو اس حوالہ سے علامہ صاوی مالکی اور سید سلیمان جمل کی رائے یہ ہے کہ وہ دنبہ چونکہ جنت سے اتارا گیا تھا اور جنت کی اشیاء پر آگ اثر نہیں کرتی اس لیے اس کا گوشت پکایا نہیں گیا نہ ہی اسے تقسیم کیا گیا' بلکہ اس کے اجزاء کو پرندوں اور درندوں نے کھالیا۔ علامہ صاوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''مابقی من الکبش اکلته السباع والطیور لان النار لا تؤثر فیما هو من الجنة'' اس دنبہ کے بچے ہوئے اجزاء کو درندوں اور پرندوں نے کھالیا' کیونکہ جنت کی اشیاء پر آگ اثر نہیں کرتی۔ اور علامہ سید سلیمان جمل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ومن المعلوم المقرران کل ماهو من الجنة لاتؤثر فیه النار فلم یطبخ لحم الکبش بل اکلته السباع والطیور'' یہ بات ثابت ہے کہ جنت کی کسی بھی چیز پر آگ اثر نہیں کرتی' اس لیے اس دنبہ کا گوشت پکایا نہیں گیا بلکہ اسے درندوں اور پرندوں نے کھالیا۔

(حاشیۃ الجمل علی الجلالین ج ۳ ص ۵۴۹) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قربانی میں عقیقہ شامل کرنے کا حکم

سوال:

گائے کی قربانی میں عقیقہ کا حصہ شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

[سائل: محمد شاہنواز' خداداد کالونی]

جواب:

قربانی کے تمام حصوں میں نیت تقرب (عبادت کی نیت) ضروری ہے۔ خواہ وہ عبادت واجبہ ہو یا غیر واجبہ۔ اس بنیاد پر قربانی میں عقیقہ کا حصہ شامل کرنا بھی جائز ہے کیونکہ عقیقہ بھی

ایک تقرب ہے' حتیٰ کہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ قربانی کے حصہ میں ولیمہ کرنے کی نیت سے شامل ہونا بھی جائز ہے۔ چنانچہ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"و كذا لو اراد بعضهم العقيقة عن ولد قد ولد له من قبل لان ذالك جهة التقرب بالشكر على نعمة الولد ذكره محمد ولم يذكر الوليمة و ينبغي ان تجوز لانها تقام شكرا لله تعالى على نعمة النكاح و وردت بها السنة فاذا قصد بها الشكر او اقامة السنة فقد اراد القربة".

(فتاوی شامی ج۹ ص ۳۹۵' طبع جدید)

یعنی اگر شرکاء قربانی میں سے کوئی شخص عقیقہ کی نیت کرے تو بھی جائز ہے۔ کیونکہ یہ اولاد کی نعمت پر شکرانہ ہے اور شکرانہ ادا کرنا عبادت ہے۔ یہ مسئلہ امام محمد علیہ الرحمۃ نے ذکر فرمایا ہے' لیکن انہوں نے اس میں ولیمہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ (علامہ شامی فرماتے ہیں:) مناسب یہی ہے کہ قربانی میں اس کی نیت بھی جائز ہو۔ کیونکہ وہ نعمت نکاح کا شکرانہ ہے اور اس کا ادا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ لہٰذا جب آدمی نے ولیمہ کی نیت کر کے شکرانہ نکاح یا عمل بالسنۃ کا ارادہ کر لیا تو یقیناً اس نے عبادت انجام دی۔

حاصل یہ کہ قربانی کے جانور میں ہر اس عمل کی شمولیت جائز ہے جو از قبیل عبادت ہو۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ فتاوی شامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: قربانی کے سب شرکاء کی نیت تقرب ہو' اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا ارادہ گوشت نہ ہو اور یہ ضروری نہیں کہ وہ تقرب ایک ہی قسم کا ہو۔ مثلاً سب قربانی ہی کرنا چاہتے ہیں بلکہ اگر مختلف قسم کے تقرب ہوں' وہ تقرب سب پر واجب ہو یا کسی پر واجب ہو اور کسی پر واجب نہ ہو ہر صورت میں قربانی جائز ہے۔ اسی طرح قربانی اور عقیقہ کی بھی شرکت ہو سکتی ہے کہ عقیقہ بھی تقرب کی ایک صورت ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۹۵) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شیعہ اور اسماعیلی شخص کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے یا حرام؟

سوال:

اگر کوئی شیعہ اور اسماعیلی شخص جانور کو ذبح کرے اور کوئی صحیح العقیدہ مسلمان اس کو خبر

کیے بغیر تکبیر پڑھتا رہے تو کیا وہ ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔[سائل: حافظ نور عزیز احمد، چترال]

جواب:

جانور کے حلال ہونے کے لیے جو شرائط بیان کی گئی ہیں، اُن میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ بسم اللہ پڑھنا (خواہ حقیقتاً ہو یا حکماً) ذبح کرنے والے کی طرف سے پایا جائے۔ جیسا کہ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وفیھا تشترط التسمیۃ من الذابح'' ذبح کرنے والے کا بسم اللہ پڑھنا شرط ہے۔ علامہ شامی علیہ الرحمہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ''واحترز بہ عمّا لو سمّی لہٗ غیرہٗ فلا تحل'' یعنی اس قید سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر ذبح کرنے والا کوئی اور ہو اور بسم اللہ کوئی اور پڑھے تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ (فتاویٰ شامی ج۹ ص ۳۶۵، مطبوعہ بیروت)

حضرت صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: خود ذبح کرنے والے کو بسم اللہ کہنا ضروری ہے، دوسرے کا کہنا اس کے کہنے کے قائم مقام نہیں۔ یعنی دوسرے کے بسم اللہ پڑھنے سے جانور حلال نہ ہوگا جبکہ ذابح نے عمداً ترک کیا ہو۔

(بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۷۶)

یہ تمام بحث اُس صورت میں ہے جب ذبح کرنے والے کی اپنی تسمیہ شرعاً معتبر ہو اور پھر وہ قصداً چھوڑ دے تو دوسرے کا پڑھنا فائدہ نہ دے گا۔ لیکن اگر ذبح کرنے والے کی اپنی تسمیہ ہی معتبر نہ ہو (مثلاً وہ مرتد و بے دین ہو) تو دوسرے کا پڑھنا درکنار اُس کا اپنا پڑھنا بھی فائدہ نہیں دے گا۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت علیہ الرحمہ نے اہل تشیّع کو اسی حکم میں شامل کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: وہابی، رافضی، قادیانی وغیرہم جن جن کی گمراہی حدِ کفر تک ہے، اُن کا ذبیحہ مردار ہے۔ (مزید فرماتے ہیں:) اسماعیلی رافضی ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبیحہ مردار ہے اور ان کے یہاں کا گوشت پکا ہوا بھی حرام ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۲۰ ص ۲۵۰، مطبوعہ لاہور) لہٰذا ایسوں کے ذبح کیے ہوئے جانور کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کھالوں کی رقم سے امام و مؤذن کے لیے گھر تعمیر کرنے کا حکم

سوال:

قربانی کی کھالوں کے پیسوں سے مسجد کی انتظامیہ موذن کا مکان بنانا چاہتی ہے آیا یہ شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز؟ [سائل: انتظامیہ مسجد، کراچی]

جواب:

فقہائے احناف کی تصریحات کے مطابق قربانی کی کھال کا صدقہ کرنا مستحب ہے۔ اور صدقہ مستحبہ میں تملیک (کسی کو مالک بنانا) شرط نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کھال کا وہی حکم ہے جو گوشت کا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''یھب منھا مایشاء للغنی والفقیر'' قربانی میں سے غنی وفقیر سب کو دے سکتا ہے۔ لہٰذا قربانی کی کھال کو جس طرح مسجد کی تعمیر وغیرہ میں لگانا جائز اور درست ہے اسی طرح اس کی رقم سے مؤذن یا امام کا مکان بنانا بھی جائز ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے: بہار شریعت حصہ ۱۵، فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۴۸۸، فتاوی فیض الرسول ج ۲ ص ۴۷۳)

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کینیڈا میں پیدا ہونے والے بچے کا عقیقہ اگر پاکستان میں کیا جائے تو کس حساب سے؟

سوال:

کینیڈا میں ایک شخص کے ہاں ولادت ہوئی۔ اس کا عقیقہ اگر وہاں کیا جائے تو گوشت کی تقسیم میں مشکل پیش آتی ہے۔ کیونکہ اب وہاں مسلمانوں پر مختلف پابندیاں لگ رہی ہیں۔ ان ہی میں ایک پابندی یہ بھی ہے کہ گوشت کو تقسیم نہ کیا جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر ایسا ہو کہ اس بچہ کا پاکستان میں اس کے والد کی رقم سے عقیقہ کیا جائے۔ تو آیا یہ شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟ پھر چونکہ کینیڈا اور پاکستان میں دن اور رات کا فرق ہے اس لیے

بچہ کی پیدائش کا جب وہاں ساتواں دن ہوگا تو یہاں چھٹا دن ہوگا۔ اس صورت میں عقیقہ کے شرعی (مستحب) طریقہ پر عمل کرنے کے لیے آیا یہاں کے ساتویں دن کا اعتبار کیا جائے یا بچہ کی جہاں ولادت ہو وہاں کے ساتویں دن کا؟ [سائل: ندیم خان' کراچی]

جواب:

جس جگہ بچہ کی ولادت ہو وہاں عقیقہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ کسی بھی جگہ بچہ کی طرف سے عقیقہ کیا جاسکتا ہے۔ اور جہاں بچہ کی ولادت ہو وہاں کے اعتبار سے ساتویں دن عقیقہ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ولادت کے ساتویں دن بچہ کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے۔ (جامع ترمذی ص ۲۷۳' تبیان القرآن ج ۲ ص ۱۳۳) لہٰذا صورت مسئولہ میں کینیڈا میں بچہ کی ولادت کو جب ساتواں دن ہو تو پاکستان میں اس کی طرف سے عقیقہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ساتویں دن عقیقہ مستحب ہے' لازمی نہیں ہے۔ سہولت کے مطابق کسی اور دن بھی کرنا جائز ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کا اس کے چہرے کو دیکھنے اور اسے کندھا دینے کا حکم

سوال:

اگر کسی شخص کی اہلیہ کا انتقال ہو جائے' تو بعد از وصال اس شخص کا اپنے اہلیہ کے چہرے کو دیکھنا' تکفین' یا تدفین کے وقت جائز ہے یا نہیں؟ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ بیوی کے مرتے ہی نکاح ٹوٹ جاتا ہے سو بیوی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔ [سائل: حکیم اسرار الحق قریشی (ر) محکمہ بلدیات' سندھ]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ عورت مرجائے تو شوہر نہ تو اسے نہلا سکتا ہے' نہ چھو سکتا ہے۔ البتہ دیکھنا اس کو جائز ہے۔ علامہ علاؤ الدین حصکفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''ویمنع زوجھا من غسلھا ومسھا لا من النظر الیھا علی الاصح'' بیوی انتقال کر جائے تو

شوہر کا اس کو نہلانا بھی ممنوع اور اسے چھونا بھی ممنوع ہے' اور صحیح ترین قول کے مطابق دیکھنا ممنوع نہیں ہے۔ (درمختار ج ا ص ۵۷۵)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ شوہر عورت کے جنازے کو نہ کندھا دے سکتا ہے' نہ قبر میں اتار سکتا ہے' نہ منہ دیکھ سکتا ہے' یہ محض غلط ہے' صرف نہلانے اور بلا حائل ہاتھ لگانے کی ممانعت ہے۔

(بہار شریعت حصہ ۴ ص ۸۹ 'مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ لاہور)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد شوہر کو دیکھنے کی اجازت ہے' البتہ ہاتھ لگانا منع ہے۔ کما نص علیہ فی التنویر والدر وغیرھما۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۹ ص ۹ 'طبع جدید) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

معاملات

☆ نکاح ☆ طلاق
☆ عدت ☆ تجارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلا وجہ نکاح نہ کرنے کا شرعی حکم

سوال:

ایک مسلمان مرد تمام مذہبی فرائض کما حقہ انجام دیتا ہے۔ مگر کسی معاشی' معاشرتی یا گھریلو مجبوری کی وجہ سے نکاح نہیں کرتا۔ بلکہ پاکیزہ تجرد کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ نکاح سنت ہے' فرض نہیں پھر بھی کیا وہ شخص صحیح کرتا ہے؟ یا کوئی غلطی کر رہا ہے؟

[سائل: محمود' گلشن اقبال]

جواب:

شریعت مطہرہ کی رو سے نکاح کرنا ہر صورت میں سنت نہیں ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں سنت' بعض میں واجب' بعض میں فرض اور بعض حالات میں مکروہ یا حرام ہے۔ سائل نے جو صورت تحریر کی ہے اس کو فقہاء نے یوں بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ اور خوف ہو کہ نکاح کرنے کی صورت میں نان ونفقہ نہیں دے سکے گا۔ یا نکاح کے بعد جو بھی جائز ضروریات ہیں وہ ان کو پورا نہیں کر سکے گا۔ تو ایسی صورت میں نکاح کرنا مکروہ ہے۔ اور اگر ان باتوں کا محض خدشہ نہ ہو بلکہ یقین ہو کہ وہ نان ونفقہ اور دیگر ضروریات پوری نہ کر سکے گا تو نکاح کرنا حرام ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۷ ص ۵)

جہاں تک گھریلو مجبوری کا معاملہ ہے تو یہ کوئی ایسی وجہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر نکاح کو ترک کیا جائے' ہاں حالات سازگار ہونے تک مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قطعاً کنارہ کشی یقیناً ترک سنت ہے۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: اعتدال کی حالت میں یعنی نہ شہوت کا غلبہ ہو' نہ عنین (نامرد) ہو اور مہر ونفقہ پر قدرت بھی ہو تو نکاح سنتِ مؤکدہ ہے کہ نکاح نہ کرنے پر اڑا رہنا گناہ ہے۔ (ایضاً)

اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پاک سے ہوتی ہے کہ "النکاح من

سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی و تزوجوا فانی مکاثر بکم الامم"۔ نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت پر عمل نہیں کیا وہ میرے طریقہ پر نہیں ہے، نکاح کرو کیونکہ تمہاری وجہ سے میں (بروزِ قیامت) دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

(سنن ابن ماجہ:۱۸۴۶)

ایک اور مقام پر فرمایا: "یٰمعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوّج فانّہ اغض للبصر واحصن للفرج" اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہو، وہ نکاح کرے کیونکہ یہ نظر کو زیادہ نیچے رکھنے اور شرم گاہ کی زیادہ حفاظت کا ذریعہ ہے۔ (صحیح بخاری:۱۹۰۵، صحیح مسلم:۱۴۰۰)

ان احادیث مبارکہ کی رو سے نکاح کو ترک کرنا اور عام حالات میں نکاح کرنے کی بہ نسبت تجرّد کی زندگی کو ترجیح دینا بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی سنتِ سَنیّہ اور طریقۂ کاملہ سے محرومی اور باعث گناہ ہے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

شادی بیاہ کے موقع پر دولہا دولہن کو دی جانے والی رقوم وتحائف کا حکم

سوال:

بعض دیہاتوں میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ اگر کوئی امیر ہو یا غریب وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی میں جب لوگوں کو "دعوتِ طعام" دیتا ہے تو لوگ شادی میں شرکت کرتے ہیں بعد از طعام لوگ دولہا اور دولہن کو کچھ رقم دیتے ہیں اور ان کی یہ رقم ان کے نام کے ساتھ بطورِ یادداشت درج کی جاتی ہے۔ کیونکہ بعد میں یہ رقم دینے والوں کے بیٹے اور بیٹی کی شادی کے موقع پر کچھ زیادتی کے ساتھ واپس کرنا ہوتی ہے۔ اور مذکورہ رقم واپسی ادا نہ کرنے پر اظہار ناراضگی ہوتا ہے۔ برائے مہربانی شریعت کی رو سے جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

[سائل: محمد شکیل احمد قادری، مظفرآباد]

جواب:

جہاں ایک ہی قوم اور زبان کے لوگ برادری سسٹم کے تحت رہتے ہیں ان میں عموماً غمی اور خوشی کے مختلف مواقع پر اپنی اپنی امتیازی رسومات کو ادا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ شادی اور ولیمہ وغیرہ کے موقع پر باہم تحفے تحائف اور لفافوں کا تبادلہ برصغیر پاک وہند میں خصوصاً اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس رسم کی امتیازی بات یہ ہے کہ اس میں رقم وغیرہ کی ادائیگی کو ایک دوسرے پر قرض کی حیثیت حاصل ہے۔ لوگ باضابطہ طور پر ایک دوسرے کی رقم کو تحریری صورت میں محفوظ رکھتے ہیں اور پھر ادائیگی کے وقت اس کا بھرپور لحاظ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کمی بیشی کی صورت میں ایک دوسرے سے ناراضگی اور ملامت کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: ''رواج سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دینے والے یہ چیزیں بطورِ قرض دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے شادیوں میں اور ہر تقریب میں جب روپے دیئے جاتے ہیں تو ہر ایک شخص کا نام اور رقم تحریر کر لیتے ہیں، جب اس دینے والے کے یہاں تقریب ہوتی ہے تو یہ شخص جس کے یہاں دیا جا چکا ہے فہرست نکالتا ہے اور اتنے روپے ضرور دیتا ہے جو اس نے دیئے تھے اور اس کے خلاف کرنے میں سخت بدنامی ہوتی ہے اور موقع پا کر کہتے بھی ہیں کہ نیوتے کا روپیہ نہیں دیا۔ اگر یہ قرض نہ سمجھتے ہوتے تو ایسا عرف نہ ہوتا جو عموماً ہندوستان میں ہے''۔

(بہار شریعت حصہ ۱۴ ص ۵۵)

مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بعض جگہ جہاں برادری اور قومی سسٹم کے تحت لوگ رہتے ہیں ان میں غمی اور خوشی کے موقع پر دیئے جانے والے عطیات کو قرض سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ سائل نے بھی بعض دیہاتوں کے حوالے سے اس رسم کا تذکرہ کیا ہے۔ شرعی نقطہ نظر اس بارے میں یہ ہے کہ جہاں ان عطیات کو قرض کی حیثیت حاصل ہو اور نہ دینے پر اظہار ناراضگی یا ندامت ہوتی ہو وہاں اضافے کے ساتھ لوٹانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ایک حدیثِ موقوف کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی نے ہر ایسے قرض کو سود قرار دیا جس پر نفع حاصل کیا جائے۔ یعنی کسی کو قرض دیکر زیادہ وصول کیا جائے وہ سود ہے۔ (سنن بیہقی ج ۵ ص ۳۵۰)

ہاں اگر اضافے کے ساتھ لوٹانا ضروری نہ ہو بلکہ لوگ اپنی مرضی اور خوشی سے زیادہ دیں تو اس میں شرعاً حرج نہیں ہے۔ کیونکہ ایک حدیث کے مطابق ایسا شخص قابلِ تعریف ہے جو قرض کو (اپنی خوشی سے) اضافے کے ساتھ واپس کرے۔ (صحیح مسلم)

خلاصہ یہ ہے کہ جن برادریوں میں خوشی یا غمی کے عطیات کو قرض کی حیثیت حاصل ہو وہاں لوگوں کا اضافہ کی شرط عائد کرنا یا اضافے کے ساتھ نہ لوٹانے پر ملامت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی خواہش سے اضافے کے ساتھ واپس لوٹائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ رہے وہ علاقے یا مقامات جہاں ان عطیات کو قرض ہی شمار نہیں کیا جاتا بلکہ ہدایا اور تحائف سمجھا جاتا ہے وہاں اگر دوسرا شخص اضافہ کے ساتھ تحفہ کا جواب دے تو اس میں بھی شرعاً حرج نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر شوہر کا دوسرا نکاح کرنا

سوال:

(۱) اگر کوئی شخص پہلی بیوی سے اجازت لیے بغیر دوسرا نکاح کرلے تو شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ پہلی بیوی اپنی اجازت کو لازمی قرار دے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲) اگر پہلی بیوی شریعت کا فیصلہ ماننے سے انکار کردے اور شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(۳) اگر قانون کی رو سے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہو تو شریعت کی نظر میں ایسے قانون کا کیا حکم ہوگا؟ [سائل: صوفی عبدالقیوم' گلستان جوہر]

جواب:

شریعت مطہرہ کی رو سے کسی بھی صاحب استطاعت شخص کو بیک وقت چار نکاح کرنے کی اجازت اور حق حاصل ہے۔ اس پر قرآن مجید اور بے شمار احادیث مبارکہ شاہد ہیں۔ قرآن مجید کی کسی آیت یا نبی اکرم ﷺ کی کسی حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ دوسرے' تیسرے نکاح کے لیے شوہر کسی سے اجازت لینے کا پابند ہے۔ پہلی بیوی کی اجازت یا اس کے راضی ہونے کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو اخلاقی فریضہ کہا جاسکتا

ہے کہ شوہر پہلی بیوی کو اعتماد میں لیکر دوسرا نکاح کرے۔ لیکن اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو شرعاً اس پر گرفت نہیں ہے۔ شوہر کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اجازت ہی کافی ہے۔ قانون کی رو سے اگر پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے تو ہوسکتا ہے یہ فیصلہ کسی عائلی اور خانگی ضرورت اور تقاضے کے پیش نظر کیا گیا ہو ورنہ شرعی حکم سب سے اعلیٰ اور سب سے برتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''خلاف شرع حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، عمل صرف اسی حکم پر ہے جو شریعت کے مطابق ہو''۔ (صحیح بخاری: ۷۲۵۷، صحیح مسلم: ۱۸۴۰)

لہٰذا شوہر نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیا ہے تو شرعی نقطۂ نظر سے پہلی بیوی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پہلی بیوی شریعت کا فیصلہ ماننے سے انکار کر رہی ہے تو ایسی صورت میں اسے نکاح سے زیادہ اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ شریعت کے فیصلے کو رد کر دینا اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کرنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا باعث ہے۔ زیرِ بحث صورت میں عورت کا شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا قطعاً بے جا اور بے محل ہے۔ طلاق کا مطالبہ اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جب شوہر حقوق ادا نہ کرے اور تکالیف پہنچائے۔ محض دوسری شادی کر لینے پر عورت کا یہ احتجاج اور ناراضگی بالکل بے معنی اور فضول ہے، شوہر کی ذمہ داری یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کے قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے دونوں بیویوں کے حقوق کی منصفانہ ادائیگی کی کوشش کرے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کیا اسلام میں مردوں کو بیک وقت ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت ہے یا ممانعت؟

دین اسلام کے کئی ایسے مسائل جن پر ہمیشہ مسلمانوں کا اتفاق رہا ہے ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ''مرد کو بیک وقت ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت شرعاً حاصل ہے''۔ اس مسئلہ پر امت مسلمہ کا اتفاق ہی بطور ثبوت کافی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت خدانخواستہ کسی حرام اور ناجائز کو جائز کرنے پر متفق نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ صحیح حدیث

سے ثابت ہے کہ پوری امت مسلمہ گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔ (سنن ترمذی: ۲۱۶۷) اس لیے تمام علماء امت کا متفقہ طور پر یہ فرمانا کہ ''مرد بیک وقت ایک سے زائد نکاح کر سکتا ہے'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ برحق ہے اس کو چیلنج (Challange) نہیں کیا جا سکتا۔

گزشتہ دنوں ڈان اخبار میں Case against polygamy کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ جو کہ محترم فیض عیسیٰ (ایڈوکیٹ) کا تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد کو اپنے نکاح میں بیک وقت ایک سے زائد عورتیں رکھنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے ہاں اگر آدمی چاہے تو پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت ایسی منتخب کرے جو یتیم یا بیوہ ہو۔

مضمون نگار نے اپنے موقف پر قرآن مجید کی تقریباً دس آیات سے استدلال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک مضمون نگار کا استدلال قطعاً درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کو بیک وقت ایک سے زائد نکاح کرنے سے مطلقاً منع کیا گیا ہو۔ اگر کسی آیت سے ممانعت ثابت بھی ہوتی ہے تو وہ صرف اس صورت میں ہے جب کہ شوہر دونوں بیویوں کے نان و نفقہ اور لازمی اخراجات میں عدل (برابری) نہ کر سکتا ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شوہر کو دوسرا نکاح نہیں کرنا چاہیے۔

ہم نے اوپر ایک بات عرض کی کہ ''مضمون نگار نے جتنی آیات سے استدلال کیا ہے ان میں سے کسی آیت میں مردوں کو دوسرا نکاح کرنے سے مطلقاً منع نہیں کیا گیا'' ہماری یہ بات دراصل شریعت مطہرہ کے ایک قانون کی طرف اشارہ ہے۔ قانون یہ ہے کہ ''ممانعت بغیر کسی دلیل خصوصی کے ثابت نہیں ہوتی''۔ (فتاویٰ شامی، البحر الرائق)

یعنی کسی چیز کی ممانعت اس صورت میں ثابت ہوتی ہے جب اس کے بارے میں ممانعت کے الفاظ وارد ہوئے ہوں۔ مضمون نگار نے جو آیات مبارکہ پیش کی ہیں ان میں سے کسی آیت میں دوسرے نکاح کی مطلقاً ممانعت نہیں ہے۔ ذیل میں ہم بالترتیب ان آیات کا صحیح مفہوم اور مضمون نگار کے استدلال کا جواب قلمبند کر رہے ہیں:

آیت (۱) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	تمہیں ایک جان (حضرت آدم) سے پیدا کیا

وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً. (النساء:۱)

اور اس سے اس کا جوڑا (حضرت حواء کو) پیدا فرمایا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

ہر منصف مزاج شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس آیت میں کہیں بھی یہ بحث نہیں ہے کہ ایک شخص کو بیک وقت کتنے نکاح کرنے چاہئیں۔ اگر مضمون نگار کا استدلال یہ ہو کہ ''اس میں حضرت آدم کے لیے صرف حضرت حوا علیہا السلام کا ذکر ہے اس لیے ہر شخص کو ایک وقت میں صرف ایک نکاح کرنا چاہیے'' تو یہ بھی غلط ہے' کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فقط حضرت حواء کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے لوگوں کے لیے ایک سے زائد نکاح کرنا منع ہو۔ ممانعت تو اس صورت میں ثابت ہوتی جب اس آیت میں دوسرے تیسرے نکاح کی بحث ہوتی اور ایک سے زائد عورتیں رکھنے سے منع کیا گیا ہوتا۔ حیرت کی بات ہے کہ مضمون نگار نے یہ تو دیکھ لیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ایک زوجہ تھیں' اور یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے نکاح میں بیک وقت کتنی ازواج تھیں؟ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے نکاح میں اگر ایک زوجہ تھی تو حضرت داؤد علیہ السلام کے نکاح میں ننانوے ازواج تھیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت (ص: ۲۳) سے ثابت ہے۔ اور اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں بیک وقت ستر اور ایک روایت کے مطابق ننانوے ازواج تھیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری (رقم: ۶۷۲۰) اور صحیح مسلم (رقم: ۱۶۵۴) سے یہ بات ثابت ہے۔ مضمون نگار اس کا جواب دیں!

آیت (۲) وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ. (النساء:۳)

اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو تمہیں جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو خواہ دو دو' تین تین اور چار چار' اور اگر تمہیں خوف ہو کہ تم (ان کے درمیان) عدل و انصاف نہیں کرسکو گے تو ایک ہی عورت رکھ لو یا اپنی باندی سے فائدہ حاصل کرو۔

مضمون نگار کے نزدیک اس آیت میں دو باتیں قابل غور ہیں: (ا) ایک یہ کہ اس آیت میں ایک سے زائد نکاح کی جو اجازت دی گئی ہے وہ یتیم عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ تمام عورتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ (۲) دوسرا یہ کہ جب آدمی کو یہ خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکے گا تو ایک عورت پر اکتفاء کرے۔

اس دوسری بات میں تو کسی کا کوئی کلام اور اختلاف نہیں کہ جب آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ دو یا دو سے زائد عورتوں میں عدل و انصاف نہیں کر سکے گا تو اپنے نکاح میں ایک ہی عورت رکھے۔ غور کیا جائے تو آیت مبارکہ کے اسی جملے میں ایک سے زائد نکاح کرنے کا واضح ثبوت ہے۔ کیونکہ اس میں جب پابندی عائد فرما دی کہ بے انصافی کا خوف ہونے کی صورت میں صرف ایک عورت رکھی جائے' تو اس سے خود ہی واضح ہو گیا کہ جب عدل و انصاف کے ساتھ گزارا ممکن ہو تو ایک سے زائد بیویاں رکھی جا سکتی ہیں۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ جس آیت میں ایک سے زائد نکاح کرنے کا ثبوت ہے اسی سے مضمون نگار یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بیک وقت ایک سے زائد نکاح نہیں کرنے چاہئیں!!!

زیر بحث آیت پر مضمون نگار نے کلام کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس آیت مبارکہ میں ایک سے زائد نکاح کی جو اجازت دی گئی ہے وہ یتیم عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ یعنی یہ ''عام اجازت'' نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک آیت مبارکہ میں ''من النساء'' کا لفظ عام ہے' جو کہ ہر طرح کی عورتوں کو شامل ہے خواہ وہ یتیم ہوں یا غیر یتیم (یعنی ایک سے زائد نکاح کے لیے کسی بھی حلال عورت کو اختیار کیا جا سکتا ہے)۔

قرآن مجید کے نزول کو چودہ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے' لیکن آج تک کسی مستند مفسر و محدث نے اس آیت سے یہ استدلال نہیں کیا کہ اس آیت کا تعلق صرف یتیم عورتوں کے ساتھ ہے بلکہ ہماری تاریخ تسلسل سے بتاتی ہے کہ صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین' مشائخ کرام' اولیاء عظام' صلحاء امت' اکابرین اسلام اور بڑے بڑے بزرگوں نے ایک سے زائد نکاح فرمائے ہیں۔ اور کبھی یہ تفریق نہیں فرمائی کہ دوسرا نکاح یتیم سے کیا جائے یا غیر

یتیم ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بیک وقت نو اور مجموعی طور پر گیارہ ازواج اپنے نکاح میں رکھی ہیں۔ مضمون نگار کے بہ قول بیک وقت دوسری عورت سے نکاح کرنا غیر شرعی عمل ہے تو رسول اللہ ﷺ، صالحین امت اور پوری امت مسلمہ کا عمل کس شمار میں ہوگا؟

آیت (۳) وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ۔ (النساء: ۱۲۹)

تم ہرگز عورتوں کے درمیان عدل و انصاف نہیں کر سکتے، اگرچہ کتنی ہی خواہش رکھتے ہو۔

اس آیت سے مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک سے زائد عورتوں کے درمیان عدل و انصاف کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا ایک سے زائد عورتیں نکاح میں نہیں رکھنی چاہئیں۔

موصوف (ایڈوکیٹ صاحب) کو شاید معلوم نہیں کہ احادیث مبارکہ اور اقوال فقہاء کے مطابق اس آیت مبارکہ میں عدل و انصاف سے محبت قلبی مراد ہے۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم قلبی محبت میں سب عورتوں کو برابر لیکر نہیں چل سکتے، اگرچہ کتنی ہی خواہش رکھتے ہو۔ خود نبی اکرم ﷺ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں یہ عرض کرتے تھے کہ جو چیز (قلبی محبت) میرے اختیار میں نہیں ہے اس میں میری گرفت نہ فرمانا۔

(ترمذی شریف: ۱۱۴۳، ابوداؤد شریف: ۲۱۳۴، نسائی شریف: ۳۹۵۳)

اس سے معلوم ہوا کہ آیت مبارکہ میں عدل سے "قلبی محبت میں برابری کرنا" مراد ہے۔ جب کہ شوہر کو جس عدل کا پابند کیا گیا ہے اس سے نان ونفقہ اور اخراجات میں عدل کرنا مراد ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن مجید میں نکاح کے متعلق دو مختلف مقامات پر عدل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ اور دوسری سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۲۹۔ ان میں سے پہلی آیت میں عدل سے نان ونفقہ کا عدل مراد ہے اور دوسری آیت میں عدل سے قلبی محبت کا عدل مراد ہے۔ شوہر کو جس عدل کا پابند کیا گیا ہے اور جس پر گرفت ہوسکتی ہے وہ نان ونفقہ کا عدل ہے۔ جب کہ قلبی محبت کے عدل میں شوہر پابند نہیں ہے اور اس میں اونچ نیچ معاف ہے۔ عدل و انصاف کے معانی کا یہ فرق اگر سامنے رکھا جائے تو دونوں آیتیں با آسانی سمجھی جاسکتی ہیں۔

آیت (۴) مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ. (الاحزاب: ۴) اللہ عزوجل نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔

اس آیت مبارکہ سے مضمون نگار نے یہ استدلال کیا ہے کہ ہر شخص کے سینے میں صرف ایک دل رکھا گیا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ ایک وقت میں صرف ایک نکاح کرے۔

ہم یہاں مضمون نگار صاحب سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ اکابرین امت میں سے جنہوں نے ایک سے زائد نکاح کئے ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ یا حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہم' ان سب کے سینے میں کتنے دل تھے؟

دوسرا یہ کہ مضمون نگار صاحب اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بدن انسانی میں چونکہ ایک دل پیدا کیا گیا ہے اس لیے محبت بھی ایک ہونی چاہیے۔ اگر مضمون نگار صاحب برا نہ منائیں تو ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ مضمون نگار صاحب کو اپنی زوجہ کے ساتھ ساتھ والدین اور اولاد سے محبت ہے یا نہیں؟ یقیناً محبت ہوگی۔ تو پھر بتایا جائے کہ جناب کے سینے میں کتنے دل ہیں؟ اور پیش کردہ آیت مبارکہ کا کیا مفہوم ہے؟

آیت (۵) وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ. (النور: ۳۲) تم اپنے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کراؤ۔

اس آیت سے بھی مضمون نگار صاحب کا استدلال حیرت سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس میں گھر کے بڑوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ ایسے افراد کا نکاح کروائیں جن کا نکاح نہ ہوا ہو۔ اس میں کہیں یہ بحث نہیں ہے کہ ایک سے زائد نکاح مت کرو۔ غالباً مضمون نگار نے اپنی جدید سوچ کی بناء پر اس آیت کا ترجمہ یہ سمجھا کہ ''تم ایسی عوتوں سے نکاح کرو جو بیوہ ہوں''۔ حالانکہ اس ایت مبارکہ میں ''الایامٰی'' کا جو لفظ ہے' اس کا معنی ہے: وہ مرد یا عورت جس کا نکاح نہ ہوا ہو۔ اور ''انکحوا'' کا معنی نکاح کرنا نہیں ہے' بلکہ نکاح کروانا ہے۔ اس لیے آیت مبارکہ کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ اپنے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کرواؤ۔ اور اس سے مضمون نگار کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔

آیت (۶) وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا. (النساء:۲۰)

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو اور پہلی کو تم ڈھیر سارا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

اس آیت سے مضمون نگار کا استدلال یہ ہے کہ اس میں ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی سے نکاح نہیں کرنا چاہیے۔

مضمون نگار صاحب کی پیش کردہ اس آیت مبارکہ میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ ایک عورت کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح مت کرو۔ بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی عورت کے ساتھ اگر گزر بسر مشکل اور پیچیدہ ہو جائے اور شوہر اسے چھوڑ کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہے تو پہلی کو جو کچھ دیا ہو اس سے وہ واپس نہ لیا جائے۔ جب کہ ہماری بحث یہ چل رہی ہے کہ ایک عورت جس سے شوہر کی بنی ہوئی ہو اس کے ساتھ ساتھ وہ (کسی بھی وجہ سے) دوسری تیسری شادی مزید کرنا چاہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

مضمون نگار صاحب نے یہ غور نہیں کیا کہ آیت کا مفہوم کیا ہے اور بحث کیا چل رہی ہے، صرف سرسری نظر ڈال کر ثابت کر دیا کہ شریعت میں ایک عورت کے ہوتے ہوئے دوسرے نکاح کی گنجائش نہیں!

مضمون نگار نے اس کے بعد مزید چند آیات پیش کی ہیں جن کا مفہوم قریب قریب وہی ہے جو گزشتہ آیات کا ہے۔ ہم اس قدر گفتگو کے بعد مؤدبانہ التماس کریں گے کہ مضمون نگار صاحب پوری سنجیدگی سے اپنے دلائل اور ہمارے پیش کردہ حقائق کا تقابلی جائزہ لیں اور زیر بحث مسئلہ پر دوبارہ مطالعہ کریں۔ شاید حق اپنی آب و تاب کے ساتھ واضح ہو جائے۔ اور جب حق واضح ہو جائے تو اسے قبول کرنے میں اور گزشتہ مؤقف سے رجوع کرنے میں ذرا برابر تامل نہ کریں۔ کہ ایک دیانتدار اور سلیم الفطرت شخص کی یہی پہچان ہوتی ہے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

سامانِ جہیز اور عورت کی دیگر چیزوں کا حکم اور عورت کی عدتِ طلاق میں شوہر کی ذمہ داری

سوال:

(۱) وہ عورت جو سونا اپنے گھر سے لے کر گئی تھی اس کا کیا حکم ہے اور جو اس کو شوہر کے گھر سے ملا تھا اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) سامانِ جہیز کے بارے میں کیا حکم ہے' آیا وہ عورت کی ملکیت ہے یا شوہر کی؟

(۳) عدتِ طلاق میں نان نفقہ اور رہائش کا خرچہ کس کے ذمہ ہوگا؟

[سائل: عبدالرحیم خان' کراچی]

جواب:

(۱) عورت کو جو سونا شوہر کی طرف سے ملا تھا اس کی ملکیت کا مسئلہ وہاں کے معمول اور دستور پر محمول ہے۔ اگر کسی علاقے اور برادری میں عام معمول ہے کہ عورت کو جو سونا دیا جاتا ہے وہ ملکیت کے طور پر دیا جاتا ہے' یعنی عورت کو اس سونے کا مالک بنا دیا جاتا ہے تو یہ عورت ہی کی ملکیت ہوگا' خواہ عورت کو طلاق ہو یا شوہر کا انتقال ہو۔ اور اگر عام معمول اور دستور یہ ہو کہ وہ سونا عورت کو بطور ملکیت نہ دیا جاتا ہو تو طلاق کی صورت میں وہ سونا شوہر (یا جو بھی مالک ہو) اس کی طرف لوٹ جائے گا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں: ''دلہن کا گہنا' جوڑا جو بری میں دیا جاتا ہے اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک مقصود ہوتی ہو تو وہ بھی قبضہ منکوحہ ملک منکوحہ ہوگا' ہمارے یہاں شرفاء کا عرف ظاہر یہی ہے۔ ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لیے بھیجا جاتا ہو اور پہنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو وہاں دلہن کی ملک نہیں ایک عاریت ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ' ج ۱۲' ص ۲۰۸' ملتقطاً' مطبوعہ لاہور)

(۲) جہیز کا سامان عورت کی ملکیت ہے۔ کسی اور کا شرعاً اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں کہ: ''وہ مال تمام و کمال خاص مِلکِ عورت ہے دوسرے کا اس میں کچھ حق نہیں''۔ ردّ المحتار میں ہے کہ: ''ہر شخص جانتا

ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور جب شوہر اس کو طلاق دیدے تو وہ تمام جہیز لے لے گی۔ اور اگر عورت مرجائے تو جہیز اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ شوہر اس میں سے اپنے لیے کچھ خاص نہیں کرسکتا"۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۲۰۱، مطبوعہ لاہور)

(۳) عدت طلاق کا خرچہ شوہر کے ذمہ واجب ہے۔ صدرالشریعہ علامہ امجد اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: "جس عورت کو طلاق دی گئی ہے بہر حال عدت کے اندر نفقہ پائے گی۔ طلاق رجعی ہو یا بائن یا تین طلاقیں عورت کو حمل ہو یا نہیں"۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۸۵)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

غیر مسلم میاں بیوی میں سے اگر عورت مسلمان ہوجائے تو نکاح کا کیا حکم ہوگا؟

سوال:

میرا نام پروین ہے اور میں شادی شدہ ہوں، پہلے میں عیسائی تھی، اب میں نے بحمدہٖ تعالیٰ اسلام قبول کرلیا ہے۔ میں نے اپنے شوہر کو بھی اسلام کی دعوت دی جو کہ اُس نے ردّ کردی۔ سوال یہ ہے کہ اس شخص کے ساتھ میرا نکاح برقرار ہے یا نہیں؟ اگر میں کسی مسلمان سے شادی کرنا چاہوں تو آیا مجھے عدت گزارنی ہوگی یا میں فوراً شادی کرسکتی ہوں؟

[سائلہ: پروین (حسین آباد، کراچی)]

جواب:

عورت اگر اسلام قبول کرلے اور شوہر بدستور کافر رہے تو عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے شخص پر اسلام کی دعوت پیش کرے، اگر وہ اسلام قبول کرلے تو نکاح برقرار رہے گا اور اگر انکار کرے تو عدالت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان دونوں کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ جاری کرے اور یہ فیصلہ عورت کے لیے ایک طلاق بائن شمار کیا جائے گا، لہٰذا اگر اس کی رخصتی ہوچکی ہو تو عدالت کے فیصلہ کے بعد وہ عدت گزارے گی اور عدت گزارنے کے بعد وہ کسی بھی صاحبِ ایمان سے نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔

شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی حنفی علیہ الرحمۃ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک کافرہ عورت نے اسلام قبول کیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم جاری کیا کہ اِس کے شوہر کو اسلام کی دعوت دی جائے' اگر وہ قبول کرلے تو عورت کے ساتھ رہنے دیا جائے ورنہ دونوں میں علیحدگی کردی جائے۔

(البنایہ فی شرح الہدایہ ج ۶ ص ۲۷۳' مطبوعہ ملتان)

اسی طرح آپ کے دورِ خلافت میں بنوتغلب کے ایک عیسائی شخص کی بیوی مسلمان ہو گئی' تو آپ نے اُس عیسائی کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

''اما ان تسلم واما ان انزعها منك فابى ان يسلم فنزعها منه عمر'' یعنی اگر تو اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس عورت کے ساتھ رہ سکتا ہے' ورنہ میں اس کو تجھ سے علیحدہ کر دوں گا' اُس شخص نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو اس سے جدا فرمادیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۸۲۹۷' مطبوعہ بیروت' لبنان)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ عورت اگر مسلمان ہو جائے اور شوہر انکار کرے تو عورت ایک طلاق بائن کے ساتھ شوہر سے جدا ہو جائے گی۔ اور شہاب الدین زہری فرماتے ہیں کہ عدالت کا فیصلہ طلاق شمار کیا جائے گا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۸۳۰۹۔۱۸۹۱۰' مطبوعہ لبنان)

حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ درّ مختار اور البحر الرائق کے حوالہ سے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

عورت مسلمان ہوئی اور شوہر پر اسلام پیش کیا گیا' اُس نے اسلام لانے سے انکار یا سکوت کیا تو تفریق کی جائے گی اور یہ تفریق طلاق قرار دی جائے' یعنی اگر بعد میں مسلمان ہوا اور اسی عورت سے نکاح کیا تو اب دو ہی طلاق کا مالک رہے گا' کہ منجملہ تین طلاقوں کے ایک پہلے ہو چکی ہے اور یہ طلاق بائن ہے اگرچہ دخول ہو چکا ہو۔ یعنی اگر مسلمان ہو کر رجعت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا' بلکہ جدید نکاح کرنا ہوگا' اور دخول ہو چکا ہو تو عورت پر عدّت واجب ہے اور عدّت کا نفقہ شوہر سے لے گی اور پورا مہر شوہر سے لے سکتی ہے۔ اور قبلِ دخول ہو تو نصف مہر واجب ہوا اور عدّت نہیں۔ (بہارشریعت حصہ ۷ ص ۴۵)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عورت کو چاہیے کہ عدالت میں اپنا دعویٰ پیش کر کے شوہر سے

طلاق کا فیصلہ حاصل کرے اور عدالت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مذکورہ دلائل کی روشنی میں شوہر کو طلب کر کے اُس پر اسلام کی دعوت پیش کرے۔ اگر وہ خدانخواستہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرے تو عدالت عورت کے حق میں شریعت کی رُو سے علیحدگی کا فیصلہ جاری کرے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کیا نکاح کے جائز ہونے کے لیے فارم اور رجسٹریشن کا ہونا ضروری ہے؟

سوال:

مؤرخہ 4 اپریل 1997ء کو مسماۃ نیاز بی بی بنت شیر اکبر کا نکاح محمد حنیف ولد محمد اسلم خان کے ساتھ ہوا۔ وکالت کے فرائض مصری خان ولد فضل الرحمٰن نے انجام دیئے اور گواہی کے فرائض مرحوم نواب خان کے دو بیٹوں (حاجی محمد نور خان اور محمد ایوب خان) نے انجام دیئے۔ ان تمام حضرات کے علاوہ دیگر قریبی رشتہ دار بھی محفل نکاح میں شریک تھے۔ ان سب کی موجودگی میں ایک نکاح خواں نے مذکورہ نکاح پڑھایا۔ البتہ اس نکاح کی کاغذی کارروائی نہیں ہوئی یعنی رجسٹر میں اس کا اندراج نہیں ہوا۔ اس تفصیل کی روشنی میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ نکاح شرعاً منعقد ہوا یا نہیں؟ حالانکہ اُس کی رجسٹریشن نہیں ہوئی اور محمد حنیف (شوہر) کے طلاق دیئے بغیر نیاز بی بی کسی اور سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟ [سائل: نصیر احمد الحسنی' نارتھ ناظم آباد' کراچی]

جواب:

شرعی نقطہ نظر سے نکاح منعقد ہونے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں' اُن میں ایک چیز ''ایجاب وقبول'' ہے اور دوسری چیز ''شہادت'' ہے۔ ایجاب سے مراد یہ ہے کہ لڑکا یا لڑکی نکاح کی پیش کش کرے اور قبول یہ ہے کہ دوسرا فریق اُس پیش کش پر اپنی رضامندی ظاہر کر دے۔ ''شہادت'' سے مراد یہ ہے کہ ایجاب وقبول کی یہ کارروائی کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کے سامنے انجام پائے۔ جب شرعی شہادت کے ساتھ لڑکے اور لڑکی کے درمیان

باہمی رضامندی سے ایجاب وقبول انجام پا جائے تو وہ نکاح شرعاً منعقد ہو جاتا ہے۔ اُسے توڑنے اور ختم کرنے کا حق شوہر کے علاوہ کسی کو باقی نہیں رہتا۔

(الا فی صُور الفسخ والتفریق فی احوال مخصوصة)

قرآن مجید میں فرمایا: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدہ:۱) تمہارے درمیان باہمی ایجاب و قبول سے جو عقد انجام پا جائیں' اُنہیں پورا کرو۔ حدیث شریف میں فرمایا: ''**فاتقوا اللّٰہ فی النساء فانکم اخذتموھن بامان اللّٰہ واستحللتم فروجھنّ بکلمة اللّٰہ**'' عورتوں کے معاملہ میں اللہ عزوجل سے ڈرو' کیونکہ تم نے اُنہیں اللہ کی امان کے ساتھ اپنے نکاح میں لیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے ساتھ اُنہیں اپنے لیے حلال کیا ہے۔

(صحیح مسلم: ۱۲۱۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۵۵)

اس حدیث میں جو کلمۃُ اللہ فرمایا گیا ہے' اس سے ایک قول کے مطابق ایجاب وقبول مراد لیا گیا ہے۔ یعنی ایجاب وقبول کے ذریعہ عورتوں کو تم اپنے لیے حلال کرتے ہو۔

(مرقات شرح مشکوٰۃ ج ۵ ص ۴۳۸)

آیت مبارکہ اور حدیث رسول ﷺ سے معلوم ہوا کہ نکاح کا دارومدار ''ایجاب و قبول'' پر ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی شرعی گواہی کے ساتھ ایجاب وقبول ثابت ہو جائے وہاں نکاح کے منعقد ہونے کا حکم لاگو کیا جائے گا۔

صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''**النکاح ینعقد بالایجاب والقبول**'' یعنی نکاح ''ایجاب وقبول'' سے منعقد ہو جاتا ہے۔ (ہدایہ مع فتح القدیر ج ۳ ص ۱۸۹)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''**امّا رکنہ فالایجاب والقبول ومنھا (ای الشروط) الشھادة**'' یعنی ''ایجاب وقبول'' نکاح کا رکن ہے اور گواہی' نکاح کے شرائط میں سے ہے۔

(ج ۱ ص ۲۶۷)

ان تمام عبارات اور دلائل سے واضح ہے کہ جو نکاح ایجاب وقبول اور گواہی کے ساتھ انجام پا جائے وہ ہمیشہ کے لیے لازم ہو گیا۔ خواہ اُسے رجسٹرڈ کیا گیا ہو یا نہیں۔ رجسٹریشن اور کاغذی کارروائی قطعاً نکاح کے لیے ضروری نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک ملکی اور قانونی ضرورت ہے' شرعی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ شرعی ضرورت ہوتی تو تمام صحابہ کرام اور جمیع

بزرگانِ دین وغیرہم من المسلمین کے نکاح رجسٹرڈ ہوئے ہوتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن مجید یا حدیث شریف یا فقہ کی کسی کتاب میں یہ شرط مذکور ہوئی ہوتی' حالانکہ ایسا بھی نہیں ہے۔ لہٰذا لوگوں کی یہ سوچ کہ نکاح جب تک رجسٹرڈ نہ ہو' منعقد نہیں ہوتا اور لڑکی آزاد ہوتی ہے' محض غلط ہے۔ اور اس قسم کی شرائط عائد کرنا جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ فقیہ اعظم مفتی محمد نور اللہ نعیمی بصیر پوری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: یہ انگوٹھوں والا رجسٹر اس زمانِ پُرفتن کی نئی ایجاد ہے' شرعاً نکاح ایجاب وقبول کا نام ہے۔ (فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۶۸۹' مطبوعہ بصیر پور)

سوال مذکور میں جو صورتِ حال بیان کی گئی ہے اگر وہ مبنی برصداقت ہے تو نیاز بی بی اور محمد حنیف کے نکاح کو کوئی شخص چیلنج نہیں کرسکتا۔ محمد حنیف کے طلاق دیئے بغیر نیاز بی بی کا کسی اور کے ساتھ نکاح شرعاً حرام' حرام اور حرام ہے۔ فی الوقت نیاز بی بی پر سوائے اُس کے شوہر محمد حنیف کے کسی اور کا حق نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نکاح کے لیے لڑکی کے راضی ہونے کی چند صورتیں اور اُن کا شرعی حکم

سوال:

ایک آدمی نے اپنی بالغہ بیٹی کا نکاح اپنے بھتیجے کے ساتھ کر دیا' اس حال میں کہ لڑکی اس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے رضامند نہ تھی' نکاح کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک وہ اپنے والدین کے گھر میں غیر مدخولہ رہی' پھر بغیر طلاق لیے اس لڑکی کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ کر دیا گیا۔

کیا یہ دوسرا نکاح صحیح ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمادیں۔ شکریہ [سائل: حافظ محمد آفتاب' چک نمبر 34 گ ب' تحصیل جڑانوالہ ضلع فیصل آباد]

جواب:

رضامندی اور اجازت کی بنیادی طور پر تین صوتیں ہیں: (۱) ''قولاً'' جیسے زبان سے اجازت دی جائے یا رضامندی کا اظہار کیا جائے (۲) ''فعلاً'' جیسے رخصت ہو کر بلا انکار

شوہر کے گھر چلے جانا (۳) ''دلالۃً'' جیسے کنواری لڑکی کا اجازت طلب کرتے وقت ہنس پڑنا یا بلا آواز رو پڑنا یا خاموش ہو جانا۔

مذکورہ صورتیں عورت کی رضامندی اور اجازت شمار کی جاتی ہیں۔ جس بالغہ لڑکی کی جانب سے مذکورہ تین صورتوں میں کوئی بھی صورت پائی جائے' نکاح منعقد ہو جائے گا' اگرچہ جبراً اُس سے رضامندی لی گئی ہو۔ لیکن اگر سرے سے لڑکی سے رائے نہیں لی گئی' نہ جبراً اُسے راضی کیا گیا اور پھر کسی سے نکاح کر دیا گیا تو اس صورت میں نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

(کما صرّح به امام اهل السنّة فی الفتاوی الرضویة ج۱۱ص ۲۰۳)

سائل (حافظ محمد آفتاب) نے جو صورتِ حال بیان کی ہے' اُس میں اگر لڑکی نے اپنے قول و فعل سے کسی بھی طرح اجازت اور رضامندی ظاہر نہیں کی تو مذکورہ نکاح شرعاً منعقد نہیں ہوا۔ جہاں دوسری جگہ نکاح کیا گیا وہ شرعاً درست ہے۔

ہاں! اگر لڑکی نے ناپسندیدگی کے باوجود باؤ میں آ کر زبان سے رضامندی ظاہر کر دی تھی تو اس صورت میں باپ کا کیا ہوا نکاح درست قرار پائے گا۔ اب اُسے توڑنے کا کسی کو اختیار نہیں اور دوسرا نکاح ناجائز ٹھہرے گا۔

سائل نے سوال میں لڑکی کی رضامندی کی وضاحت نہیں کی' اس لیے مسئلہ کی دونوں صورتیں تحریر کر دی گئی ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قادیانی شخص کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا بیان

سوال:

ایک عورت جس کا پہلا شوہر مسلمان تھا' اس سے اس کے دو بچے ہیں' اس نے دوسری شادی ایک قادیانی سے کی' اور اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے اور اس کے دوسرے شوہر کے قادیانی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' اس نے اپنی بیٹی کی شادی قادیانی لڑکے سے اور اپنے لڑکے کی شادی قادیانی لڑکی سے کی اور یہ اس کے پہلے مسلمان شوہر سے ہیں اور لڑکا اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور ہماری مساجد میں نماز ادا کرتا ہے' اس کا نکاح ایک سنی نکاح خواں نے پڑھایا ہے' سوال یہ ہے کہ اس لڑکے کے قول کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں اور اس نکاح

پڑھانے والے پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ [سائل: محمد ادریس' کورنگی]

جواب:

قادیانی' شرعاً اور قانوناً کافر اور گستاخِ رسول ہیں۔ اُن سے کسی مسلمان عورت کا نکاح قطعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نکاح' نکاح نہ ہوگا بلکہ خالص زنا ہوگا اور اس سے پیدا ہونے والے بچے ولد الحرام ہوں گے۔ جس عورت کا سوال میں تذکرہ کیا گیا ہے' اُس نے دوسری شادی جس ملعون قادیانی شخص سے کی' وہ شرعاً منعقد نہ ہوئی۔ اور اب تک جتنی بار وہ آپس میں ملے ہیں' زنائے خالص کے مرتکب ہوئے ہیں۔ عورت پر لازم ہے کہ مذکورہ قادیانی سے علیحدہ ہو کر کسی مسلمان سے نکاح کرے۔ نیز اس علیحدگی کے لیے عورت کو اُس ملعون سے طلاق لینے کی بھی حاجت نہیں ہے' کیونکہ وہ کافر ہونے کے سبب اس کا شوہر نہیں اور یہ اُس کی بیوی نہیں۔

عورت کے اس حکم کے واضح ہونے کے بعد اس کے بچوں کا شرعی حکم بھی واضح ہے کہ اگر اُس نے اپنے بچوں کی شادی قادیانی بچوں سے کی تو یہ بھی خالص زنا اور حرام کاری ہوگی اور اس ساری بدکاری پھیلانے کی ذمہ دار عورت ہوگی۔

لہٰذا مذکورہ عورت پر جس طرح ملعون قادیانی سے اپنا تعلق ختم کر کے علیحدہ ہونا فرض ہے' اسی طرح اپنے بچوں کو بھی قادیانیوں کے زنا میں دینے سے بچانا فرض ہے۔ یہ نکاح اگر پڑھا جا چکا ہے تو شرعاً منعقد نہیں ہوا' اگرچہ قادیانی لڑکا اپنے آپ کے مسلمان کہے۔ نیز جس نے یہ نکاح پڑھایا اُس پر توبہ اور اس نکاح سے بیزاری کا اعلان ضروری ہے۔ اور اگر خدانخواستہ نکاح خواں نے سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود نکاح پڑھایا ہے تو اُسے تمام لوگوں کے سامنے خود اپنے ایمان اور اپنے نکاح کی تجدید کرنا ہوگی۔

مذکورہ عورت اور اس کے بچے حکم شرعی واضح ہونے کے باوجود اگر قادنیوں سے اپنا تعلق نہ توڑیں اور عورت سمیت اُس کے بچے زنا میں مبتلا رہیں تو تمام مسلمان بھائی (خواہ رشتہ دار ہوں یا پڑوسی) ان کا مل کر بائیکاٹ کریں اور دُعا سلام' اُٹھنا بیٹھنا اور غمی خوشی میں شرکت سے مکمل کنارہ کریں۔ رسولِ محترم ﷺ نے ہمیں اسی غیرت کا درس دیا ہے۔

ارشاد فرمایا: اگر یہ لوگ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت کو نہ جاؤ' اگر مر جائیں تو ان کے

جنازے میں نہ جاؤ اور کہیں ملیں تو انہیں سلام بھی نہ کرو۔ (سنن ابن ماجہ: ۹۲)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شوہر کے کلماتِ کفریہ کہنے کی صورت میں نکاح کا حکم

سوال:

مسماۃ شازیہ جو کہ سائل کی سگی بہن ہے۔ والدین نے برضاوخوشی اس کی شادی لاہور کے ایک شخص سے کردی جو کہ پہلے سے ہمارا عزیز تھا۔ بعد از رخصتی اس نے دلہن سے گفتگو کے دوران یہ کہا کہ میں کسی عاشق رسول ﷺ کو نہیں مانتا جب میں خدا اور رسول ﷺ کو نہیں مانتا تو کسی اور کو کیا مانوں گا؟ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے گھر میں نماز شماز نہیں ہوتی' ہم دنیا دار ہیں۔ پھر اس نے یہ بھی فعل شنیع کیا کہ رخصتی کے بعد تا ایں دم فعل لواطت کیا ہے' شرعی صحبت نہیں کی ہے۔ اس کی بیوی جب زخمی اور خوفزدہ ہوگئی تو اس نے کہا کہ ابھی سے ڈر گئی ہو؟۔ ہم اس بچی کو لے کر واپس شادی کے 36 گھنٹوں کے اندر اندر اپنے عزیزوں کے ہاں آئے۔ پھر واپس کراچی لے آئے۔ اب اس واقعہ کی بنا پر درج ذیل سوالوں کے جوابات اسلام کی روشنی میں دیں تا کہ ہم گمراہی سے بچ جائیں اور ہدایت پاسکیں۔ ہم آپ کے ممنون اور مشکور ہوں گے۔

(۱) کیا وہ شخص اس بیان کے بعد مسلمان رہا یا نہیں؟ اور یہ کہ اب اس سے نکاح قائم ہے یا ٹوٹ چکا ہے؟

(۲) اب اس کے بعد اس سے ملاقات تنہائی اور حصول اولاد کا عمل زنا کے زمرے میں آئے گا یا نہیں؟

(۳) اگر برادری کے بڑے لوگ مل کر یہ کہیں یا وہ خود کہے کہ مولویوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ خیر ہے کچھ نہیں ہوا' مرد ایسے ہی ہوتے ہیں' لہٰذا تم چھوڑو سب باتیں اور بچی کو بھیج دو۔ جب اللہ معاف کرتا ہے تو بندے کون ہوتے ہیں؟ کیا ایسی باتوں میں آکر بچی کو واپس وہاں بھیجنا صحیح ہے یا ہرگز بھیجنا نہیں چاہیے؟

(۴) اس کے اس فعل کے بعد اس سے خلع لینا بچی کا شرعی اور قانونی حق ہے یا نہیں؟

(۵) اگر وہ یہ کہے میں ان فتووں شتوں کو نہیں مانتا' بس یہ میری بیوی ہے اور میں اس کا خاوند ہوں' تو تنسیخِ نکاح کی کیا صورت ہوگی؟

(۶) اگر وہ بغیر توبہ یا توبہ کے ساتھ معافی مانگے اور پھر یہ بھی کہے کہ میں نے ایسا کچھ کہا ہی نہیں؟ بات کر بھی جائے' منکر بھی ہو جائے تو کل کلاں اس کی توبہ پر اعتبار کی کیا صورت ہوگی؟

(۷) اگر ہم اپنی بچی کو اس کے ساتھ ہی دوبارہ بسانا چاہیں تو اسلام کی روشنی میں اس کی کیا صورت ہوگی؟ [سائل: حقیقی بھائی محمد فرخ]

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ سائل نے جس شخص کے حوالے سے سوال کیا ہے اس نے اگر اپنی زبان سے یہ جملہ کہا ہے کہ ''میں خدا اور رسول ﷺ کو نہیں مانتا'' تو وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکا اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوتے ہی اس کی بیوی اس کے نکاح سے خارج ہو چکی۔ کیونکہ میاں بیوی میں سے کسی ایک کا بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہونا نکاح کو اسی وقت ختم کر دیتا ہے۔ البحر الرائق میں ہے کہ: ''وارتداد احدهما فسخ فی الحال'' زوجین میں سے کسی ایک کا بھی دائرہ اسلام سے خارج ہونا نکاح کو فی الفور ختم کر دیتا ہے۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۲۱۴)

صورتِ مسئولہ میں جب شوہر نے اپنی زبان سے کفریہ کلمہ نکالا اسی وقت نکاح ٹوٹ گیا اور وہیں سے عورت کی عدت شروع ہوگئی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جب بغیر طلاق کے جدائیگی واقع ہو جائے اور عورت حیض والی ہو تو اس کی عدت تین ماہواری کا آنا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۵۲۶)

لٰہذا شوہر کے دائرہ اسلام سے خارج ہوتے ہی عورت کی عدت کا آغاز ہو گیا اور شرعاً چونکہ یہ نکاح ٹوٹ چکا ہے لٰہذا عورت کو خلع لینے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ شرعاً جب نکاح ٹوٹ چکا تو دونوں کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ ہاں اگر شوہر توبہ کر لے اور از سر نو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے شوہر سے دوبارہ نکاح کر لے یا بعد عدت گزار کر کسی دوسرے صحیح العقیدہ مسلمان سے نکاح کر لے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

یہی وضاحت فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۱۲۶، فتح القدیر ج ۳ ص ۲۰۴ اور فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص ۱۵۶ میں موجود ہے۔

ٹیلیفون پر نکاح میں ایک لازمی خرابی یہ ہے کہ مجلسِ ایجاب وقبول ایک نہیں ہوتی۔ دوسری خرابی عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ گواہان ایک ساتھ الفاظِ نکاح نہیں سن سکتے۔ سوال مذکور میں تحریر کردہ وضاحت کے مطابق اگرچہ اسپیکر سسٹم کے ذریعہ گواہوں کا ایک ساتھ سننا ممکن ہوگیا لیکن ظاہر ہے کہ اختلافِ مجلس کی خرابی بدستور قائم ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ''الفرق بین الکتاب والخطاب ان فی الخطاب لو قال قبلت فی مجلس 'اخر لم یجز وفی الکتاب یجوز''۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۶۵) خط وکتابت اور براہِ راست گفتگو میں فرق ہے، براہِ راست گفتگو میں اگر قبول کا لفظ دوسری مجلس میں ادا کیا تو نکاح جائز نہ ہوگا، جب کہ خط وکتابت میں جائز ہوگا۔ اس عبارت سے واضح ہے کہ ڈائیریکٹ گفتگو میں جس جگہ ایجاب ہوا، اسی جگہ قبول کرنا ضروری ہے۔ جب کہ ٹیلیفون پر ایجاب وقبول کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ مزید ایک اور خرابی در آتی ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مفتی محمد وقار الدین قادری رضوی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: (ٹیلیفون پر نکاح باطل ہونے کی) تیسری وجہ یہ ہے کہ ٹیلیفون پر صرف آواز سنی جاتی ہے، کون شخص قبول کر رہا ہے؟ یہ معلوم نہیں ہوتا ہے اور صرف آواز سے یہ متعین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فلاں شخص کی آواز ہے۔ اس لیے کہ آواز دوسرے کی طرح بنائی جاسکتی ہے۔ لوگ جانوروں کی آوازوں کی اس طرح نقل کرتے ہیں کہ اگر سامنے نہ ہو تو پہچانا نہیں جاسکتا کہ یہ آواز جانور کی ہے یا انسان نقل کر رہا ہے۔ بہرحال ٹیلیفون پر نکاح باطل ہے۔ اس کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

(وقار الفتاویٰ ج ۳ ص ۵۲)

شرح صحیح مسلم شریف میں شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

بعض اوقات لڑکا ایک ملک میں اور لڑکی دوسرے ملک میں ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کا نکاح کر کے اس کو لڑکے کے پاس بھیج دیں۔ مثلاً لڑکی پاکستان میں اور لڑکا انگلینڈ میں ہے۔ ایسے مواقع پر لوگ پوچھتے ہیں کہ آیا ٹیلیفون پر نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بتا چکے ہیں کہ نکاح میں یہ ضروری ہے کہ دو مسلمان گواہوں کے سامنے

مجلسِ نکاح میں ایجاب وقبول کیا جائے اور جب لڑکا انگلینڈ میں ٹیلیفون پر قبول کر رہا ہے تو اس کا یہ قبول کرنا مجلس میں دو گواہوں کے سامنے نہیں ہے۔ اور وہ شرعاً اور قانوناً لڑکے کے قبول کرنے کی گواہی نہیں دے سکتے۔ اس لیے ٹیلیفون پر نکاح کرنا جائز نہیں۔

(شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۸۲۹)

ہاں البتہ یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ لڑکا خط یا ٹیلیفون کے ذریعہ کسی شخص کو اپنا وکیل بنا دے اور وہ وکیل لڑکے کی طرف سے پاکستان میں ایجاب وقبول کر لے اور یہ ایجاب وقبول حسبِ دستور دو گواہوں کے سامنے مجلسِ نکاح میں ہو اس طرح نکاح منعقد ہو جائیگا۔ اس کی مثال خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل ہے کہ آپ نے نجاشی کی طرف خط لکھا اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام دیا اور نجاشی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت ام حبیبہ کا نکاح کر دیا۔ (المبسوط ج ۵ ص ۱۶، ۱۵، شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۸۲۹)

حاصلِ کلام یہ کہ نکاح کے صحیح ہونے کے لیے ایجاب وقبول کا ایک مجلس میں دو مسلمان گواہوں کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ٹیلیفون پر اس طرح کی صورت ناممکن ہے۔ اس لیے ٹیلیفون پر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی ایسی ہی مجبوری ہے کہ نکاح جلد کرنا ہے اور لڑکا یہاں نہیں آ سکتا تو وکالت کی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ایک ہی دن تقریب نکاح اور ولیمہ منعقد کرنے کا شرعی حکم

سوال:

زید کے لڑکے کی شادی بکر کی لڑکی سے طے پائی، مگر زید وبکر میں اس بات پر اتفاق ہوا ہے کہ دونوں (یعنی زید وبکر) مل کر ایک تقریب منعقد کرتے ہیں جس میں نکاح پڑھایا جائے گا۔ زید (یعنی لڑکے والے) اس تقریب کو ولیمہ کا نام دیں گے اور بکر (یعنی لڑکی والے) اسے نکاح کی تقریب سے منسوب کریں گے۔ آیا کہ ایسا کرنا از روئے شریعت مطہرہ جائز ہے کہ ایک دن کو دو مختلف ناموں سے منسوب کیا جائے اور ولیمہ تو شبِ زفاف گزار کر منعقد

ہوتا ہے اسے پہلے سے منعقد کرنا کیسا ہے اور قائلین کے بارے میں کیا حکم ہے؟

[سائل: محمد نعیم الدین قادری' F.B ایریا]

جواب:

ولیمہ کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک شادی کے دن جو کھانا کھلایا جائے وہ ولیمہ ہے اور بعض کے نزدیک شب زفاف کے بعد جو ضیافت کی جائے وہ ولیمہ ہے۔ دوسرا قول راجح اور مختار ہے۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ ولیمہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ولیمہ یہ ہے کہ شب زفاف کی صبح کو اپنے دوست احباب عزیز و اقارب اور محلّہ کے لوگوں کی حسب استطاعت ضیافت کرے۔ (بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۳۲)

اس تعریف کے پیش نظر مسنون طریقہ یہی ہے کہ شب زفاف کے بعد ہی ولیمہ کی تقریب کی جائے' تاہم اگر ولیمہ کے لغوی معنی کے اعتبار سے شادی اور نکاح کے کھانے کو ولیمہ کہہ دیا جائے تو لغت کی حد تک درست ہے' کیونکہ ولیمہ کا لغوی معنی دعوتِ طعام ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا کہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ شب زفاف کے بعد دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''ولیمة العرس سنة و فیها مثوبة عظیمة وهی اذا بنی الرجل بامرء ته ینبغی ان یدعو الجیران والاقرباء والاصدقاء و یذبح لهم و یصنع لهم طعاما''. (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۴۳)

دعوت ولیمہ سنت ہے اور اس میں بہت ثواب ہے اور دعوت ولیمہ یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی سے زفاف کرنے کے بعد اپنے پڑوسیوں' عزیز و اقارب اور دوستوں کے لیے دعوت کا اہتمام کرے' ان کے لیے جانور کو ذبح کر کے کھانا تیار کرے۔

اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ: شب زفاف کی صبح کو احباب کی دعوت کرنا ولیمہ ہے۔ رخصت سے پہلے جو دعوت کی جائے ولیمہ نہیں۔ یونہی بعد رخصت قبل زفاف اور ریاء و ناموری کے قصد سے جو کچھ ہو حرام ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۲۵۶' مطبوعہ لاہور) **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

اہل تشیع سے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

کسی سنی لڑکی کا نکاح شیعہ لڑکے سے یا سنی لڑکے کا نکاح شیعہ لڑکی سے جائز ہے یا نہیں؟ [سائل: عبداللہ خان، پرانی سبزی منڈی]

جواب:

صورت مسئولہ کے جواب سے قبل جاننا چاہیے کہ شیعوں کے بعض عقائد و نظریات علماء اعلام کی تصریحات کے مطابق کافرانہ ہیں، خصوصاً وہ شیعہ جو شیخین کریمین (سیدنا ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما) پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ مصلحتی مسلمان قرار دیتے ہیں، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگاتے ہیں وہ بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اور وہ شیعہ جو حضرات سیدنا ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما کو برا بھلا نہیں کہتے، نہ ان کی خلافت کا انکار کرتے ہیں اور دیگر کافرانہ نظریات بھی نہیں رکھتے بلکہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو دیگر صحابہ سے افضل جانتے ہیں وہ بدعت اور گمراہی کا شکار ہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت امام احمد رضا خان محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: رافضی تبرائی جو حضرات شیخین صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما خواہ ان میں سے ایک کی شان پاک میں گستاخی کرے اگرچہ صرف اسی قدر کہ انہیں امام و خلیفہ برحق نہ مانے، کتب معتمدہ فقہ حنفی کی تصریحات اور عامہ ائمہ ترجیح و فتویٰ کی تصحیحات پر مطلقاً کافر ہے۔ (اس کے بعد آپ مختلف کتب سے عبارات ذکر کرتے ہوئے شرح نقایہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:)

"من انکر امامة ابی بکر الصدیق رضی الله عنه فهو کافر وعلی قول بعضهم هو مبتدع و لیس بکافر و الصحیح انه کافر و کذلك من انکر خلافة عمر رضی الله عنه فی اصح الاقوال". (شرح نقایہ ج ۴ ص ۲۱-۲۰)

یعنی سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا منکر کافر ہے، بعض نے کہا کہ ایسا شخص بدمذہب ہے کافر نہیں ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ وہ کافر ہے۔ اسی طرح صحیح ترین قول کے مطابق

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا منکر بھی کافر ہے۔

پھر آپ نے غنیۃ منیہ کی عبارت بھی ذکر کی ہے' اس میں شیعوں کے کافرانہ نظریات کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ'' ان میں حد سے بڑھنے والے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہتے ہیں یا یوں کہتے ہیں کہ نبوت حضرت علی کے لیے تھی' جبریل امین نے وحی اتارنے میں غلطی کر دی' اسی طرح وہ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر غلط الزام لگاتے ہیں' حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صحابیت یا خلافت کا انکار کرتے ہیں اور حضرات شیخین (سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو برا کہتے ہیں''۔ پھر مزید عبارات ذکر کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں: ''روافض زمانہ (آج کل کے رافضی) صرف تبرائی نہیں بلکہ یہ تبرائی علی العموم منکران ضروریات دین اور باجماع مسلمین یقیناً قطعاً کافر مرتدین ہیں۔ یہاں تک علمائے کرام نے تصریح فرمائی کہ جو انہیں کافر نہ جانے خود کافر ہے' بہت عقائد کفریہ کے علاوہ کفر صریح میں ان کے عالم جاہل مرد عورت چھوٹے بڑے سب بالاتفاق گرفتار ہیں: (۱) کفر اول یہ کہ قرآن عظیم کو ناقص بتاتے ہیں۔ (۲) کفر دوم یہ کہ ان کا ہر متنفس سیدنا امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم و دیگر ائمہ طاہرین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حضرات عالیات انبیائے سابقین علیہم السلام و التحیات سے افضل بتاتا ہے۔ اور جو کسی غیر نبی کو نبی سے افضل کہے باجماع مسلمین کافر بے دین ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۴ ص ۲۵۰ ملخصاً)

مذکورہ تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ علی العموم شیعوں کے نظریات کافرانہ ہیں اور وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ البتہ وہ شیعہ جو بہ ظاہر صرف اس نظریہ کا پرچار کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام (بشمول حضرت ابوبکر و عمر عثمان غنی رضی اللہ عنہم) سے افضل ہیں ان پر اگرچہ کتب فقہ میں کفر کا حکم نہیں ہے' صرف گمراہی کا حکم ہے۔ تاہم وہ اپنے مذہب میں '' تقیہ'' کے نظریہ کے مطابق فی زمانہ بہت شدت کے ساتھ کافرانہ نظریات کے ساتھ اپنی براءت کا اعلان کرتے ہیں اس لیے اہل سنت کے معتمد علماء نے ہر صورت میں شیعوں سے نکاح کو ممنوع قرار دیا ہے' خواہ لڑکا سنی ہو اور لڑکی شیعہ یا لڑکی سنی ہو اور لڑکا شیعہ۔ چنانچہ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

'' روافض زمانہ بوجوہ کثیرہ کافر مرتد ہیں' سنیہ سے ہرگز نکاح نہیں ہو سکتا' اگر کیا جائے

گا باطلِ محض وزنائے خالص ہوگا“۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۵۷)

اسی طرح مفتی وقار الدین قادری رضوی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ”شیعہ لڑکے سے سنی لڑکی کا نکاح باطل ہے۔ اس لیے کہ شیعہ آج کل عام طور پر تبرائی اور حضرت ابوبکر وحضرت عمر کی خلافت کے منکر ہیں اور ان ہستیوں کو سب وشتم کرنے والے ہیں۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر قذف (تہمت) لگانے والے ہیں۔ تفضیلی شیعہ کا بھی یہی حال ہے۔ ان تمام عقائد کو عالمگیری وشامی وغیرہ کتب فقہ میں کفریات شمار کیا ہے، اور کسی کافر سے کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ شیعہ کے یہاں ”تقیہ“ یعنی جھوٹ بولنا فرض ہے۔ تفضیلی شیعہ کا بھی یہی حکم ہے۔ یہ لوگ سنی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو تفضیلی بتاتے ہیں اس لیے ان کے قول کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ”ضروریات دین جن کو ماننا ایمان کے لیے ضروری ہے ان میں سے کسی کا انکار کرنا کفر ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور ان کے صحابی ہونے کی تصدیق بھی ان ہی میں سے ہے۔ شیعہ بہت سی باتوں میں اختلاف کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا بھی انکار کرتے ہیں اور انہیں خائن و غاصب مانتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اب بھی تہمتیں لگاتے ہیں۔ اس لیے ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا کلمہ بھی علیحدہ کرلیا اور اذان بھی تبدیل کرلی۔ لہٰذا کسی مسلمان کا نکاح کسی شیعہ لڑکی سے نہیں ہوسکتا۔ اور چونکہ شیعوں کے مذہب میں ”تقیہ“ کرنا یعنی اپنے مذہب کو چھپالینا اور جھوٹ بولنا ان کے عقائد اور فرائض میں شامل ہے اس لیے ان کے قول پر بھی یقین کرنا مشکل ہے۔ (وقار الفتاویٰ ج ۳ ص ۳۱۔۳۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ جو عورت مذہب شیعہ سے تعلق رکھتی ہے اس سے کسی سنی مرد کا اور کسی شیعہ لڑکے سے سنی لڑکی کا نکاح جائز نہیں ہے اگر چہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے مذہب شیعہ کو چھوڑ دیا ہے یا اہل سنت کے مذہب کو قبول کرلیا ہے۔ کیونکہ بہر حال اس بات کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے مذہب اور نظریات کو چھپانا ”عبادت“ سمجھتے ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ اسی عبادت کی ادائیگی کے طور پر اپنے مذہب سے بیزاری ظاہر کریں اور اپنے آپ کو سنی ظاہر کریں۔ اس لیے اہل سنت کو ان کے ساتھ مناکحت (شادی بیاہ) سے

بچنا لازم ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) سے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

(۱) کسی مسلمان عورت کا اہل کتاب سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کوئی مسلمان شخص کسی کتابیہ سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں اگر وہ کتابیہ ہو مشرکہ یعنی تثلیث کا عقیدہ رکھتی ہو تو کیا حکم ہے؟ مشرکہ سے نکاح کی ممانعت اور کتابیہ سے نکاح کے جواز کی کیا وجہ ہے؟ [سائل: محمد اسماعیل اشرف، ملیر]

جواب:

(۱) مسلمان عورت کسی بھی کافر کے لیے حلال نہیں۔ علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی علیہ الرحمۃ "ولا تنکحوا المشرکات" (البقرۃ:۲۲۱) کی تفسیر میں حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں کہ: "ولا تنکحوا المشرکاتِ نسخ من ذالك نکاح نساءِ اھل الکتاب احلھن للمسلمین وحرم المسلمات علی رجالھم"۔ (روح المعانی ج۱ ص۶۹۹) یعنی "ولا تنکحوا المشرکات" (مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو) تو اس حکم سے نکاحِ کتابیہ کو نکال دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی عورتوں کو مسلمان مردوں کے لیے حلال فرمادیا اور مسلمان عورتوں کو اہلِ کتاب کے مردوں پر حرام فرمادیا۔ علامہ قرطبی مالکی فرماتے ہیں: "لم یحل اللہ مومنۃ لکافر"۔ (قرطبی ج۱۸ ص۸۵) اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورت کو کسی کافر کے لیے حلال نہیں فرمایا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "لا الٰہ الا اللہ! مسلمان عورت کا نکاح نصرانی وغیرہ کسی کافر سے نہیں ہوسکتا، اگر ہوگا زنائے محض ہوگا۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: "لاھن حل لھم ولاھم یحلون لھن" نہ مسلمان عورتیں کافروں کو حلال ہیں اور نہ کافر مسلمان عورتوں کو حلال"۔ (فتاویٰ افریقیہ ص۱۰۳)

(۲) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ" (البقرۃ:۲۲۱) مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ اس آیت میں مشرکہ عورتوں سے نکاح کی علی الاطلاق ممانعت فرمادی گئی

لیکن بعد میں کتابیہ کو اس آیتِ مبارکہ کے عموم سے خاص کر کے اس سے نکاح کو جائز قرار دے دیا گیا۔ ارشادِ ربانی ہے: ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' (المائدہ:۵) (حلال ہیں) پاکدامن مومنہ عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان کی جنہیں کتاب دی گئی۔ صاحبِ فتح القدیر علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: ''ولا تنكحوا المشركاتِ نسخت فی حقِ اهل الكتابِ المثلثين وغيرهم باية الكتاب وبقى من سواهم تحت المنع''۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۲۲۹)

یعنی مشرکات سے نکاح نہ کرنے کا حکم اہلِ کتاب کے حق میں سورۃ المائدہ کی آیت سے منسوخ کر دیا گیا' خواہ اہل کتاب تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہوں یا دوسرے ہوں' اور اہلِ کتاب کے ماسوا بقیہ دیگر مشرکین سے نکاح بدستور منع ہے۔

علامہ ابنِ ہمام کی اس عبارت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ اہل کتاب و دیگر مشرکین حکمِ نکاح میں یکساں نہیں ہیں وہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کتابیہ عورت خواہ تثلیث کا عقیدہ رکھتی ہو اس کے باوجود نکاح کرنا جائز ہے' تاہم یہاں یہ بات واضح رہے کہ فقہاء کرام نے اس نکاح سے بچنا ہی بہتر قرار دیا ہے' جیسا کہ درمختار ج ۴ ص ۱۰۱' تبیین الحقائق ج ۲ ص ۴۷۷' مجمع الانہر ج ۱ ص ۴۸۳' اور دیگر کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے' اس لیے وہ مسلمان جو اپنی کم علمی یا سادہ طبیعت کی وجہ سے اپنے ایمان کو بچانے پر قادر نہ ہو' وہ صرف مسلمان عورت ہی سے نکاح کرے۔ کتابیہ سے نکاح کر کے اپنا ایمان خطرہ میں نہ ڈالے۔ مفسر قرآن حضرت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ نعمۃ الباری لکھتے ہیں: اس نکاح میں چار باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے: اوّلاً یہ کہ اپنا ایمان بچا سکے' اس (کتابیہ) کی صُحبت سے خود عیسائی یا یہودی نہ بن جائے۔ دوسرے یہ کہ اپنے بچوں اور گھر والوں کو بھی کفر سے بچا سکے' ایمان پر قائم رکھ سکے۔ تیسرے یہ کہ اس کتابیہ سے دلی محبت اور اس کی طرف میلان پیدا نہ ہو۔ رب فرماتا ہے: ''وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ'' (ھود:۱۱۳) ظلم کرنے والوں کی طرف میلان نہ رکھو' ورنہ تمہیں بھی جہنم کی آگ چھوئے گی۔ چوتھے یہ کہ اس کتابیہ کو اپنا' اپنی قوم اور اپنے ملک کا رازدار نہ بنائے۔ جس سے وہ ہم کو نقصان پہنچا سکے۔ جو شخص اتنی احتیاطیں کر سکے وہ اس نکاح کی جرأت کرے۔ ورنہ یہ نکاح اس کے دین' ایمان' قوم بلکہ ملک کے لیے زہر قاتل ہو

گا۔ (تفسیر نعیمی ج ۶ ص ۲۱۸۔۲۲۱، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، لاہور)

علاوہ ازیں کتابیہ عورت کی وجہ سے عموماً گھروں میں یا کم از کم بچوں میں اخلاقی خرابیاں در آتی ہیں اور اسلامی تہذیب کی خلاف ورزی کو فروغ ملتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس نکاح کے سماجی اور سیاسی نقصانات کی وجہ سے اس کو شدید ناپسند جانتے تھے۔ آپ کو جب اطلاع ملی کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے مدائن پہنچ کر ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا ہے تو آپ نے اُن کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دے کر فارغ کرو۔ حضرت حذیفہ نے جواب میں لکھا کہ کیا یہ عورت میرے لیے حرام ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا، لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاک دامنی نہیں ہے، اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانے میں اس راہ سے فحاشی و بدکاری داخل نہ ہو جائے۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۳۲۴) علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت طلحہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہما کو بھی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح پر سخت تنبیہ فرمائی اور حکم دیا کہ انہیں طلاق دے کر فارغ کریں۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان عورتوں سے ہونے والی اولاد کے بگڑنے کا خطرہ ہوتا تھا اور یہ ڈر کہ ایک گھر میں کفار اور مسلمانوں کے اختلاط کی وجہ سے تہذیبوں میں ٹکراؤ لازم آئے گا۔

(فتح القدیر ج ۳ ص ۲۳۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

رہا یہ سوال کہ مشرکہ سے نکاح کو ممنوع اور کتابیہ (اگرچہ تثلیث کا عقیدہ رکھتی ہو) سے نکاح کو جائز کیوں رکھا گیا؟ اس حوالے سے فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ کافرہ مشرکہ عورت اور مسلمان کے درمیان کسی بھی درجہ کی مطابقت نہیں ہے کیونکہ وہ سرے سے اللہ، اس کے رسول ﷺ، ملائکہ، حشر و نشر وغیرہ کی منکر ہوتی ہے۔ جب کہ کتابیہ عورت اصولِ دین (عبادت و رسالت و عقیدہ آخرت) میں ہمارے ساتھ مشترک ہے، اس بنیاد پر کتابیہ سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا تاکہ نکاح کے ذریعے اسے اسلام میں داخل کرنا آسان ہو، برخلاف کافرہ اور مشرکہ کے، کہ اسے ہمارے مذہب سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں، لہٰذا اس سے اسلام کی امید رکھنا بہت بعید ہے، اس بنیاد پر اس سے نکاح کو حرام قرار دیا گیا۔ (دیکھئے: بدائع الصنائع ج ۲ ص ۴۲۶، حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۳۵۴) (اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھئے (فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۴۰۰) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نابالغی کی حالت میں نانی کے کرائے ہوئے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

سرحد کی ایک عدالت میں ایک لڑکی کی طرف سے تنسیخ نکاح کے لیے خیار بلوغ کا حق استعمال کرتے ہوئے درخواست داخل کی گئی۔ عدالت نے یک طرفہ گواہی کے بیان کی روشنی میں تنسیخ نکاح کا حکم جاری کر دیا۔ تو کیا یہ نکاح منسوخ ہو گیا جب کہ یہ نکاح لڑکی کی نانی نے کرایا تھا حالانکہ چچا موجود تھا۔

برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔

[سائل: فضل غنی نارتھ ناظم آباد]

جواب:

اس سوال کے جواب سے قبل چند اصول سمجھنا ضروری ہے:

★ نکاح کی ولایت اوّلاً ان مردوں کو حاصل ہے جو عصبہ بنفسہ کہلاتے ہیں۔ اور وہ بالترتیب بیٹا، باپ، بھائی اور چچا ہیں۔ اگر یہ اور ان کے اصول وفروع موجود نہ ہوں تو پھر ولایت ان عورتوں کو حاصل ہوگی: (۱) ماں پھر دادی پھر نانی (۲) بیٹی پھر پوتی پھر نواسی (۳) اگر یہ نہ ہوں تو پھر نانا پھر سگی بہن پھر سوتیلی (۴) اگر یہ بھی نہ ہوں تو بالترتیب ان کی اولاد۔ (۵) اگر وہ بھی نہ ہوں تو پھوپھی، پھر ماموں، پھر خالہ، پھر چچازاد بہن پھر بالترتیب ان کی اولاد۔

★ دوسرا اصول یہ سمجھنا چاہیے کہ جن مردوں کو ولایتِ نکاح حاصل ہے ان میں سے کسی ایک کے بھی موجود ہوتے ہوئے کوئی عورت (ماں، نانی وغیرہا) تصرف کا حق نہیں رکھتی۔ اگر ایسی صورت میں وہ تصرف کرے گی تو یہ نکاح فضولی ہوگا اور اصل ولی کی اجازت پر موقوف رہے گا۔ اگر اس نے اجازت دیدی تو نکاح صحیح ہوگا ورنہ نہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۵۴۰، مطبوعہ لاہور)

★ تیسرا اصول یہ سمجھنا چاہیے کہ نابالغہ کا نکاح کرانے والا باپ دادا کے علاوہ کوئی اور ہو تو

نابالغہ کو بالغ ہوتے ہی فسخِ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۴ ص ۱۲۹) یعنی جب کہ لڑکی بالغ ہوتے ہی کسی کو گواہ بنائے کہ میں نے اس نکاح کو فسخ کر دیا' مجھے ناپسند ہے یا اور کوئی ایسی بات جس سے ناراضی ثابت ہوتی ہو۔ اگر لڑکی نے بلوغت کے بعد ایک لحہ بھی بے عذر خاموشی اختیار کی یا کسی دوسرے کام میں مشغول ہوئی تو وہ نکاح لازم قرار پائے گا۔

(ہدایہ اولین ص ۳۱۷' فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۵۴۰)

مذکورہ اصول کی روشنی میں پوچھے گئے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب مدّعیہ کا چچا موجود ہے تو نانی کو نکاح کرانے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اس کے باوجود نانی نے مدّعیہ کا (بہ حالت نابالغی) نکاح کر دیا۔ لہٰذا شرعی نقطہ نظر سے یہ نکاح چچا کی اجازت پر موقوف تھا۔ اگر انہوں نے مدّعیہ کے نکاح کو درست قرار دیا تھا تو یہ نکاح درست ہوگیا اور اگر انہوں نے نکاح کو رد کر دیا تھا تو شرعاً یہ نکاح صحیح نہ ہوا۔

بہرصورت چونکہ یہ نکاح باپ یا دادا کا کرایا ہوا نہیں ہے اس لیے ذکر کردہ اصول کے مطابق مدّعیہ نابالغہ کو بالغ ہوتے ہی فسخِ نکاح کا حق حاصل تھا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مدّعیہ نابالغہ نے اگر بالغ ہوتے ہی بغیر کسی عذر کے فی الفور نکاح کو رد نہیں کیا بلکہ کچھ لمحات گزار کر نکاح کو فسخ کیا تو شرعاً یہ فسخ درست نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی عذر کی وجہ سے فی الفور نکاح کو رد نہ کر سکی اور عذر کے زائل ہونے کے بعد فسخِ نکاح کا دعویٰ کر دیا تو شرعاً نکاح فسخ ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مدّعیہ کا نکاح اس کی نانی نے کرایا تھا لہٰذا مدّعیہ کو بالغ ہوتے ہی فی الفور نکاح کو فسخ کرنے کا حق حاصل تھا' سو اگر مدّعیہ نے بالغ ہوتے ہی کسی کو گواہ بنا کر نکاح کو فسخ کیا ہے تو قاضی کے حکم کے مطابق فسخ نکاح درست ہے اور اگر مدّعیہ نے فسخِ نکاح کا دعویٰ اپنے بالغ ہونے کے ساتھ فی الفور نہیں کیا تھا تو یہ نکاح لازم ہوگیا اور قاضی کا فسخِ نکاح درست نہیں ہے۔

(بدائع الصنائع ج ۲ ص ۴۹۴' در مختار مع رد المختار ج ۴ ص ۱۳۰-۱۲۹' البحر الرائق ج ۳ ص ۱۲۰' فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۵۲۱' بہار شریعت حصہ ۷ ص ۲۶) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

بدکاری کرنے والے مرد و عورت کا باہمی نکاح اور اسقاطِ حمل کا شرعی حکم

سوال:

ایک لڑکے اور لڑکی نے (معاذ اللہ) زنا کاری کی جس کے نتیجے میں حمل ٹھہر گیا جو کہ چھ ماہ کا ہے۔ لڑکا اور لڑکی نکاح کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ بچہ گرا کر نکاح کریں گے۔ کیا وہ دونوں آپس میں نکاح کر سکتے ہیں اور بچہ گرانا کیسا ہے؟

[سائل: عبدالرب' کراچی]

جواب:

زنا کاری شرعاً اشد حرام اور گناہ کبیرہ ہے جس سے توبہ کرنا نہایت لازم اور ضروری ہے۔ تاہم ایسے دونوں مرد و عورت کا آپس میں نکاح کرنا جائز ہے بشرطیکہ ان کے درمیان کوئی اور وجہ حرمت نہ ہو۔ علامہ قرطبی مالکی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسی آدمی نے ایک عورت سے بدکاری کی تو آپ نے ان دونوں کو سزا کے طور پر سو کوڑے لگوائے پھر ان کا آپس میں نکاح کر دیا۔ (تفسیر قرطبی ج ۶ ص ۱۵۷)

ہمارے دیگر فقہاء نے بھی اس نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔

(دیکھئے: درمختار ج ۴ ص ۱۰۶' فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۳۲۴' ۴۲۹' بہار شریعت حصہ ۷ ص ۱۸)

رہا یہ مسئلہ کہ عورت کو جو حمل ٹھہرا ہو اس کو گرانا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حمل چھ ماہ کا ہو چکا ہے اس لیے اس کو گرانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ حمل ٹھہرنے کے چار ماہ بعد بچے کے اندر روح پھونک دی جاتی ہے۔ (بخاری ج ۱ ص ۴۵۶) اور جب روح پھونک دی جاتی ہے تو وہ جاندار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کو گرانا ایک جاندار کو قتل کرنا ہوگا جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر حمل چار ماہ سے کم کا ہو تو کسی عذر کی بناء پر اس کو گرانا جائز ہے۔

علامہ شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"لو ارادت القاء الماء بعد وصوله الی الرحم قالوا ان مضت مدة ينفخ

فیه الروح لا یباح لها و النفخ مقدر بمائة و عشرین یوما بالحدیث''.

(فتاویٰ شامی ج۵ ص۳۲۹)

یعنی اگر عورت رحم میں نطفہ پہنچنے کے بعد اس کو گرانے کا ارادہ کرے تو فقہاء نے کہا ہے کہ اگر اتنی مدت گزر گئی ہے جس میں روح پھونک دی جاتی ہے تو یہ جائز نہیں ہے اور حدیث کے مطابق یہ مدت چار ماہ ہے۔

لہٰذا سوال مذکور میں لڑکی کا حمل گرانا جائز نہیں ہے' کیونکہ حمل چھ ماہ کا ہو چکا ہے۔ اسی حالت میں دونوں کا نکاح کر دیا جائے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی شخص کا اپنے چچازاد بھائی کی بیٹی سے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

درج ذیل صورت میں طارق کا نکاح اپنے چچازاد بھائی کی بیٹی (حنا) سے ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اللہ یار (والد)

عبدالقیوم (بیٹا) + آسیہ (زوجہ)　　　سلیم (بیٹا) + شاہجہاں (زوجہ)

عارف (بیٹا)　　　طارق (بیٹا)　　　حنا (بیٹی)

واضح رہے کہ مذکورہ صورت میں آسیہ اور شاہ جہاں آپس میں بہنیں ہیں اور عبدالقیوم اور سلیم آپس میں بھائی ہیں۔ [سائل: عبدالحق قادری' لانڈھی]

جواب:

صورت مسئولہ میں طارق کا نکاح اپنے چچازاد بھائی عارف کی بیٹی حنا کے ساتھ جائز ہے' بہ شرطیکہ کوئی اور وجہ حرمت نہ ہو۔ کیونکہ چچیرے ممیرے رشتوں کو شریعت مطہرہ نے جائز رکھا ہے۔ (فتاویٰ شامی ج۴ ص۸۱)

زیر بحث مسئلہ میں نکاح کے جائز ہونے کی واضح مثال سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

الکریم کا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا عم زاد کی صاحبزادی تھیں۔ فرق یہ ہے کہ ابو طالب کی زوجہ یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی والدہ اور نبی اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ آپس میں سگی بہنیں نہیں تھیں۔ (جیسا کہ زیر بحث مسئلہ میں آسیہ اور شاہجہاں آپس میں بہنیں ہیں) لیکن اس سے نفس مسئلہ پر کوئی فرق نہیں آتا۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

کسی عورت کا اپنی والدہ کے خالہ زاد اور اپنے والد کے ماموں زاد بھائی سے نکاح کا حکم

سوال:

مسمی ارشاد جو کہ ہماری والدہ کی خالہ اور ہمارے والد کے ماموں کا لڑکا ہے یعنی دو رشتے ہیں' اس سے میری بہن کا نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟ [سائل: محمد کامران' لانڈھی]

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائل کی بہن کا والدہ کی خالہ اور والد کے ماموں کے لڑکے ارشاد سے نکاح جائز ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے: "**تحل بنات العماتِ والاعمام والخالات والاخوال**" (ردالمحتار علی الدر المختار ج ۴ ص ۸۱) چچا' پھوپھی' خالہ اور ماموں کی لڑکیوں سے نکاح جائز ہے' اور جب اپنے ماموں اور خالہ وغیرہا کی لڑکیوں سے نکاح جائز ہے تو ماں باپ کے خالہ اور ماموں کی لڑکی' لڑکے سے نکاح بھی جائز ہوگا بشرطیکہ خالہ ماموں کی لڑکی' لڑکے کے ساتھ کوئی اور سبب حرمت نہ ہو۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: باپ' ماں' دادا' دادی' نانا' نانی وغیرہم اصول کی پھوپھیاں یا خالائیں اپنی پھوپھی اور خالہ کے حکم میں ہیں۔ (بہار شریعت حصہ ۷ ص ۱۳)

چنانچہ جس طرح اپنی خالہ اور ماموں کے لڑکے سے نکاح جائز ہے اسی طرح اپنے والدین کے ماموں اور خالہ کے لڑکے سے بھی نکاح جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

دو ایسی عورتیں جو آپس میں سوتیلی ماں اور بیٹی کا رشتہ رکھتی ہوں ان سے کسی ایک شخص کے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

دو عورتیں جو آپس میں سوتیلی ماں اور سوتیلی بیٹی کا رشتہ رکھتی ہوں ان کو کوئی شخص اپنے نکاح میں جمع کرسکتا ہے یا نہیں؟ [سائل: غلام حسن قادری' یاسین آباد]

جواب:

ایسی دو عورتیں جو آپس میں سوتیلی ماں اور سوتیلی بیٹی کا رشتہ رکھتی ہوں ان دونوں سے بیک وقت نکاح کرنا جائز ہے۔ کیونکہ شرعاً ان دونوں کے درمیان نہ قرابت ہے نہ رضاعت۔ اور جب قرابت و رضاعت دونوں موجود نہیں ہیں تو دونوں کو نکاح میں جمع کرنا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: ''لا باس بان یجمع بین امرءۃ و بنت زوج کان لها من قبل لانه لا قرابة بینهما ولا رضاعة'' عورت اور اس کے پہلے شوہر سے جو بیٹی ہو ان کو نکاح میں جمع کر سکتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے درمیان قرابت اور رضاعت دونوں نہیں ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

دو ایسی عورتیں جو آپس میں ساس اور بہو کا رشتہ رکھتی ہوں ان سے کسی ایک شخص کے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

شاہد اور ناصر دو بھائی تھے۔ شاہد نے شادی کی پھر اس سے ایک لڑکا ہوا پھر شاہد فوت ہوگیا۔ شاہد کی بیگم سے چھوٹے بھائی ناصر نے شادی کرلی کچھ عرصہ بعد شاہد کا لڑکا بھی فوت ہوگیا اور ناصر نے اس کی بیگم سے بھی شادی کرلی۔ کیا یہ دونوں عورتیں ناصر کے نکاح میں بیک وقت جمع ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ [سائل: قاری عبدالوہاب' آزاد کشمیر]

جواب:

فقہ حنفی کی مستند کتب میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ ایسی دو عورتیں جن میں سے ایک کو مرد فرض کیا جائے تو ان کا آپس میں نکاح نہ ہوسکتا ہو' ان کو اپنے نکاح میں جمع کرنا جائز نہیں۔

(ہدایہ اولین ص ۳۲۸' درِّ مختار ج ۴ ص ۹۳)

صورت مسئولہ میں شاہد کی بیوی اور اس کے لڑکے کی بیوی آپس میں ساس اور بہو ہیں' ان میں سے اگر ساس کو مرد فرض کیا جائے تو ان کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا' جب کہ اگر بہو کو مرد فرض کیا جائے تو ان کا آپس میں نکاح ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ساس اور بہو کو نکاح میں جمع کرنا جائز ہے۔

علامہ ابن نجیم علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''وکذلك بين المرءة و امرءة ابنها فان المرءة لو فرضت ذكرا لحرم عليه االتزوج بامرءة ابنه ولو فرضت امرءة الابن ذكرا لجاز له التزوج بالمرءة لانه اجنبي عنها''. (البحر الرائق ج ۳ ص ۹۸' مجمع الانہر ج ۱ ص ۳۸۰' درِّ مختار ج ۴ ص ۹۵)

یعنی اسی طرح عورت اور اس کی بہو کا کسی ایک شخص کے نکاح میں جمع ہونا جائز ہے کیونکہ ان دونوں عورتوں میں اگر ساس کو مرد تصور کیا جائے تو اس پر اپنی بہو کے ساتھ نکاح حرام ہوگا لیکن اگر بہو کو مرد فرض کیا جائے تو اس کے لیے اس عورت کے ساتھ نکاح جائز ہوگا کیونکہ اب وہ اس عورت کے لیے اجنبی ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

دودھ شریک سوتیلے بھائی بہنوں کے باہمی نکاح کا شرعی حکم

سوال:

زید نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا۔ پھر جب زید کی اس پھوپھی کا انتقال ہوا تو پھوپھا نے دوسرا نکاح کیا۔ اس سے جو اولاد ہوئی اس میں سے ایک لڑکی سے زید کا نکاح کر دیا گیا۔ اب زید کے اس سے دس بچے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا نکاح درست ہوا یا نہیں؟

اگر نہیں تو اب کیا کیا جائے؟ اور اولاد کا کیا حکم ہے؟ [سائل: محمد مراد کراچی]

جواب:

زید نے جب اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تو وہ زید کی رضاعی ماں اور پھوپھا رضاعی باپ ہوگیا' اور پھوپھا کی دوسری زوجہ زید کی سوتیلی رضاعی ماں ہوگئی اور اس سے ہونے والی اولاد زید کے لیے رضاعی سوتیلے بھائی بہن ہوگئے۔ اور جس طرح نسبی سوتیلے بھائی بہن ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں اسی طرح دودھ شریک سوتیلے بھائی بہن بھی ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''یحرم من الرضاع ما یحرم من الولادۃ''۔ یعنی نسب کی وجہ سے جو رشتے حرام ہیں وہ دودھ کی وجہ سے حرام ہیں۔ (صحیح بخاری' مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۳)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: بہن خواہ حقیقی ہو یعنی ایک ماں باپ سے یا سوتیلی' کہ باپ دونوں کا ایک ہے اور مائیں دو' یا ماں ایک ہے اور باپ دو' سب حرام ہیں۔ (مزید فرماتے ہیں کہ:) بچہ نے جس عورت کا دودھ پیا وہ اس بچہ کی ماں ہو جائے گی اور اس کا شوہر اس دودھ پینے والے بچہ کا باپ ہو جائے گا اور اس عورت کی تمام اولادیں اس کے بھائی بہن' خواہ اسی شوہر سے ہوں یا دوسرے شوہر سے' اس کے دودھ پینے سے پہلے کی ہوں یا بعد کی یا ساتھ کی۔ اور عورت کے بھائی اور ماموں اس کی بہن خالہ' یونہی اس شوہر کی اولادیں اس کے بھائی بہن اور اس کے بھائی اس کے چچا اور اس کی بہنیں اس کی پھوپھیاں' خواہ شوہر کی یہ اولادیں اسی عورت سے ہوں یا دوسری سے۔

(بہار شریعت حصہ ۷ ص ۱۳۔۱۹)

ذکر کردہ حدیث پاک اور فقہی عبارت سے معلوم ہوا کہ جس طرح نسبی سوتیلے بھائی بہن ایک دوسرے کے لیے محرم ہیں اسی طرح دودھ کے رشتے کے سوتیلے بھائی بہن بھی ایک دوسرے کے لیے محرم ہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کا اپنے پھوپھا کی لڑکی سے نکاح درست نہ ہوا' کیونکہ وہ دودھ کے رشتے سے زید کی سوتیلی بہن ہے۔ سو دونوں پر لازم ہے کہ فی الفور ایک دوسرے سے جدائیگی اختیار کریں۔ اور دونوں کے درمیان ہونے والا یہ نکاح چونکہ شرعاً منعقد ہی نہیں ہوا تھا اس لیے عورت کو کسی سے بھی نکاح کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ جہاں تک اولاد کا

مسئلہ ہے سو اس کا نسب زید سے ثابت ہوگا۔ (کذا فی الفتاویٰ الرضویہ ج ۱۳ ص ۳۷۵)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

خالہ زاد رضاعی بہن سے نکاح کا شرعی حکم

سوال:

زید کی خالہ نے زید کو بھولے سے بچپن میں دودھ پلا دیا تھا اس کے بعد کچھ عرصہ تک جان بوجھ کر اسے دودھ پلایا تھا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا اپنی خالہ کی بیٹی سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم مدلل جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

[سائل: محمد شہزاد قادری لیاقت آباد]

جواب:

صورت مسئولہ میں زید کا اپنی خالہ کی بیٹی سے نکاح جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جس خالہ نے زید کو دودھ پلایا ہے وہ شرعاً زید کی رضاعی ماں اور اس کی بیٹیاں زید کی رضاعی بہنیں ہوگئیں۔ تو جس طرح کسی بھی شخص کا اپنی سگی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح اپنی رضاعی بہن سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ'' (النساء: ۲۳) (تم پر حرام کی گئیں) تمہاری رضاعی بہنیں، اور حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یحرّم من الرضاعة ما یحرّم من النسب''۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۶۰، صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۶۶، ترمذی ج ۱ ص ۱۳۶) جو رشتے نسب کی بنیاد پر حرام ہیں وہ رضاعت (دودھ) کی بنیاد پر حرام ہیں۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اجمعوا علی انتشار الحرمة بین المرضعة و اولاد الرضیع و اولاد المرضعة و مذهب کافة العلماء ثبوت حرمةِ الرضاع بینه و بین المرأة و یصیر ولدا له و اولاد الرجل اخوة الرضیع و اخواته''. (عمدۃ القاری شرح البخاری ج ۱۳ ص ۲۹۱)

یعنی تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دودھ پلانے والی عورت اور اس کی اولاد اور دودھ پینے والے کی اولاد آپس میں ایک دوسرے پر حرام ہیں اور تمام علماء اس بات پر متفق

ہیں کہ دودھ پینے کی وجہ سے وہ عورت جس نے دودھ پلایا اس کے شوہر اور دودھ پینے والے بچے یا بچی کے درمیان رشتۂ حرمت ثابت ہوگا اور دودھ پینے والا بچہ یا بچی اس آدمی کی اولاد بن جائے گا اور اس آدمی کے بچے' بچیاں' دودھ پینے والے کے بھائی اور بہن بن جائیں گے۔

اسی طرح اس آدمی کی اولاد کے دیگر رشتہ دار حتی کہ ماموں' چچا' خالہ اور پھوپھی وغیرہ سب شرعاً اس بچہ یا بچی کے ماموں' خالہ' پھوپھی اور چچا کہلائیں گے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

تنہا عورت کا کسی کو دودھ پلانے کے اقرار کرنے کا شرعی حکم

سوال:

مسماۃ زینب کی آخری اولاد ایک سات سالہ بچی ہے۔ بعد ازاں اس کے بیٹے کے ہاں بچی پیدا ہوئی جس کا نام کینجھر رکھا گیا۔ کینجھر جب تیرہ سال کی عمر کو پہنچی تو زینب کے پاس اس کے نواسے نے کینجھر سے نکاح کا پیغام بھیجا' جس پر زینب نے کہا میں نے اپنی پوتی کو دودھ پلایا ہے۔ زینب کی اپنی بیٹیاں جن کی عمر پچیس اور تیئس سال ہے' انہوں نے زینب سے کہا کہ کینجھر نے تو بوتل کے دودھ پر پرورش پائی ہے اور اس وقت تیرے پاس سات سالہ بچی تھی' اس وقت تیرے پستانوں میں دودھ کہاں سے آیا؟ تو جھوٹ بولتی ہے۔

تقریباً دو مہینوں کے بعد زینب نے کہا کہ پتا نہیں میں نے دودھ پلایا تھا یا نہیں' مجھے یاد نہیں ہے۔ اب یہ ہے کہ میرا نواسا گاؤں سے شہر میں آجائے اور ادھر مکان وغیرہ بنائے تو یہ رشتہ اس کو دے دیں گے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے بیٹے (زینب کے نواسے) کے لیے یہ رشتہ جائز ہوگا یا نہیں؟ براہ کرم جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ [سائلہ: سعیدہ بیگم' سندھ]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ مذکورہ رشتہ شرعاً جائز ہے۔ کیونکہ تنہا عورت کا بیان شرعاً کافی نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں کہ بعد میں اپنے گذشتہ بیان میں شک وشبہ کا اظہار کرے۔ فتاویٰ نوریہ میں عالمگیری کے حوالہ سے ہے کہ: "ولا یقبل فی الرضاع الا شھادۃ رجلین اورجل و امرأتین عدول کذا فی المحیط" (فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۶۱۲) دودھ کے رشتہ کے ثبوت کے لیے صرف دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی جو کہ سب اصحابِ عدالت ہوں۔

اس طرح کی عبارت فقہ حنفی کی تمام مستند کتب میں موجود ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ تنہا ایک عورت کا بیان ہے وہ بھی بعد میں یادداشت کا عذر پیش کر رہی ہے۔ اس لیے رضاعی رشتہ ثابت نہیں ہوگا اور دونوں کا نکاح آپس میں شرعاً جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بیوی کے اپنے بہنوئی کے ساتھ غیر ضروری تعلقات اور بلا عذر شرعی میکے میں بیٹھے رہنے کا شرعی حکم

سوال:

(۱) اگر زید اپنی بیوی سے کہے کہ وہ اپنے بہنوئی سے نہ ملے اور نہ ہی کسی قسم کا تعلق رکھے مگر بیوی اس حکم کی صریح خلاف ورزی کرے۔

(۲) اگر زید اپنی بیوی کو منع کرے کہ وہ اپنے بہنوئی سے بات چیت نہ کرے بیوی بظاہر زید کو یقین دلاتی رہے کہ وہ اپنے بہنوئی سے نہ تو ملتی ہے اور نہ ہی بات چیت کرتی ہے۔ شوہر کو یقین دلانے کے لیے جھوٹی قسمیں بھی کھاتی رہے۔ یہاں تک کہ سال ڈیڑھ سال گزرنے کے بعد یہ بات بہنوئی خود ظاہر کر دیتا ہے۔ تو شرع اس معاملہ میں کیا کہتی ہے؟

(۳) اگر بیوی بغیر کسی سبب یعنی اخلاقی، شرعی یا قانونی وجوہ کے بغیر اپنے میکے میں بیٹھی رہے تو کیا حکم ہے؟ [سائل: محمد عامر قادری، لیاقت آباد]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ کسی بھی عورت کا بلاضرورت غیر محرم مرد سے ملنا اور باتیں کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور ہر وہ بات جو خلافِ شرع ہو اس سے روکنا شوہر پر لازم ہے۔ سوال مذکور میں زید کی بیوی کے اس کے بہنوئی سے تعلقات کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ شرعاً جائز نہیں ہیں۔ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے سختی سے روکے۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ (شوہر اپنی بیوی کو) غیروں کے یہاں جانے یا ان کی عیادت کرنے یا شادی وغیرہ کی تقریبوں میں شرکت سے منع کرے۔ بغیر اجازت جائے گی تو گناہ گار ہوگی اور اجازت سے گئی تو دونوں گناہ گار ہوں گے۔

(درمختار و عالمگیری، بہار شریعت حصہ ۸ ص ۸۹)

لہٰذا شوہر اپنی ذمہ داری پوری کرے۔ عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ موافقِ شرع باتوں میں خاوند کی فرمانبرداری کرے۔ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے بہترین عورت کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ عورت کہ جب شوہر اسے حکم دے تو فرماں برداری کرے اور ایسی بات جو ناپسندیدہ ہو اسے اپنی ذات اور اپنے مال میں حائل کر کے شوہر کی مخالفت نہ کرے۔ (سنن نسائی: ۳۲۳۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۲) لہٰذا عورت زید کی جائز بات کو تسلیم کرے اور اس کی بھرپور فرمانبرداری کرے۔ اور اس کی ناراضی سے بچے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسی عورت جس سے اس کا خاوند ناراض ہو اللہ تعالیٰ اس عورت کی نماز قبول نہیں فرماتا۔ (شعب الایمان للبیہقی: ۸۶۰۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۷۱)

رہی یہ بات کہ کوئی عورت کسی شرعی، قانونی اور اخلاقی وجہ کے بغیر میکے بیٹھی رہے، تو یقیناً یہ بھی سخت حرام اور ناجائز ہے۔ اور چونکہ یہ بات شوہر کی ناراضی کا باعث ہے اس لیے حدیثِ مذکور کی روشنی میں عورت کو اپنی نمازوں کی فکر کرنی چاہیے۔ جہاں تک اس کے شرعی حکم کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں عورت شوہر کی طرف سے خرچہ کی مستحق نہیں ہے۔ بہار شریعت میں درمختار اور شامی کے حوالہ سے ہے کہ "عورت شوہر کے یہاں سے ناحق چلی گئی تو نفقہ نہیں پائے گی"۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۸۴)

یہاں ہم بہنوئی کے حوالہ سے خصوصاً اور زید کی بیوی کے لیے شرعی حکم کو مزید واضح

کرنے کی غرض سے یہ تحریر کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ نے بہت واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ بہنوئی عورت کے لیے محض اجنبی ہے بلکہ اس کا نقصان خالص بیگانے سے زیادہ ہے' کیونکہ بیگانہ شخص گھر میں آنے سے کتراتا ہے جب کہ بہنوئی اندر رہ کر فساد اور خرابی پھیلاتا ہے اور شوہر جب منع کرتا ہے اور ناراض ہوتا ہے اس کے باوجود عورت نہ مانے تو وہ اللہ عزوجل کے غضب میں گرفتار ہوگی۔ جب تک شوہر ناراض رہے گا عورت کی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی اللہ کے فرشتے عورت پر لعنت کریں گے۔ اگر طلاق کا مطالبہ کرے گی تو منافقہ ہوگی۔ (آخر میں فرماتے ہیں کہ) جو لوگ عورت کو بھڑکاتے ہیں شوہر سے بگاڑ پر ابھارتے ہیں وہ شیطان کے پیارے ہیں۔

(ملخصاً وموضحاً از فتاویٰ رضویہ ج۱۰ ص ۲۲۳) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

زانی کے بیٹے اور زانیہ کی بیٹی کا آپس میں نکاح

سوال:

زانی کے بیٹے اور زانیہ کی بیٹی کا آپس میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمادیں۔ [سائل: نور عالم' بالاکوٹ]

جواب:

زانی کے بیٹے اور زانیہ کی بیٹی یعنی زانی اور زانیہ کی اولاد کا آپس میں نکاح کرنا شرعاً جائز ہے۔ چنانچہ علامہ شامی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''یحل لاصول الزانی وفروعه اصول المزنی بها وفروعها'' (فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۸۶) زانی کے اصول وفروع کے لیے زانیہ کے اصول وفروع حلال ہیں'' وهكذا فی المجلد الاول من فتاویٰ فیض الرسول ص ۵۸۴ 'وفی المجلد الاول من الفتاویٰ المجددية النعيمية''۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ زانی اور زانیہ کے باہمی زنا سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہو اُن دونوں کا آپس میں نکاح جائز نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

عدت کے دوران نکاح کرنا

سوال:

ایک عورت کو طلاق مغلظہ ہوئی ابھی عدت کو چند دن گذرے تھے کہ اس نے کسی اور سے دوسرا نکاح کرلیا۔ آیا یہ نکاح ہوا یا نہیں؟ اور اس عورت کا عدت میں نکاح کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟ [سائل: نسیم فراز کراچی]

جواب:

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ'' مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض آنے تک روکے رکھیں گی۔ (البقرہ: ۲۲۸) اس آیت میں واضح بیان ہے کہ مطلقہ خاتون کی عدت مکمل تین حیض ہے۔ اور یہی عدتِ طلاق ہے۔ اس کے دوران کسی سے نکاح کرنا تو درکنار نکاح کا پیغام دینا بھی حرام ہے۔ حتیٰ کہ اگر نکاح کرلیا تو یہ نکاح سرے سے جائز ہی نہ ہوگا۔ چنانچہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ بہارِ شریعت میں لکھتے ہیں: دوسرے کی منکوحہ سے نکاح نہیں ہوسکتا بلکہ اگر دوسرے کی عدت میں ہو جب بھی نہیں ہوسکتا۔ عدت طلاق کی ہو یا موت کی۔ (بہار شریعت حصہ ۷ ص ۱۸) یہی وضاحت فتاویٰ شامی ج ۵ ص ۱۴۲ میں موجود ہے۔ چونکہ عورت نے عدت کے دوران دوسرا نکاح کر کے شریعت مطہرہ کی کھلی خلاف ورزی کی ہے اس لیے اس پر اور اس کے شوہر پر لازم ہے کہ فوراً ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور آپس میں میاں بیوی کے تعلقات ہرگز قائم نہ کریں۔ اگر کر چکے تھے تو توبہ کریں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

خلع کی صورت میں فریقین پر عائد ہونے والے واجبات کا شرعی حکم

سوال:

خلع کی صورت میں لڑکی اور لڑکی کے گھر والوں پر کن چیزوں کی ادائیگی لازم ہوتی

ہے؟ نیز خلع کی صورت میں لڑکے کو فدیہ اور شادی کے اخراجات بھی دیئے جائیں گے یا نہیں؟ [سائل: سید محمد احمد نقوی لانڈھی]

جواب:

خلع کا حکم یہ ہے کہ اگر زیادتی عورت کی جانب سے ہو تو وہ شوہر کو اپنا مہر معاف کر یگی (اگر لیا نہ ہو) اور اگر لے چکی ہو تو واپس کر یگی۔ اور اگر زیادتی شوہر کی جانب سے ہوئی ہو تو خلع پر مال لینا مکروہ ہے۔ خلع کی صورت میں لڑکے کو شادی کے اخراجات دینا شرعاً لازم نہیں ہے۔ ہاں اگر پہلے سے یہ بات شرائط کے ساتھ فریقین کی رضامندی سے طے پا جائے تو شرائط پر عمل کرتے ہوئے شادی کے اخراجات بھی دیئے جائیں گے۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ لکھتے ہیں: نکاح کی وجہ سے جتنے حقوق ایک دوسرے پر تھے وہ خلع سے ساقط ہو جاتے ہیں اور جو حقوق کہ نکاح سے علاوہ ہیں وہ ساقط نہ ہوں گے۔ عدت کا نفقہ اگرچہ نکاح کے حقوق سے ہے مگر یہ ساقط نہ ہوگا' ہاں اگر ساقط ہونے کی شرط کر دی گئی تو یہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ یونہی عورت کے بچہ ہو تو اس کا نفقہ اور دودھ پلانے کے مصارف ساقط نہ ہوں گے۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۵۰)

مفتی محمد وقار الدین قادری علیہ الرحمۃ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اگر زیادتی شوہر کی ہے تو اسے کچھ مال لینا جائز نہیں ہے' بلکہ خود ہی بیوی کو طلاق دیدے' اسے لٹکا کر نہ رکھے۔ اور اگر زیادتی بیوی کی ہے تو شوہر وہ مال لے سکتا ہے جو شوہر نے دیا ہے' یعنی مہر ادا کر دیا گیا ہے تو واپس لے لے' نیز شوہر نے جو زیورات وغیرہ دیئے ہیں وہ بھی واپس لے سکتا ہے۔ (وقار الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۹۹) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

حرمت مصاہرت کے چند اہم جزئیات پر ایک علمی اور تحقیقی بحث

سوال:

زید نے لاعلمی کی بناء پر بلا شہوت اپنی والدہ ھندہ کے لب پر سب گھر والوں کے سامنے بوسہ لیا۔ آیا زید کے والد عمر کی ھندہ سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوئی یا نہیں؟ دلائل کے ساتھ

قرآن وحدیث کی روشنی میں صورتِ مسئولہ کی تفصیل کے ساتھ وضاحت فرمائیں۔اور اگر پیشانی یا رخسار پر بوسہ لے تو کیا حکم ہے؟ اللہ عزوجل آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین

[سائل: محمد حسام رضا، گلشن اقبال]

دارالافتاء دارالعلوم امجدیہ سے جاری ہونے والا فتویٰ اور تحقیق

جواب:

حرمتِ مصاہرت جس طرح وطی سے ثابت ہوتی ہے اسی طرح دواعی وطی یعنی بشہوت چھونے اور بوسہ لینے اور فرجِ داخل کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوجاتی ہے جب کہ انزال نہ ہوا ہو۔لیکن منہ کا بوسہ لینا مطلقا حرمتِ مصاہرت ثابت کردے گا اگرچہ بوسہ لینے والا شہوت نہ ہونے کا دعویٰ کرے۔چنانچہ بہارِ شریعت میں ردالمحتار کے حوالے سے ہے کہ منہ کا بوسہ لیا تو مطلقا حرمتِ مصاہرت ثابت ہوجائے گی اگرچہ کہتا ہو کہ شہوت سے نہ تھا۔ردالمحتار میں ہے: ''**ومنهم من فصل فی القبلة فقال ان كانت علی الفم یفتیٰ بالحرمة ولا یصدق انه بلا شهوة**''۔(ردالمحتار ص ۳۰۶ ج ۲) بوسہ کے بارے میں امام ظہیرالدین مطلقا حرمت کا فتویٰ دیتے تھے۔چنانچہ اسی ردالمحتار میں ہے: ''**كان الامام ظهیر الدین یفتی بالحرمة فی القبلة مطلقا و یقول لا یصدق فی انه لم یکن بشهوة**''۔(ردالمحتار ج ۲ ص ۳۰۶) امام ظہیر الدین بوسہ میں مطلقا حرمت کا فتویٰ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس مسئلہ میں اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی کہ وہ شہوت سے نہ تھا۔فتاویٰ رضویہ میں اعلیٰ حضرت فتح القدیر کے حوالے سے فرماتے ہیں: بلکہ امام محقق علی الاطلاق کمال الملت والدین محمد بن الھمام قدس اللہ سرہ العزیز نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں تصریح فرمائی ہے کہ جس طرح لبوں کا بوسہ لینا خواہی نہ خواہی بہ نظرِ شہوت قرار پائے گا یہاں تک کہ اگر وہ شخص ادعاء کرے کہ یہ فعل مجھ سے بہ نظرِ شہوت نہ ہوا تو ہرگز قبول نہ کریں گے اور حکم حرمتِ ابدی دیں گے یہی حال بوسۂ رخسار کا ہونا چاہیے کہ یہ بھی بہ شہوت ہی ٹھہرے گا اور بوسہ لینے

والے کا انکار مسموع نہ ہوگا۔(فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۱۲۴-۱۲۳) لہٰذا ان تمام حوالہ جات کی روشنی میں صورتِ مسئولہ میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جائے گی۔ رخسار کا بوسہ لینے کا وہی حکم ہے جو منہ کا بوسہ لینے کا ہے جیسا کہ فتح القدیر کے حوالہ سے گزر چکا۔ البتہ پیشانی کا بوسہ لیتے وقت اگر شہوت تھی تو حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ لہٰذا اب شوہر پر متارکہ واجب ہے یعنی وہ یہ کہے کہ میں نے تجھے چھوڑا۔ جب تک زید متارکہ نہ کرے اور عدت نہ گزرے عورت کو دوسرے سے نکاح حرام ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے:''بحرمة المصاهرة لا یرتفع النکاح حتی لا یحل التزوج بآخر الا بعد المتارکة وانقضاء العدة''۔

واللّٰہ ورسوله اعلم بالصواب' کتبہٗ: ابوالانوار ندیم اقبال سعیدی

زیرِ بحث مسئلہ پر دارالافتاء جامعہ انوار القرآن کی تحقیق

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائل جواب یہ ہے کہ زید کے والد عمر کی اپنی زوجہ ھندہ سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوئی۔ اور ھندہ بدستور اپنے شوہر عمر کے نکاح میں ہے۔ کیونکہ ھندہ کا بوسہ لینے والا اس کا اپنا بیٹا ہے اور بوسہ بھی تنہائی میں نہیں بلکہ سب کے سامنے لیا گیا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ بیٹے نے اپنی والدہ کا بوسہ شہوت کے ساتھ نہیں لیا ہے۔ جیسا کہ سائل نے خود اپنے سوال میں اس بات کی صراحت کی ہے۔ اور جب بلاشہوت یہ بوسہ لیا ہے تو عمر اور ھندہ کے درمیان حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوئی۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:''قبل أم امرأته فی ای موضع کان علی الصحیح حرمت علیه امرء ته ما لم یظهر عدم الشهوة ولو علی الفم''کسی شخص نے اپنی ساس کا بوسہ لیا تو مذہب صحیح کے مطابق خواہ کسی جگہ بھی بوسہ لیا ہو اس شخص پر اس کی بیوی حرام ہو جائے گی (اور یہ حکم اس وقت ہے) جب کہ بوسہ کا بلاشہوت ہونا ظاہر نہ ہو' خواہ منہ پر لیا جائے۔(تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۴ ص ۹۰ طبع جدید)

تنویر الابصار کی اس عبارت میں صراحت ہے کہ بوسہ کی صورت میں (خواہ منہ پر لیا

جائے) حرمت کا فتویٰ اس وقت ہے جب اس کا بلاشہوت ہونا ظاہر نہ ہو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بوسہ کا بلاشہوت ہونا ظاہر ہو تو حرمت کا حکم لاگو نہیں ہوگا۔ چنانچہ علامہ شامی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں:

"لا یصدق اذا ادعی عدم الشهوة الا اذا ظهر عدمها بقرینة الحال"

بوسہ لے کر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ بلاشہوت تھا تو اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا (اور حرمت ثابت ہو جائے گی) ہاں اگر کوئی ایسا قرینہ (اور علامت) پائی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ بوسہ لینا بلاشہوت تھا تو اس صورت میں اس کی بات مان لی جائے گی (اور حرمت ثابت نہیں ہوگی)۔

چند سطور کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"والمعنی حرمت امر ء ته اذا لم یظهر عدم اشتهاء وهو صادق بظهور الشهوة وبالشك فیها امّا اذا ظهر عدم الشهوة فلا تحرم ولو كانت القبلة علی الفم". (ردالمحتار ج ۴ ص ۹۱، طبع جدید)

یعنی اس آدمی پر اس کی بیوی اس وقت حرام ہوگی جب بوسہ کا بلاشہوت ہونا ظاہر نہ ہو۔ یعنی جب شہوت ظاہر ہو اور اس میں شک ہو تب حرمت کا حکم لاگو ہوگا۔ ہاں جب یہ بات ظاہر ہو کہ بوسہ بلاشہوت لیا گیا ہے تو عورت (اپنے شوہر پر) حرام نہیں ہوگی، اگرچہ بوسہ اس کے منہ پر لیا گیا ہو۔

ان عبارات سے جہاں یہ واضح ہوا کہ بوسہ کی صورت میں مطلقاً حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا وہاں یہ بھی واضح ہوا کہ بوسہ خواہ کسی بھی حصہ کا لیا جائے، ہر صورت میں حکم یکساں ہے۔ یعنی اگر شہوت کے ساتھ بوسہ لینا ثابت ہو تو حرمت کا فتویٰ دیا جائے گا اور اگر شہوت کے ساتھ بوسہ لینا ثابت نہ ہو تو حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا اگرچہ عورت کے لب پر بوسہ دیا جائے۔ صاحب خانیہ امام قاضی خان اسی اطلاق کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اما الحرمة بدواعی الوطی اذ مسها او قبلها بشهوة تثبت حرمة المصاهرة وان انكر الشهوة كان القول قوله الا ان یكون مع انتشار الآلة".

یعنی دواعی وطی سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آدمی عورت کو شہوت کے ساتھ چھوئے یا اس کا بوسہ لے تو حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی۔ اگر وہ شہوت کا انکار کرے تو اس کی بات مان لی جائے گی۔ ہاں! اگر اس کا آلہ منتشر ہو تو شہوت سے انکار کرنا تسلیم نہیں کیا جائے گا (کیونکہ آلہ کا منتشر ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ اس نے شہوت ہی کے ساتھ بوسہ لیا ہے)۔

چند سطور کے بعد مزید فرماتے ہیں: ''**لو قبل الرجل ام امرأته یثبت الحرمة ما لم یظهر انه قبلها بغیر شهوة**'' اگر آدمی نے اپنی ساس کا بوسہ لیا تو حرمت ثابت ہو جائے گی بشرطیکہ بوسہ کا بلاشہوت ہونا ظاہر نہ ہو۔ (فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص ۱۶۸-۱۶۷)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ زیرِ بحث مسئلہ کے بارے میں ہمارے اکثر فقہاء نے اپنی کتب میں دو مختلف قول ذکر کیے ہیں۔ ایک امام صدر الشہید علیہ الرحمۃ کا اور ایک امام ظہیر الدّین مرغینانی علیہ الرحمۃ کا۔ ہم نے سابق میں جو تفصیل ذکر کی ہے وہ امام صدر الشہید علیہ الرحمۃ کے قول کے مطابق ہے۔ اس کے برعکس امام ظہیر الدین مرغینانی علیہ الرحمۃ کا قول یہ ہے کہ آدمی خواہ عورت کے منہ پر بوسہ لے یا اس کے رخسار پر لے یا اس کے سر پر، ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی اور ایسا شخص اگر یہ کہے کہ بوسہ بلاشہوت لیا تھا تو اس کی بات بھی نہیں مانی جائے گی اور یہی کہا جائے گا کہ حرمت ثابت ہو چکی ہے۔ یہاں اگر یہ تاویل کر لی جائے کہ امام ظہیر الدین علیہ الرحمۃ کا قول محارم (وہ عورتیں جن سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے) کے استثناء پر محمول ہے، یعنی اس میں محارم خواتین شامل نہیں ہیں تو پھر ان دونوں اقوال میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس تاویل کو تسلیم نہ کرے تو پھر امام صدر الشہید علیہ الرحمۃ کے قول کے راجح ہونے کی حسب ذیل وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ امام صدر الشہید کے قول کو متعدد احادیث سے تائید اور توثیق حاصل ہے۔ کیونکہ احادیث مبارکہ سے یہ امر ثابت ہے کہ باپ اپنی بیٹی کے رخسار، پیشانی اور سر کو چوم سکتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ بیٹا اپنی ماں کی پیشانی اور سر کو بوسہ دے سکتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من قبل بین عینی امه کان له سترا من النار**'' جس نے اپنی ماں کی

دو آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اس کے لیے وہ بوسہ دوزخ کی آگ سے حجاب بن جائے گا۔

(شعب الایمان ج ۶ ص ۱۸۷ رقم: ۷۸۶۱ الدر المنثور ج ۴ ص ۱۷۳ کنز العمال: ۴۵۴۴۲ الکامل لابن عدی ج ۲ ص ۸۰۱)

یہ حدیث اس بات میں تو صریح ہے کہ ماں کی دو آنکھوں کے درمیان بوسہ دینا دوزخ کی آگ سے نجات کا باعث ہے لیکن اشارۃً اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ماں کے چہرے پر بوسہ دینا جائز ہے۔ کیونکہ ماں اور بیٹے کے درمیان جو مقدس رشتہ قائم ہے وہ جس طرح دو آنکھوں کے درمیان بوسہ لینے میں شہوت سے مانع ہے اس طرح پورے چہرے پر کسی بھی جگہ بوسہ لینے میں شہوت سے مانع ہے۔ لہٰذا جس طرح بیٹا اپنی ماں کی دو آنکھوں کے درمیان بوسہ دے سکتا ہے اسی طرح اپنی ماں کے رخسار' اس کے سر اور اس کے منہ پر بھی بوسہ دے سکتا ہے۔ ہماری اس تقریر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے جب اکثر ساتھیوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور حجاج بن یوسف کی طرف چلے گئے تو آپ اپنی والدہ کے پاس حاضر ہوئے اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ آپ کی والدہ نے کچھ نصیحتیں کیں اور آخر میں فرمایا: تم کب تک دنیا میں رہو گے؟ شہید ہو جانا بہت بہتر ہے۔ ''فدنا ابن الزبير فقبّل رأسها'' پھر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما آگے بڑھے اور والدہ کے سر کو بوسہ دیا۔

(تاریخ الامم والملوک للطبری ج ۵ ص ۳۰ مطبوعہ مؤسسۃ الاعلمی بیروت' الکامل لابن اثیر ج ۴ ص ۲۴ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت' البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۶ ص ۹۴۰ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

چونکہ امام ظہیر الدین علیہ الرحمۃ کا فتویٰ مطلقاً حرمت کا ہے (کہ خواہ سر کا بوسہ لیا جائے یا منہ کا یا رخسار کا' ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی اور بلا شہوت ہونے کا دعویٰ بھی نہیں مانا جائے گا) لہٰذا ان کے اس قول کے مطابق لازم آئے گا کہ حضرت ابن زبیر کے اپنی والدہ کے سر پر بوسہ لینے کی وجہ سے والد اور والدہ کے درمیان حرمت مصاہرت ثابت ہو! ''ولا قائل به احدٌ قطعا'' کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے اس واقعہ سے اور اس سے قبل ذکر کردہ حدیث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بیٹا اپنی والدہ کے چہرے کے کسی بھی حصہ پر بوسہ دے سکتا ہے'

بلکہ ہر وہ رشتہ جس میں مرد وعورت کے درمیان شہوت کا تصور معدوم ہو وہاں بوسہ دینا قطعاً موجبِ حرمت نہیں ہوگا۔ چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو چومتے تھے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کو بوسہ دیتی تھیں۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

"مارأیت احدا کان اشبه سمتا وهدیا ودلّا برسول الله ﷺ من فاطمة کانت اذا دخلت علیه قام الیها فأخذ بیدها فقبّلها واجلسها فی مجلسه وکان اذا دخل علیها قامت الیه فأخذت بیدہٖ فقبّلتہٗ واجلستہٗ فی مجلسها".

(سنن الترمذی: ۳۸۷۲، سنن ابوداؤد: ۵۲۱۷، سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۰۱ رقم: ۱۳۵۷۸، مشکوۃ المصابیح ص ۴۰۲ مطبوعہ کراچی)

یعنی میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ سیرت وصورت اور عادت میں رسول اللہ ﷺ کے مشابہ ہو۔ حضرت فاطمہ جب حضور کی خدمت میں آتیں تو آپ ان کے لیے کھڑے ہوجاتے، ان کا ہاتھ پکڑتے، ان کو چومتے اور انہیں اپنے پاس میں بٹھاتے۔ اسی طرح جب حضور انور ان کے پاس تشریف لاتے تو وہ حضور کے لیے کھڑی ہوجاتیں، آپ کا ہاتھ پکڑتیں، آپ کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتیں۔

اس حدیث میں ام المؤمنین نے جو فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ حضرت فاطمہ کو چومتے تھے، اس کی شرح میں علامہ علی قاری حنفی فرماتے ہیں:

"ای بین عینیها اورأسها والاظهر الاوّل لما رواه ابن عدی والبیهقی عن ابن عباس مرفوعا من قبل بین عینی امه کان لهٗ سترا من النار فکانه ﷺ نزلها منزلة امّه تعظیما لها". (مرقات ج ۸ ص ۴۶۹ مطبوعہ کوئٹہ)

یعنی نبی اکرم ﷺ حضرت فاطمہ کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتے تھے یا ان کے سر کو چومتے تھے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ ابن عدی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ جس شخص نے اپنی ماں کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اس کے لیے وہ بوسہ دوزخ کی آگ سے حجاب بن جائے گا۔ تو گویا نبی اکرم ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تعظیم اور احترام کے پیشِ نظر اپنی والدہ

کا مرتبہ دیتے تھے اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتے تھے۔

ہم کہتے ہیں کہ جہاں یہ ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت فاطمہ کی دونوں آنکھوں کے درمیان یا ان کے سر پر بوسہ دیتے تھے' وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ حضرت فاطمہ کے رخسار پر بوسہ دیتے ہوں۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم ﷺ کی مکمل پیروی کیا کرتے تھے اور آپ کے محبوب ترین صحابی سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل احادیث سے ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے رخسار پر بوسہ دیا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں:

''**دخلت مع ابی بکر رضی الله تعالٰی عنه اوّل ما قدم المدینة فاذا عائشة بنتهٗ مضطجعة قداصا بها حمّی فاتا ها ابو بکر فقال کیف انت یا بنّیة وقبل خدّها**''. (صحیح بخاری: ۳۹۱۸' سنن ابوداؤد: ۵۲۲۲' سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۰۱' رقم: ۱۳۵۸۲' مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۰۲' مطبوعہ کراچی)

مدینہ منورہ میں سب سے پہلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ داخل ہوا' ان کی بیٹی عائشہ کو بخار تھا اور وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس آئے اور کہا: پیاری بیٹی کیسی ہو؟ پھر انہوں نے حضرت عائشہ کے رخسار کو بوسہ دیا۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: (۱) ایک یہ کہ باپ اپنی بیٹی کے رخسار کو چوم سکتا ہے۔ (۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ اپنی صاحبزادی کو جو بوسہ دیتے تھے اس سے رخسار کا بوسہ مراد لیا جاسکتا ہے' جیسا کہ خود علامہ علی قاری مؤخر الذکر حدیث کی شرح میں ''**قبل خدّها**'' کے تحت فرماتے ہیں: ''**أی للرحمة والمودّة او مراعاة للسنّة**'' حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی عائشہ کے رخسار کا بوسہ یا تو رحمت اور محبت کی وجہ سے لیا یا سنت کی رعایت کرتے ہوئے لیا۔ (مرقات ج ۸ ص ۴۶۹)

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمہ ''قبل خدھا'' کے تحت لکھتے ہیں: معلوم ہوا کہ باپ اپنی جوان بچی کا رخسار چوم سکتا ہے' یہ چومنا رحمت کا ہے' سنت سے ثابت ہے' حضور انور نے اولاد کے رخسار چومے ہیں۔ (مرآۃ المناجیح ج ۶ ص ۲۸۶' مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ لاہور)

الحاصل مذکورہ تمام احادیث سے معلوام ہوا کہ چہرے کے کسی حصہ پر بوسہ لینا علی الاطلاق حرمت کا موجب نہیں ہے' (جیسا کہ امام ظہیر الدین کا قول ہے) بلکہ اس میں ہر مقام پر شہوت اور عدم شہوت کا دخل ہے' یعنی اگر شہوت کے ساتھ بوسہ لیا جائے گا تو حرمت ثابت ہوجائے گی اور اگر شہوت نہیں ہوگی تو حرمت بھی ثابت نہیں ہوگی۔ اگرچہ رخسار اور منہ کا بوسہ لیا جائے۔ (جیسا کہ امام صدر الشہید کا قول ہے) چونکہ احادیث سے امام صدر الشہید کے قول کی تائید ہوتی ہے اس لیے ہمارے نزدیک وہی راجح اور معتمد ہے۔

یہاں زیرِ بحث مسئلہ کی یہ شق بھی واضح رہے کہ والدین اور اولاد کا باہمی رشتہ یا اور اس جیسے دیگر رشتے جن میں شہوت کا تصور معدوم ہو' ان میں پائے جانے والے بوسہ میں بالفرض اگر شہوت کا ہونا ثابت ہو تو پھر وہی حکم ہوگا جو شہوت کے پائے جانے کا ہے' یعنی حرمت کا حکم لاگو ہوجائے گا۔ لیکن ایسے مواقع پر شہوت فقہیہ کا وجود علی العموم نا قابلِ تصور ہے۔ الا یہ کہ کوئی شخص جامۂ انسانیت سے خارج ہو۔

شہزادہ اعلیٰ حضرت حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ماں بہن کی طرف نظر یا انہیں مس کرنے میں ہرگز غلبہ احتمالِ شہوت نہیں بلکہ یقیناً اس کا عدم۔ اس سے امن ہی غالب ہے' ہاں اس کا امکان ہے تو یہاں اس بناء پر یہی کہا جائے گا کہ ماں اور' اور محارمِ نسبیہ کی جانب نظر اور ان کے ان اعضاء کا مس جن کی طرف نظر جائز ہے' جائز ہے۔ ہاں اگر ''احد الجانبین'' سے شہوت کا اندیشہ بھی ہو تو جائز نہیں۔

چند سطور کے بعد مزید فرماتے ہیں: یوں ہی مسِ اجنبیہ حرہ بے ضرورت وحاجت مکروہ وحرام ہے ''وان امن الشھوۃ'' اور محرماتِ نسبیہ کا جائز اگر شہوت سے مامون ہو' ورنہ ناجائز' اور محرماتِ سببیہ کا ناجائز' اگر خوفِ شہوت وفتنہ نہ ہو تو جائز۔

(الفتاویٰ المصطفویہ ص ۵۲۹۔۵۲۸' مطبوعہ شبیر برادرز' لاہور)

حضور مفتی اعظم ھند رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اس عبارت سے یہ واضح فرمادیا کہ حرمتِ مصاہرت کی جزئیات اور مسائل تمام عورتوں کے حق میں برابر نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں محارم' اور غیر محارم عورتوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ خواہ عباراتِ علماء میں اس فرق کی صراحت موجود ہو یا نہ ہو۔ (لان الظاھر لا یحتاج الی البیان) لہٰذا ایسے مقامات جہاں

شہوت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا (جیسے ماں بیٹا وغیرہ) ان پر بلا تفریق و امتیاز فقہاء کی عمومی عبارات کو منطبق کر کے حرمتِ مصاہرت کا حکم لاگو کرنا درست نہیں ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ امام صدر الشہید علیہ الرحمۃ کا قول صاحب تنویر الابصار نے اپنے متن میں ذکر کیا ہے (جیسا کہ ہم فتویٰ کے آغاز میں ذکر کر چکے ہیں) اور اہل علم پر مخفی نہیں کہ تنویر الابصار کو فقہ حنفی میں کس قدر اعلیٰ اور ارفع متن کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اصول ہے کہ متن کو مذہب کی تمام کتب فتاویٰ اور کتب شروح پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ متن میں جو چیز بہ "طریقِ مفہوم" ہو وہ اس پر مقدم ہوتی ہے جو کتب فتاویٰ میں "مذکور" اور "ملفوظ" ہو۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں: عمدہ ترین کتب مذہب متون ہیں پھر شروح پھر فتاویٰ۔ عند التخالف متون سب پر مقدم ہیں اور فتاویٰ سب سے مؤخر۔ درّ مختار میں ہے: جب متن و شروح میں تعارض ہو تو متن پر عمل ہوگا۔ البحر الرائق میں ہے: اگر متون اور فتاویٰ میں مذکور کا تعارض ہو تو متون کا ذکر قابل اعتماد ہے۔ حموی شرح اشباہ میں ہے: یہ چیز مخفی نہیں کہ جو متون اور شروح میں ہو اگرچہ بہ طریق مفہوم ہی ہو وہ فتاویٰ میں مذکور پر مقدم ہے' اگرچہ فتاویٰ کی عبارات میں اضطراب نہ ہو۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۱۱۳' مطبوعہ لاہور)

نیز اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک "تنویر الابصار" کا تعلق ان ہی متون سے ہے جن کا قول قابلِ ترجیح ہوتا ہے' چنانچہ آپ مہر کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ شامی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "**اقتصاره فی المتن** (یعنی تنویر الابصار) **یفید ترجیحه**" (رد المحتار ج ۸ ص ۹۹' طبع جدید) "ماتن" (یعنی تنویر الابصار) کا اس پر اکتفا کرنا ترجیح کو مفید ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۱۰۵' طبع لاہور)

پھر طحطاوی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "**الاقتصار علیه یدل علی اعتماده**" (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص ۳۲۱) ماتن کا اس پر اکتفاء کرنا ان کے اعتماد کی دلیل ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ایضاً)

نیز ایک دوسرے مقام پر فسخ نکاح کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: یہی مذہب اعظم ارکان مذہب امام ابو یوسف کا ہے اور اس کو بوجوہ کثیرہ ترجیح حاصل'

اسی کو تمام متون مذہب مثل کنز ووافی ووقایہ ونقایہ ومختار واصلاح وتنویر وملتقی وغیرھا میں اختیار فرمایا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۴۸۸، طبع لاہور)

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ امام صدر الشہید علیہ الرحمۃ کے قول کو امام قاضی خان نے اختیار کیا ہے اور اصول ہے کہ امام قاضی خان اسی قول کو لیتے ہیں یا مختلف اقوال کی صورت میں اسی کو مقدم فرماتے ہیں جو زیادہ ظاہر اور معروف ہوتا ہے۔ اور جس کو وہ مقدم فرمائیں وہی قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: وہ (امام قاضی خان) اسی قول کو مقدم کرتے ہیں جو اشہر اور اظہر ہو۔ خود اپنے فتاویٰ کے خطبہ میں فرمایا: ''قدمت ما هو الاظهر وافتتحت بما هو الاشهر'' میں نے (اپنی کتاب میں) ظاہر کو مقدم کیا ہے اور مشہور سے ابتداء کی ہے۔ علماء فرماتے ہیں: تو جسے یہ پہلے بیان کریں وہی قول معتمد ہے۔ حاشیہ طحطاویہ میں ہے: ''اصطلاحه تقديم الاظهر فيكون هو المعتمد'' ان کی اصطلاح زیادہ ظاہر کو مقدم کرنا ہے تو وہی قابل اعتماد ہوتا ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۱۰۶، مطبوعہ لاہور)

ایک مقام پر فرماتے ہیں: ایک امام محقق علی الاطلاق کمال الدین ابن الہمام ہیں جن کی نسبت علماء تصریح فرما چکے ہیں کہ پایۂ اجتہاد رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان کے بعض معاصر انہیں لائق اجتہاد کہتے ہیں حالانکہ معاصرت دلیل منافرت ہے، ایک امام علامہ فقیہ النفس قاضی خان ہیں جن کی نسبت علماء فرماتے ہیں کہ ان کی تصحیح اوروں کی تصحیح پر مقدم ہے۔ ''غمز العيون والبصائر شرح الاشباه والنظائر'' میں علامہ قاسم کی تصحیح القدوری کے حوالہ سے ہے کہ جس کو امام قاضی خان صحیح قرار دیں وہ قول دوسروں کے اقوال پر مقدم ہے کیونکہ آپ فقیہ النفس ہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۱۱۴، مطبوعہ لاہور)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: امام قاضی خان وامام محقق علی الاطلاق وغیرہم اجلہ ائمہ اعلام ہیں، علماء فرماتے ہیں کہ امام قاضی خاں کی ترجیح اوروں کی ترجیح پر مقدم ہے اور فرماتے ہیں اس سے عدول نہ کیا جائے کہ وہ فقیہ النفس ہیں کمافی ردّ المحتار وغیرہ۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۴۹۱، مطبوعہ لاہور)

(۴) امام صدر الشہید علیہ الرحمۃ کا قول اختیار کرنے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ امام ظہیر الدین

مرغینانی کا قول (اگر استثناء محارم کی تاویل تسلیم نہ کی جائے تو) عسر اور حرج (تنگی) پر مبنی ہے یعنی اس پر عمل کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ فتاوی عالمگیری کی عبارت کے مطابق وہ فرماتے ہیں کہ آدمی خواہ عورت کے منہ پر بوسہ لے یا اس کے رخسار پر لے یا اس کے سر پر ہر صورت میں حرمت ثابت ہو جائے گی اور اس شخص کا یہ دعویٰ بھی قابل قبول نہیں ہوگا کہ بوسہ لینا بلاشہوت تھا۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۷۶ مطبوعہ مصر)

اس کے برخلاف حضرت صدر الشہید علیہ الرحمۃ کا قول یسر اور آسانی پر مبنی ہے جیسا کہ ہم فتویٰ کے آغاز میں ذکر کر چکے ہیں۔ اور اصول یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اقوال مختلف ہوں تو اس قول کو اختیار کرنا چاہیے جس میں لوگوں کے لیے آسانی اور نرمی ہو۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: مقاصدِ شرع کا ماہر خوب جانتا ہے کہ شریعت مطہرہ رفق و تیسیر پسند فرماتی ہے نہ معاذ اللہ تضییق و تشدید لہٰذا جہاں ایسی دقتیں واقع ہوئیں علماء انہیں روایات کی طرف جھکے ہیں جن کی بناء پر مسلمان تنگی سے بچیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۱۵۱ مطبوعہ لاہور)

حاصلِ کلام یہ ہے کہ استثناء محارم کی رُو سے اور وجوہِ مذکورہ کے مطابق یہی قول لائق فتویٰ قرار پاتا ہے کہ زیرِ بحث سوال میں حرمت مصاہرت ثابت نہ ہو۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بیٹے کا اپنی والدہ کے لب پر یا پیشانی اور رخسار پر بوسہ لینا حرمت کا باعث نہیں ہے۔ اور زید کے والد عمر اور ان کی زوجہ ہندہ کے درمیان رشتہ ازدواج بدستور قائم ہے کیونکہ بوسہ والدہ کا لیا گیا ہے جو کہ بلاشہوت ہونے کی دلیل ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

جامعہ انوار القرآن کی تائید میں ممتاز علماء کرام کی تصدیقات

☆ مفتی محمد حسن حقانی اشرفی: لقد صح الجواب والمجیب مصیب ومثاب

(جامعہ انوار القرآن گلشن اقبال)

☆ مفتی غلام رسول سعیدی: ذالک کذالک انی مصدق لذالک

(دار العلوم نعیمیہ F.B ایریا)

☆ حضرت مفتی محمد جان نعیمی: ھذا ھو الحق والحق احق ان یتبع
(دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ، ملیر)

☆ مفتی عبد السبحان قادری: الجواب صحیح (دارالعلوم قادریہ سبحانیہ، ڈرگ روڈ)

☆ مفتی غلام یٰسین امجدی: الجواب صحیح (دارالعلوم قادریہ رضویہ، ملیر)

☆ مفتی محمد رفیق الحسنی: الجواب صحیح (جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستان جوہر)

☆ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی مذکورہ فتویٰ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دارالعلوم امجدیہ کے دارالافتاء سے دربارۂ مصاہرت ایک استفتاء پر مفتی ندیم اقبال سعیدی مدظلہ العالی کا تحریر کردہ فتویٰ جاری ہوا جس میں انہوں نے حرمت مصاہرت ثابت ہو جانے کا حکم دیا، نیز اسی استفتاء پر جامعہ انوار القرآن سے مفتی محمد اسماعیل قادری نورانی کا تحریر کردہ فتویٰ جاری ہوا اس میں انہوں نے مع دلائل حرمت مصاہرت ثابت نہ ہونے کا حکم دیا جب کہ دارالافتاء اہل سنت سے مفتی محمد ابوبکر صدیق عطاری مدظلہ العالی نے فتاویٰ مزبورہ پر بطور محاکمہ فتویٰ لکھا اور دارالعلوم امجدیہ کے دارالافتاء کی تائید کی۔ راقم الحروف کے نزدیک مفتی محمد اسماعیل قادری نورانی صاحب کا تحریر کردہ حکم یعنی "حرمت مصاہرت ثابت نہ ہونا" صواب ہے۔ صدر الشریعہ مفتی محمد امجد علی اعظمی علیہ رحمۃ القوی تقبیلِ اجنبیہ سے متعلق ایک استفتاء کا جواب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: بوسہ لینے کی صورت میں اگر معلوم ہے کہ شہوت نہیں ہوئی جب تو حرمت مصاہرت ثابت نہیں ورنہ حرمت ثابت ہو جائے گی۔ (الخ)

(فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۸۸) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حرمت مصاہرت پر مفتی فیض الرسول رضوی کی تحقیق

بیٹے کا اپنی ماں کے منہ پر بوسہ لینے کی صورت میں حرمت مصاہرہ ثابت ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ فی الوقت علمائے کرام میں مختلف فیہ ہے۔ بعض نہایت ہی معظم علماء نے بندہ کو اس مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کا حکم دیا ہے لہٰذا تعمیل حکم کی نیت سے چند سطور رقم کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

بندہ کی رائے یہ ہے کہ منہ پر بوسہ لینے کے مسئلہ میں اجانب اور محارم کے فرق کو ملحوظ

رکھا جائے' اجانب میں حرمت کے ثبوت کا اور محارم میں عدم ثبوت کا حکم دیا جائے۔اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) منہ کے بوسہ کو مطلقاً بہ شہوت قرار دینے کا مدار قرآن وحدیث کی نص کے بجائے عرف پر ہے اور مسلمانوں میں کہیں بھی محارم کے منہ پر شہوت کے ساتھ بوسہ دینے کا عرف نہیں ہے بلکہ محارم کے بوسہ میں اصل عدم شہوت ہے۔تبیین الحقائق ص ۱۹' ج ۴ میں ہے:''**ولان الحرمة المؤبدة تقلل الرغبة والشهوة فيها بل تعدمه بخلاف الاجانب**''۔امام زیلعی علیہ الرحمۃ محارم کے پردہ نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حرمت ابدی محارم میں رغبت اور شہوت کو قلیل کر دیتی ہے بلکہ شہوت کو معدوم کر دیتی ہے بہ خلاف اجانب کے۔

البنایہ ج ۱۱ ص ۱۷۳' میں ہے:''**(كذا الرغبة تقل) ما تشتهي بل ينعدم اصلا بالكلية عند ارباب الدين والطبع السليم (للحرمة المؤبدة)**''۔اگر سلیم الفطرت شخص اپنے دل پر توجہ کرے تو معلوم ہوگا کہ محارم بالخصوص ماں کی جانب بہ شہوت نظر کرنے کی طرف بھی طبیعت کا میلان نہیں ہوتا چہ جائیکہ بہ شہوت بوسہ لینے کی طرف رغبت ہو۔

(۲) حرمت مصاہرت اس بوسہ سے ثابت ہوتی ہے جو داعی الی الوطی ہو۔یہی وجہ ہے کہ بہ صورت انزال یا جماع بلا دخول یا پیچھے کے مقام میں وطی کرنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی (بہار شریعت ج ۷ ص ۱۵-۱۴) اور بوسے کا مفضی الی الوطی ہونا بھی اجانب میں ہے محارم میں نہیں۔اگر کسی کے ذہن میں یہ آئے کہ فلاں جگہ محارم کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ حکم میں اکثر کا اعتبار ہوتا ہے نیز عرف کا تعلق بھی اکثریت کے ساتھ ہے جس پر اس مسئلہ کا مدار ہے لہٰذا محارم کے بوسہ میں اصل عدم شہوت ہی رہے گا۔جہاں اس کے خلاف شہوت کی دلیل پائی جائے وہاں حرمت کا حکم دے دیا جائے گا۔

(۳) محارم کے بوسہ میں اصل یہ ہے کہ رحمت' شفقت اور مودت کا ہو۔چنانچہ البنایہ ص ۲۲۱' جلد ۱۱ (مطبوعہ مکۃ المکرمۃ) میں فقیہ ابو اللیث کی شرح جامع الصغیر کے حوالہ

سے منقول ہے:

''القبلة على خمسة اوجه قبلة تحية' قبلة الرحمة' قبلة مؤدة و قبلة الشهوة فاما قبلة التحية المؤمنون يقبل بعضهم بعضا على اليد و قبلة الرحمة قبلة الولد لوالدة والوالدة لولدها على الخدو قبلة الشفقة قبلة الوالد لولده ولوالدته على الرأس واما قبلة المؤدة يقبل اخاه واخته على الجبهة واما قبلة الشهوة قبلة الزوج لزوجته على الفم وفى كفاية تاج الشريعة رحمه الله زاد بعضهم قبلة الديانة وهى القبلة على الحجر الاسود''۔

یعنی بوسے کی پانچ اقسام ہیں بوسہ تحیت' بوسہ شفقت' بوسہ رحمت' بوسہ مؤدت' بوسہ شہوت بہر حال بوسہ تحیت جو بعض مؤمنین بعض کو ہاتھ پر دیتے ہیں اور بوسہ رحمت ماں اور باپ کا اپنی اولاد کے رخسار پر دینا اور بوسہ شفقت اولاد کا والد اور والدہ کو سر پر بوسہ دینا بہر حال بوسہ مؤدت اپنے بھائی اور بہن کو پیشانی پر بوسہ دینا' بہر حال بوسہ شہوت مرد کا اپنی بیوی کو منہ پر بوسہ دینا' تاج الشریعۃ کی کفایہ میں ہے بعض نے بوسہ دیانت کا اضافہ کیا ہے اور یہ حجر اسود کو بوسہ دینا ہے۔

بوسہ کی یہ اقسام مندرجہ ذیل کتب میں بھی منقول ہیں: تبیین الحقائق ص ۲۵ ج ۶' مکتبہ امدادیہ ملتان' عالمگیری ص ۳۲۹ ج ۵' مکتبہ رشیدیہ' جوہرہ ص ۳۸۷' مکتبہ امدادیہ ملتان' درمختار مع الشامی ص ۵۵۱ ج ۹' مکتبہ امدادیہ ملتان' حاشیہ طحطاوی علی الدر ص ۱۹۲ ج ۴' حاشیہ مجمع الانہر ص ۵۴۲' بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۱۷۔

نیز ابوداؤد شریف (مکتبہ حقانیہ پشاور) ص ۷۰۸ پر حضور ﷺ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بوسہ دینا اور ان کا آپ ﷺ کو بوسہ دینا مذکور ہے۔ ص ۷۰۹ پر ابونضرہ کا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رخسار پر بوسہ دینا مذکور ہے اسی صفحہ پر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رخسار پر بوسہ دینا مذکور ہے۔ البنایہ ص ۲۱۷' ج ۱۱' میں شعب الایمان کے حوالہ سے حضور ﷺ کا جعفر بن عبداللہ کو ہونٹوں پر بوسہ دینا مذکور ہے۔ البنایہ ص ۲۲۷' ج ۱۱' میں ہے:

''فعلم من مجموع ما ذكرنا اباحة قبلة اليد و الرجل والرأس والكشح

کما علم من الاحادیث المقدمة اباحتها من الجبهة المتقدمة وبین العینین وعلی الشفتین''۔

یعنی ہماری بیان کردہ جملہ احادیث سے ہاتھ' پاؤں سر اور پہلو کو بوسہ دینے کا جواز معلوم ہوا جیسا کہ گزشتہ احادیث سے پیشانی کے اگلے حصہ کو اور آنکھوں کے درمیان اور ہونٹوں پر بوسہ دینے کا جواز معلوم ہوا تھا۔

طحطاوی علی الدرص ۱۹۲' ج ۴' میں ''علی الشفتین'' کے بعد ''اذا کان علی وجه المبرة والاکرام'' کے الفاظ زائد ہیں۔ عالمگیری ص ۳۶۹' ج ۵' فتاوی قاضی خان کے حوالہ سے مندرج ہے: ''فان کانت المعانقة من فوق قمیص او جبة او کانت القبلة علی وجه المبرة دون الشهوة جاز عند الکل'' پس قمیص یا جبہ پہنے ہوئے ہو یا بوسہ بلاشہوت اکرام کے طور پر ہو تو یہ سب کے نزدیک جائز ہے۔ پس مذکورہ عبارات سے بوسہ شفقت ورحمت کے جواز کی تصریح موجود ہے بلکہ مسنون ہونا ثابت ہے۔

(۴) شامی ص ۵۴۵' ج ۹ میں ہے: ''اذا اقر بالتقبیل وانکر الشهوة اختلف فیه قیل لا یصدق ولا یقبل الا ان یظهر خلافه' وقیل یقبل و قیل یقبل بالتفصیل بین کونه علی الرأس والجبهة فیصدق او علی الفم والارجح هذا واستظهر الحاق الخد بالفم قلت فقد حصل التوفیق''۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ امام بن ہمام کے قول سے پہلے دونوں قولوں میں تطبیق ہوگئی۔ پہلا قول منہ پر محمول ہے جب کہ دوسرا قول منہ کے علاوہ پر محمول ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ: ''لا یصدق ولا یقبل الا ان یظهر خلافه'' اس قول میں جملہ استثنائیہ ''الا ان یظهر خلافه'' بھی موجود ہے اس جملہ سے محارم کا مستثنیٰ ہونا واضح ہے۔

(۵) صاحب فتح القدیر' علامہ شامی' اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے رخسار کو منہ کے ساتھ لاحق کیا ہے جب کہ فقیہ ابو اللیث شرح جامع الصغیر میں ان سے پہلے بوسہ رحمت ماں باپ کا اپنی اولاد کے رخسار پر بوسہ دینے کا ذکر فرما چکے ہیں یہ بھی بعید ہے کہ یہ حضرات رحمہم اللہ فقیہ ابو اللیث کی مذکورہ عبارت سے لاعلم رہے ہوں پس بوسہ رحمت میں رخسار کے بوسہ کا ذکر ہونے کے باوجود ان حضرات کا بوسہ رخسار کو منہ کے ساتھ

لاحق کرنا اس طرف مشیر ہے کہ ان کے نزدیک بوسہ رخسار اور بوسہ منہ کا شہوت کے ساتھ ہی ہونا اجانب کے ساتھ خاص ہے جب کہ محارم میں یہ بوسہ رحمت کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۶) صاحب بہار شریعت نے بہار شریعت ص ۱۵' ج ۷' میں شامی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''رخسار' ٹھوڑی' پیشانی اور منہ کے علاوہ کسی اور جگہ کا بوسہ لیا اور کہتا ہے کہ شہوت نہ تھی تو اس کا قول مان لیا جائے گا۔'' محارم کا استثناء نہ ماننے پر اس عبارت سے بھی یہ لازم آتا ہے کہ صدر الشریعہ کو رخسار پر بوسہ رحمت ہونے کی اطلاع نہ ہوسکی جب کہ رخسار پر بوسہ رحمت ہونا کئی کتب فقہ میں مذکور ہے نیز صدر الشریعہ نے حصہ ۱۶ ص ۱۷' پر بوسہ کی چھ اقسام بیان کی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رخسار' ٹھوڑی' پیشانی اور منہ پر بوسہ رحمت نہیں ہوسکتا تو پھر کہاں ہوگا؟ نیز احادیث سے تعارض لازم آئے گا اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ صدر الشریعہ جیسی شخصیت پیشانی اور رخسار پر بوسہ لینے والی احادیث سے آگاہ نہ ہو لہٰذا یہی ماننا پڑے گا کہ صدر الشریعہ کے نزدیک بھی حرمت مصاہرہ کے متعلق مذکورہ قول اجانب کے ساتھ خاص ہے اور محارم کے رخسار' ٹھوڑی پیشانی اور منہ پر بوسہ لینے سے حرمت مصاہرہ اس وقت تک ثابت نہ ہوگی جب تک شہوت کے ساتھ بوسہ لینے کی کوئی دلیل یا قرینہ نہ پایا جائے۔

(۷) عالمگیری ص ۲۷۶' ج ۱' میں ہے امام ظہیر الدین مرغینانی علیہ الرحمہ منہ' رخسار اور سر کے بوسے میں حرمت کا فتوی دیتے تھے اگر چہ پردہ میں ہی کیوں نہ چھپی ہو اگر وہ عدم شہوت کا دعوی کرے تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔ محارم کا استثناء نہ ماننے پر لازم آتا ہے کہ امام ظہیر الدین' بوسہ شفقت و رحمت کے سرے سے قائل ہی نہ تھے نیز اس عبارت کا احادیث کے ساتھ کھلا تعارض لازم آتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے فقیہ سے بوسہ کی تما احادیث مخفی رہ گئیں ہوں لہٰذا مذکورہ خرابی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ محارم کا اس قول سے استثناء مان لیا جائے۔

(۸) صاحب فتح القدیر' علامہ شامی' اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ' صاحب بہار شریعت اور امام ظہیر الدین کی عبارات کے مطابق اگر رخسار میں بھی حرمت مصاہرہ مان لی جائے تو

حرج عظیم لازم آتا ہے کیوں کہ والدین اکثر اولاد کو رخسار پر بوسہ دیتے ہیں پس اس صورت میں حرمت مصاہرہ سے کسی کا بچنا دشوار ہو جائے گا۔ جب کہ مذکورہ حضرات رحمہم اللہ بھی اس حرج عظیم سے آگاہ تھے پس حرج عظیم کے باوجود ان حضرات کا رخسار کو منہ کے ساتھ لاحق کرنا بھی ان کے نزدیک محارم کے استثناء کی دلیل ہے۔

نوٹ: بندہ کی جانب سے مذکورہ بالا اظہار رائے حتمی فیصلہ وفتوی نہیں بلکہ بندہ کے نزدیک حرمت مصاہرہ سے متعلق مذکورہ موقف اکثریت علماء اہلسنت کی تصدیق کے ساتھ مشروط ہے۔ **هذا ما ظهر لي والله ورسوله اعلم بالصواب**

سسر اگر اپنی بہو کے ساتھ بوس وکنار کرلے تو......

سوال:

مؤرخہ ۲۲ اپریل کو میں گھر میں اکیلی تھی۔ میرے ساتھ سسر بھی موجود تھے۔ میں گھر میں کام کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں سسر نے مجھے کمرے میں بلالیا اور کہا کہ میرے پاس لیٹ جاؤ۔ پھر مجھے غلط کاری کی دعوت دی اور میرے منہ پر دونوں طرف بوسہ لیا۔ میرے شور کرنے پر وہ گھر سے چلا گیا۔ کیا اس صورت میں میرے اور میرے شوہر کے نکاح پر کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں؟ اگر اثر پڑا ہے تو تفصیل سے اس کی وضاحت فرمادیں تا کہ میری آخرت برباد نہ ہو۔ [سائلہ: زۂ کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں جو حالت بیان کی گئی ہے اگر وہ مبنی برصداقت ہے تو سائلہ اپنے شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو چکی ہے۔ بشرطیکہ شوہر اس بات کی تصدیق کرے۔ یعنی اگر اسے یقین ہے کہ میرے والد نے میری بیوی کے ساتھ فعل مذکور کیا ہے تو بیوی حرام ہو گئی ورنہ نہیں۔

علامہ زین الدین ابن نجیم مصری حنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''**فی فتح القدیر وثبوت الحرمة بلمسها مشروط بان یصدقها**'' فتح القدیر میں ہے کہ چھونے کی وجہ سے جو حرمت ثابت ہوتی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ شوہر بھی اس بات کی تصدیق اور تائید کرے۔

(البحر الرائق ج ۳ ص ۱۰۰)

البحر الرائق کی اس عبارت کو علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی علیہ الرحمہ نے بھی اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۸۶)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''عورت کا بیان کوئی چیز نہیں جب تک شوہر اس کی تصدیق نہ کرے۔ درمختار میں ہے کہ کیونکہ حرمت کا فیصلہ عورت کے ہاتھ نہیں اور فقہائے کرام نے فرمایا کہ تمام صورتوں میں اسی پر فتویٰ ہے۔ اور اگر شوہر کا باپ بھی اقرار کرے جب بھی شوہر پر حجت نہیں۔ ہاں اگر شوہر اپنے دل میں اس بات کو سچ جانتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ عورت کو اپنے اوپر حرام جانے اور متارکہ کر دے (یعنی یہ کہے کہ میں نے بیوی کو چھوڑ دیا) بزازیہ پھر ہندیہ میں ہے کہ اگر شوہر کے دل میں اس بات کا سچ ہونا واقع ہو تو اسے قبول کرنا واجب ہے۔ (یعنی بیوی کو حرام جاننا ضروری ہے) یا دو عادل گواہوں کی گواہی سے یہ معاملہ ثابت ہو''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۱۷۵)

مفتی جلال الدین احمد الامجدی علیہ الرحمہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ: ''شوہر کو مطلع کیا جائے کہ تمہارے باپ کے بارے میں تمہاری بیوی کا ایسا بیان ہے اگر شوہر تسلیم کرے کہ ہاں ایسا ہوا تو بیوی اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی۔ اب اس صورت میں شوہر پر فرض ہے کہ اپنی بیوی سے متارکہ کرے مثلاً کہہ دے کہ میں نے اسے چھوڑا۔ اس کے بعد بیوی عدت گزار کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے اور اگر شوہر اپنی بیوی کی بات کی تصدیق نہ کرے تو اس کا بیان شرعاً کوئی چیز نہیں''۔ (فتاویٰ فیض الرسول ج ۱ ص ۵۸۴)

مذکورہ تمام عبارات کا حاصل یہ ہے کہ سائلہ نے سوال مذکور میں جو صورتحال بیان کی ہے اس کی شوہر بھی اگر تصدیق و تائید کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میرے باپ نے ایسا کیا ہے تو شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی سے فی الفور جدائی اختیار کرے اور اسے کہہ دے کہ میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ جب شوہر بیوی سے یہ بات کہہ دے گا تو بیوی عدت گزار کر کسی بھی شخص سے نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن اپنے پہلے شوہر کے حق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی۔ اور اگر شوہر اپنی بیوی کے بیان کو تسلیم نہ کرے اور اس کی تصدیق و تائید نہ کرے تو بیوی کی بات

ثابت نہیں ہوگی اور اس صورت میں نہ نکاح ٹوٹے گا نہ بیوی اپنے شوہر پر حرام ہوگی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بہو کو شہوت کے ساتھ چھونے کی صورت میں حرمت مصاہرت کا حکم

سوال:

ایک شخص نے بہو کو پیار دیا' رخسار پر یا ماتھے پر یا اسے کہا کہ تم آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ بہو نے سسر کے اس فعل اور گفتگو کو شہوت کے طور پر سمجھا' جب کہ سسر کا کہنا ہے کہ میں نے بیٹی سمجھ کر پیار دیا ہے۔ اس میں کس کا قول معتبر ہے؟ اگر سسر نے بہو کے ساتھ شہوت کی نظر سے ایسا کیا ہو تو کیا حرمتِ مصاہرت ثابت ہوگی یا نہیں؟

[سائل: محمد عقیل اختر' ناظم آباد' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ مس ونظر (دیکھنے اور چھونے) سے حرمتِ مصاہرت کے ثبوت کے لیے علماء احناف نے کچھ شرائط بیان کی ہیں جن کا بہ تمام پایا جانا ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک شرط بھی ان میں سے معدوم ہوئی تو حرمت ثابت نہ ہوگی: (۱) پہلی شرط یہ ہے کہ مس ونظر بہ حالت شہوت ہو۔ یعنی ان کے کرتے وقت انتشار آلہ ہو جائے یا پہلے سے انتشار موجود ہو تو وہ بڑھ جائے۔ شہوت کی یہ کیفیت اگر مس ونظر کے بعد پیدا ہو تو حرمت ثابت نہ ہوگی۔ (۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جس حصہ کو مس کیا جائے وہ برہنہ ہو۔ (۳) تیسری شرط یہ کہ مس ونظر میں انزال نہ ہو۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں کہ مس ونظر کے سبب حرمت مصاہرت ثابت ہونے میں یہ (مذکورہ) شرطیں ہیں' جب تک صاف صاف تمام شرائط کا تحقق ہونا ظاہر نہ ہو اس وقت تک حکم حرمت نہیں ہوسکتا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۱ ص ۳۲۰)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں: چھونے اور نظر کے وقت شہوت نہ

تھی بعد کو پیدا ہوئی' یعنی جب ہاتھ لگایا اس وقت نہ تھی' ہاتھ جدا کرنے کے بعد ہوئی تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ (مزید فرماتے ہیں کہ) اس مقام پر شہوت کا معنی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انتشار آلہ ہوجائے اور اگر پہلے سے انتشار موجود تھا تو اب زیادہ ہوجائے۔ یہ جوان کے لیے ہے' بوڑھے اور عورت کی شہوت یہ ہے کہ دل میں حرکت پیدا ہو اور پہلے سے ہو تو زیادہ ہوجائے۔ محض میلانِ نفس کا نام شہوت نہیں۔ (مزید فرماتے ہیں کہ) نظر اور چھونے سے حرمت جب ثابت ہوگی کہ انزال نہ ہو اور انزال ہوگیا تو حرمت مصاہرت نہ ہوگی۔ (بہار شریعت حصہ ۷ ص ۱۴)

زیر بحث سوال میں سائل نے جو صورت بیان کی ہے اس میں سسر کا فعل بیان کیا گیا ہے لیکن حرمت کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کے پائے جانے کی وضاحت نہیں ہے اور سسر نے بہو کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس میں اسے حقیقی اور فقہی معیار کی شہوت تھی یا نہیں؟ یہ سسر کے اقرار اور وضاحت پر موقوف ہے۔ سسر اگر حلفیہ طور پر کہہ دے کہ جس وقت میں نے بہو کو رخسار یا ماتھے پر پیار دیا تھا وہ مذکورہ شہوت کے ساتھ نہیں تھا تو حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوگی اور اگر وہ یہ کہے کہ میں نے جو کچھ کیا اس وقت مجھے مذکورہ شہوت بھی تھی اور انزال بھی نہیں ہوا تو حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

سالی سے بدکاری کرنا

سوال:

آٹھ ماہ پہلے میں اپنی سالی سے صحبت کر بیٹھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس عمل سے نکاح ختم ہوجاتا ہے۔ اور یہ بات چند دن پہلے ہی پتا چلی ہے' میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ ایک بات اور یہ کہ صحبت کرنے کے کچھ دنوں کے بعد جب اپنی بیوی سے صحبت کی تو حمل ٹھہر گیا' جو اس وقت چھ ماہ کا ہے۔ [سائل: محمد عبداللہ خان' ناظم آباد' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ سالی سے صحبت کرنے کے سبب بیوی شوہر پر حرام نہیں ہوتی۔ جیسا کہ درمختار میں یہ عبارت موجود ہے: ''وطی اخت امراتہ لا تحرم علیہ

امرأته" (درمختار ج ۳ ص ۸۸) سالی سے صحبت کرنا بیوی کو شوہر پر حرام نہیں کرتا۔ ہاں البتہ شوہر پر اس فعل قبیح کے سبب اللہ کے حضور سچے دل سے توبہ کرنا نہایت لازم اور ضروری ہے۔

صدر الشریعہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: معاذ اللہ! یہ فعل بے شک حرام ہے' مگر اس کی وجہ سے نکاح نہیں ٹوٹا' وہ بدستور اس کی زوجہ ہے۔ زنا سے صرف چار حُرمتیں ثابت ہوتی ہیں: مزنیہ زانی کے اصول وفروع پر حرام ہو جاتی ہے اور زانی پر مزنیہ کے اصول وفروع حرام۔ بہن نہ اصول میں ہے نہ فروع میں' تو اس کی حرمت کی کوئی وجہ نہیں۔ (مسئلہ کی تائید میں مختلف کتابوں سے حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:) صحیح بخاری شریف میں ہے: "قال ابن عباس اذا زنا باخت امرء ته لم تحرم علیه امرء ته" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: جب کوئی شخص اپنی سالی سے زنا کر بیٹھے تو اس کی وجہ سے اس پر بیوی حرام نہیں ہوتی۔ (صحیح بخاری: ۵۱۰۵) (مزید لکھتے ہیں:) ہاں وطی بالشبہہ ہوئی ہو تو جب تک اس موطوءہ کی عدت نہ پوری ہو جائے' زوجہ سے وطی جائز نہیں' مگر نکاح میں اب بھی خرابی نہ آئے گی۔ ردّ المحتار میں ہے: "قوله لا تحرم ای لا تثبت حرمة المصاهرة فالمعنی لا تحرم حرمة مؤبدة والا فتحرم الی انقضاء عدّة الموطوء ة لو بشبهة. قال فی البحر لو وطیء اخت امرء ته بشبهة تحرم امرء ته مالم تنقض عدة ذات الشبهة"۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۷۲) واللہ ورسوله اعلم بالصواب

شوہر کا اپنی بیوی کو "بہن" کہنے کا شرعی حکم

سوال:

میرے شوہر نے مجھے تین یا چار مرتبہ ایک ہی وقت میں کہا: "تو میری بہن ہے"۔ میرے بہنوئی کی موجودگی میں یہ بات ہو رہی تھی' انہوں نے بھی میرے شوہر سے کہا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس بات پر بھی اس نے کہا کہ آج سے یہ میری بہن ہے۔ دو سال سے نہ وہ گھر آتے ہیں اور نہ ہی خرچ دیتے ہیں' اس لیے میں خود کام کرتی ہوں اور جو مجھے پیسے ملتے ہیں وہ بھی شوہر چھین لیتا ہے۔

آپ ہمیں یہ بتائیں کہ کیا شوہر کے اس جملے سے طلاق ہو جائے گی یا نہیں؟ حالانکہ

اس نے طلاق کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ براہ کرم شریعت کی روشنی میں ہمیں جواب سے مطلع فرمائیں۔ [سائلہ: شائلہ بیگم، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائلہ کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ بیوی کو بلا تشبیہ کے فقط "ماں" یا "بہن" کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ہاں! اس طرح کہنے سے گناہ لازم آتا ہے، جس سے توبہ ضروری ہے۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں: "تو میری ماں ہے، تو میری بہن ہے، یہ بھی الفاظِ طلاق سے نہیں، ہاں اس طرح کہنے سے گناہ گار ہوا"۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۲۴۴)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدثِ بریلوی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: عورت کی نسبت یہ لفظ کہنا کہ یہ میری بہن ہے، نکاح میں کچھ خلل نہیں ڈالتا (ہاں یہ کہنا) سخت گناہ و ناجائز ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۵۳۱۔ ۶۳۰) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کوئی شخص اپنی بیوی کو بدکلامی کی وجہ سے طلاق دینا چاہتا ہے اور والدہ راضی نہیں ہے

سوال:

زید کا اپنی بیوی سے اس کی بدکلامی پر جھگڑا ہوا۔ یعنی بیوی زید اور زید کی والدہ سے بد کلامی کر رہی تھی۔ اسی حالت میں زید نے کہا: اگر تم زیادہ تنگ کر رہی ہو تو میں تمہیں طلاق دیدوں گا "ایک تو فی الحال قبول کرو"۔ دو کے لیے اپنے والد کو بلاؤ اس کا معاملہ بھی طے کردوں گا۔ مگر زوجہ اور والدہ کی معذرت کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ابھی زید مزید دو طلاقیں دینا چاہتا ہے حالانکہ والدہ راضی نہیں ہے۔ اس صورت میں شرع کا کیا حکم ہے؟ نیز بدکلام عورت کے لیے کیا وعیدیں آئی ہیں؟ ایسی عورت کو طلاق دینا شرعاً کیسا ہے؟ اور زید جو طلاق دے چکا ہے، اس سے رجوع کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ [سائل: محمد یوسف، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ زید کی بیوی پر ایک طلاق رجعی واقع ہو چکی ہے۔ یعنی زید عدت کے اندر اندر رجوع کر سکتا ہے۔ چاہے تو اپنے قول سے رجوع کرے مثلاً یوں کہے: میں نے تجھ سے رجعت کی اور چاہے تو اپنے فعل کے ذریعہ رجوع کرے۔

والدہ کے راضی نہ ہونے کے باوجود زید دو طلاقیں جو دینا چاہتا ہے اس حوالہ سے یہ ذہن نشین رہے کہ طلاق دینا بلاشبہ ایک جائز امر ہے' لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ فعل ہے۔ لہٰذا بلا وجہ شرعی حق طلاق استعمال کرنے سے اجتناب و احتراز چاہیے' خاص کر اس صورت میں جب والدہ بھی اس فعل پر راضی نہ ہوں۔ کہ والدہ کی نافرمانی حرام ہے۔ (صحیح بخاری:۵۹۷۵' صحیح مسلم:۱۷۱۵)

بدکلام' عورت ہو یا مرد' دونوں کے لیے رسول پاک ﷺ نے یہ وعید بیان فرمائی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بدکلام سے راضی نہیں ہوتا۔ ایک روایت کے مطابق بدکلامی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (رواہ ابوداؤد فی سننہ والبیہقی فی شعب الایمان' کذا فی المشکوٰۃ ص ۴۳۱) نیز ایک روایت کے مطابق اس عورت کی نہ کوئی نماز قبول ہوتی ہے نہ کوئی نیکی اوپر جاتی ہے جسکا شوہر اس سے ناراض ہو۔ (مشکوٰۃ ص ۲۸۳)

حضور اکرم ﷺ کے ایک صحابی حضرت لقیط بن صبرہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میری ایک بیوی ہے جسکی زبان میں بدکلامی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اسے طلاق دیدو۔ انہوں نے عرض کی: میرا اس سے ایک بچہ ہے اور اس سے میرا پرانا ساتھ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے نصیحت کرو۔ اگر اس کے اندر بہتری ہوگی تو وہ اسے قبول کر لے گی۔ (مشکوٰۃ ص ۲۸۲)

اس حدیث شریف کی بنیاد پر علماء وفقہاء نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ بدزبان بیوی کو طلاق دینا مباح ہے یعنی طلاق دے سکتے ہیں۔ (کذا فی المرقاۃ ج۶ ص ۴۰۴' والمراۃ ج۵ ص ۹۹)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

طلاق دینا کب مستحب ہے؟

سوال:

زید وھندہ میں رشتہ طے ہوا اور لڑکی والوں کی طرف سے ھندہ کے عالمہ فاضلہ ہونے کو بتایا گیا اور اسی خوبی کی بناء پر زید کے گھر والوں (جو کہ خالصتاً مذھبی ماحول والے ہیں) نے رشتہ قبول کرلیا جب کہ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ ھندہ عالمہ فاضلہ تو کجا درست ناظرہ قرآن تک نہیں پڑھی ہوئی اور ہندہ کے گھر والوں میں بے پردگی کا ماحول ہے۔ شادی کے بعد زید کو سسرال کے گھر آنے کا اصرار کیا جاتا رہا مگر وہ بے پردگی وغیرہ کی وجہ سے کتراتا رہا۔ زید ہر تین ماہ کے بعد یا چار ماہ بعد ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کر کے بیوی کے پاس جاتا رہا کیونکہ زید کے والدین دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور وہ بیوی کو اپنے پاس صحیح عذر شرعی کی وجہ سے نہیں رکھ سکتا۔ اب ھندہ کا اصرار ہے کہ مجھے فیصلہ دے دو اور زید کے گھر والوں سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا اور ھندہ کے گھر والوں نے اور ھندہ نے علاقہ کے لوگوں میں زید اور اس کے گھر والوں کی برائیاں کرنا شروع کر دیں۔ یوں ان کی عزت اچھالنے لگے اور ادھر سے ھندہ کا اصرار ہے کہ میرا فیصلہ کردو اب میرا رہنا مشکل ہے آخر کار: (۱) ھندہ کا عالمہ فاضلہ بلکہ درست ناظرہ قرآن پاک نہ پڑھا ہونا (۲) بے پردگی کے ماحول میں سسرال کے گھر نہ جانے کی وجہ سے سسرال والوں کا عجیب عجیب باتیں پھیلانا (۳) صحیح شرعی عذر کی وجہ سے بیوی کو پاس نہ رکھنے پر سسرال والوں کا رویہ غلط ہونا جب کہ زید کے گھر میں اسے ہر سہولت میسر ہے (۴) ھندہ کا بار بار فیصلہ کا اصرار (۵) ھندہ کے خاندان والوں کی طرف سے زید اور اس کے گھر والوں پر کالا جادو کروانا جس کا ثبوت شرعی بھی متحقق ہو چکا ہے۔

ان سب وجوہات پر تنگ آکر زید نے بیوی کو کہا کہ تو میری طرف سے فارغ ہے اور طلاق ہی کی نیت سے بولا۔ ارشاد فرمائیں کہ زید کا ان وجھوں پر طلاق دینا شرعاً واجب، مستحب، جائز، مباح یا حرام و ناجائز تھا۔ نیز ھندہ کو طلاق ہوئی تو کون سی اور اس کی عدت کیا ہے۔ [سائل: ابن غلام حیدر، منظور کالونی، کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل نے جو صورت حال بیان کی ہے اس کی رو سے شوہر کے لیے طلاق دینا مباح بلکہ مستحب تھا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں: اگر شوہر کو طلاق کی کوئی حاجت ہو تو مباح ہے ورنہ ممنوع۔ یہی قول صحیح اور دلائل سے مؤید ہے۔ علامہ محقق نے فتح القدیر میں اس کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ خاتمۃ المحققین شامی نے اس کا دفاع کیا ہے جس سے اس کی صحت مستفاد ہوتی ہے۔ (الیٰ قولہ) بلکہ عورت کا فسق اور کسی حرام فعل کا ارتکاب ثابت ہے تو طلاق مستحب ہے۔ درمختار میں ہے کہ عورت اگر موذی ہے یا نماز کو ترک کرنے کی عادی ہے تو مستحب ہے۔ ''غایہ'' میں اسی طرح ہے۔ اور ردالمحتار (شامی) میں ہے کہ نماز کے علاوہ دیگر فرائض کا ترک بھی نماز کی طرح ہے۔

(فتاویٰ رضویہ مترجمہ ومخرجہ ج ۱۲ ص ۳۲۲)

اسی طرح حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ: طلاق دینا جائز ہے مگر بے وجہ شرعی ممنوع ہے۔ اور وجہ شرعی ہو تو مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحب۔ مثلاً عورت اس کو یا اوروں کی ایذا دیتی ہے یا نماز نہیں پڑھتی ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۶)

زیر نظر تفصیل میں سائل نے طلاق دینے کے جو اسباب بیان کئے ہیں ان میں خصوصیت کے ساتھ بیوی کی جانب سے مسلسل ایذا رسانی اور غلط بیانی کا بہت بڑا دخل ہے اور اسی کی مثل وجوہات پر طلاق کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ صورت مسئولہ میں طلاق دینے کے لیے جو جملہ استعمال کیا ہے وہ چونکہ از قبیل کنایات ہے اس لیے بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہو گئی اور اب بغیر تجدید نکاح دونوں کا باہمی تعلق جائز نہیں ہے۔ عورت کو اگر حمل نہیں ہے تو عدت کی کل مدت تین ماہواری ہے۔ لقولہ تعالیٰ: ''وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ'' (البقرۃ: ۲۲۸) اور اگر حمل ہے تو جب تک وضع نہ ہو جائے عدت جاری رہے گی۔ لقولہ تعالیٰ: ''وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ''۔ (الطلاق: ۴)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

فاسقہ‘فاجرہ‘بدکاراوربیہودہ گوبیوی کو طلاق دینے کا استحباب

سوال:

(۱) بہت شرمندگی کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ میری بیوی بدقسمتی سے بدکاری میں ملوث رہتی ہے‘اس کے اس جرم پر باقاعدہ ثبوت موجود ہیں۔اس کے علاوہ وہ زبان کی بھی بہت خراب ہے‘گندی گندی گالیاں دیتی ہے اور معاذ اللہ قرآن وسنت کو بھی اپنی زبان درازی کا نشانہ بناتی ہے۔عرض یہ ہے کہ میں ایسی عورت کو طلاق دے سکتا ہوں یا نہیں؟

(۲) میری دو بیٹیاں ہیں بڑی بیٹی چھ سال کی ہے اور دوسری چار سال کی ہے کیا میں اپنے دونوں بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے سکتا ہوں؟ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچوں پر برا اثر پڑے۔لہٰذا آپ سے التماس ہے کہ قرآن وسنت کی رو سے ان دونوں مسئلوں کا حکم بیان فرمائیں۔[سائل: رئیس احمد خان‘لانڈھی]

جواب:

سوالِ مذکور میں سائل نے جو صورت حال بیان کی ہے اگر وہ درست ہے تو شرعی نقطہ نظر سے مذکورہ عورت فاحشہ‘عاصیہ‘ناشزہ اور گناہ کبیرہ کی مرتکبہ ہے۔فقہائے کرام نے بعض صورتوں میں طلاق دینے کو مستحب قرار دیا ہے۔ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ عورت فاحشہ ہو۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ:

”چوں فسق وارتکاب چیزے از محرمات ثابت شود طلاق مستحب گردد.فی الدر المختار بل یستحب لو موذیة اوتارکة صلوة کذا فی الغایة“.(فتاویٰ رضویہ ج۱۲ص۳۲۲)

(۱) یعنی جب عورت کا فسق وفجور اور کسی حرام کا ارتکاب ثابت ہو تو طلاق دینا مستحب ہے۔درمختار میں ہے کہ عورت اگر ایذاء پہنچانے والی ہو یا نماز ترک کرنے کی عادی ہو

تو اسے طلاق دینا مستحب ہے۔

حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ: طلاق دینا جائز ہے مگر بے وجہ شرعی ممنوع ہے اور وجہ شرعی ہو تو مباح (یعنی جائز) بلکہ بعض صورتوں میں مستحب۔ مثلاً عورت اس کو یا اوروں کو ایذاء دیتی ہو یا نماز نہیں پڑھتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ بے نمازی عورت کو طلاق دے دوں اور اس کا مہر میرے ذمہ باقی ہو' اس حالت کے ساتھ دربار خدا میں میری پیشی ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ زندگی بسر کروں۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۶) اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بے نمازی عورت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خیال ہے تو فاسقہ فاجرہ عورت کے بارے میں کیا خیال ہوگا! اس لیے خدانخواستہ کسی کی بیوی اگر بے حیائی کا ارتکاب کرے اور شوہر کی اصلاحی کوششوں کے باوجود وہ باز نہ آئے تو ایسی عورت کو طلاق دینا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔

(۲) جہاں تک بچیوں کی پرورش کا معاملہ ہے تو شرعی اعتبار سے نو سال کی عمر تک اس کا حق والدہ کو ہے۔ لیکن عورت اگر فاحشہ ہو اور اس کے پاس رہنے کی صورت میں اولاد کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو شرعی اعتبار سے ایسی عورت کے پاس اولاد کو نہیں رکھا جائے گا۔ تنویر الابصار مع درمختار میں ہے کہ: ''الا ان تکون مرتدة او فاجرة فجورا یضیع الولد به کزنا وغناء و سرقة ونیاحة'' عورت اگر (خدانخواستہ) بے دین ہو جائے یا ایسے فسق و فجور میں مبتلا ہو جس کی وجہ سے اولاد کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو' مثلاً بدکاری یا گانے یا چوری یا نوحہ خوانی میں مبتلا ہو تو اسے حق پرورش نہیں رہے گا۔

(تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۵ ص ۲۰۴) **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

ایک مجلس میں دی جانے والی تین طلاقوں کا شرعی حکم

سوال:

میرے داماد سید عثمان ولد سید مظہر نے میری بیٹی بینا ناصر کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیدی ہیں۔ اہل حدیث علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ ایک ساتھ دی جانے والی تین طلاقیں درحقیقت

ایک ہی شمار ہوتی ہیں۔آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی حقیقت ہم پر واضح فرمائیں اور بتائیں کہ میں اپنی بیٹی کو سید عثمان کے گھر دوبارہ بھیج سکتا ہوں یا نہیں؟

[سائل: محمد ناصر خان' پیر کالونی]

جواب:

زیر بحث سوال کے جواب میں سب سے پہلے یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ایک جملہ میں یا ایک مجلس میں دی جانے والی تین طلاقیں ''تین'' ہی شمار ہوتی ہیں۔اس پر عہد رسالت سے اب تک امت مسلمہ کا اتفاق رہا ہے۔اس پر سوائے غیر مقلدین (اہل حدیث) کے کسی مسلمان کا اختلاف نہیں۔اہل حدیث علماء عموماً اپنے موقف کی تائید میں صحیح مسلم سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت نقل کر دیتے ہیں اور اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تین طلاقیں (جو بیک وقت دی جائیں) ایک طلاق شمار کی جاتی تھیں۔یہاں یہ بات دلچسپی اور تعجب سے خالی نہ ہوگی کہ اہل حدیث علماء اکثر و بیشتر صحیح بخاری کا نام استعمال کرتے ہیں اور جب کوئی روایت بخاری میں موجود ہو تو عامۃ المسلمین کے موقف کے مطابق بخاری ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔لیکن تین طلاق کے مسئلہ میں ان کا یہ حال ہے کہ صحیح بخاری کی روایت کو چھوڑ کر مسلم کی روایت پر زور دیتے ہیں اور عوام کو دھوکا دیتے ہیں کہ تین طلاقیں ایک ہی ہوتی ہیں۔حالانکہ صحیح بخاری' صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد کی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد اقدس میں بھی تین طلاقیں ''تین'' ہی شمار کی جاتی تھیں۔حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ! یہ بتایئے کہ ایک شخص اپنی عورت کے ساتھ کسی مرد کو دیکھ لے تو اس کو قتل کر دے یا کیا کرے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں قرآن مجید میں لعان (میاں بیوی کا قاضی کے سامنے ایک دوسرے کے خلاف ایک خاص شرعی طریقہ کے مطابق قسمیں کھانے) کا مسئلہ بیان فرمایا۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے درمیان فیصلہ فرما دیا ہے۔(حضرت سہل کہتے ہیں کہ) دونوں میاں بیوی نے میرے سامنے مسجد میں لعان کیا۔جب وہ لعان سے فارغ

ہو گئے تو اس شخص نے کہا کہ اب اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو میں خود جھوٹا ہوں۔
پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ سے پہلے ہی اس شخص نے لعان سے فارغ ہو کر اپنی بیوی کو
تین طلاقیں دیدیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ آپ
نے ارشاد فرمایا کہ سب لعان کرنے والوں کے درمیان یہ تفریق اور جدائی ہے۔
(صحیح بخاری، ج ۲ ص ۸۰۰)

امام بخاری کی ایک اور روایت کے مطابق مذکورہ شخص کا نام عویمر تھا۔ انہوں نے عرض
کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اب اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھا تو میں جھوٹا ہوں۔ پھر حضرت
عویمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے ہی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔ (صحیح
بخاری ج ۲ ص ۸۰۰) امام بخاری کے روایت کردہ یہ الفاظ صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابو داؤد
میں بھی موجود ہیں۔ امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں کہ: حضرت عویمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے سامنے تین طلاقیں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تینوں طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ (سنن ابو داؤد:
۲۲۵۰) صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ابو داؤد وغیرہ کی مذکورہ روایات سے یہ بات بالکل واضح
اور روشن ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین طلاقوں کو "تین" ہی شمار فرمایا کرتے تھے۔ لہٰذا اہل
حدیث علماء کا تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا قطعاً غلط اور ناقابل توجہ ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ابن عباس سے اہل حدیث علماء کا استدلال ۔۔۔۔۔۔ اور اس کا جواب

علماء اہل حدیث اپنی تائید میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ روایت
پیش کرتے ہیں کہ "عہد رسالت میں بیک وقت دی جانے والی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی
تھیں۔" ہمارے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت سے استدلال
کرنا غلط اور باطل ہے۔ کیونکہ خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ثابت ہے
کہ وہ اس کے خلاف فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یعنی ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو "تین"
شمار کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جس روایت سے علماء اہل
حدیث استدلال کرتے ہیں وہ حضرت ابن عباس سے ان کے شاگرد طاؤس نے روایت کی
ہے اور ائمہ نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ طاؤس کی حضرت ابن عباس سے یہ روایت وہم اور

مغالطہ پر مبنی ہے۔لہٰذا ایسی روایت سے استدلال کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے' جب کہ اس کے مقابلے میں صحیح بخاری' صحیح مسلم اور سنن ابو داؤد وغیرہ کی صحیح روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے تین طلاقین دی گئیں اور آپ نے تینوں کو نافذ فرمایا۔اور اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت ابن عباس خود اپنی روایت کے خلاف فتوی دیا کرتے تھے۔اور تین طلاقوں کو "تین" ہی شمار فرماتے تھے۔

چنانچہ امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ایک چیز روایت کریں اور فتوی اس کے خلاف دیں۔اس لیے ان کی یہ روایت (جس میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا گیا ہے) شاذ (اور ناقابل استدلال) ہے۔اور حضرت ابن عباس کی طرف اس روایت کو منسوب کرنے میں طاؤس کو وہم ہوا ہے۔ (فتح الباری شرح بخاری' ج ۹ ص ۳۶۳) امام ابن حجر عسقلانی نے جو کچھ کلام فرمایا ہے اس کی مزید وضاحت امام بیہقی کے بیان سے ہوتی ہے۔امام بیہقی فرماتے ہیں:

تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کی حدیث ان احادیث میں سے ہے جس میں امام بخاری اور امام مسلم کا اختلاف ہے۔امام مسلم نے اس کو روایت کیا ہے اور امام بخاری نے اس کو ترک کر دیا ہے۔اور میرا گمان یہ ہے کہ امام بخاری نے اس حدیث کو اس لیے ترک کیا ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عباس کی دیگر روایات کے خلاف ہے۔حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں' حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم تین طلاقیں لے لو اور ستانوے چھوڑ دو۔عطاء' عمرو بن دینار اور مالک بن حارث وغیرہ طاؤس کے علاوہ حضرت ابن عباس کے تمام شاگرد حضرت ابن عباس سے یہی روایت کرتے ہیں کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں۔

(سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۳۷)

اسی طرح امام ابو جعفر بن نحاس اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں فرماتے ہیں کہ:

طاؤس اگرچہ نیک شخص ہیں' لیکن وہ حضرت ابن عباس سے بہت سی روایات میں منفرد اور تنہا ہیں۔اہل علم ایسی روایات کو قبول نہیں کرتے۔ان روایات میں سے ایک روایت

وہ بھی ہے جس میں انہوں نے حضرت ابن عباس سے تین طلاقوں کے ایک ہونے کی روایت کی ہے لیکن حضرت ابن عباس اور حضرت علی سے صحیح روایت یہی کہ تین طلاقیں ''تین'' ہی شمار ہوتی ہیں۔ (مزید تفصیل وتحقیق کے لیے تبیان القرآن ج ۱ ص ۸۵۶ تا ۸۸۹ کا مطالعہ فرمائیں)

مذکورہ تمام گفتگو کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ جب ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں تو وہ تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ جو لوگ تین کو ایک قرار دیتے ہیں ان کا موقف صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ دلائل کی روشنی میں بہت وضاحت کے ساتھ ہم بیان کر چکے۔ لہٰذا سید عثمان ولد سید مظہر علی نے اپنی زوجہ مسماۃ بینا ناصر کو بیک وقت جو تین طلاقیں دی ہیں وہ تینوں طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور وہ حرمت مغلظہ کے ساتھ اپنے شوہر پر حرام ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب بغیر حلالہ شرعیہ دونوں کا باہمی ملاپ ممکن نہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ''فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ'' شوہر اگر اس کو (تیسری) طلاق دیدے تو وہ اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے (اور وہ اس سے صحبت بھی کرے)۔ (البقرہ: ۲۳۰)

نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں پھر وہ عورت کسی اور سے نکاح کرے اور وہ شخص صحبت کیے بغیر اس عورت کو اپنے نکاح سے فارغ کر دے تو آیا وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت پہلے شوہر کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ اور اس کا شوہر دونوں ایک دوسرے کی مٹھاس نہ چکھ لیں۔ (سنن ابو داؤد: ۲۳۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۹۳۳، سنن نسائی: ۳۴۰۷، سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۷۵، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ جس عورت کو مکمل طلاقیں دیدی گئی ہوں وہ پہلے شوہر کے پاس اس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک کہ کسی اور سے نکاح مع صحبت نہ کر لے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق اور طلاقِ ثلٰثہ کا شرعی حکم

سوال:

(۱) اگر شوہر نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے تو کیا طلاق ہو جائے گی' جب کہ طلاق دیتے وقت مرد کے حواس درست نہ تھے۔

(۲) اگر عام حالت میں شوہر اپنی بیوی کو ایک وقت میں کئی بار یہ کہہ دے کہ میں نے تجھے طلاق دی' میں نے تجھے طلاق دی' میں نے تجھے طلاق دی۔ تو کیا از روئے شریعت طلاق واقع ہو جائے گی اور نکاح ٹوٹ جائے گا یا پھر ایک طلاق ہوگی۔ اگر ایک طلاق ہوگی تو اس صورت میں اگر مرد عورت سے رجوع کر لے اور ملاپ ہو جائے تو کیا ایک طلاق بدستور برقرار رہے گی یا ختم ہو جائے گی۔

برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جوابات عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

[سائل: حامد کاغانی' کراچی]

جواب:

(۱) فقہائے احناف کے نزدیک حالت نشہ میں دی جانے والی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ تنویر الابصار میں ہے: ''**و یقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو مکرها او هازلا او سفیها او سکران**''۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ج ۴ ص ۴۲۳) ہر عاقل بالغ شوہر کی طلاق واقع ہو جاتی ہے' خواہ وہ مجبور ہو یا مذاق میں ہو یا بیوقوف اور کم عقل ہو یا نشہ میں ہو۔

ہدایہ میں ہے: ''**طلاق السکران واقع**'' جو شخص نشہ میں ہو اس کی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۳۵۸)

(۲) شوہر جب اپنی بیوی کو یہ کہہ دے کہ میں نے تجھے طلاق دی' میں نے تجھے طلاق دی' میں نے تجھے طلاق دی تو اس سے بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ الگ الگ تین طلاق دی جائیں یا ایک ہی کلمہ میں' وہ تینوں

واقع ہو جاتی ہیں۔ جمہور صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے تمام مشائخ کا یہی مذہب ہے۔ (فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۳۲۰)

یہ بھی واضح رہے کہ جب کسی عورت پر تین طلاقیں واقع ہو جائیں تو وہ اپنے شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ بغیر حلالۂ شرعیہ ان کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ''۔ (البقرة: ۲۳۰) پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہ لے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کا شرعی حکم اور حدیث رکانہ کا جواب

سوال:

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیدے تو وہ اس کو نکاح میں رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ براہ کرم دلائل کی روشنی میں مسئلہ واضح فرمادیں۔

[سائل: عبدالقدوس نقشبندی' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے تو بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ تین طلاقیں ایک ساتھ دے یا متفرق طور پر۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس میں کسی امام کا اختلاف نہیں ہے۔ سند المحققین علامہ شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''ذهب جمهور الصحابة و التابعين و من بعدهم من ائمة المسلمين الى انه يقع الثلاث ''۔ (ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۴ ص ۳۲۰) جمہور صحابہ و تابعین اور ان کے بعد آنے والے ائمہ مسلمین کا یہی موقف تھا کہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب ایک صحابی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو نبی اکرم ﷺ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمادیا۔ (سنن ابوداؤد' کتاب الطلاق: ۲۲۵۰)

اہل حدیث علماء کا موقف یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی ہیں۔ وہ

اپنی تائید میں مسند احمد سے حضرت رکانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت رکانہ کی دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا۔ (مسند احمد ج ا ص ۲۶۵)

یہاں اہل حدیث علماء کی خیانت پر جس قدر افسوس کیا جائے' کم ہے۔ کیونکہ حضرت رکانہ کا یہی واقعہ امام ترمذی' امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے اور ان تینوں ائمہ کی کتابیں (سنن ترمذی' سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ) صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہیں۔ لیکن اہل حدیث علماء جو کہ ہر جگہ صحاح ستہ کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے' اس مسئلہ میں تینوں صحیح کتابوں کو چھوڑ کر دیگر کتب حدیث کا سہارا لیتے ہیں۔ علماء اہل حدیث ایسا کیوں کرتے ہیں' اس کی تفصیل جاننے کے لیے سطور ذیل ملاحظہ فرمائیں:

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو (ایک مجلس میں) تین طلاقیں دی ہی نہیں تھیں۔ بلکہ انہوں نے "طلاق بتہ" (طلاق بتہ وہ طلاق ہے جس میں بتہ کا لفظ بول کر بیوی کو اپنے آپ سے جدا کیا جائے لیکن اس میں تعداد واضح نہ کی جائے۔ اس طلاق کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس میں قائل کی نیت معلوم کی جاتی ہے' اگر وہ ایک کا ارادہ ظاہر کرے تو ایک اور تین کا ارادہ ظاہر کرے تو تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں) حضرت رکانہ اپنی بیوی کو طلاق بتہ دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' پھر کیا ہوا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا حکم فرمایا؟ اس کی تفصیل کے لیے سنن ترمذی' سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کی روایت ملاحظہ فرمائیں:

(ترجمہ:) حضرت رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق بتہ دی' اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس حاضر ہو کر اس کی خبر دی اور کہا کہ خدا کی قسم! میرا ارادہ ایک ہی طلاق کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پھر حلفیہ پوچھا کہ تمہارا ارادہ ایک ہی طلاق کا تھا؟ حضرت رکانہ نے عرض کیا: خدا کی قسم! میرا ارادہ ایک ہی طلاق کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی بیوی ان کی طرف لوٹا دی۔ پھر حضرت رکانہ نے دوسری طلاق حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اور تیسری طلاق حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں دی۔ (سنن ابوداؤد: ۲۲۰۶۔ کتاب الطلاق باب فی البتۃ' سنن ترمذی: ۱۱۷۷۔ باب ما جاء فی الرجل یطلق امراتہ البتۃ' سنن ابن ماجہ: ۲۰۵۱۔ باب طلاق البتہ)

سنن ترمذی' سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کی یہ حدیث بتارہی ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں نہیں دی تھیں۔ بلکہ ایک طلاق انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں' دوسری طلاق زمانہ فاروقی میں اور تیسری طلاق زمانہ عثمانی میں دی۔ لہٰذا اہل حدیث علماء کا اس واقعہ سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

ہماری اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ علماء اہل حدیث یہ واقعہ ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ سے پیش کیوں نہیں کرتے اور مسند احمد کا سہارا کیوں لیتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اہل حدیث کے علاوہ پوری امت مسلمہ نے مسند احمد کی اس حدیث کو چھوڑا ہوا ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مستند ائمہ دین کے نزدیک مسند احمد کی اس روایت کی سند درست نہیں ہے۔ مثلاً امام ابن جوزی لکھتے ہیں:

یہ حدیث (سنداً) صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند کا ایک راوی ابن اسحاق مجروح ہے اور دوسرا راوی داؤد اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ امام ابن حبان نے کہا ہے کہ اس کی روایات سے بچنا واجب ہے اور طلاق بتہ والی (ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ) کی روایت صحت کے قریب ہے اور مسند احمد والی روایت میں راویوں کی غلطی ہے۔

(العلل المتناہیہ فی الاحادیث الواہیہ ج ۲ ص ۱۵۱)

اسی طرح شیخ الاسلام محی الدین نووی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

وہ روایت جس کو مخالفین (غیر مقلدین) روایت کرتے ہیں کہ رکانہ نے تین طلاقیں دی تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک قرار دیا' تو یہ روایت کمزور ہے اور اس کے راوی مجہول ہیں۔ صحیح روایت وہ ہے جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ حضرت رکانہ نے اپنی زوجہ کو ''طلاق بتہ'' دی تھی اور لفظ ''بتہ'' میں ایک اور تین دونوں کا احتمال ہے۔ شاید روایت ضعیفہ کے راوی نے یہ سمجھ لیا کہ لفظ ''بتہ'' تین پر بولا جاتا ہے پس اپنی سمجھ کے مطابق روایت بالمعنی کر دی اور اس میں غلطی کا شکار ہوگیا۔ (شرح مسلم للنووی علی ہامش صحیح مسلم' ج ۱ ص ۴۷۸' مطبوعہ کراچی)

علمائے امت کی ان آراء سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسند احمد کی جس روایت سے اہل حدیث علماء استدلال کرتے ہیں' وہ سنداً صحیح نہیں ہے' لہٰذا صحیح یہی ہے کہ عوام مسلمین کو تین طلاقوں کے بعد زنا کی اجازت دینے کے بجائے حرمت مغلظہ کا فتویٰ دیا جائے۔ اسی پر عہد

رسالت سے اب تک امت مسلمہ کا اتفاق رہا ہے' اس اتحاد کو توڑنے کی ناپاک اور مذموم سعی نہ کی جائے۔

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں؟ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس شخص نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی شخص لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوتیں تو آپ اس کو مارتے تھے اور دونوں کو جدا کر دیتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۱۱)

ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں' میں کیا کروں؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تین طلاقیں لے لو اور ستانوے چھوڑ دو۔

(سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۳۷)

مذکورہ دلائل کے علاوہ اور بھی احادیث و آثار موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہوں تو وہ تین طلاقیں ہی شمار ہوں گی اور بیوی شوہر پر حرام ہو جائے گی۔ اور اس وقت تک اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ حلالہ شرعیہ نہ کر لے۔ قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ: ''فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ''۔ (البقرہ: ۲۳۰) پھر اگر اسے (تیسری) طلاق دی تو وہ اسے حلال نہ ہوگی جب تک کہ دوسرے خاوند کے پاس نہ رہ لے (اور مجامعت کا عمل بھی نافذ ہو)۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حلالہ کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

زید نے ۱۳ سال قبل اپنی منکوحہ کو طلاق دے دی اور ایک دوسری خاتون سے نکاح کر لیا۔ ۱۳ سال بعد زید کو معلوم ہوا کہ موجودہ خاتون سے زید کا نکاح بہ وجہ حرمتِ قرابت منعقد ہی نہیں ہوا' جس پر دونوں نے علیحدگی اختیار کر لی اب زید یہ چاہتا ہے کہ اپنی مطلقہ

خاتون کے ہمراہ پھر سے نکاح کرلے۔ جب کہ مطلقہ نے زید کی طرف سے طلاق دیئے جانے کے بعد کسی سے نکاح نہیں کیا۔ واضح ہو کہ مطلقہ اس وقت ایک بیٹے کی ماں ہے' جس کی عمر ۱۴ سال ہے اور یہ بچہ زید کی اولاد ہے' جو طلاق دیئے جانے کے وقت ایک سال کا تھا۔

صورتِ مذکورہ میں حل طلب امر یہ ہے کہ ازروئے شرع وہ کیا صورت ہوسکتی ہے کہ زید مطلقہ سے پھر نکاح کرسکے؟ جب کہ مطلقہ نے حلالہ نہیں کیا۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ''کوئی ایسا شخص جو اس ساری صورتِ حال سے واقف ہو' وہ خاتون سے اس نیت سے نکاح کرے کہ وہ اسے طلاق دے دے گا تاکہ حلالہ کی شرط پوری ہوجائے۔ اور وہ عورت زید سے نکاح کرسکے۔ لیکن مطلقہ کو نہ اس بات کا علم ہو نہ طلاق دینے کی کوئی پیشگی شرط ہو اور مذکورہ شخص اس کام کو نیکی سمجھ کر کرے''۔

اس صورت حال میں آپ سے رہنمائی مطلوب ہے کہ ازروئے قرآن وسنت اس طرح کے عمل کی گنجائش ہے؟ یا اس کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟ [سائل: رفیق خان' نیو کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ زید نے کتنی طلاقیں دی تھیں؟ لیکن سوال کا اگلا متن (جس میں حلالہ کا ذکر ہے) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زید نے تین یا اس سے زائد طلاقیں دی تھیں۔ اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو وہ عورت بغیر حلالۂ شرعیہ کے زید کے لیے حلال نہ ہوگی اور حلالہ شرعیہ یہ ہے کہ عورت اگر مدخولہ ہے تو طلاق کی عدت پوری ہونے کے بعد عورت کسی اور سے نکاح صحیح کرے اور یہ شوہر ثانی اس عورت سے صحبت بھی کرلے اب اس شوہر ثانی کے طلاق یا موت کے بعد عدت پوری ہونے پر شوہر اول سے نکاح ہوسکتا ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۳۸)

فقہائے کرام نے اپنی کتب میں بہت وضاحت سے لکھا ہے کہ نیتِ حسنہ کے ساتھ اس مقصد سے نکاح کرنا کہ زوجین کے درمیان رشتہ ازدواج ازسرِ نو قائم ہوجائے تو حلالہ کرنے والا ان حالات میں اجر وثواب کا بھی مستحق ہوگا' لیکن حلالہ کی شرط نہ لگائی جائے۔ اس لیے کہ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک حلالہ کی شرط لگا کر نکاح کرنا مکروہِ تحریمی ہے اور ایسے شخص کو حدیث شریف میں ملعون قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ حلالہ کی شرط لگائے بغیر

ضروری مصلحتوں کے پیش نظر نکاح کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

فی الهداية: ''اذا تزوجها بشرط التحليل فالنكاح مكروه لقوله عليه السلام لعن الله المحلل والمحلل له وهذا هو محمله''۔ (ہدایہ اولین ص ۴۰۰)

''وقال العلامة ابن الهمام في فتح القدير تحت العبارة المذكورة: قوله بشرط التحليل اى بان يقول تزوجتك على ان احللك له او تقول هي ذالك فهو مكروه كراهة التحريم المنتهضة سببا للعقاب لقوله عليه السلام لعن الله المحلل والمحلل له. اما لو نوياه ولم يقولاه فلا عبرة به ويكون الرجل ماجورا لقصد الاصلاح''.

(فتح القدیر ج ۴ ص ۱۸۱) ھکذا قال العلامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی فی المرقاۃ (ج ۶ ص ۴۴۳)

ہدایہ میں ہے کہ جب کوئی شخص عورت سے حلالہ کی شرط لگا کر نکاح کرے تو یہ نکاح مکروہ ہے اس لیے کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اس پر جو حلالہ کرے اور اس پر جس کے لیے حلالہ کیا جائے اس حدیث کا یہی مطلب ہے۔ علامہ ابنِ ہمام فتح القدیر میں ہدایہ کی اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حلالہ کی شرط لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یا عورت یہ کہے کہ میں نے تم سے حلالہ کے لیے نکاح کیا' یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اور حدیثِ مذکور کے بہ موجب اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ ہاں! اگر میاں بیوی دونوں حلالہ کی نیت تو کریں لیکن زبان سے کچھ نہ کہیں اس میں حرج نہیں۔ نیز اگر یہ نکاح اصلاح کی غرض سے ہو تو آدمی مستحق اجر بھی ہوگا۔

''وفي التفسيرات الاحمديه: لا ينبغي للمرأة ولا للزوج الثاني ان تنكحا بنية الحلالة حيث قال عليه السلام لعن الله المحلل والمحلل له وهذا نكاح فاسد عند مالك والاوزاعي وابي عبيد والشافعي وغيرهم ويجوز عند ابي حنيفة مع الكراهة وان اضمرا التحليل في النفس ولم يصرحا به يجوز من غير كراهة''. (التفسیرات الاحمدیہ ص ۱۳۲)

یعنی تفسیرات احمدیہ میں ہے کہ عورت اور زوجِ ثانی کے لیے ذکر کردہ حدیث کی وجہ سے یہ مناسب نہیں کہ وہ باقاعدہ حلالہ کی نیت سے نکاح کریں۔ امام اعظم ابو حنیفہ کے

نزدیک یہ نکاح (یعنی شرطِ حلالہ کے ساتھ) گو کہ مکروہ ہے مگر منعقد ہو جائے گا۔ ہاں! اگر دل میں حلالہ کی نیت ہو لیکن زبان سے صراحت نہ کی جائے تو یہ نکاح بلا کراہت جائز ہوگا۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

حلالہ کے ثبوت میں دلائل

سوال:

جس عورت کو تین طلاقیں ہو جائیں اس کے لیے حلالہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ قرآن وسنت سے اس بارے میں رہنمائی فرمائیں؟

[سائل: سمیع اللہ، جوہر موڑ، کراچی]

جواب:

جس عورت کو اس کا شوہر تین طلاقیں دیدے وہ اپنے شوہر پر حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے دوبارہ اپنے اس شوہر سے نکاح کرنا بغیر حلالۂ شرعیہ کے جائز نہیں ہے۔ حلالۂ شرعیہ سے مراد یہ ہے کہ عورت اپنی طلاق مغلظہ کی عدت پوری ہونے کے بعد کسی اور سے نکاح کرے۔ وہ (شوہر ثانی) اس عورت سے مجامعت (صحبت) کرے۔ پھر اگر وہ طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہو جائے اور عورت طلاق یا وفات کی عدت پوری کرلے تو اب وہ عورت اپنے سابق شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔

حلالۂ شرعیہ کے ذریعہ سابق شوہر کے حق میں عورت کے حلال ہونے پر قرآن مجید کی یہ آیت دلیل ہے: ''**فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره**'' اگر وہ اس کو (تیسری) طلاق دیدے تو وہ اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے (اور وہ اس سے صحبت بھی کرے)۔ (البقرۃ: ۲۳۰)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''**مذهب جمهور المجتهدين ان المطلقة بالثلاث لاتحل لذالك الزوج الا بخمس شرائط: تعتد منه وتعقد الثانی و یطؤها ثم یطلقهاثم تعتد منه**''۔

(تفسیر کبیر، البقرۃ، ص ۲۳۰، تفسیر الخازن، ایضا)

یعنی جمہور مجتہدین کا موقف یہ ہے کہ تین طلاق والی عورت اپنے سابق شوہر کے لیے اس وقت حلال ہوگی جب پانچ شرائط پائی جائیں: (۱) پہلے شوہر کی دی ہوئی طلاقوں کی عدت گزارے (۲) عدت پوری کرنے کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کرے (۳) وہ اس سے صحبت کرے (۴) پھر وہ اس کو طلاق دے (۵) اور یہ اس کی عدت گزارے۔

مذکورہ آیت مبارکہ اور اس کی تفسیر سے واضح ہوگیا کہ جس عورت کو اس کے شوہر نے تین طلاقیں دیدی ہوں وہ اپنے اس شوہر کے لیے اس وقت حلال ہوگی جب وہ کسی اور سے نکاح کرلے اور دونوں کے درمیان ازدواجی تعلق قائم ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اگر مرجائے یا طلاق دیدے تو عورت عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگی۔

احادیث مبارکہ سے بھی حلالۂ شرعیہ کا جواز ثابت ہے۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ ایک صحابی رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ میں رفاعہ کے نکاح میں تھی، انہوں نے مجھے طلاق دیدی تھی اور میری طلاق کو منقطع کردیا تھا پھر میں نے عبدالرحمٰن بن زبیر سے نکاح کرلیا لیکن وہ نامرد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ مسکرادیئے اور پوچھا: کیا تم دوبارہ رفاعہ کے پاس جانا چاہتی ہو؟ (اگر ایسا ہے تو) یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ عبدالرحمٰن اور تم ایک دوسرے کی مٹھاس نہ چکھ لو۔ (صحیح بخاری: ۲۶۳۹، صحیح مسلم: ۱۴۳۳، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۴)

اس حدیث سے واضح ہے کہ جس عورت کو مکمل طلاقیں دے دی گئی ہوں وہ پہلے شوہر کے پاس اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک کہ کسی اور سے نکاح (مع صحبت) نہ کرلے۔

اسی طرح ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ جس شخص نے بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں پھر وہ عورت کسی اور سے نکاح کرے اور وہ شخص صحبت کئے بغیر اس عورت کو اپنے نکاح سے فارغ کردے تو آیا وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت پہلے شوہر کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک کہ وہ اور اس کا شوہر دونوں ایک دوسرے کی مٹھاس نہ چکھ لیں۔ (سنن ابوداؤد: ۲۳۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۹۳۳، سنن نسائی: ۳۴۰۷، سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۷۵، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵)

بعض احادیث جن میں حلالہ کرنے والے پر لعنت کی گئی ہے ان کے متعلق احناف کا

نظریہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص حلالہ کی شرط کے ساتھ نکاح کرے تو حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں ملعون ہیں۔ اور اگر حلالہ کی شرط نہ لگائی جائے تو اس صورت میں لعنت نہیں ہے بلکہ حلالہ کی شرط لگائے بغیر کوئی شخص اس لیے طلاق یافتہ عورت سے نکاح کرے تاکہ وہ اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے اور دونوں کے معاملات سنور جائیں تو اس نیت پر حلالہ کرنے والا اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔

صاحب ھدایہ علامہ مرغینانی حنفی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"اذا تزوجها بشرط التحليل فالنكاح مكروه لقوله ﷺ لعن الله المحلل والمحلل له. وهذا هو محمله". (ھدایہ اولین ص ۴۱۰)

یعنی حلالہ کی شرط لگا کر نکاح کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ ایسا نکاح مکروہ ہے۔

صاحب فتح القدیر علامہ کمال الدین ابن ہمام علیہ الرحمۃ ھدایہ کی مذکورہ عبارت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قوله بشرط التحليل: أى بان يقول تزوجتك على ان احللك له او تقول هى ذالك فهو مكروه كراهة التحريم المنتهضة سببا للعقاب لقوله ﷺ لعن الله المحل والمحلل له اما لو نوياه ولم يقولاه فلا عبرة به ويكون الرجل مأجورا لقصد الاصلاح". (فتح القدیر ج ۴ ص ۱۸۱ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

یعنی حلالہ کی شرط لگانے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مثلاً یوں نکاح کرے کہ میں تجھے پہلے شوہر کے لیے حلال کرنے کی غرض سے نکاح کر رہا ہوں یا عورت یہ جملہ کہے تو یہ نکاح مکروہِ تحریمی ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ "حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے" اس حدیث کی وجہ سے مذکورہ نکاح اخروی گرفت کا سبب ہے۔ ہاں اگر مرد وعورت صرف دل میں حلالہ کی نیت رکھیں اور زبان سے اس کا اظہار نہ کریں تو وہ قابل گرفت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آدمی اصلاح کی غرض سے نکاح کرنے کی وجہ سے اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔

علامہ قاری حنفی اور علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی (علیہما الرحمۃ) نے بھی یہی فرمایا ہے۔ (روح المعانی' البقرہ: ۲۳۰' مرقات المفاتیح' ج ۶ ص ۴۴۳)

حاصل کلام یہ ہے کہ حلالہ کی شرط لگا کر نکاح کرنا مکروہ تحریمی اور گناہ کا باعث ہے۔ جب کہ حلالہ کی شرط کے بغیر نکاح کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ قرآن وسنت اور عباراتِ علماء کرام کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حلالہ میں دوسرے شوہر کا عمل زوجیت کے بغیر طلاق دینے کا شرعی حکم

سوال:

کسی عورت کو تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ حلالہ کے لیے کسی اور سے نکاح کرے تو آیا یہ دوسرا شوہر ہمبستری کے بغیر طلاق دے سکتا ہے یا نہیں؟ [سائل: سمیع اللہ جوہر موڑ' کراچی]

جواب:

تین طلاق ہونے کی صورت میں دوسرا شوہر عورت کو صحبت کے بغیر طلاق تو دے سکتا ہے لیکن وہ عورت اپنے پہلے والے شوہر کیلیے حلال نہیں ہوگی۔ حلال اسی صورت میں ہوگی جب کہ دوسرا شوہر اس سے ہمبستری کر کے طلاق دے۔

ہدایہ اولین میں ہے:

"ان کان الطلاق ثلثا فی الحرۃ او ثنتین فی الامۃ لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ نکاحا صحیحا و یدخل بھا ثم یطلقھا او یموت عنھا والاصل فیہ قولہ تعالی فان طلقھا فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ".

(ہدایہ اولین ص ۳۹۹)

یعنی اگر عورت کو تین طلاقیں ہو جائیں تو وہ اپنے شوہر کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح صحیح نہ کر لے۔ پھر وہ مرد اس عورت سے ہمبستری کرے اور اس کے بعد اسے طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہو جائے تو اب یہ عورت اپنے پہلے

والے شوہر کے لیے حلال ہوگی۔ اس بارے میں دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ ''اگر وہ عورت کو (تیسری) طلاق دیدے تو اب عورت اس پر اس وقت تک حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرلے''۔ (البقرۃ: ۲۳۰)

صاحب ہدایہ نے قرآن مجید کی جو آیت مبارکہ ذکر کی ہے اس کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ نکاح سے مراد عمل ازدواج ہے۔ یعنی جب تک دوسرا شوہر اس عورت سے ہم بستری نہیں کرے گا اس وقت تک وہ پہلے شوہر پر حلال نہ ہوگی۔

(روح المعانی جز ۲، ص ۷۲۹)

ابوداؤد شریف کی حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے یہی سوال کیا گیا کہ آیا عمل زوجیت سے پہلے عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگی یا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمادیا۔ (ابوداؤد: ۲۳۰۹) واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

عورت کا عدالت میں اپنے نکاح کو مختصر قرار دے کر طلاق حاصل کرنا

سوال:

محمد احسن صدیقی ولد شمیم احمد صدیقی کا نکاح فائزہ علی بنت سید اسد علی سے مورخہ 15 اپریل 2001ء بروز اتوار کو قرار پایا (رخصتی نہیں ہوئی تھی) نکاح کے پانچ دن بعد یعنی 20 اپریل 2001ء کو میری بیوی امریکہ روانہ ہوگئی لیکن ہمارا ٹیلی فون پر رابطہ رہا۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک یہ سلسلہ رہا اچانک ان کی طرف سے 15 مارچ 2003 کو فائزہ علی بنت اسد علی نے طلاق کے کاغذات بھیجے۔ جس میں فائزہ علی نے ہمارے نکاح کو مختصر شادی قرار دیا۔ کہ یہ کاغذات موصول ہونے کے 20 دن بعد (امریکی قانون کے تحت) خودبخود ہماری طلاق واقع ہوجائے گی۔ لیکن پھر میں نے (محمد احسن صدیقی) اپنے وکیل سے مشورہ کیا تو میرے وکیل نے ان کے لیٹر کا جواب بھیجا جس میں میرے وکیل نے کہا کہ قرآن وسنت کے مطابق یہ طلاق نہیں ہوسکتی۔ امریکہ کی عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ یہ نکاح ختم

کرسکے۔ کیونکہ یہ نکاح کراچی میں رجسٹرڈ ہوا تھا۔لیکن جب یہاں (کراچی) سے خطوط بھیجے گئے جس کو فائزہ علی اور ان کے وکیل نے وصول کیے۔تیسرا لیٹر جو کہ امریکہ کی عدالت کے نام تھا وہ وصول نہیں ہوا' کیونکہ امریکہ کی عدالت کے مطابق جو پتا فائزہ علی اور وکیل نے بھیجا تھا وہ جعلی تھا۔لہٰذا وہاں کی کوریئر سروس نے پاکستان روانہ کیا واپس FedEx نے SkyNet کو کراچی روانہ کردیا اور اس کے ساتھ مجھے پتا جعلی ہونے کا ایک لیٹر دیا۔

(نوٹ) یہ نکاح بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا تقریباً دو سو افراد نے شرکت کی تھی۔

براہ کرم مجھے قرآن وسنت اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق یہ بتایا جائے کہ آیا طلاق واقع ہوئی ہے کہ نہیں اور اسلام میں مختصر شادی کا کوئی تصور ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ میں نے اپنی بیوی کو کسی قسم کی کوئی طلاق نہیں دی ہے نہ زبانی نہ تحریری؟

[سائل: محمد احسن صدیقی' عزیز آباد' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائل فائزہ علی بنت سید اسد علی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی وہ بدستور نکاح میں ہے۔ کیونکہ سائل نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو کسی قسم کی کوئی طلاق نہیں دی ہے اور جب شوہر نے طلاق نہیں دی ہے تو امریکی قانون یا کسی بھی ملک کا قانون طلاق کیسے واقع کرسکتا ہے۔شریعت مطہرہ کا قانون یہ ہے کہ نکاح کی گرہ شوہر کے ہاتھ میں ہے۔جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”بیدہ عقدۃ النکاح“ (البقرۃ آیت: ۲۳۷) ”اس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے“۔

امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔ (الدر المنثور ج۱ ص ۲۹۲ بحوالہ تبیان القرآن ج۱ ص ۸۹۶) لہٰذا جب تک شوہر طلاق نہیں دے گا اس وقت تک بیوی اپنے شوہر کے نکاح میں برقرار رہے گی اور یہ حکم اس صورت کو بھی شامل ہے جس میں عورت واقعۃً عدالت سے خلع حاصل کرلے۔ یعنی اس میں شوہر کا طلاق دینا ضروری ہے۔الا فی صور مخصوصۃ. (تبیان القرآن ج۱ ص ۸۵۴)

رہا یہ سوال کہ اسلام میں مختصر شادی کا کوئی تصور ہے یا نہیں؟ تو شرعی قانون کے مطابق

نکاح کے صحیح ہونے کے لیے ایک مستقل شرط "تابید" ہے۔ یعنی نکاح اسی وقت صحیح ہوگا جب وہ ہمیشہ کے لیے کیا جائے گا۔ مختصر اور محدود مدت کے نکاح کی شریعت مطہرہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ ابن مسعود کاسانی حنفی علیہ الرحمہ نکاح کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ومنها التابيد فلا يجوز النكاح الموقت وهو نكاح المتعة" نکاح کی شرائط میں ایک شرط یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے کیا جائے۔ لہٰذا ایک مخصوص وقت کے لیے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور یہ نکاحِ متعہ ہے۔ (بدائع الصنائع ج ۲ ص ۴۳۰، فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۱۱۰)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر والے دن "متعۃ النساء" سے منع فرمادیا یعنی ایک مخصوص مدت کے لیے کسی عورت سے نکاح کرنا حرام فرمادیا۔ (صحیح البخاری، کتاب المغازی: ۴۲۱۶، صحیح مسلم، کتاب النکاح: ۱۴۰۷، عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۲۲۴) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی شخص کا نامرد ہونے کے باوجود بیوی کو اپنے نکاح میں رکھنے کا شرعی حکم

سوال:

میں نے اپنی بچی کی شادی مسمی محمد ولد اسماعیل سے کی۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ نامرد ہے۔ ہم نے اس کا کافی علاج معالجہ بھی کرایا لیکن بے سود۔ اس کے گھر والوں کو ہم نے دو ماہ کی مہلت دی کہ وہ اپنا علاج کرائے لیکن اس کے باوجود وہ نامرد ہی رہا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ آیا نامرد آدمی عورت کو اس طرح رکھ سکتا ہے کہ اس کے حقوق ہی ادا نہ کر سکے؟ کیا شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے؟ براہ مہربانی قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ [سائل: محمد ہاشم جیوا، پیر کالونی]

جواب:

صورت مسئولہ میں شوہر کے نامرد (عنین) ہونے کی شکل میں نکاح کے برقرار رہنے نہ رہنے یا اس سے چھٹکارہ پانے کی شرعی حیثیت کے بارے میں مختصراً یہ ہے کہ:

شوہر کا اگر نامرد ہونا ثابت ہو جائے تو پھر بھی ایک سال کی مہلت اس لیے دی جائی گی تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا نامرد ہونا کسی عارضی بیماری یا آفت کی وجہ سے تو نہیں۔ ہاں اگر سال بھر کی اس مدت میں بھی ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق نامرد قرار دیا جائے تو پھر یہ یقینی اور اصلی نامرد متصور ہوگا۔ ایسی صورت میں قاضی کو ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد نکاح کی تفریق کا طلاق بائن کے طور پر حق حاصل ہے بشرطیکہ حکومت اسلامی ہو اور مسلم حکمران کی جانب سے سند یافتہ قاضی مقرر کیا گیا ہو' چونکہ یہاں ایک بڑی حد تک یہ شرط مفقود ہے اس لیے اب اس کی چند صورتیں ممکن ہیں:

(۱) یہ کہ لڑکی اور لڑکے کے برادری کے بزرگ سر جوڑ کر بیٹھیں اور مظلوم لڑکی کو گناہ گارانہ زندگی سے بچانے کے لیے لڑکے سے طلاق دلوائیں۔ برادری کے بزرگوں کو یہ فریضہ انجام دینا چاہیے تا کہ خلع کا مقدمہ کرنے کی وجہ سے عدالتوں میں چکر لگانا برادری کی بدنامی کا باعث نہ بنے اور لڑکی یا لڑکی والے پریشان ہو کر کسی غیر اسلامی حرکت کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ جب حدود الٰہیہ کو قائم نہ کرنے کا خوف لاحق ہو اور زنا جیسی حرکت کا امکان ہو تو ایسی صورت میں دونوں طرف کے حَکَم اور بڑے اس الجھن کو سلجھانے میں مدد دیں کہ یہ شرعی سہولت اسلام نے دی ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا'' (النساء:۳۵) اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کا اندیشہ ہو تو لڑکے اور لڑکی والوں کی طرف سے حَکَم مقرر کر لو۔ اس طرح بڑوں کی مداخلت سے لڑکا طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ مہر کی معافی کے ساتھ بطور فدیہ مزید کچھ رقم طرفین کے بڑے مقرر کر کے خلع کی سی شکل بنالیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ'' (البقرہ:۲۲۹)

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کچھ حرج نہیں عورت کے فدیہ دینے میں۔

(۲) ایک صورت یہ ہے کہ شوہر بیوی کو باقاعدہ تحریری طور یہ لکھ کر دے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق کا حق سپرد کرتا ہوں یہ چار یا چھ ماہ تک میری صحت کا انتظار کرلے اگر اس مدت

تک میں صحت یاب ہو کر اس کے قابل نہ ہو جاؤں تو وہ طلاق کے حق کو استعمال کرے۔

خلاصہ کلام یہ کہ قاضی والی صورت فی زمانہ مشکل ہے اور عدالت میں خلع کا مقدمہ داخل کرنے کی صورت طویل مدت تک مقدمہ بازی ہے۔لہٰذا برادری کے بزرگوں کا لڑکے کو طلاق پر آمادہ کرنا یا لڑکے کا لڑکی کو چار یا چھ ماہ تک صحت کی شرط پر طلاق کا حق دینا لڑکی کو پریشانی' اضطراب اور مظلومیت سے بچانا ہے۔واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

طلاق نامہ کی تحریر اور دستخط کے وقت شوہر کے ارادہ میں اگر اختلاف ہو تو کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

سوال:

میں نے طلاق نامہ مرتب کروایا اور کاتب نے طلاق کے جملے یوں لکھے: ''میں پہلی طلاق دیتا ہوں' دوسری طلاق دیتا ہوں اور آج ہی میں دوسری طلاق دیتا ہوں''۔

میں یہ حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میں نے جب اس طلاق نامہ پر دستخط کیے اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس میں کتنی طلاقیں لکھی ہوئی ہیں' صرف اتنا ذہن میں تھا کہ یہ فیصلہ کا کاغذ ہے۔لیکن فیصلہ کے کاغذ کا مطلب میرے ذہن میں یہی ہے کہ اس میں تین طلاقیں ہوتی ہیں اور فیصلہ کے کاغذ سے ہمیشہ کی کاروائی ہوتی ہے۔

اس صورت میں بتایا جائے کہ عورت پر کتنی طلاقیں واقع ہوئیں اور وہ اپنے شوہر کے نکاح میں ہے یا نہیں؟ [سائل: محمد صدیق' کراچی]

جواب:

شوہر (محمد صدیق) نے خود دارالافتاء میں آ کر حلفیہ بیان دیا کہ میں اگرچہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے حق میں نہیں تھا' صرف گھر والوں کے دباؤ کی وجہ سے میں نے طلاق نامہ مرتب کروایا تھا' لیکن اس پر میں نے جو دستخط کیے ہیں وہ تین طلاق سمجھ کر کیے ہیں کیونکہ طلاق نامہ یا فیصلے کے کاغذ کا مطلب میرے ذہن میں یہی ہے کہ اس میں تین طلاقیں ہوتی ہیں۔شوہر سے ہم نے یہ بھی پوچھا کہ آپ جب گھر سے (طلاق نامہ لکھوانے کے لیے) نکلے

تھے اس وقت ذہن میں کیا تصور تھا' آیا آپ دائمی چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جا رہے ہیں یا جزوی اور عارضی؟ اس سوال کے جواب میں شوہر نے کہا کہ میں مکمل کاروائی اور ہمیشہ کا چھٹکارا حاصل کرنے کے ارادے سے گھر سے چلا تھا' جزوی اور عارضی چھٹکارے کا تصور اور ارادہ نہیں تھا۔

شوہر کے اس اقرار و اعتراف اور بیان کی روشنی میں اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور اس کی بیوی حرمتِ مغلظہ کے ساتھ اس پر حرام ہو چکی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شوہر جب (بلا اکراہِ شرعی) طلاق نامہ پر دستخط کرے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ طلاق نامہ میں کتنی طلاقیں لکھی ہوئی ہیں تو ایسی صورت میں شوہر کی نیت کے مطابق حکم ہوتا ہے۔ جیسا کہ فقیہ اعظم مفتی نور اللہ نعیمی بصیر پوری علیہ الرحمۃ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص (محمد عاشق) نے لکھنے والے کو صرف اتنا کہا کہ طلاق لکھ دے' لکھنے والے نے لفظِ طلاق تین بار (طلاق' طلاق' طلاق) لکھ دیا اور شوہر نے طلاق نامہ پر دستخط کر دیئے۔ اس صورت میں کتنی طلاقیں ہوئیں؟ تو آپ نے جواباً فرمایا کہ محمد عاشق کے لفظ لکھ دینے میں نیت ایک طلاق کی ہے اور ایک ہی طلاق سمجھ کر دستخط کیے ہیں تو طلاق ایک ہی واقع ہوئی رجعی' جس سے رجوع ہو گیا اور معاملہ صاف ہو گیا۔ اور اگر تین طلاق کی نیت ہے تو طلاقِ مغلظہ پڑ گئی۔

(فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۱۷۵)

اسی طرح زیرِ بحث سوال میں شوہر نے طلاق نامہ پر تین طلاق سمجھ کر دستخط کیے اور تصور بھی دائمی کاروائی کا تھا تو تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ اب بغیر حلالہ شرعیہ کے دونوں کا آپس میں تعلق جائز نہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مستقبل کے الفاظ سے طلاق دینا

سوال:

میری بہن کا میرے بہنوئی سے جھگڑا ہو گیا۔ دورانِ جھگڑا میرے بہنوئی نے مندرجہ ذیل الفاظ ادا کیے: ''لڑکی ایک قلم کی محتاج ہے' جہاں میں نے ۲۶ سال ایسے گذارے ہیں ویسے ہی گذار دوں گا''۔ آیا ان الفاظ کے ادا کرنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

[سائل: محمد سلمان' نیو کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ شوہر نے جو الفاظ اپنی بیوی سے کہے ہیں' شرعی اعتبار سے بیوی پر (بصورت طلاق) ان کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ شوہر کے الفاظ زمانہ مستقبل سے متعلق ہیں۔ اور زمانہ مستقبل کے صیغے استعمال کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

اگر ہزار بار کہے میں تجھے طلاق دے دوں گا' طلاق نہ ہوگی۔'' وھٰذا ظاھر جدا وفي جواھر الاخلاطي فقال الزوج طلاق ميكنم طلاق ميكنم انها ثلاث لان ميكنم يتمحض للحال وھو تحقيق بخلاف قوله كنم لانه يتمحض للاستقبال وبالعربية قوله اطلق لا يكون طلاقا لانه دائر بين الحال والاستقبال فلم يكن تحقيقا مع الشك''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۵۸۸)

خاص طور پر جب کہ سوال مذکور میں صراحتاً طلاق کا بھی تذکرہ نہیں ہے۔ لہٰذا بیوی پر مذکورہ بالا الفاظ سے طلاق واقع نہ ہوگی۔ لانه وعد لا تنجيز كما صرح به في المجلد الثالث من الفتاوىٰ النوريه۔ والله ورسوله اعلم بالصواب

شدید غصہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق کا شرعی حکم

سوال:

میری اپنی اہلیہ کے ساتھ لڑائی ہوگئی اور بات انجانے میں اتنی بڑھ گئی کہ میں نے غصے کی حالت میں لاشعوری طور پر بغیر کسی ارادہ ونیت کے اپنی اہلیہ کو تین مرتبہ صریح الفاظ میں کہا میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اس فیصلے میں میری طرف سے قطعی طور پر کسی نیت یا ارادے کا کوئی دخل نہ تھا' یہ الفاظ غصہ میں لاشعوری طور پر میری زبان سے ادا ہوگئے تھے۔ چنانچہ آپ

قرآن وسنت کی روشنی میں میری رہنمائی فرمائیں کہ آیا میرے اس فیصلے کے بعد میری بیوی سے میرا تعلق بالکل ختم ہوگیا یا کوئی ایسی صورت باقی ہے کہ میں دوبارہ اپنی اہلیہ کے ساتھ رہ سکوں۔ [سائل: عبدالمنان' ملیرسٹی' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ طلاق خواہ غصہ میں دی جائے یا خوشی سے اور دینے کی نیت ہو یا نہ ہو بہر صورت طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرّہ فرماتے ہیں: آج کل اکثر لوگ طلاق دے بیٹھتے ہیں بعد کو افسوس کرتے ہیں اور طرح طرح کے حیلے سے یہ فتویٰ لینا چاہتے ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو۔ ایک عذر اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ غصہ میں طلاق دی تھی۔ مفتی کو چاہیے کہ یہ امر ملحوظ رکھے کہ مطلقاً غصہ کا اعتبار نہیں' معمولی غصہ میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ صورت کہ عقل غصہ سے جاتی رہے بہت نادر ہے لہٰذا جب تک اس کا ثبوت نہ ہو محض سائل کے کہہ دینے پر اعتماد نہ کرے۔

(بہار شریعت حصہ ۸ ص ۸ ' مطبوعہ ضیاء القرآن' لاہور)

اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت امام احمد رضا خان محدث بریلوی نوّر اللہ مرقدہ فرماتے ہیں: غصہ مانعِ وقوعِ طلاق نہیں بلکہ اکثر وہی طلاق پر حامل ہوتا ہے' تو اسے مانع قرار دینا گویا حکمِ طلاق کا رأساً ابطال ہے۔ ہاں اگر شدتِ غیظ و جوشِ غضب اس حد کو پہنچ جائے کہ اس سے عقل زائل ہو جائے' خبر نہ رہے کہ زبان سے کیا نکل رہا ہے تو بے شک ایسی حالت کی طلاق ہرگز واقع نہیں ہوگی۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۳۸۳)

صورت مسئولہ میں عبدالمنان صاحب نے جو تین طلاقیں دی ہیں وہ واقع ہو چکی ہیں اور ان کی زوجہ حرمتِ مغلظہ کے ساتھ ان پر حرام ہو چکی ہے۔ اب حلالہ شرعیہ کے بغیر دونوں کا آپس میں نکاح شرعاً درست نہیں ہے۔ ہاں اگر طلاق دیتے وقت غصہ اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ ماں بہن اور بیوی کے درمیان تمیز ختم ہو چکی تھی تو اس کا شرعی حکم اس صورت میں واضح کیا جائے گا جب سائل خود دارالافتاء میں آکر حلفیہ بیان کے ساتھ تفصیلات فراہم کرے گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

عورت طلاق کا دعوی کرے اور شوہر اس سے انکار کرے تو کس کی بات کا اعتبار ہوگا؟

سوال:

زید اور اس کی بیوی کے مابین لڑائی ہوئی اور وہ اپنے میکے چلی گئی۔ اس دوران بیوی نے یہ دعوی کیا کہ وہ کلام مجید پر حلفیہ قسم اٹھا کر یہ کہنے کو تیار ہے کہ اسے زید نے دو طلاقیں دے دی ہیں۔ جب کہ زید بھی کلام مجید اٹھا کر حلفیہ قسم کھانے کو تیار ہے کہ اس نے کوئی طلاق نہیں دی ہے۔ یاد رہے کہ اس کا کوئی گواہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس سلسلہ کو عرصہ نو ماہ بیت گئے ہیں اور انہوں نے اس دوران کوئی رجوع بھی نہیں کیا ہے۔ براہ کرم مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ [سائل: یعقوب، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل نے جو تفصیل بیان کی ہے اگر وہ درست ہے تو شرعاً عورت پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ محض عورت کے دعوی سے شرعاً طلاق ثابت نہیں ہوتی۔ طلاق کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ شوہر اقرار کرے یا عورت اپنے دعوی پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ کے طور پر پیش کرے۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں: اگر شوہر طلاق دینے سے انکار کرتا ہو تو جب تک گواہ نہ ہوں طلاق ثابت نہیں ہو سکتی۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۲۰۳)

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان "درمختار" کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ نکاح اور طلاق میں گواہی کا نصاب یہ ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۳ ص ۲۳۲)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اگر کوئی اپنی بیوی سے یوں کہے:
میں نے طلاق دی' دی' دی!

سوال:

شوہر نے بیوی کے ساتھ ایک جھگڑے کے دوران غصہ میں کہا کہ "میں نے طلاق دی' دی' دی"۔ اس جملہ میں نہ شوہر نے بیوی کا نام لیا اور نہ ہی اس کو مخاطب کیا' البتہ بیوی ہی کو کہا۔ یعنی ذہن میں بیوی ہی کا تصور تھا اور اسی کے ارادے سے یہ جملہ کہا تھا لیکن طلاق دینے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔

جب کہ بیوی کا کہنا یہ ہے کہ شوہر نے تین دفعہ میرا نام لیکر مجھے طلاق دی ہے۔ بیوی کے پاس گواہ کوئی نہیں ہے' البتہ وہ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر یہ بات کرتی ہے۔ اس صورت میں واضح کیا جائے کہ بیوی پر کتنی طلاقیں واقع ہوئیں؟ اور میاں بیوی کا کیا حکم ہے؟

[سائل: عبدالمجید سیفی' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں برتقدیر صدق سائل شخص مذکور کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور بیوی اپنے شوہر پر حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام ہو چکی ہے۔ کیونکہ جب شوہر نے اپنی ہی بیوی سے کہا کہ "میں نے طلاق دی" تو اس سے ایک طلاق واقع ہوئی اور پھر متصلاً ہی "دی' دی" کے الفاظ کہے تو ان سے مزید دو طلاقیں واقع ہوگئیں۔ یوں عورت پر کل تین طلاقیں واقع ہوئیں' لہٰذا اب بغیر حلالہ شرعیہ کے دونوں کا باہمی تعلق شرعاً جائز نہیں ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان تحریر فرماتے ہیں کہ: اگر واقع میں تین بار "دی" کا لفظ کہا تو اس پر فرض ہے کہ اسے چھوڑ دے اور بے حلالہ ہاتھ نہ لگائے۔ اگر خلاف کرے گا تو بدکاری میں مبتلا ہوگا اور عذاب شدید کا مستحق ہوگا۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۴۳۳)

لہٰذا صورت مسئولہ میں شخص مذکور اگر اپنی بیوی سے دوبارہ تعلق قائم کرنا چاہتا ہے تو اس

کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت کی عدت طلاق گزر چکی ہے تو وہ کسی اور سے نکاح کرے اور دونوں کے درمیان عملِ زوجیت بھی ہو۔ پھر اس کے بعد اگر وہ شخص اس عورت کو طلاق دیدے یا اس شخص کا انتقال ہو جائے تو طلاق یا موت کی عدت پوری ہونے کے بعد عورت دوبارہ اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں آسکے گی۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا: ''فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ'' (البقرۃ:۲۳۰) یعنی اگر اسے (تیسری) طلاق بھی دیدی تو وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہ لے۔ (یعنی دوسرا خاوند عملِ زوجیت بھی کرلے)۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ایک شخص کا اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہوئے مختلف کنایات کا استعمال اور ان سب کا شرعی حکم

سوال:

تقریباً آٹھ سال قبل ۱۹ سال کی عمر میں میری شادی ایک اچھے شریف خاندان میں ہوئی۔ بیوی جو کہ میری ہم عمر ہے' نماز کی پابند اور نیک ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے چار بیٹوں سے نوازا ہے۔ ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔

مسئلہ کچھ یوں ہے کہ شادی کے چار چھ ماہ بعد ایک رات میری بیوی نے مجھ سے پانی مانگا' میں یہ سمجھا کہ یہ مجھ پر حکم چلا رہی ہے۔ میں نے ناسمجھی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو ڈانٹا اور سختی برتی جس پر وہ غصہ میں آگئی اور کہنے لگی کہ میں اپنے والدین کے گھر رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے ایک تھپڑ بھی مارا اور طلاق کی دھمکیاں بھی دیدیں۔ تو وہ بولی مجھے طلاق دے دو تو میں نے صرف اتنا کہا کہ ''میں تجھ کو'' اور اس سے آگے کا لفظ زبان پر لاتے ہوئے رک گیا اور میں نے وہ لفظ زبان سے نہیں نکالا اور پھر اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو تو میں نے سوچا کہ میں نے کون سا اس کو پکڑ رکھا ہے اور سوچا کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں اور میں نے اپنی بیوی ہی کو مراد لیتے ہوئے محض دھمکانے کے لیے اسے کہا ''چھوڑ دیا'' اور سوچا کہ اس کو رکھنے

یا نہ رکھنے کا فیصلہ صبح والدین کے آگے ہوگا اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ تمام الفاظ میں نے طلاق دینے کی نیت سے نہیں کہے تھے اور یہ بات میرے دل میں تھی کہ اس طرح آسانی سے نہیں چھوڑوں گا اور بات چیت بند کرنے کی نیت سے کہا کہ ''جا تیرا میرا کوئی واسطہ نہیں ہے'' پھر سوتے وقت اس نے میرے سرہانے تکیہ لگانا چاہا تو میں نے اسے دھتکار دیا اور پھر کہا کہ مجھ سے دور ہو جا تو وہ بولی اس طرح بھگا رہے ہو؟ کیا تمہارا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے؟ تو میں نے کہا: کون سا رشتہ' کیسا رشتہ' کس رشتے کی بات کر رہی ہو؟ اور یہ کہتے ہوئے میں نے سوچا کہ ابھی خود ہی اس رشتے کو توڑنے والی بات کر رہی تھی۔ پھر میں نے کہا: ''جا مجھ سے دور ہو جا'' تو وہ بولی کیا تم ختم کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ تو خود ختم کرنا چاہتی ہے تو اس نے کہا کہ کب ختم کرو گے؟ تو میں نے پھر اس کو ڈرانے اور دھمکانے کی غرض سے کہا جلدی ختم کر دوں گا۔ تو وہ بولی کیا ابھی سے ختم سمجھ لوں؟ میں نے کہا: ''اب تو جیسے مرضی چاہے سمجھ لے'' لیکن بیوی نے اس جملہ کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے بھی یہ بات اپنی جان چھڑانے کی غرض سے کہی اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں نے کوئی لفظ طلاق کی نیت سے نہیں کہا تھا۔

ایک اور بات میرے لیے الجھن کا باعث بن رہی ہے کہ جس وقت طلاق دینے کا کہہ رہی تھی تو میں نے کہا کہ سوچ لے' لوگ تجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھیں گے اور تجھے طلاق یافتہ کہیں گے۔ یہاں مجھے صحیح یاد نہیں آرہا ہے کہ میں نے اس وقت شاید اسے کہا تھا کہ ''میں تیرا نام طلاق یافتہ رکھتا ہوں تو بار بار طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے''۔ شاید میں نے یہ بات اسے کہی یا نہیں کہی یا شیطانی وسوسہ ہے۔ مجھے صحیح یاد نہیں ہے۔ اور یہ تمام باتیں میں نے طلاق کی نیت سے نہیں کہیں بلکہ محض ڈرانے اور تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے کہی تھیں۔ برائے کرم قرآن وسنت کی روشنی میں میرے مسئلہ کا حل بیان فرمائیں۔ اللہ رب العزت آپ کو عزت و عظمت عطا فرمائے۔ [سائل: عبدالرحمٰن' نارتھ کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کے بیان کے مطابق سائل کی بیوی پر اسی وقت دو بائنہ طلاقیں واقع ہو چکیں جب شوہر نے ذکر کردہ جملوں میں پہلا اور دوسرا جملہ ادا کیا (یعنی ''چھوڑ دیا'' اور ''جا تیرا میرا کوئی واسطہ نہیں ہے'') اور بعد ازاں عدت گزرنے کے ساتھ ہی عورت

اپنے شوہر کے نکاح سے خارج ہو چکی اور اس وقت سے لیکر اب تک جو تعلقات قائم رہے یا قائم ہیں وہ شرعاً گناہ گارانہ تعلقات ہیں جن کو فی الفور ختم کرنا اور ان سے توبہ کرنا دونوں پر ضروری ہے۔اب اگر شوہر دوبارہ اپنی بیوی سے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے تو باقاعدہ نکاح کر کے اسے اپنے عقد میں لائے اور اس صورت میں اسے پوری زندگی میں اپنی اس بیوی کو صرف ایک طلاق دینے کا حق حاصل رہے گا۔اس جواب کی تفصیل دلائل کی روشنی میں درج ذیل ہے:

سائل نے اپنی بحث وتکرار کے دوران بیوی سے جو مختلف جملے کہے ان میں قابل بحث جملے یہ ہیں:

(۱) چھوڑ دیا۔(یہ جملہ شوہر نے اپنی بیوی ہی کو مراد لیتے ہوئے محض دھمکانے کے لیے کہا)

(۲) جا تیرا میرا کوئی واسطہ نہیں ہے (یہ جملہ بات چیت بند کرنے کی نیت سے شوہر نے کہا)

(۳) کون سا رشتہ؟ کیسا رشتہ؟ کس رشتے کی بات کر رہی ہو؟

(۴) جا مجھ سے دور ہو جا۔

(۵) اب تو جیسے مرضی چاہے سمجھ لے۔(بیوی نے اس جملہ کا کوئی جواب نہیں دیا)

(۶) میں تیرا نام طلاق یافتہ رکھتا ہوں۔(اس جملہ کے بارے میں سائل کو یاد نہیں ہے کہ اس نے ایسا کہا یا نہیں کہا)

یہ تمام جملے شوہر نے بیوی سے جس وقت کہے وہ (بیان کردہ تفصیلات کے مطابق) غصہ کی حالت تھی اور اسی حالت نے آگے جا کر مذاکرۂ طلاق کی شکل اختیار کر لی تھی۔یعنی آغاز میں تو دونوں جانب سے غصہ تھا بعد میں طلاق اور رشتہ ختم کرنے کی باتیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔

ذکر کردہ جملوں میں تیسرا' پانچوں اور چھٹا جملہ طلاق میں مؤثر نہیں ہے' کیوں کہ تیسرے جملے میں انداز سوالیہ ہے اور طلاق دینا اس میں واضح نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں جب شوہر کی نیت بھی طلاق دینے کی نہ تھی۔اور پانچویں جملہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں شوہر نے اپنی بات کو بیوی کی مرضی پر چھوڑا اور بیوی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔لہٰذا اس سے بھی طلاق نہ ہوگی۔

”درمختار پھر ردالمحتار میں ہے کہ تفویض کنائی میں بھی جب تک عورت خود اپنے آپ کو طلاق نہ دے اس وقت تک طلاق نہیں ہوتی اگرچہ شوہر کی نیت طلاق کی ہو اور دلالت حال موجود ہو“۔ (الدر المختار مع ردالمحتار ج ۴ ص ۴۰۲)

شوہر کے چھٹے جملے کا حال یہ ہے کہ اس کے بارے میں خود شوہر کو شک ہے کہ آیا اس نے ایسا کہا یا نہیں کہا' لہٰذا اس سے بھی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ ”اس میں شک ہے کہ طلاق دی ہے یا نہیں' تو کچھ نہیں“۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۱۲)

جہاں تک دوسرے اور چوتھے جملے کا تعلق ہے سو وہ دونوں کنایات طلاق میں سے ہیں۔ اور کنایات طلاق تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) بعض وہ ہوتے ہیں جن میں ردّ کا احتمال ہوتا ہے (یعنی عورت کے مطالبہء طلاق کو رد کرنا)۔

(۲) بعض وہ ہوتے ہیں جن میں سب وشتم کا احتمال ہوتا ہے (یعنی ان کا محض ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہونا ممکن ہوتا ہے)۔

(۳) اور بعض وہ ہوتے ہیں جن میں نہ تو رد کا احتمال ہوتا ہے اور نہ سب وشتم کا' بلکہ وہ خالصۃ جواب طلاق کے لیے بولے جاتے ہیں۔

ان تمام کنایات کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ جب غصہ کی حالت ہو تو پہلی دونوں قسموں میں نیت طلاق کا اعتبار ہوگا اور آخری قسم میں نیت کا اعتبار نہ ہوگا اور جب مذاکرۂ طلاق کی حالت ہو تو صرف پہلی قسم میں نیت کا اعتبار ہوگا' باقی دو میں نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

(الدر المختار مع ردالمحتار ج ۴ ص ۳۹۸)

شوہر کے ذکر کردہ دوسرے اور چوتھے جملے میں دوسرے کا تعلق کنایات کی دوسری قسم سے ہے اور چوتھے جملے کا تعلق پہلی قسم سے ہے اور چونکہ حالت مذاکرۂ طلاق کی ہے اس لیے قاعدۂ مذکورہ کے مطابق چوتھے جملے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور دوسرے جملے سے ایک طلاق بائن ہوگی۔ کہ اگرچہ نیت طلاق کی نہیں تھی مگر حالت مذاکرۂ طلاق کی تھی۔

(ولا احتیاج الی النیة فی الاخیرین فی مذاکرة الطلاق)

رہا شوہر کا پہلا جملہ جس میں اس نے بیوی ہی کو مراد لیتے ہوئے اس کو دھمکانے کی

غرض سے کہا: چھوڑ دیا' یہ وقوع طلاق میں صریح جملہ ہے۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:
عورت کو کہا: میں نے تجھ کو چھوڑا اور کہتا ہے کہ میرا مقصود یہ تھا کہ بندھی ہوئی تھی اس کی بندش کھول دی یا مقید تھی اب چھوڑ دی تو یہ تاویل نہ سنی جائے گی۔ ہاں اگر تصریح کر دی کہ تجھے قید یا بندش سے چھوڑا تو قول مان لیا جائے گا۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۱۰) ھکذا فی الفتاوی الرضویہ (ج ۱۲ ص ۶۱۰۔ ۶۲۹)' والفتاویٰ الامجدیہ (ج ۲ ص۔ ۱۸۱۔ ۲۱۲)' والفتاویٰ النوریہ (ج ۳ ص ۲۰۶)

رہی یہ بات کہ شوہر کا جملہ (چھوڑ دیا) اضافت سے خالی ہے' اس سے طلاق کیسے ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جملے میں اگر چہ صراحۃً اضافت نہیں ہے لیکن چونکہ اس نے بیوی ہی کو مراد لیتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا اور دلالت حال بھی اس پر واضح قرینہ ہے کہ اس جملہ سے اس کا خطاب اپنی ہی بیوی کو تھا' اس لیے اس سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

''والذی تحصل للعبد الضعیف بتوفیق المولی اللطیف جل وعلا ان الاضافة لا بد منها اما فی اللفظ و اما فی النیة اذ لا طلاق الا بالا یقاع والایقاع الا باحداث تعلق الطلاق بالمرءة و لیس ذالك الا بالاضافة(الی قوله)نعم قد توجد الاضافة فی اللفظ فلا یحتاج فی الحکم الی النیةوقد لاتوجدفی اللفظ فیحتاج الی ظهور النیة''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۳۴۴)

یعنی وہ بات جو اس ناتواں بندے کو اپنی مہربان مالک جل وعلا کی توفیق سے حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ اضافت کا ہونا ضروری ہے' خواہ لفظ میں ہو یا نیت میں ہو۔ کیوں کہ طلاق بغیر واقع کیے نہیں ہوتی اور واقع کرنا اس وقت تک نہیں پایا جاتا جب تک کہ طلاق کا تعلق عورت کے ساتھ قائم نہ ہو اور یہ بغیر اضافت کے نہیں ہو سکتا۔ ہاں اضافت کبھی لفظوں میں ہوتی ہے' سو اس صورت میں نیت کی ضرورت نہیں ہوتی اور کبھی اضافت لفظوں میں نہیں ہوتی سو اس صورت میں ظہورِ نیت کی حاجت ہوگی۔

صدر الشریعہ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: '' حق یہ ہے کہ صراحتاً اضافت ہونا ضروری نہیں' بلکہ اضافت اگر نیت میں ہو جب بھی کافی ہے''۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۱۷۵)

لہٰذا زیرِ بحث سوال میں شوہر کا بیوی سے یہ کہنا کہ '' چھوڑ دیا'' ایک طلاق کا باعث ہے

اور یہ کل دو طلاقیں ہوئیں۔ ایک جملہ اولیٰ سے اور ایک جملہ ثانیہ سے۔ لیکن دونوں طلاقیں بائنہ ہوں گی' کیوں کہ جملہ اولیٰ طلاق میں صریح ہے اور دوسرا جملہ کنایہ ہے اور قاعدہ ہے کہ جب طلاق صریح کے بعد بائنہ طلاق دیجائے تو صریح طلاق بھی بائنہ ہو جاتی ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۵۷۱) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اگر کوئی اپنی بیوی سے یوں کہے: "میں نے تمہیں طلاق دی' ایک طلاق دی دو طلاق دی"

سوال:

زید نے انتہائی غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو یہ الفاظ کہے: "اب بہت ہو گیا' لو سنو دردانہ بیگم! میں نے تمہیں طلاق دی' ایک طلاق دی دو طلاق دی"۔ جب تیسری بار بولنے والا تھا تو بیٹی نے رو پیٹ کر منہ بند کر دیا اور تیسری بار کہنے سے روک دیا۔ اس کے بعد زید نے دردانہ سے کہا کہ اپنا کھانا پینا خود کرو اور یہاں گھر سے جہاں دل چاہے چلی جاؤ' میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ کیا پہلا جملہ "دردانہ بیگم میں نے تمہیں طلاق دی" ملا کر طلاق واقع ہو گئی؟ اگر نہیں ہوئی تو کیا کرنا چاہیے؟ [سائلہ: ایک خاتون' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ دردانہ بیگم پر دو طلاقیں واقع ہو گئی ہیں۔ ایک اس جملہ سے جس میں شوہر نے کہا کہ "ایک طلاق دی" اور دوسری اس جملہ سے جس میں اس نے کہا کہ "دو طلاق دی"۔ پہلا جملہ جس میں شوہر نے کہا کہ "دردانہ بیگم میں نے تمہیں طلاق دی" اس سے زیر بحث مسئلہ میں طلاق واقع نہیں ہو گی۔ کیونکہ اس جملہ کا تعلق بہ ظاہر اگلے دو جملوں سے ہے' جس کی بنیاد پر اس میں اجمال ہے اور اگلے دونوں جملے اس کی تفسیر اور وضاحت ہیں۔ جیسا کہ علماء اصول کا قاعدہ ہے کہ کلام میں اجمال کے بعد اس کا بیان اور تفسیر لائی جا سکتی ہے۔ (حاشیہ اصول الشاشی ص ۲۵) لہٰذا پہلا جملہ طلاق میں مؤثر نہیں ہے اور دردانہ

بیگم پر صرف دو طلاق واقع ہوں گی۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

اگر کوئی اپنی بیوی سے یوں کہے: تم مجھ پر حرام ہو!

سوال:

میں نے غصہ میں آ کر اپنی بیوی سے جھگڑے کے دوران کہا کہ تم چلی جاؤ میرے اوپر حرام ہو اگر جانا ہے تو جاؤ' میرے سے حرام ہے' حرام ہے۔

اگر تم چاہو تو میں لکھ کر بھی دیدوں۔ ان جملوں سے میرا ارادہ طلاق دینے کا نہیں تھا۔ آیا اس صورت میں طلاق ہوئی یا نہیں؟ [سائل: کریم بخش' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ سائل نے جب اپنی بیوی سے کہا کہ "میرے اوپر حرام ہو" تو اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور بیوی سائل کے نکاح سے خارج ہوگئی۔ بقیہ جملے جن میں سائل نے حرام کا لفظ استعمال کیا ہے وہ بھی چونکہ بائن کے جملے ہیں اس لیے ان سے طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی۔ علامہ شامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: "**لو کررہ انت علی حرام لا یقع الا الاول لان البائن لا یلحق البائن**"۔ (فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۷۶۵' بحوالہ فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۲۱۴) اگر کسی نے یہ جملہ کہ "تو مجھ پر حرام ہے" تکرار کے ساتھ کہا تو صرف پہلی مرتبہ کہنے سے طلاق واقع ہوگی' کیونکہ بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ شوہر کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی تو وہ زیر بحث جملہ میں معتبر نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص طلاق کی نیت کے بغیر اپنی بیوی کو حرام کہے تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: "اپنی عورت سے کہا تو مجھ پر حرام ہے تو ایک بائن طلاق ہوگی اگرچہ نیت نہ کی ہو۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۱۰) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ نے بھی فتاویٰ شامی کے حوالہ سے یہی لکھا ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۵۳۱)

خلاصہ یہ ہے کہ سائل مذکور کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے اور عورت اپنے

شوہر سے آزاد ہو چکی ہے۔ اگر دونوں دوبارہ رشتہ ازدواج قائم کرنا چاہیں تو از سرِ نو نکاح کرنا لازمی ہوگا۔ یعنی نئے نکاح اور نئے مہر کے ساتھ دونوں دوبارہ اپنے درمیان رشتہ قائم کر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد شوہر کو پوری زندگی میں فقط دو طلاق کا حق حاصل رہے گا۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کوئی اپنی بیوی سے یوں کہے: اگر تو نے اپنے بھائی سے بات کی تو تجھے تین طلاق!

سوال:

زید نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے عمر سے بات کی تو تجھے تین طلاق ہے۔ (عمر زید کی بیوی کا بھائی ہے) اب اگر زید کی بیوی اپنے بھائی سے بات نہ کرے اور اس کے برعکس عمر اپنی بہن یعنی زید کی بیوی سے بات کرے اور وہ جواب بھی دے تو کیا طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ براہ مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بیان فرمائیں۔

[سائل: عبدالخالق، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں زید نے تین طلاقوں کو اس بات کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ "اگر تو نے عمر سے بات کی تو تجھے تین طلاق ہے"۔ اس جملہ میں مطلق بات کرنے کا ذکر ہے، خواہ وہ خود بات کرے یا عمر کے بات کرنے کی صورت میں اس سے جواباً گفتگو کرے۔ لہٰذا بہر دو صورت عمر سے بات کرنے کی صورت میں زید کی بیوی پر تین طلاق واقع ہو جائیں گی۔

فتح القدیر اور دیگر کتب فقہ میں ہے کہ اگر کسی شخص نے مثلاً زید سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی، پھر زید نے اس شخص کو آواز دی اور اس نے جواب دیا تو (بھی) اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ (فتح القدیر ج ۵ ص ۱۴۴)

اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ بات کا آغاز خواہ کسی کی طرف سے ہو اگر قسم کھانے والے نے یا صورت مسئولہ میں زید کی بیوی نے ممنوعہ شخص سے بات چیت کی تو قسم والی صورت میں

قسم ٹوٹ جائے گی اور تعلیق والی صورت میں بیوی پر طلاق واقع ہوجائے گی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

طلاق میں شرط کو مقدم کرنے اور مؤخر کرنے کے متعلق ایک اہم مسئلہ

سوال:

میں نے اپنی بیوی کو کہا: ''تجھے طلاق اور طلاق اور طلاق اگر تو اپنے چچا کے گھر کے اندر داخل ہوئی''۔ جب کہ مسئلہ یہ ہے کہ ابھی رخصتی نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی علیحدگی میں ملے ہیں۔ اور اب وہ اپنے چچا کے گھر میں داخل ہوچکی ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں شریعت کی روشنی میں آگاہ فرمائیں۔ [سائل: شعیب احمد دستگیر، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں عورت جب چچا کے گھر میں داخل ہوگئی تو شوہر کے جملہ کے مطابق اُس پر تینوں طلاقیں واقع ہوگئیں۔ کیونکہ شوہر نے اپنے جملہ میں معروف طریقہ کے برخلاف شرط کو مؤخر اور طلاق کو مقدم رکھا ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ شرط کو جب مؤخر رکھا جائے تو اُس کے ماقبل جو بھی کلام ہو وہ پورا کا پورا اُس شرط پر موقوف رہتا ہے اور شرط کے پائے جانے کے ساتھ ہی وہ سابق کلام وجود میں آجاتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ سابق کلام طلاق پر مشتمل ہو تو جتنی طلاقیں ذکر کی گئی ہوں وہ سب واقع ہوجاتی ہیں۔

صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی علیہ الرحمہ (المتوفی ۵۹۳ھ) لکھتے ہیں: ''**لو قال لها انت طالق واحدة وواحدة ان دخلت النار فدخلت طلقت ثنتين بالاجماع**'' یعنی شوہر نے بیوی سے یوں کہا کہ تجھے طلاق ہو ایک اور ایک اگر تو گھر میں داخل ہوئی۔ پھر وہ داخل ہوگئی تو اُس پر بالاتفاق دونوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ (ہدایہ اوّلین ص ۳۸۸۔۳۸۹، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ شرطیہ جملہ جب مؤخر ہو تو کلام سابق پورا کا پورا مؤثر ہوتا ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں شوہر نے جب جملہ کے آغاز میں تین مرتبہ طلاق کا لفظ کہا اور پھر چچا کے گھر میں داخل ہونے کی شرط بیان کی تو تینوں طلاقیں شرط کے ساتھ معلق ہو گئیں اور جیسے ہی عورت نے شرط کی خلاف ورزی کی' اُس پر تینوں طلاقیں واقع ہو گئیں۔ ہاں! اگر شوہر نے یوں کہا ہوتا کہ اگر تو اپنے چچا کے گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق اور طلاق اور طلاق۔ تو اس صورت میں اس پر ایک طلاق واقع ہوتی اور بقیہ دو طلاقیں لغو ہو جاتیں۔ کیونکہ شرط کے مقدم ہونے کی وجہ سے پہلی طلاق سے ہی وہ بائنہ ہو جاتی اور بقیہ دو طلاقوں کا محل نہ رہتی۔ لیکن زیرِ بحث صورت میں ایسا نہیں ہے۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ پہلی طلاق سے عورت کا بائنہ ہو جانا اور بقیہ دو طلاقوں کا لغو ہونا' اُس صورت میں ہے جب عورت کے ساتھ اُس کے شوہر نے خلوتِ صحیحہ اختیار نہ کی ہو۔ اور اگر خلوتِ صحیحہ اختیار کر لی ہو تو شرط پائے جانے کی ہر صورت میں تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ خواہ اُس نے شرط کو تین طلاقوں سے پہلے ذکر کیا ہو یا تین طلاقوں کے بعد۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

اگر کوئی اپنی بیوی سے یوں کہے: اب میں تمہیں بازار لایا تو تمہیں طلاق!

سوال:

زید اپنی بیوی کو خریداری کے لیے بازار لے گیا' وہاں اس کے مطالبات خریداری کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہو گئے جس سے شوہر عاجز آ گیا اور اس کی اہلیہ مستقل ادھر ادھر گھماتی پھراتی رہی۔ گھر آ کر زید نے غصہ میں کہا: اب میں تمہیں بازار لایا تو میری طرف سے تمہیں طلاق۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید نے طلاق کو آئندہ بازار لے جانے سے معلق کیا ہے تو کیا ساری زندگی زید اپنی بیوی کو بازار نہیں لے جا سکتا کہ جب لے کر جائے گا طلاق واقع ہو جائے گی یا کوئی ایسی صورت بھی ہے کہ تعلیق کو ختم کیا جا سکے؟ نیز بازار لے جانے کی صورت

میں کتنی طلاق واقع ہوں گی؟ [سائل: غلام مرتضیٰ، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں تعلیق کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی شرط کے برخلاف بیوی کو بازار لے جائے۔ اور بازار میں لے جاتے ہی بیوی پر ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ شوہر کے جملے میں یہ تھا کہ اب میں تمہیں بازار لایا تو میری طرف سے تمہیں طلاق۔ اس میں طلاق کا لفظ مطلق ہے جو کہ رجعیت کا متقاضی ہے۔ اور طلاق رجعی میں شوہر کو عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں شخص مذکور طلاق واقع ہونے کے بعد بیوی سے رجوع کرلے، یوں تعلیق ختم ہو جائے گی اور شوہر کو آئندہ صرف دو طلاقوں کا حق حاصل رہے گا۔

البحر الرائق میں ہے کہ اگر کسی نے مطلقاً کہا کہ تجھے طلاق ہو یا تو طلاق والی ہے تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ مزید فرمایا کہ شوہر کا بیوی سے یوں کہنا کہ تو اپنے آپ کو طلاق دیدے یا تو اپنے آپ کو طلاق رجعی دیدے۔ ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بہ ہر حال ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ (البحر الرائق ج ۳ ص ۲۵۹۔۳۲۷)

بہار شریعت میں صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ تعلیق کے حوالہ سے مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ایک مرتبہ شرط پائی جانے سے تعلیق ختم ہو جاتی ہے، یعنی دوبارہ شرط پائی جانے سے طلاق نہ ہوگی، مثلاً عورت سے کہا اگر فلاں کے گھر گئی یا تو نے فلاں سے بات کی تو تجھ کو طلاق ہے، عورت اس کے گھر گئی تو طلاق ہوگئی دوبارہ پھر گئی تو اب واقع نہ ہوگی کہ اب تعلیق کا حکم باقی نہیں ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۲۶)

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

دورانِ حج عورت اگر بیوہ ہو جائے تو عدت کا آغاز کہاں سے ہوگا؟

سوال:

ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ حج کے لیے گئی۔ دورانِ حج شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اب

عورت کی عدت وہیں فوراً شروع ہوگئی یا گھر آنے کے بعد عدتِ وفات شروع ہوگی؟ واضح رہے کہ شوہر کے انتقال کے بعد عورت نے ۳۳ دن وہاں گذارے تھے۔ آیا وہ ۳۳ دن عدت میں شمار ہوں گے یا نہیں؟ نیز عدت کے ایام کس اعتبار سے شمار ہوں گے؟

[سائلہ: زوجۃ المتوفیٰ نیو کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ عورت کی عدت شوہر کے انتقال کے فوراً بعد ہی شروع ہوجاتی ہے خواہ شوہر کا انتقال کہیں بھی ہو۔ لہٰذا سوال مذکور میں عورت نے شوہر کے انتقال کے بعد جو ۳۳ دن وہاں گذارے تھے وہ بھی عدت میں شمار ہوں گے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''**ابتداء العدة فی الطلاق عقیب الطلاق و فی الوفاة عقیب الوفاة**''۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۵۳۱)

یعنی طلاق کی عدت طلاق کے فوراً بعد سے شروع ہوجاتی ہے اور اسی طرح وفات کی عدت وفات کے بعد سے شروع ہوجاتی ہے۔

دیگر کتب فقہ میں بھی اسی طرح کی عبارات موجود ہیں۔ (حوالہ کے لیے دیکھئے: تبیین الحقائق ج ۳ ص ۲۶۰، ملتقی الابحر ج ۲ ص ۱۵۶) نیز عدتِ وفات کے ایام شمار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر شوہر کا انتقال چاند کی پہلی تاریخ کو ہو تو عورت مکمل چار مہینے اور دس دن عدت گزارے گی، خواہ ان میں کوئی مہینہ انتیس کا ہو یا تیس کا۔ اور اگر شوہر کا انتقال پہلی تاریخ کے علاوہ ہو تو عورت ۱۳۰ دن تک عدت گزارے۔ **واللہ و رسولہ اعلم بالصواب**

مکانِ عدت تبدیل کرنے کا شرعی حکم

سوال:

میری بہن جن کے شوہر کا حال ہی میں انتقال ہوا اب عدت وہ اپنے سسرال میں گزار رہی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ میری والدہ کی طبیعت خراب رہتی ہے ان کی تیمارداری کے لیے کوئی نہیں ہے۔ پہلے میری بھابھی دیکھ بھال کرتی تھیں مگر اب ان کی ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کو کہا ہے۔ فی الحال ہماری کرایہ دار خاتون والدہ

کی جتنی خدمت کر سکتی ہیں کرتی ہیں لہٰذا کیا بہن کو عدت کے ایام میں سسرال سے والدہ کے گھر لا سکتے ہیں اور وہ باقی عدت کے ایام والدہ کے گھر پر گزار سکتی ہیں یا نہیں؟

[سائل: محمد مبشر عطاری، کراچی]

جواب:

جو عورت عدّتِ وفات میں ہو اس کو بغیر شرعی ضرورت کے اجازت نہیں ہے کہ وہ گھر تبدیل کرے۔ شرعی ضرورت سے مراد وہ ضرورت ہے کہ جس کے بغیر چارۂ کار نہ ہو۔ جیسا کہ صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ: آج کل معمولی باتوں کو جن کی کچھ حاجت نہ ہو محض طبیعت کی خواہش کو ضرورت بولا کرتے ہیں وہ یہاں مراد نہیں بلکہ ضرورت وہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۷۵)

زیرِ بحث سوال میں سائل نے جو صورتِ حال بیان کی ہے وہ ایسی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے لیے عورت اپنا مکانِ عدّت تبدیل کرے۔ والدہ کی تیمارداری کے لیے عارضی طور پر کسی اور رشتہ دار عورت کو بھی گھر میں ٹھہرایا جا سکتا ہے یا والدہ کو کسی رشتہ دار کے یہاں عارضی طور پر ٹھہرایا جا سکتا ہے اور خدانخواستہ زیادہ طبیعت خراب ہونے کی صورت میں ہسپتال میں ایڈمٹ کر کے لیڈی ڈاکٹرز اور رشتہ دار خواتین کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں ماحول کے اعتبار سے اس کا کوئی اور حل بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ یہ دائمی مسئلہ نہیں ہے، صرف عورت کی مدّتِ عدّت تک کی بات ہے۔ لہٰذا ایک مختصر اور عارضی مدّت کے لیے مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکل آنا ممکن ہے (مثلاً یہ بھی ممکن ہے کہ والدہ کو عورت (بیوہ) کے پاس ٹھہرا لیا جائے)۔

تاہم جو صورتیں ہم نے بیان کی ہیں وہ یا کوئی اور حل ناممکن ہو اور والدہ کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہو تو پھر عورت اپنے مکانِ عدّت کو چھوڑ کر والدہ کے پاس منتقل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عذرِ شرعی کی بنیاد پر مکانِ عدت کو تبدیل کرنا جائز ہے۔

علامہ کاسانی حنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "**لانّ السکنی وجبت بطریق العبادۃ حقا للہ تعالیٰ علیھا والعبادات تسقط بالاعذار**" عورت کا شوہر کے گھر میں عدت گزارنا چونکہ اللہ تعالیٰ کا (مقرر کردہ) حق ہے اس لیے یہ عبادت کے طور پر واجب ہے۔ اور عبادتیں

معقول عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔(بدائع الصنائع ج ۳ ص ۳۲۲)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

عدت والی کو گھر سے نکلنے کی اجازت

سوال:

معتدہ کو کن کن صورتوں میں گھر سے نکلنے کی اجازت ہے؟

[سائل: عدنان قادری' لیاقت آباد' کراچی]

جواب:

معتدہ کی دو اقسام ہیں: (۱) معتدہ طلاق (۲) معتدہ موت

ہر دو صورت میں جس گھر میں عورت کی سکونت تھی اس گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں سکونت نہیں کر سکتی' سوائے ضرورت کے۔ضرورت سے مراد وہ ہے کہ جس کے بغیر چارہ ممکن نہ ہو۔شریعتِ مطہرہ نے جو چند ضروریات گنوائی ہیں کہ جنکی وجہ سے معتدہ گھر چھوڑ سکتی ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) معتدہ طلاق کو شوہر گھر سے نکال دے (۲) معتدہ موت کرائے کے مکان میں رہتی ہے اور مالک مکان کرایہ کا تقاضا کرتا ہے بصورت دیگر گھر خالی کرنے کا کہتا ہے اور اس کے پاس کرایہ نہ ہو (۳) معتدہ موت بعد وراثت اس جگہ کی مالک ہوئی جو قابل سکونت نہ ہو (۴) ورثا اپنے حصہ میں رہنے نہ دیتے ہوں (۵) مکان ڈھ رہا ہو یا ڈھنے کا اندیشہ ہو (۶) چوروں کا خوف ہو (۷) مال تلف ہونے کا اندیشہ ہو (۸) نفقہ نہ ہو تو کمانے کے لیے دن میں نکل سکتی ہے۔چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

"معتدہ طلاق و موت لایخرجان منه الا ان تخرج او یتھدم المنزل او تخاف انھدامه او تلف مالھا او لاتجد کراء البیت ونحو ذالك من الضرورات"۔(درمختار ج ۵ ص ۱۸۰)

علامہ علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں: "المتوفی عنھا زوجھا تخرج نھارا او بعض اللیل ولاتبیت فی غیر منزلھا"۔(ھدایہ اولین ص ۴۲۸)

علامہ امجد علی اعظمی فرماتے ہیں: جس مکان میں عدت گزارنا واجب ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتی مگر اس وقت کہ اسے کوئی نکال دے مثلاً طلاق کی عدت میں شوہر نے گھر میں سے اسے نکال دیا یا کرایہ کا مکان ہے اور عدت' عدتِ وفات ہے مالک مکان کہتا ہے کہ کرایہ دے یا مکان خالی کر اور اس کے پاس کرایہ نہیں یا وہ مکان شوہر کا ہے مگر اس کے حصے میں جتنا پہنچا ہو قابل سکونت نہیں اور ورثہ اپنے حصہ میں رہنے نہیں دیتے یا کرایہ مانگتے ہیں اور پاس کرایہ نہیں۔ یا مکان ڈھ رہا ہو یا ڈھنے کا خوف ہو یا چوروں کا خوف ہو' مال تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے یا آبادی کے کنارے مکان ہے اور مال وغیرہ کا اندیشہ ہے تو ان صورتوں میں مکان بدل سکتی ہے۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۱۷ عالمگیری' درمختار) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مجبوری کی بناء پر بیوہ عورت کا مکانِ عدت تبدیل کرنے کا شرعی حکم

سوال:

میرے داماد کا انتقال ہو گیا ہے۔ میری بیٹی جس گھر میں عدت گزار رہی ہے اس میں وہ اکیلی ہے۔ کوئی بھی عدت کی مدت تک ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں ہے یہانتک کہ چھوٹے بھائی نے بھی انکار کر دیا ہے۔ تو اس صورت میں میں (اس کا والد) محمد ہاشم اپنی بیوہ بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا وہ خود بھی اپنے گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا میں اس کی عدت کا وقت پورا کرنے کے لیے اپنی حفاظت میں اپنے گھر لیجانا چاہتا ہوں تا کہ وہ یہاں تحفظ کے ساتھ اپنی عدت گزار لے۔ براہ کرم آپ میری شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

[سائل: محمد ہاشم' پی آئی بی کالونی' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ جو عورت عدت وفات میں ہو اس کو بغیر شرعی ضرورت کے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ گھر تبدیل کرے۔ شرعی ضرورت میں فقہاء نے چند چیزیں شمار کی ہیں جن کی بنیاد پر بیوہ کو تبدیلی مکان کی اجازت دی ہے۔ مثلاً ایک ضرورت یہ بیان کی

ہے کہ عورت کو چوروں کے آنے کا خوف ہے یا اپنے ساز و سامان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے تو وہ گھر تبدیل کر سکتی ہے' اور اگر چور اور پڑوسیوں میں سے کسی کا خوف نہیں ہے لیکن تنہائی کی وجہ سے خوف آتا ہے تو اس صورت میں فقہاء نے یہ شرط بیان کی ہے کہ اگر خوف زیادہ ہو تو مکان بدلنے کی اجازت ہے' اور معمولی خوف ہو تو مکان بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ نے پہلے ضرورت کی تعریف اور اس کی حقیقت بیان کی ہے' پھر اس کی مختلف صورتیں بیان فرمائیں ہیں' آپ لکھتے ہیں: ''آج کل معمولی باتوں کو جس کی کچھ حاجت نہ ہو محض طبیعت کی خواہش کو ضرورت بولا کرتے ہیں وہ یہاں مراد نہیں' بلکہ ضرورت وہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔ جس مکان میں عدت گزارنا واجب ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتی مگر اس وقت کہ اسے کوئی نکال دے' مثلاً طلاق کی عدت میں شوہر نے گھر سے اس کو نکال دیا یا کرایہ کا مکان ہے اور عدت' عدت وفات ہے مالک مکان کہتا ہے کہ کرایہ دے یا مکان خالی کر اور اس کے پاس کرایہ نہیں ہے۔ (الی قولہ) یا مکان ڈھے رہا ہو یا ڈھینے کا خوف ہو یا چوروں کا خوف ہو یا مال تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو یا آبادی کے کنارے مکان ہے اور مال وغیرہ کا اندیشہ ہے تو ان صورتوں میں مکان بدل سکتی ہے۔ (مزید فرماتے ہیں:) اگر اس مکان میں نہ چور کا خوف ہو نہ پڑوسیوں کا' مگر اس میں کوئی اور نہیں ہے اور تنہا رہتے خوف کرتی ہے تو اگر خوف زیادہ ہو تو مکان بدلنے کی اجازت ہے ورنہ نہیں''۔ (بہار شریعت حصہ ۸ ص ۷۵' مطبوعہ لاہور)

لہٰذا سوال مذکور میں جس عورت کے حوالہ سے پوچھا گیا ہے اسے اگر اپنے مکان میں چوری یا مال و متاع کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے یا تنہائی کی وجہ سے بہت خوف محسوس کرتی ہے تو سوال میں مذکور متبادل مکان میں منتقل ہونا اس کے لیے جائز ہے' ورنہ نہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

طلاق ہو جانے کی صورت میں بچوں کی پرورش' نان ونفقہ' سامانِ جہیز اور مہر کی ادائیگی کا شرعی حکم

سوال:

(۱) ایک شخص نے اپنی بیوی کو اسٹامپ پیپر پر لکھ کر ان الفاظ کے ساتھ یوں طلاق دی کہ میں اپنی زوجہ مسماۃ فوزیہ دختر عبدالعزیز کو اپنی زوجیت سے آزاد کرتا ہوں اور تین بار تحریری اور زبانی مسماۃ فوزیہ دختر عبدالعزیز کو طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔ آج کے بعد سے ہم دونوں ایک دوسرے پر قطعی حرام ہیں عدت گزارنے کے بعد مسماۃ فوزیہ جہاں چاہے عقد کر سکتی ہے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مذکورہ بالا الفاظ کے ذریعے کیا فوزیہ کو طلاق ہوگئی اگر ہاں تو کتنی اور کیسے؟ کیا اب ان کا آپس میں رجوع ہو سکتا ہے؟

(۲) مسماۃ فوزیہ کے بطن سے ایک لڑکی بہ عمر چار سال ہے۔ طلاق واقع ہو جانے کے بعد یہ بچی کس کے پاس کب تک رہے گی اور اس کے اخراجات کون برداشت کرے گا اور کب تک؟

(۳) شادی کے وقت جو جہیز میں سامان لڑکی والوں کی طرف سے ہر قسم کے جوڑے' زیورات اور فرنیچر وغیرہ آیا ہے' یہ جہیز کس کی ملکیت قرار پائے گا اور کس کے پاس آئے گا۔ اور وہ جوڑے کپڑے اور زیورات اور دیگر اشیاء جو لڑکے والوں کی طرف سے دیئے گئے یا چڑھائے گئے ان کے بارے میں کیا شرعی حکم ہے؟ [سائل: عبدالعزیز' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی سچائی اور دیانت پر اعتماد کرتے ہوئے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱) مسماۃ فوزیہ پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں ہیں اور وہ حرمت مغلظہ کے ساتھ شوہر پر حرام ہوگئی ہے اور تین طلاقوں کے بعد آپس میں رجوع کسی بھی طرح بجز حلالہ ممکن نہیں

ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ'' پھر اگر اسے تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی۔جب تک وہ دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔(البقرہ:۲۳۰)

جہاں تک کہ اس بات کا تعلق ہے کہ شوہر نے طلاق کی دستاویز پر پہلے یہ لکھا کہ میں اپنی زوجہ مسماۃ فوزیہ دختر عبدالعزیز کو اپنی زوجیت سے آزاد کرتا ہوں تو یہ کنایہ ہے اور اس کے ساتھ ہی متصلاً شوہر نے یہ بھی تحریر کیا کہ مسماۃ فوزیہ دختر عبدالعزیز کو طلاق دیتا ہوں۔تین بار تحریر بھی کیا اور تین بار زبانی بھی کہا تو اس طرح کنایہ کے بعد صریح لفظ کے ساتھ شوہر نے طلاق دی تو اس طرح بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: یونہی بائن کے بعد بھی صریح لفظ سے (طلاق) واقع کر سکتا ہے جب کہ عورت عدت میں ہو۔(بہار شریعت حصہ ۸ ص ۱۶)

(۲) مسماۃ فوزیہ کے بطن سے جو لڑکی بعمر چار سال فوزیہ کے پاس ہے اس کی پرورش کی حق دار فوزیہ ہی ہے اور نو سال کی عمر تک یہ بچی ماں کے پاس ہی رہے گی۔اس کے بعد اگر باپ لینا چاہے تو لے سکتا ہے اور اس کے اخراجات فوزیہ کے شوہر کے ذمہ ہوں گے۔علامہ ابوبکر فرغانی حنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''ونفقة الاولاد الصغار على الاب لا يشاركه فيها احد كما لا يشاركه في نفقة الزوجة لقوله تعالى وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف. والمولود له هو الاب''. (ھدایہ اولین ص ۴۴۴)

یعنی چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر ہے۔اس نفقہ میں باپ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوگا' جیسا کہ شوہر کے ساتھ بیوی کے نفقہ میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق ہے اور مولود لہ باپ ہے۔

نو سال کی عمر کے بعد باپ اگر بچی کو نہ لے جائے اور بدستور بچی ماں کے پاس ہی رہے تو بچی کی شادی بیاہ تک کے اخراجات باپ کو برداشت کرنا ہوں گے۔جہاں تک بچی کی پرورش میں ماں کے حق دار ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ حدیث پیش نظر رہے کہ ایک خاتون نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ میرا

لڑکا ہے میرا پیٹ اس کے لیے ظرف تھا اور میرے پستان اس کے لیے مشک اور میری گود اس کی محافظ تھی۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب وہ اس کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے (اس خاتون سے) ارشاد فرمایا کہ تو زیادہ حقدار ہے جب تک تو نکاح نہ کر لے۔

(۴) شادی کے وقت جہیز میں جو سامان لڑکی والوں کی طرف سے دیا گیا' وہ لڑکی ہی کی ملکیت ہے۔ لہٰذا طلاق کے بعد لڑکی بدستور ان تمام چیزوں کی مالک رہے گی اور اس کے علاوہ جو چیزیں لڑکے سمیت اس کے دیگر رشتہ داروں کو دی جاتی ہیں وہ سب ان کی ملکیت ہوتی ہیں۔ البتہ لڑکے والوں کی طرف سے جو تحائف دیئے جاتے ہیں' اُن کی ملکیت کا معاملہ عرف اور رواج پر موقوف ہے۔ (اس کی تفصیل اسی کتاب میں ص ۲۳۸ پر ملاحظہ کریں) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ضبطِ تولید (Birth Control) کا شرعی حکم

سوال:

پچھلے ماہ بفضلہٖ تعالیٰ میری ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔ اب میں پیدائش میں پانچ' چھ سال کا وقفہ چاہتی ہوں۔ برائے کرم آپ مجھے آگاہ فرمائیں کہ وقفہ کرنے کی کون سی صورت جائز ہے؟ نیز ایسا طریقہ بتا دیجئے جس کے ذریعہ وقفہ کیا جا سکے اور وہ طریقہ جائز بھی ہو؟

[سائلہ: شگفتہ رضوان' ناظم آباد' کراچی]

جواب:

وقفہ کی جتنی صورتیں فی زمانہ مروج ہیں وہ تقریباً جدید ہیں۔ لیکن وقفہ کرنے کا تصور قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ پہلے کے لوگ اسے ''عزل'' سے تعبیر کرتے تھے۔ عزل کا مطلب ہے: ''اذا قارب الانزال فنزع وامنی خارج الفرج''۔ (القاموس الفقہی ص ۲۵۰) صحبت کے دوران جب منی نکلنے کا وقت قریب آئے تو مرد اپنا عضو مخصوص باہر نکال دے تاکہ منی اندر نہ جانے پائے۔

احادیث مبارکہ میں بھی ''عزل'' سے متعلق تفاصیل موجود ہیں۔ لیکن احادیث اس

بارے میں مختلف ہیں۔ بعض احادیث سے جواز معلوم ہوتا ہے اور بعض سے ممانعت۔
بہر حال عزل (Birth Control) کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا دارومدار اس کے سبب پر ہے۔ سو اگر پیدائش میں وقفہ اس بنیاد پر ہو کہ اولاد زیادہ ہونے کی وجہ سے رزق میں تنگی ہوگی تو پھر وقفہ کا کوئی طریقہ جائز نہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں صراحتاً اس کی ممانعت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ''۔ (الاسراء: ۳۰) اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے خوف سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اسی طرح اگر وقفہ اس بنیاد پر ہو کہ آدمی بچیوں کی پیدائش اور کثرت سے بچنا چاہتا ہے تو بھی وقفہ کا کوئی طریقہ جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہ نیت زمانہ جاہلیت کے مشرکین اور کفار کی ہوا کرتی تھی کہ وہ بچی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے اور بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا کہ: ''تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم''۔ (ابوداؤد کتاب النکاح ج ۱ ص ۲۸۷) ایسی عورتوں سے شادی کرو جو شوہروں سے محبت کرنے والی ہوں اور جن سے اولاد زیادہ ہو اس لیے کہ قیامت کے دن میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔

ہاں! اگر وقفہ کرنے کی وجوہات یہ ہوں کہ کثرت ولادت سے عورت شدید بیمار ہو جائے گی یا بچوں کی مسلسل پیدائش سے ان کی تربیت ونگہداشت میں حرج واقع ہوگا تو پھر وقفہ کے جو طریقے جائز ہیں مثلاً (Method, Tablets,Injection,Chemical, Condom,Loop) ان کا استعمال شرعاً درست ہے۔ مگر محققین نے جائز ہونے کے باوجود ان کے مضر اثرات بھی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

استقرارِ حمل کو روکنے کے لیے گولیاں کھائی جائیں کیمیائی اشیاء لگائی جائیں یا خارجی حائل (ساتھی اور چھلہ وغیرہ) کا استعمال کیا جائے ان میں سے کوئی چیز بھی حمل سے رکاوٹ کا یقینی سبب نہیں ہے۔ بسا اوقات دوائیں اور کیمیاوی اشیاء اثر نہیں کرتیں بعض مرتبہ ڈایا فرام کے استعمال کے باوجود قطرات رحم میں چلے جاتے ہیں اور حمل ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات چھلے کے استعمال کے باوجود حمل ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات کنڈوم (ساتھی) پھٹ

جاتا ہے اور قطرے رحم میں چلے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا ہے: ''جس پانی سے بچے نے پیدا ہونا ہے اگر تم اس کو پتھر پر بھی ڈال دو تو اللہ تعالیٰ اس سے بچہ پیدا کرے گا''۔ اور یہ بارہا مشاہدہ ہوا کہ ضبط تولید کے تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود بچے پیدا ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات جڑواں بچے بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان تمام چیزوں کے مضر اثرات بہت زیادہ ہیں۔ چھلّہ اور ڈایا فرام کے استعمال سے الرجی اور انفیکشن کی شکایات عام ہیں اور کھانے والی دواؤں سے سنا گیا ہے کہ چھاتی کا کینسر ہوجاتا ہے۔ انسان جب بھی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے فطری اور طبعی نظام سے ہٹ کر کوئی کام کرے گا' مشکلات میں گرفتار ہوگا۔ اس لیے ناگزیر حالات کے علاوہ ضبطِ تولید سے احتراز کرنا چاہیے۔ (شرح صحیح مسلم ج ۳ ص ۸۸۹)

اقتباسِ مذکور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انتہائی ناگزیر حالات کے علاوہ ضبطِ تولید سے بچنا نہایت مفید ہے۔ تاہم اگر ایسے حالت پیش آجائیں جن میں ضبط تولید کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو تو اس عمل کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں: ''یجوز لھا سد فم رحمھا کما تفعلہ النساء''۔ (شامی ج ۴ ص ۲۵۲) عورت کے لیے اپنی بچہ دانی کا منہ بند کرنا جائز ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی شرعی حیثیت

سوال:

ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق کسی شخص کا مادّہ منویہ عورت کے رحم میں قرار نہیں پاتا۔ جس کی وجہ سے وہ شخص اولاد سے محروم ہے۔ آیا شرعی نقطہ نظر سے یہ جائز ہے کہ مرد کا جرثومہ جدید ڈاکٹری طریقے کے مطابق عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے تاکہ اولاد کا حصول ممکن ہوسکے؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس عمل کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟ [سائل: محمد یوسف نیو کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل نے جو صورت تحریر کی ہے' وہ دورِ حاضر میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی (Test Tube Baby) کے نام سے معروف ہے۔ اس عمل کو بعض علماء مطلقاً ناجائز کہتے

ہیں۔ لیکن ہمارا موقف اس سلسلے میں یہ ہے کہ اس عمل کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

(۱) شوہر کے تولیدی جرثومے اور اس کی بیوی کے انڈوں کو ٹیوب میں ملانے کے بعد اسی بیوی کے رحم میں رکھا جائے تاکہ اولاد کا حصول ہو۔

(۲) شوہر کے تولیدی جرثوموں کو کسی اور عورت کے انڈوں کے ساتھ ٹیوب میں ملایا جائے اور پھر اسے ولادت کے لیے بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے۔

پہلی صورت یعنی جرثومے جس شخص کے ہوں اسی کی بیوی کے انڈوں کو ٹیوب میں ملایا جائے اور اسی عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جائے' یہ بلا تکلف جائز ہے۔ اور اس کی نظیر کتب فقہ میں موجود ہے۔ چنانچہ صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''**وما قيل لا يلزم من ثبوت النسب منه وطؤه لان الحبل قد يكون بادخال الماء الفرج دون جماع فنادر**''۔ (فتح القدیر ج ۴ ص ۱۷۱' مطبوعہ سکھر) یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی شخص سے ثبوت نسب سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے جماع (صحبت) بھی کی ہو' کیونکہ بغیر جماع کے بھی عورت کی اندام نہانی میں نطفہ پہنچانے سے عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو یہ نادر الوقوع ہے۔

علامہ شمس الائمہ سرخسی' علامہ علاء الدین حصکفی اور علامہ ابن عابدین شامی نے بھی لکھا ہے کہ اگر شوہر نے بغیر صحبت کے اپنا نطفہ عورت کی اندام نہانی میں پہنچا دیا اور بچہ ہو گیا تو اس کا نسب اپنے باپ سے ثابت ہو جائے گا۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے: المبسوط ج ۵ ص ۱۰۴' در مختار مع رد المحتار ج ۲ ص ۸۱۷۔ کما حققہ شیخ الحدیث العلامہ غلام رسول السعیدی فی الجلد الثالث من شرحہ لمسلم تحت باب الولد للفراش وتوقی الشبہات)

دوسری صورت (یعنی شوہر کے تولیدی جرثوموں کو کسی اور عورت کے انڈوں کے ساتھ ٹیوب میں ملا کر اپنی بیوی کے رحم میں داخل کیا جائے) یہ ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں شوہر کا غیر کو سیراب کرنا اور استعمال کرنا لازم آتا ہے' جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''**لا يحل لامرء يؤمن بالله واليوم الآخر ان يسقى ماءه زرع غيره**'' (ابوداؤد شریف) جو شخص بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اپنا پانی کسی اور کی کھیتی میں ڈالے۔ (ھٰکذا فی الھدایہ ص ۳۱۲)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کب جائز کب ناجائز؟

سوال:

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے متعلق علمائے دین کی کیا رائے ہے؟(۱) کیا اس طرح بچہ حاصل کرنا جائز ہے؟

(۲) اگر جائز ہے تو کیوں اور کن صورتوں میں؟ (۳) اگر ناجائز ہے تو کیوں اور یہ کتنا بڑا گناہ ہے اور اس گناہ کا ازالہ کس طرح ہوسکتا ہے؟[سائل: دوست محمد سندیلا' کراچی]

جواب:

ٹیسٹ ٹیوب بے بی (TEST TUBE BABY) کے متعلق علماء اسلام کی رائے یہ ہے کہ یہ عمل نہ تو بالکلیہ جائز ہے' نہ مکمل حرام' بلکہ اس کی بعض صورتیں جائز ہیں اور بعض ناجائز ہیں۔ فقہاء احناف کی مستند کتب میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ عورت سے ہم بستری کیے بغیر اگر شوہر کا مادّہ عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے جس سے عورت حاملہ ہو جائے تو اس سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب اس عورت سے ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ علامہ ابن ہمام رقم طراز ہیں: ''لا یلزم من ثبوت النسب منه وطؤه لان الحبل قد یکون بادخال الماء الفرج دون جماع''۔(فتح القدیر ج ۴ ص ۱۷۱' المبسوط ج ۵ ص ۱۰۴' درمختار ج ۲ ص ۸۱۷' ردالمحتار ج ۲ ص ۸۱۷) کسی شخص سے ثبوت نسب سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے جماع بھی کیا ہو' کیونکہ بغیر جماع کے بھی عورت کی اندام نہانی میں نطفہ پہنچانے سے عورت حاملہ ہو جاتی ہے۔

بعینہٖ یہی صورتِ حال ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی بھی ہے کہ مرد کے جرثوموں اور بیوی کے انڈوں کو ٹیوب میں ملا کر عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ عمل چند وجوہ کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ (۱) مرد کے تولیدی جرثومے ہوں لیکن مرد عملِ تزویج پر قادر نہ ہو۔ (۲) مرد کے تولیدی جرثومے بھی ہوں اور عملِ تزویج پر بھی قادر ہو لیکن کسی خرابی کے باعث وہ تولیدی جرثومے نسوانی نالی تک نہ پہنچ سکیں۔ (۳) نسوانی نالی سکڑ جائے یا اس میں انفیکشن ہو یا کوئی اور خرابی ہو جس کی وجہ سے کاشت شدہ انڈے رحم کی طرف سفر نہ کر سکیں۔ (۴) رحم کی ساخت میں خرابی ہو جس کی وجہ سے مرد کے جرثومے نسوانی نالی میں نہ پہنچ سکیں۔

ان وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ بھی پائی گئی تو ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا عمل جائز ہے بشرطیکہ: (۱) جرثومے شوہر ہی کے ہوں۔ (۲) انڈے اسی شوہر کی بیوی کے ہوں۔ (۳) بیوی کے رحم ہی میں رکھے جائیں۔

اگر ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا عمل جائز نہ ہوگا۔ مثلاً (۱) جرثومے شوہر کے نہ ہوں بلکہ کسی اور کے جرثومے لیکر بیوی کے انڈوں کیساتھ ٹیسٹ ٹیوب میں رکھے جائیں بعد ازاں بیوی کے رحم میں اس کو منتقل کر دیا جائے۔ (۲) بیوی کے انڈے نہ ہوں بلکہ کسی اور عورت کے انڈے شوہر کے جرثوموں کے ساتھ ٹیسٹ ٹیوب میں ملائے جائیں بعد ازاں بیوی کے رحم میں اس کو منتقل کر دیا جائے۔ (۳) شوہر کے جرثومے بیوی کے انڈوں سے ٹیسٹ ٹیوب میں ملا کر کسی اور عورت کے رحم میں رکھے جائیں۔

ان صورتوں کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں مرد کا غیر کی ملکیت کو استعمال کرنا ہے' جو نہ صرف ناجائز بلکہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**لا یحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الاخر ان یسقی ماءہ زرع غیرہ**''۔ (سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۹۳' مطبوعہ مجتبائی لاہور پاکستان) جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پانی غیر کی کھیتی میں ڈالے۔

(شرح صحیح مسلم ملخصاج ۳ ص ۹۳۵) **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

گود لیے ہوئے بچہ کے متعلق ولدیت اور پردہ کے حوالہ سے چند ضروری مسائل

سوال:

(۱) اگر کوئی شخص اپنی سگی بہن کا بیٹا پیدا ہوتے ہی اپنی پرورش میں لے لے (یعنی گود لے لے) تو اس بچے کی ولدیت کیا لکھی جائے گی؟

(۲) رضاعی بہنوں سے پردہ ہوگا یا نہیں؟

(۳) اپنے سگے باپ کی وراثت میں اس کا حصہ ہوگا یا نہیں؟ اور منہ بولے باپ کی وراثت

میں حصہ ہوگا یا نہیں؟

(۴) بڑا ہونے کے بعد اس کے حقیقی والدین اسے لے سکتے ہیں یا نہیں؟

(۵) بچے کو ماں سے دُور رکھنا' دودھ نہ پلوانا' اس سے بچے کی حق تلفی تو نہیں ہوگی؟

[سائل: محمد آصف عطاری' فیڈرل بی ایریا' گلشن شمیم]

جواب:

(۱) ولدیت میں اصل والد کا نام پکارنا اور لکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ''وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ○اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآءِهِمْ'' تمہارے منہ بولے بیٹوں کو اللہ نے تمہارا بیٹا نہیں بنایا' یہ تمہارے منہ کی اپنی باتیں ہیں اور اللہ حق بات فرماتا ہے اور (سیدھی) راہ دکھاتا ہے' تم ان بچوں کو ان کے باپ ہی کا کہہ کر پکارو۔ (الاحزاب: ۴۔۵)

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من ادعى الى غير ابيه وهو يعلم انه غير ابيه فالجنة عليه حرام'' جو شخص یہ جانتے ہوئے کہ فلاں اس کا باپ نہیں ہے پھر بھی اس کی طرف اپنی نسبت کرے تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے۔

(صحیح بخاری: ۴۳۲۶' صحیح مسلم: ۶۳)

اس آیت وحدیث سے معلوم ہوا کہ بچہ خواہ کہیں بھی پرورش میں رہے' اُسے اصل والد ہی کی طرف نسبت دینا ضروری ہے۔ شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور نکاح فارم وغیرہ میں زیادہ احتیاط چاہیے۔

(۲) دودھ شریک بہن سے شرعاً پردہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رہے کہ بعض اوقات بچے کو پرورش میں لیا جاتا ہے اور اُسے دودھ بھی پلایا جاتا ہے اور بعض اوقات دودھ نہیں پلایا جاتا۔ پردہ کا دارومدار درحقیقت اسی دودھ پینے پر ہے۔ اگر بچے نے پرورش کرنے والی عورت کا دودھ پیا ہو (اڑھائی سال کی عمر کے اندر اندر) تو اُس عورت کی تمام بچیاں (خواہ پہلے کی ہوں یا بعد کی) اُس بچے کی رضاعی (دودھ شریک) بہنیں شمار ہوں گی اور ان سے پردہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر عورت نے اپنا دودھ نہ پلایا ہو تو وہ بچہ شرعاً اجنبی ہوگا اور بالغ ہونے کے بعد اُس پر اُس عورت سے اور اس کی تمام بچیوں

سے پردہ واجب ہوگا۔

(۳) سگے باپ کی وراثت میں وہ بدستور حصہ دار رہے گا لیکن منہ بولے باپ کی وراثت میں وہ حصہ دار نہیں ہوگا۔

(۴) حقیقی والدین ہمیشہ اپنے بچے کے مالک ہیں' جب چاہیں اُسے لے سکتے ہیں۔ خواہ بالغ ہونے سے پہلے یا بالغ ہونے کے بعد۔

(۵) حق تلفی اُس صورت میں ہوسکتی ہے جب بچہ اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کے پاس نہ رہ پائے' یا بچے کے ماں باپ کسی اور کی پرورش میں دینے پر راضی نہ ہوں۔ اگر ماں باپ اپنی خوشی سے پرورش میں دیں اور بچے کو بھی تکلیف نہ ہو تو اس صورت میں حق تلفی نہیں ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب.

کسی کی پرورش میں اپنا بچہ دینے اور پھر اُس کو واپس مانگنے کا شرعی حکم

سوال:

منسلکہ درخواست کی روشنی میں چند باتوں کا شرعی حل مطلوب ہے اور وہ یہ کہ

(۱) درخواست میں جس بچہ کا تذکرہ کیا گیا ہے' اُس کا حقیقی والد محمد فاروق ولد ولی محمد ہے۔ جبکہ نور محمد ولد محمد ابراہیم نے اس کی پرورش کی ہے۔ کیا محمد فاروق کو شرعی نقطہ نظر سے اپنا بچہ نور محمد سے واپس لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(۲) نور محمد کا بچہ کو واپس کرنے سے انکار اور اس پر دھمکی دینے کا رویہ درست ہے یا نہیں؟

(۳) نور محمد نے جتنا عرصہ بچہ کی پرورش کی ہے' اتنے عرصہ کے اگر وہ اخراجات طلب کرے تو کیا حکم ہے؟ [سائل: محمد فاروق ولد ولی محمد (نیو کراچی)]

جواب:

پرورش کرنے اور پالنے کی وجہ سے کوئی بچہ یا بچی پرورش کرنے والے کی حقیقی اولاد نہیں بن جاتے' بلکہ حقیقی والدین کی ہی اولاد رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بچہ یا بچی کو

پرورش کرنے والے کا بیٹا یا بیٹی قرار دینے اور پرورش کرنے والے کو ان کا والد قرار دینے سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا: ''مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَ کُمْ اَبْنَآءَ کُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ وَاللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ○ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآءِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ''۔

ترجمہ: (اے پرورش کرنے والو!) پرورش میں لیے ہوئے بچوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا' یہ تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے اور وہی راہ دکھاتا ہے○ تم ان بچوں کو ان کے حقیقی باپ ہی کا کہہ کر پکارو' یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔ (الاحزاب: ۴۔۵)

اس آیت میں واضح طور پر یہ بات فرمائی گئی ہے کہ بچوں کو اُن کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ پرورش میں لیے ہوئے بچوں کے تمام کاغذات (شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور نکاح فارم وغیرہ) میں اُن کو پرورش کرنے والے شخص کی طرف منسوب کرنا حرام ہے اور جو ایسا کرے' وہ سخت گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

زیر بحث سوال میں جس بچہ کے متعلق جھگڑا ہے' وہ چونکہ حقیقتاً محمد فاروق کا بیٹا ہے' اس لیے وہی اُس کو اپنی پرورش میں رکھنے کا حق دار ہے جتنے دن اُس نے اپنا بیٹا نور محمد کی پرورش میں رکھا' یہ نور محمد پر اُس کا احسان تھا' لہٰذا جب محمد فاروق اپنے بیٹے کو اپنی پرورش میں واپس لینا چاہے تو اُسے ہر طرح سے اس کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ نور محمد یا کسی کو بھی اس پر اعتراض یا انکار کا قطعاً حق نہیں ہے۔ بلکہ نور محمد اور اس کے دیگر ہمنواؤں پر لازم ہے کہ وہ شریعت کا مقابلہ کرنے کے بجائے شریعت کے حکم کے آگے سر جھکائیں اور ناجائز دھمکیاں دے کر اپنی آخرت برباد نہ کریں۔ مزید یہ کہ بچہ کی پرورش کے دوران نور محمد نے جو خرچہ کیا' وہ کسی کے جبر کی وجہ سے نہیں کیا' بلکہ اپنی رضاء ورغبت سے کیا تھا' لہٰذا اُسے اس خرچ کے مطالبہ کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ (هكذا فی الفتاوی الرضوية الجديدة المخرّجة ج ۱۳ ص ۴۱۳)

واللّٰه ورسوله اعلم بالصواب

کمپیوٹر ایمبرائیڈری کا کام اور کپڑوں پر جان دار چیزوں کی تصویر بنانے کا حکم

سوال:

بعض لوگ کمپیوٹر ایمبرائیڈری کی مشین لگاتے ہیں اور کپڑوں پر مختلف طریقوں کی کڑھائی کرتے ہیں۔اس میں بعض اوقات تصویریں بنانے کا کام بھی آتا ہے۔تصویریں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔بعض جاندار کی ہوتی ہیں اور بعض بے جان چیزوں کی۔جاندار چیزوں کی تصویریں بعض کی آدھی ہوتی ہیں اور بعض کی پوری ہوتی ہیں۔مثلاً کسی کے سینہ تک کا حصہ اور کسی کا پورا بنانا ہوتا ہے۔اسی طرح بعض اوقات تصویریں چھوٹی ہوتی ہیں۔

آپ تفصیل سے بتائیں کپڑوں پر تصاویر کی کڑھائی جائز ہے یا نہیں؟ کیا ہر تصویر بنانا حرام ہے یا نہیں؟ کیا ہر تصویر بنانا حرام ہے یا اس میں کچھ شرعاً گنجائش ہے؟ نیز بتائیں کہ اس کام کو کرنے والے کی کمائی کا کیا حکم ہے۔کیونکہ اس کی کمائی ملی جلی ہے اور اس کی نیت تو یہی ہوتی ہے کہ بے جان اشیاء کی تصویروں کا کام لیا جائے مگر بعض اوقات آرڈر دینے والا راضی نہیں ہوتا' اس لیے جاندار کی بنانی پڑتی ہے؟ [سائل: محمد یوسف سوکی' نیو کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ جاندار کی تصویر بنانا شرعاً جائز نہیں ہے۔احادیث میں اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔حضرات شیخین (امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ) روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ میں ہاتھ سے چیزیں بنا کر کماتا ہوں اور میں تصویریں بناتا ہوں مجھے اس بارے میں فتویٰ دیجیے؟ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے' آپ نے ارشاد فرمایا: "**من صوّر صورة فان الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح و ليس بنافخ فيها ابدًا**" جس نے تصویر بنائی اس کو اللہ تعالیٰ (قیامت میں) اس

وقت تک عذاب دے گا جب تک وہ اس میں روح نہیں پھونک دے گا اور آدمی اس میں کبھی بھی روح نہیں پھونک سکے گا (یعنی ہمیشہ اس شخص کو عذاب ہوگا)۔ یہ حدیث سن کر وہ شخص غمگین ہوگیا اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر تم تصویریں ہی بنانا چاہتے ہو تو درخت اور ہر اس چیز کی بنا سکتے ہو جو بے جان ہو۔

(صحیح البخاری: ۲۲۲۵، صحیح مسلم: ۲۱۱۰)

اس حدیث کی روشنی میں حکم واضح ہے کہ جاندار کی تصویریں بنانا جائز نہیں ہے۔ اور اسی حدیث سے واضح ہے کہ بے جان چیزوں کی تصاویر بنانا شرعاً درست ہے۔ اب رہا یہ کہ جاندار چیزوں کی ایسی تصویر جو مکمل نہ ہو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی جاندار کی اتنی تصویر جس سے حیات باقی نہ رہے اس کا بنانا جائز ہے، مثلاً کسی کا صرف چہرہ بنانا یا سینہ تک کی تصویر بنانا یا کسی اور عضو کی تصویر بنانا جیسے انگلیاں یا ناک، آنکھ، کان وغیرہ یہ شرعاً جائز ہے کہ اس صورت میں یہ تصویر بے جان کے حکم میں ہے اور بے جان کی تصویر بنانے کا جواز مذکورہ حدیث سے ثابت ہے۔

فقیہ اعظم مفتی نور اللہ نعیمی بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد اور معتمد کتابوں کی روشنی میں لکھا ہے کہ جاندار کی ایسی تصویر جو قابل حیات نہ ہو (یعنی اتنے حصے کے رہتے ہوئے زندہ رہنا ممکن نہ ہو) وہ شرعاً جائز ہے۔ فیض القدیر شرح جامع صغیر میں علامہ مناوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: حدیث شریف میں جس تصویر سے ممانعت وارد ہوئی ہے اس سے مراد پورے جاندار کی تصویر ہے لہٰذا اگر کسی نے بے جان کی تصویر بنائی یا جاندار کی اتنی تصویر جس سے حیات باقی نہ رہتی ہو تو یہ شرعاً جائز ہے۔ (فتاویٰ نوریہ ج ۲ ص ۳۰۲)

مفسر قرآن شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی صاحب مدظلہ العالی نے بھی متعدد کتب کے حوالوں سے لکھا ہے کہ جاندار کی اتنی تصویر جس سے حیات باقی نہ رہے اس کا بنانا جائز ہے۔ علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اگر تصویر کا اتنا حصہ کاٹ دیا جائے جتنا حصہ کاٹ دینے سے کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکے، مثلاً سینہ یا پیٹ یا سر کو باقی بدن سے الگ کر دیا جائے تو پھر یہ تصویر ممانعت کے حکم میں داخل نہیں ہے۔ اگر تصویر سے اتنا حصہ کاٹ دیا جائے جس کے نہ ہونے سے جاندار زندہ رہتا ہے، مثلاً آنکھ، ہاتھ اور پیر

وغیرہ تو یہ تصویر ممانعت کے تحت داخل ہے۔اسی طرح جب ابتداء بغیر سر کے صرف بدن کی تصویر بنائی جائے یا بغیر بدن کے صرف سر کی تصویر بنائی جائے یا سر اور بدن کے صرف اتنے حصہ کی تصویر بنائی جائے جس کے ساتھ آدمی زندہ نہیں رہتا تو یہ صورتیں ممانعت کے تحت داخل نہیں ہیں کیونکہ یہ جاندار کی تصویر نہیں ہے۔(المغنی ج ۷ ص ۲۱۶۔۲۱۵)

مختلف کتابوں سے مزید عبارات ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں: تصویر بنانے کی حرمت سے ایسی تصویر مستثنیٰ ہے جس میں ابتداء ایسا عضو نہ ہو جس کے بغیر حیات ناگزیر ہو مثلاً سر یا سینے یا پیٹ کے بغیر کوئی تصویر بنائی گئی ہو اس صورت میں مشابہت لخلق اللہ نہیں ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی جاندار مخلوق نہیں بنائی جو سر یا سینے یا پیٹ کے بغیر ہو یا بعد میں کسی تصویر کا سینہ یا سر یا پیٹ کاٹ دیا گیا ہو۔(شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۴۶۹)

رہا یہ سوال کہ مخلوط آمدنی کا کیا حکم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خلاف تقویٰ ہے اور اس سے بچنا بہت بہتر ہے۔حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ اس طرح کی آمدنی سے اور اس کے استعمال سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"الحلال بیّن والحرام بیّن وبینهما مشتبهات لا یعلمها کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات استبرء لدینه و عرضه ومن وقع في الشبهات کراعی یرعی حول الحمٰی یوشك ان یواقعه". (صحیح البخاری: ۵۲، صحیح مسلم: ۱۵۹۹)

یعنی حلال چیزیں بھی واضح ہیں اور حرام چیزیں بھی واضح ہیں اور ان دونوں کے درمیان کچھ چیز مشتبہ (شبہ والی) ہیں۔سو جو شخص شک اور شبہ والی چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کا تحفظ کر لیا اور جو شک وشبہ والی چیزوں میں پڑ گیا وہ اس چرواہے کی طرح ہے جو شاہی چراگاہ کے اردگرد جانور چرانے لگے کہ ممکن ہے کہ وہ اس ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائے (اسی طرح شک وشبہ کی چیزوں میں پڑنے سے ممکن ہے کہ آدمی حرام چیزوں کا مرتکب ہو جائے)۔واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی کمپنی کے ملازمین کا بینک سے ایڈوانس رقم کا مطالبہ کرنا

سوال:

ہم ایک کاروبار کر رہے ہیں اور ہمارا لین دین ایک غیر ملکی کمپنی سے ہے۔ آرڈر ملنے پر ہم مال تیار کرتے ہیں۔ تجارتی لین دین میں اسلامی تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم رقم کی وصولیابی میں سود کی دخل اندازی سے اپنے آپ کو بچائیں۔ چنانچہ اس کے لیے ہم اپنی رقم میں بینک کو واسطہ بنانے کے بجائے ڈائریکٹ کمپنی سے رابطہ میں رہتے ہیں۔ یعنی کمپنی اگر یہ چاہتی بھی ہے کہ اس پر جو ہماری رقم عائد ہوتی ہے وہ ہم بینک سے وصول کرلیں' اس کے باوجود ہم بینک اور سود کی مداخلت سے بچنے کے لیے کمپنی ہی سے رقم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کمپنی کا ذاتی طور پر بینک سے رابطہ رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سامان زیادہ تیار کرنے کی صورت یا کام کے لیے جگہ کی صورت میں ایڈوانس رقم کے لیے کمپنی سے رجوع کریں وہ زیادہ بہتر ہے یا بینک سے ریلیٹڈ ہونا بہتر ہے؟۔

[سائل: محمد انیس الرحمٰن' کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل نے جو صورت حال بیان کی ہے اس کے مطابق کسی بھی تاجر کا یہ جذبہ باعث برکت ہے کہ وہ اپنے لین دین میں سود کی دخل اندازی سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ فی زمانہ سود نہ سہی تو کم از کم اس کا غبار کم وبیش ہر شخص کے جسم میں پہنچ رہا ہے۔ سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس کے مطابق بہتر بلکہ بعض صورتوں میں واجب العمل ہے کہ بینک کی طرف رجوع کرنے کے بجائے متعلقہ کمپنی ہی سے رجوع کیا جائے اور اس سے ایڈوانس رقم وغیرہ کا مطالبہ کیا جائے۔ تاہم کسی بھی کمپنی سے تجارتی لین دین قائم کرنے میں ان تین صورتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو تجارت اور کسب حلال کے باب میں علماء نے بیان فرمائی ہیں۔ اور وہ یہ کہ جس کمپنی سے آدمی کو اپنے

کام کی تنخواہ اور اجرت ملے اس کے بارے میں اگر مکمل طور پر معلوم ہو کہ کمپنی جو رقم اپنے ورکرز کو دے رہی ہے وہ مال حرام سے نہیں ہے تو لینا شرعاً جائز ہے۔ اور اگر مکمل طور پر یہ معلوم ہو کہ کمپنی جو رقم دے رہی ہے وہ خدانخواستہ مال حلال سے نہیں ہے تو اس کا لینا بھی جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں جو جواب دیا گیا کہ ایڈوانس وغیرہ کی رقم بینک کے بجائے کمپنی سے طلب کی جائے' یہ مذکورہ صورتوں میں پہلی دو صورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ تیسری صورت کا حکم واضح ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شراکت کے کاروبار میں نقصان ہونے کی صورت میں پارٹنرز کو رقم واپس کرنے کا حکم

سوال:

ایک شخص ادریس صاحب نے کاروباری مد میں تعاون کی غرض سے مجھے چھ لاکھ روپے دیئے جس میں باہمی شراکت کے طور پر اس نے اپنے لیے چار ہزار روپے منافع طے کیا۔ اس مد میں اسے تین لاکھ روپے دے چکا ہوں۔ اب کاروبار میں مجھے کافی نقصان ہوا ہے اور میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اپنے تمام پارٹنرز کو ان کی رقم واپس کروں۔ شرعی نقطہ نظر سے میرے لیے کیا حکم ہے؟ [سائل: میزان ولد نور عالم' کراچی]

جواب:

کسی کام میں دو یا چند افراد کی باہمی شراکت اس طور پر کہ ایک شخص کی جانب سے کام ہو اور دوسرے کی جانب سے پیسہ ہو' شرعی اصطلاح میں اس کو مضاربَت کہتے ہیں۔ مضاربت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فریقین کے درمیان منافع' مقدار کے اعتبار سے متعین نہ ہو۔ یعنی کوئی بھی فریق کسی مخصوص مقدار کی وصولیابی لازم نہ کرے۔ البتہ فیصدی اعتبار سے تعین کرنا درست ہے۔ بہ صورت دیگر قانون شرع کی رُو سے مُضاربت فاسد ہوتی ہے۔ اور مُضاربت فاسدہ کا حکم یہ ہے کہ اس میں مُضارِب (ورکنگ پارٹی) کے لیے اجرتِ مثل (fair rent)

واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ مُضاربت جب فاسد ہو تو وہ اجارۂ فاسدہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
لہٰذا صورت مسئولہ میں میزان ولد نور عالم پر لازم ہوگا کہ وہ ادریس صاحب کو مزید تین لاکھ روپے واپس کرے تاکہ اس کی چھ لاکھ روپے کی رقم مکمل اس تک پہنچ جائے۔ البتہ میزان نے جتنا عرصہ کام کیا ہے اس کی جو اجرتِ مثل بنتی ہے اتنی مقدار اگر وہ اپنے منافع کے نام پر کاروبار سے لے چکا ہو تب تو اس کو اپنی اجرتِ مثل مل گئی۔ اور اگر کل حاصل کردہ منافع اتنا نہ ہو کہ اجرتِ مثل پوری ہوجائے تو جتنی مقدار اُجرت مثل کی باقی ہو وہ ادریس صاحب سے وصول کرے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

مندروں اور گرجوں کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کا غیر مسلموں کو ماربل وغیرہ سپلائی کرنا

سوال:

اجمیر شریف (انڈیا) کے قرب و جوار میں مکرانہ نام کا ایک مشہور علاقہ ہے وہاں کے اکثر مسلمانوں کا آباء واجداد سے پیشہ سنگ مرمر کا ہے۔ وہاں کے لوگ (یعنی مسلمان) مساجد، مزارات، مندر اور گرجے وغیرہ اور عمارات میں ماربل سپلائی اور فٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ ان مسلمانوں کا فقط یہی ذریعہ معاش ہے علاوہ ازیں اور کوئی روزی کمانے کا ذریعہ نہیں ہے۔
ایک مسلمان ٹھیکیدار کو ایک مندر بنانے کا ٹھیکہ ملا ہے جس میں تمام کام سنگ مرمر کا ہے اس میں قسم قسم کے نقش ونگار، پھول پتیاں اور مورتی وغیرہ بنانا ہے۔ نقش ونگار وغیرہ میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کے نام وغیرہ اور مورتی وغیرہ بنانا شامل ہے۔ مسلمان ٹھیکیدار مورتی وہاں کے ہندو کاریگروں سے بناتے ہیں نام وغیرہ بھی وہ خود ہی تحریر کرتے ہیں، مسلمان کاریگر عمارت (یعنی مندر) کی وہ جگہ خالی چھوڑ دیتے ہیں جہاں مورتی نصب کی جاتی ہے وہاں ہندو ہی مورتی لگاتے ہیں مسلمان فقط ماربل لگاتے ہیں۔
اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:
(۱) کیا مسلمان ہندو کاریگر سے مورتی بنوا کر فروخت کرسکتا ہے؟

(۲) کیا مسلمان مندر میں فٹنگ پھول پتیاں وغیرہ کا کام کرسکتا ہے؟

(۳) کیا مسلمان مندروں اور گرجوں کی تعمیر کے لیے ہندوؤں اور غیر مسلموں کو ماربل وغیرہ سپلائی کرسکتا ہے؟

یاد رہے کہ مسلمانوں کے ذریعہ معاش کا انحصار اسی پر ہی ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرماتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں۔ [سائل: عبدالرحیم، کرانہ، بھارت]

جواب:

بنیادی طور پر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ گناہ کے کام پر کسی کے ساتھ تعاون کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے: ''وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ '' (المائدہ:۲) گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو۔ اس آیت مبارکہ کی روشنی میں فقہاء اسلام نے متعدد ایسے مسائل بیان کیے ہیں جن میں گناہ پر معاونت کی وجہ سے ناجائز ہونیکا حکم ہے۔ (تفصیل کتب فقہ میں کتاب الاجارہ وغیرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے) مورتی بنانا یا اسے فروخت کرنا بھی اسی بناء پر جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں گناہ پر معاونت واضح ہے۔ البتہ مندروں میں مسلمانوں کا نقش ونگاری کرنا یا ہندوؤں کو ماربل وغیرہ سپلائی کرنا، اس میں شرعاً حرج نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ان کے کفر وشرک میں براہ راست تعاون نہیں ہے۔ براہ راست تعاون اس صورت میں لازم آتا ہے جب ہندوؤں کی پوجا پاٹ ہندوؤں کی نقش ونگاری پر موقوف ہو یا ماربل صرف مندروں اور گرجوں میں لگائے جاتے ہوں اور ماربل کے لگنے پر ان کی مشرکانہ رسوم کا دارومدار ہو، جب کہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا کہ ہندوؤں کے جلسہ میں کرایہ پر کرسیاں دینا جائز ہے یا ناجائز؟ آپ نے فرمایا کہ ان کی کفریات کرسی پر موقوف نہیں، ہیں نہ کرسی کا ان کے کفر میں کوئی تعاون ہے، لہٰذا انہیں کرایہ پر کرسی دینا جائز ہے اور ان کا کرایہ حرام نہیں ہے۔ (فتاویٰ رضویہ، ج ۲۳ ص ۵۳۸) اسی طرح کسی ہندو یا عیسائی وغیرہ کو ماربل سپلائی کرنے میں بھی شرعاً حرج نہیں ہے، کیونکہ ماربل وغیرہ سے مندر یا گرجہ کی تعمیر کا الزام خود یہود وہنود پر ہے نہ کہ بیچنے والے مسلمان پر۔ جیسے کسی غیر مسلم کو مکان فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا شرعاً جائز ہے، جب کہ اسے کسی خاص گناہ یا کفر وشرک کا کام کرنے کا کہہ کر نہ دیا جائے۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے: ''کل موضع تعلقت المعصیة بفعل فاعل مختار کما اذا آجر منزلها لیتّخذه بیعة او کنیسة او بیت نار یطیب له'' ہر وہ صورت جس میں گناہ کا تعلق خود مزدور سے نہ ہو بلکہ کسی اور با اختیار شخص سے ہو وہاں مزدوری جائز ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنا گھر کسی کو عبادت خانہ' گرجا یا آتش کدہ بنانے کے لیے کرایہ پر دے تو اس کے لیے کرایہ جائز ہے۔ (فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الھندیہ ج ۵ ص ۱۲۵) مندر اور گرجا کی تعمیر سے حاصل ہونے والی اجرت کو بھی فقہاء نے جائز قرار دیا ہے' لیکن اس کام کو (یعنی تعمیر کو) گناہ قرار دیا ہے۔ (فتاویٰ بزازیہ' ایضا) اس لیے حتی الامکان مندر اور گرجہ کی تعمیر کا ٹھیکہ لینے سے بچا جائے تو اچھا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

قادیانیوں کی کسی تقریب کے لیے پینٹرز کا اپنی خدمات مہیا کرنا اور شرعی نقطہ نظر سے اس کی شدید مذمت

سوال:

قادیانی آج کل اپنے ''صد سالہ جشن'' کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مختلف پوسٹرز' بینرز' پمفلٹز اور ہینڈ بلز بنوا رہے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا کوئی مسلمان شخص اُجرت پر ان کا کام لے سکتا ہے یا نہیں اور اگر مسلمان حقائق کا علم رکھنے کے باوجود ان کے کاموں میں تعاون کرے اور محض پیسہ کمانے کے لیے ان کے بینرز اور پوسٹرز وغیرہ تیار کرے تو اُس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے۔ [سائل: محمد عبدالمصطفیٰ' ملیر (کراچی)]

جواب:

جناب رسول اللہ ﷺ کی عزت و ناموس پر حملہ کرنے والے کسی بھی کافر و مرتد کے ساتھ تعاون کرنا یا اُس کے ساتھ کسی بھی قسم کا کاروباری لین دین کرنا قطعاً حرام حرام حرام اور سخت گناہ ہے۔ بلکہ العیاذ باللہ جو مسلمان' گستاخِ رسول کے حقائق جاننے کے باوجود اُس کی گستاخیوں کی اشاعت و تشہیر کا سبب بنے اور اُسے درست سمجھے تو وہ بھی اُسی گستاخ کی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے کہ ''قادیانی'' وہ بدباطن اور بدمذہب ٹولہ ہے جو رسولِ محترم ﷺ کی شانِ خاتمیت کا منکر ہے۔ حالانکہ نبی ﷺ کی یہ شان قرآن مجید کی کئی آیات اور متعدد صحیح وصریح احادیث سے ثابت ہے۔ ''قادیانی فرقہ'' حضور کے آخری نبی ہونے کا انکار کر کے درحقیقت قرآن اور حدیث کا انکار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ نے متفقہ طور پر اس فرقہ کو کافر اور مرتد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون کرنا یا ان کا ساتھ دینا شرعاً حرام اور سخت گناہ ہے۔ بینر اور پوسٹر بنانے والے مسلمان بھائی اپنے ایمان کی فکر کریں اور چند روپوں کی خاطر اپنا ایمان ضائع نہ کریں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بیوہ خواتین کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے جاری کردہ ایک اسکیم کا شرعی حکم

سوال:

مسئلہ بیوہ خواتین کے متعلق ہے کہ ڈاکخانہ والوں کی طرف سے ایک اسکیم ہے جو کہ صرف بیوہ خواتین کے لیے ہے اس اسکیم کے تحت بیوہ خاتون اپنے مال کو جمع کروائے تو ایسی صورت میں ماہوار ایک لاکھ روپیہ پر ۱۴ سو روپے ملیں گے۔ کیا ایسی صورت میں سود کی کوئی شق موجود ہے۔ برائے کرم اس مسئلہ کا حل تجویز فرمایئے۔ [سائل: احمد حسین، معین آباد لانڈھی]۔

جواب:

کسی کو رقم دینا یا رکھوانا اس کے بعد معینہ مدت پر اضافہ کے ساتھ وصول کرنا سود ہے۔ سوال میں جس اسکیم کا ذکر کیا گیا ہے یہ سودی اسکیم ہے۔ اس طرح کی اسکیموں کو علماء نے اپنی کتب میں سود کے زمرے میں شامل کیا ہے اور اس میں شمولیت کو حرام قرار دیا ہے۔

(وقار الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۵۳، تفہیم المسائل ج ۱ ص ۳۴۲)

اس کی بنیاد یہ ہے کہ ایک حدیثِ موقوف کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی نے ہر ایسے قرض کو سود قرار دیا جس پر نفع حاصل کیا جائے۔ یعنی کسی کو قرض دیکر زیادہ وصول کیا جائے وہ سود ہے۔ (سنن بیہقی ج ۵ ص ۳۵۰، کنز العمال: ۱۵۵۱۶)

واضح رہے کہ مذکورہ اسکیم کو یا اس سے ملتی جلتی دیگر اسکیموں کو شراکت قرار دینا بھی درست نہیں ہے' کیونکہ شراکت میں نفع کی مقدار معین نہیں کی جاسکتی' جب کہ مذکورہ اسکیم میں نفع کی مقدار معین ہے۔لہٰذا اس اسکیم میں اصل رقم کے علاوہ جو زائد رقم وصول کی جائے گی وہ سود ہے اور حرام ہے۔شراکت داری میں نفع کا اصول شرعی تناسب ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بینک کی ملازمت کا شرعی حکم

سوال:

بینک کی ملازمت شرعاً درست ہے یا نہیں؟[سائل: ایاز خان' کراچی]

جواب:

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے' سود کھلانے والے' سودی کاروائی لکھنے والے اور سود کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا کہ یہ سب کے سب برابر ہیں۔(صحیح مسلم' کتاب المساقاۃ: ۱۵۹۸)'اس حدیث میں چونکہ سودی کاغذات لکھنے اور اس کی گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی گئی ہے اس لیے بینک کی کوئی ایسی ملازمت جائز نہیں ہے' جس میں سود کے کاغذات لکھنے پڑیں۔اور جن لوگوں کو سود کے کاغذات لکھنا نہیں ہوتے ہیں مثلاً دربان' پیون اور ڈرائیوران کی ملازمتیں جائز ہیں۔

(وقار الفتاویٰ ج ۳ص ۳۴۲' جدید فقہی مسائل ج ۱ص ۲۴۷) **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم

سوال:

اگر کسی شخص نے بینک سے کریڈٹ کارڈ لیا یعنی اس طرح قرض لیا کہ اگر یہ قرض فلاں تاریخ تک ادا کردوں تو ٹھیک ورنہ سود کے ساتھ ادا کرنا ہوگا۔یہ صورت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

[سائل: محمد شہزاد عطاری' لیاقت آباد]

جواب:

سوال میں مذکور صورت شرعاً جائز نہیں ہے اس لیے کہ کوئی بھی ایسا قرض جس میں مقررہ مدت پر یا اس کے بعد اضافہ کی شرط عائد کردی جائے وہ سود ہے اور سود حرام قطعی ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ ایک حدیث موقوف کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک صحابی نے ہر ایسے قرض کو سود قرار دیا جس پر نفع حاصل کیا جائے۔ یعنی کسی کو قرض دیکر زیادہ وصول کیا جائے وہ سود ہے۔ (سنن بیہقی ج ۵ ص ۳۵۰، کنز العمال: ۱۵۵۱۶)

اس مقام پر تحقیق یہ ہے کہ سود کی دو قسمیں ہیں: رِبا الفضل اور رِبا النسیئۃ۔ رِبا الفضل یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو دست بدست اضافہ کے ساتھ آپس میں بیچا جائے۔ مثلاً ایک کلو گندم کے بدلہ میں دو کلو گندم خریدنا یا بیچنا۔ اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کا حرام ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ (حوالہ کیلئے دیکھئے: صحیح بخاری: ۲۱۷۴، صحیح مسلم: ۱۵۸۶، سنن ترمذی: ۱۲۴۳، مسند احمد ج ۱ ص ۲۴) دوسری قسم ربا النسیئہ ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ قرض میں ایک معین مدت پر یا اس کے بعد اصل رقم سے زائد وصول کرنے کی شرط رکھی جائے۔ اس کو رِبا القرآن بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کا حرام ہونا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں کفار و مشرکین کے درمیان یہی سود رائج اور متعارف تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۷۲، البقرۃ: ۲۷۵) یہی وجہ ہے کہ سود کی اس قسم کو رِبا الجاہلیہ بھی کہتے ہیں۔ علامہ ابو بکر جصاص علیہ الرحمۃ ربا الجاہلیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جب قرض کی مدت پوری ہو جاتی تو قرض یا تو ادا کر دیا جاتا یا اس پر سود لگا دیا جاتا، قرض خواہ مدت میں اضافہ کرتا تو مقروض اصل رقم میں اضافہ کرتا۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۴۶۹، شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۱۶) اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابو الولید سلیمان مالکی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ربا الجاہلیہ یہ ہے کہ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے کہے کہ تم قرض ادا کر رہے ہو یا میں سود کے عوض مدت میں اضافہ کر دوں؟ اگر مقروض سود کو مان لیتا تو قرض خواہ مدت میں اضافہ کر دیتا۔ (آخر میں فرماتے ہیں:) اس کے حرام ہونے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (المنتقی ج ۵ ص ۶۵ بحوالہ سابق)

ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی نے ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں خاص طور پر دور حاضر کے سودی

لین دین اور بینک کے قرضوں پر بحث کی ہے اور ایسے قرض جو اضافہ اور سود کی شرط کے ساتھ لیے جائیں ان کا حرام ہونا ثابت کیا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے ان کی مذکور الصدر کتاب کی جلد ۵ ص ۱۸۱۷ تا ۲۷۵۴ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے) خلاصہ یہ ہے کہ ایسا قرض جس میں ایک معین مدت پر یا اس معین مدت کے بعد اصل رقم سے زائد رقم وصول کرنے کی شرط رکھی جائے وہ سود (ربا النسیئہ) ہے اور حرام ہے۔ سائل نے سوال میں جو صورت ذکر کی ہے اس میں بھی چونکہ مشروط طور پر قرض کا لین دین ہے اس لیے شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

معلوم ہونے کے باوجود کسی سے چوری کردہ مال کو خریدنا اور اسے آگے فروخت کرنا

سوال:

اگر کوئی شخص دوائیوں کے اسٹور پر کام کرتا ہے اور اس کا مالک اس شخص کو مقررہ مدت پر تنخواہ دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ملازم دوائیاں چرا کر کسی اور کو فروخت کرتا ہو اور اس سے آدھی یا کم قیمت لیتا ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا کام زید نے کیا اب زید دوائی چرا کر بکر کو دیتا ہے اور پیسے لیتا ہے اور بکر وہ دوائی علاقہ میں کسی اور کے ہاتھ بیچتا ہے اس طرح بکر کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ملتا ہے' حالانکہ بکر کو معلوم ہے کہ یہ چوری کا مال ہے۔ اس صورت میں زید و بکر کی اس خرید و فروخت کا کیا حکم ہے نیز بکر کا ان دوائیوں کو آگے فروخت کرنا چوری پر اعانت ہے یا نہیں؟ [سائل: محمد سراج احمد سعیدی' کراچی]

جواب:

خرید و فروخت کے جائز ہونے کے لیے فقہائے کرام نے مختلف شرائط بیان فرمائی ہیں۔ ایک شرط یہ بھی بیان فرمائی کہ مبیع بائع کی مملوک ہو یعنی جس چیز کو فروخت کیا جا رہا ہے وہ بیچنے والے کی ملکیت میں ہو۔ چنانچہ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں: "وشرط المعقود علیہ ستۃ: کونہ موجودا مالا متقوما مملوکا فی

نفسه و کون الملك للبائع فیما یبیعه لنفسه''۔(ردالمحتار ج ۷ ص ۱۱) خرید و فروخت کی شرائط میں سے یہ ہے کہ جس چیز کو بیچا جا رہا ہے وہ موجود ہو' مال متقوم ہو اور بیچنے والے کی ملکیت میں ہو۔سوال مذکور میں یہ بات وضاحت سے موجود ہے کہ زید دوائیاں چوری کرتا ہے اور بکر کو فروخت کرتا ہے اسی طرح بکر کو بھی معلوم ہے کہ یہ دوائیاں چوری کردہ ہیں اس کے باوجود زید سے خریدتا ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کا بکر کو دوائیاں فروخت کرنا جائز نہ ہوا' کہ وہ خود ان کا مالک نہیں اور چونکہ بکر کو چوری کا بخوبی علم ہے لہٰذا اس کا خریدنا اور مزید آگے فروخت کرنا بھی ناجائز ہوا۔کیونکہ یہ چوری پر اعانت اور مدد دینا ہے جو کہ قرآن حکیم کی رو سے ممنوع ہے۔ارشاد ربانی ہے:''تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''(المائدہ:۲) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔واللہ ورسوله اعلم بالصواب

کمپنی کی طرف سے ملنے والے پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت

سوال:

میں پچیس سال سے ایک پرائیوٹ کمپنی میں ملازمت کرتا ہوں اس کمپنی کے قواعد کے مطابق ہر ماہ پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے کچھ مخصوص رقم لازمی طور پر جمع کرنی پڑتی ہے اور اتنی ہی رقم کمپنی اپنی طرف سے ملازم کے فنڈ میں جمع کرتی ہے اور پھر یہ رقم ملازم کو ریٹائرمنٹ کے وقت یکمشت دی جاتی ہے تو ملازم کے لیے یہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ میرے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ایک لاکھ چالیس ہزار روپے بنتی ہے جب کہ کمپنی اس پر مزید تین لاکھ روپے منافع دیتی ہے تو یہ اضافی رقم لینا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔[عبداللہ شاہ فیصل کالونی]

جواب:

عموماً کمپنی پراویڈنٹ فنڈ پر اپنے ملازمین کو جو اضافہ دیتی ہے اس کی دو صورتیں

ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ کمپنی بغیر کسی پیشگی معاہدہ کے اپنے طور پر کل رقم کا دوگنا کر کے دیتی ہے' یہ اضافہ ملازم کے لیے جائز ہے اور اس کو کمپنی کی طرف سے حق خدمت تصور کیا جائے گا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی سے رقم لینے کے بعد واپسی میں از خود اضافہ کر کے دے تو شرعاً یہ جائز ہے۔ (شرح مسلم للامام النووی ج ۲ ص ۳۰) دوسری صورت یہ ہے کہ کمپنی اپنے ملازمین سے معلوم کرنے کے بعد ان کے فنڈ میں سود شامل کرتی ہے۔ اور اس صورت میں کل رقم کے دوگنے پر مزید اضافہ کے ساتھ ملازمین کو رقم لوٹائی جاتی ہے اس میں چونکہ سود کے عنوان سے اضافی رقم دی جاتی ہے لہٰذا اس کا لینا جائز نہیں ہوگا۔ صورت مسئولہ میں سائل کو سودی معاہدہ کے تحت جو اضافی رقم دی جارہی ہے وہ ناجائز ہے اور بغیر سودی معاہدہ کے کمپنی کی جانب سے کل رقم کا جو دوگنا مل رہا ہے وہ جائز ہے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

سامان کفن کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:

سامان کفن ودفن کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ [سائل: ندیم خان' کراچی]

جواب:

شرعی نقطۂ نظر سے سامان کفن دفن کو بیچنا جائز ہے اس لیے کہ یہ ساماں شرعاً مال متقوم (قیمت والا مال) ہے اور مال متقوم کی خرید وفروخت جائز ہے۔ چنانچہ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں: ''وشرط المعقود علیه ستة: کونه موجودا مالا متقوما مملوکا فی نفسه و کون الملك للبائع فیما یبیعه لنفسه''۔ (ردالمحتار ج ۷ ص ۱۱) خرید وفروخت کی شرائط میں سے یہ ہے کہ جس چیز کو بیچا جارہا ہے وہ موجود ہو' مال متقوم ہو اور بیچنے والے کی ملکیت میں ہو۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

ایسی ڈیوٹی کرنے کا حکم جس میں غیر محرم عورتوں کو دیکھنا پڑے

سوال:

ایک شخص کالونی کے مین گیٹ پر گارڈ کی خدمات سرانجام دیتا ہے۔ اس کی ڈیوٹی ہے کہ کسی غیر ساکن کالونی کو شناخت کے بغیر داخل نہ ہونے دے' اب وہ داخل اور خارج ہوتے ہوئے ہر مرد و زن کو بہ نظر دقیق دیکھتا ہے کہ آیا وہ ساکن کالونی ہے یا نہیں؟ اس میں غیر محرم عورتوں کو بھی بہ وجہ ذمہ داری دیکھتا ہے اور ضرورت کے پیش نظر کلام وسلام بھی ہوتا ہے اس طرح دن میں ہزاروں غیر محرمات کو دیکھنا اس کی مجبوری ہے' تو آیا وہ یہ نوکری کرے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں سائل کو شرعی توضیحات سے مطلع فرمائیں؟ [سائل: افضل رفیق' کراچی]

جواب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ان الحلال بین وان الحرام بین وبینهما امور مشتبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات استبراء لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام''. (مسلم شریف ج ۱ ص ۲۸)

یعنی بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں۔ جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جس نے اپنے آپ کو امور مشتبہ سے بچالیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کی براءت وحفاظت حاصل کرلی اور جو شبہات والے امور میں پڑ گیا' وہ حرام میں پڑ جائے گا۔

حدیث مذکور میں اس بات کی تعلیم فرمائی جارہی ہے کہ مشتبہ امور سے بچنا' درحقیقت اپنے دین اور آبرو دونوں کی حفاظت کا ضامن ہے۔ کہ عموماً امور مشتبہ کے قریب جانا ہی حرام میں ڈال دیتا ہے۔ سوال میں جس شخص کے حوالے سے پوچھا گیا ہے اس کا غیر محرم عورتوں کو دیکھنا اگرچہ بہ وجہِ ذمہ داری اور ضرورت کے پیشِ نظر ہے لیکن یہی ضرورت عادت کا رخ

اختیار کر کے حرام کی طرف نہ لے جائے! اور پھر اس میں کسی بھی موڑ پر عزت و وقار کے مجروح ہونے کا خطرہ بھی بعید از امکان نہیں۔ اس لیے حدیث مذکور میں رسول اللہ ﷺ نے واضح انداز میں فرمایا کہ جو مشتبہ امور سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو دونوں کو محفوظ کر لیا۔ اس بنیاد پر شخصِ مذکورر کے لیے مناسب اور مستحسن یہی ہے کہ وہ اس نوکری کے ساتھ دوسری مناسب نوکری کی تلاش جاری رکھے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

پرائز بانڈز کا شرعی حکم

سوال:

پرائز بانڈز (Price Bonds) کا شرعی حکم کیا ہے؟ [سائل: محمد ارشاد اورنگی ٹاؤن]

جواب:

پرائز بانڈ اور اس پر ملنے والی رقم شرعاً جائز ہے۔ بعض لوگ اس کو جوا اور سود قرار دے کر ناجائز کہتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ جوئے میں دونوں فریق میں سے کسی ایک کے مال کے ڈوب جانے کا خطرہ ہوتا ہے جب کہ پرائز بانڈ میں ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح سود اس منافع کو کہتے ہیں جو لین دین کے وقت مشروط کر دیا جائے۔ یعنی ایک معیّن یا غیر معیّن منافع کی شرط لگا دی جائے۔ پرائز بانڈ میں یہ صورت بھی نہیں ہے۔ اسی طرح بانڈز ہولڈرز کے درمیان جو انعام تقسیم کیا جاتا ہے وہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ہوتا ہے اور قرعہ اندازی قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ پرائز بانڈ میں رقم کا اضافہ مشروط نہیں ہے اور اپنے پیسوں میں (یعنی اصل رقم میں) کمی نہیں ہوتی اس لیے یہ جوا نہیں ہے اور قرعہ اندازی بھی شرعاً جائز ہے، اس لیے انعامی بانڈ کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(وقار الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۲۶)

بانڈز اور ان پر ملنے والے انعام کے جواز پر مفصل اور مدلل تحقیق کا مطالعہ کرنے کے لیے ملاحظہ فرمائیں: شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۱۱۱ تا ۱۲۶، از مفسر قرآن، شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی رجسٹرڈ کمپنی کے آئیٹمز (Items) کی نقل بنا کر فروخت کرنا

سوال:

(۱) ہمارے ملک کی رجسٹرڈ کمپنیز کے آئٹمز کی نقول بنانا یا بنوانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ہمارے ہاں مختلف برانڈز کمپنیاں جیسے لیور برادرز' PNG اور بہت سی کمپنیاں کاسمیٹکس کے آئٹمز بناتی ہیں' جیسے فیئر اینڈ لولی کریم' تبت کریم وغیرہ اور شیمپو' جیسے ہیڈ اینڈ شولڈرز' سن سلک' پینٹین وغیرہ۔ میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ ان آئٹمز کی نقول بنوانا یا بنانا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ اس سے ان کمپنیز کی شہرت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

(۲) کراچی میں کاسمیٹکس کی ہول سیل مارکیٹ میرٹ روڈ بولٹن مارکیٹ ہے۔ لاہور سے ان آئٹمز کی نقول کی خرید وفروخت کی جاتی ہے لیکن یہاں یہ بات مدنظر رہے کہ ان آئٹمز کے ریٹ (نرخ) اور کمپنیز کے آئٹمز کے ریٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مثلاً فیئر اینڈ لولی (جار) کی قیمت =/60 روپے ہے لیکن نقلی فیئر اینڈ لولی کی قیمت ہول سیل میں =/12 روپے اور =/20 روپے بھی ہے۔ ہول سیلر ان آئٹمز کو انتہائی کم منافع پر ریٹیلر کو فروخت کر دیتے ہیں اور انہیں یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ آئٹمز نقلی ہیں اور خریدار اس بات کو بخوبی جانتا ہے۔ اس تفصیل کی روشنی میں بتایئے کہ ہول سیلر کا ان آئٹمز کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

(۳) تیسرا سوال ریٹیلر کے حوالے سے ہے اور وہ یہ کہ ریٹیلر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) دوکان دار (۲) لاٹ والے۔ (جو بازاروں میں ہر مال ایک ہی دام میں بیچتے ہیں۔) ریٹیلر دوکان دار ان ہی نقلی آئٹم کو اوریجنل کہہ کر اسی قیمت میں فروخت کرتا ہے جو کہ اوریجنل قیمت کی ہوتی ہے۔ آیا ان کا اس طرح جھوٹ بول کر ان آئٹمز کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ لاٹ والا ہر =/12 والی نقلی کریم =/15 روپے میں اور ہر =/20 والی

=/25 روپے میں بیچتا ہے اور کسٹمر پر یہ بات واضح ہے کہ لاٹ میں اوریجنل آئٹمز کم ہی ملتے ہیں۔ ان کا اس طرح مال بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ [سائل: عبدالمالک گلشن اقبال]

جواب:

سوالِ مذکور میں سائل نے جو صورتحال بیان کی ہے اگر درست ہے تو شرعی نقطۂ نظر سے اس طرح کا لین دین اور خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی تجارت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ دھوکہ دہی، غلط بیانی اور نقصان سے پاک ہو۔ شریعتِ مطہرہ ہر اس تجارت کو ناجائز قرار دیتی ہے جس میں جھوٹ، فراڈ اور ضرر رسانی کا سہارا لیا جائے۔ قرآن حکیم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ''۔ (النساء: ۲۹) اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ۔ اس آیت میں ''باطل'' کی تفسیر کرتے ہوئے تمام مفسرین کرام نے اپنی تفاسیر میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ طریقہ ہے جو شرعاً ناجائز ہو۔ جیسے جھوٹ، دھوکہ، بددیانتی ضرر رسانی وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی طریقہ لین دین میں اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر، روح المعانی، روح البیان)

حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لا ضرر ولا ضرار'' نقصان اٹھانے اور نقصان پہنچانے کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔

(سنن ابن ماجہ: ۲۳۴۰، سنن بیہقی ج ۶ ص ۶۹، مسند احمد ج ۱ ص ۳۱۳، مستدرک ج ۲ ص ۵۸)

ایک اور حدیث جو ہمارے زیر بحث سوال کے جواب میں بہت ہی واضح ہے اس میں راوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک صحابی کے پاس سے گزرے جو غلہ فروخت کر رہے تھے، آپ نے اپنا ہاتھ غلّہ کے اندر ڈالا تو ہاتھ میں کچھ تری محسوس ہوئی۔ آپ نے پوچھا: یہ تری کیسی ہے؟ غلّہ کے مالک نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر بارش ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے اس بھیگے ہوئے غلّہ کو اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیتے۔ پھر فرمایا: جس شخص نے دھوکہ دیا وہ میرے طریقہ پر نہیں ہے۔

(صحیح مسلم: ۱۰۱، سنن ترمذی: ۱۳۱۵، سنن ابن ماجہ: ۲۲۲۴)

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ''من باع عیبا لم ینبه لم یزل فی مقت اللہ او

لم تزل الملائکة تلعنه "ایسا شخص جو کسی عیب دار چیز کو فروخت کرے اور اس پر خریدار کو آگاہ نہ کرے وہ مسلسل اللہ کی ناراضگی میں رہتا ہے (یا فرمایا کہ) اس پر فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ: ۷۰۲۲۴، مشکوٰۃ شریف ص ۲۴۹)

قرآن وسنت کے ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ تجارت اور لین دین میں کوئی بھی ایسا طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے جس میں خریدار کو دھوکہ دیا جائے یا نقصان پہنچایا جائے۔ ملک کی رجسٹرڈ کمپنیز کے آئٹمز کی نقول بنانا یا بنوانا اور ان کی خرید وفروخت کرنا درحقیقت ان کمپنیز کو نقصان پہنچانا ہے اور ان کو Devalue کرنا ہے۔ خصوصاً نقلی آئٹمز کو اوریجنل کہہ کر فروخت کرنا بہت بڑی بددیانتی اور دھوکہ ہے۔ اس لیے سائل کی بیان کردہ صورتوں میں سے کوئی بھی صورت شرعاً جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنی تجارت کو ہر قسم کے جھوٹ، دھوکہ اور بددیانتی سے پاک رکھیں اور اپنی توانائی کو دیانتداری کے ساتھ حلال رزق کے حصول میں صرف کریں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بعض اسکولوں کے ایک سودی پیکج کا شرعی حکم

سوال:

نارتھ ناظم آباد میں ایک اسکول بنام "دی پیراڈائز اسکول" واقع ہے، جس میں رواں تعلیمی سال کے آغاز میں ایک پیکیج کا اعلان ہوا ہے۔ اسکول کی انتظامیہ نے اعلان کیا ہے کہ اگر ہمارے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے والدین پچیس ہزار روپے اسکول میں جمع کروادیں تو وہ رقم انہیں سال کے اختتام پر مل جائے گی اور سال بھر ان بچوں سے اسکول فیس بھی وصول نہیں کی جائے گی اور اگر والدین پچیس ہزار روپے جمع نہیں کرواتے ہیں تو پھر انہیں ہر مہینے کی فیس (ایک ہزار روپے) ادا کرنی ہوگی۔ اسکول کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ: "ہم آپ کے بچوں کو بالکل فری تعلیم دے رہے ہیں لیکن اسکول کے اخراجات پورے کرنے ہیں اس کے لیے ہم کاروبار کررہے ہیں۔ لہٰذا آپ کاروبار کے لیے ہمیں کچھ رقم دیں، ہم آپ کو پوری رقم ایک سال بعد لوٹا دیں گے"۔ آپ سے سوال یہ ہے کہ آیا اسکول کی طرف سے دیئے جانے والے اس پیکیج سے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

[سائل: عبدالرحمٰن میمن نیو کراچی]

جواب:

فی زمانہ لوگوں نے سود کھانے کے نئے نئے طریقے وضع کر لیے ہیں اور سودی طریقۂ کار کے اچھے اچھے نام رکھ کر عوام الناس کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ سوال میں جس پیکیج کا ذکر کیا گیا ہے یہ سود ہے کیونکہ اسکول کی انتظامیہ کا یہ کہنا کہ ہم بچوں کو فری تعلیم دے رہے ہیں اور ادھار فقط کاروبار کے لیے لے رہے ہیں یہ محض ایک دھوکہ ہے۔ کیونکہ اسکول کی انتظامیہ صرف اس بچے کی سال بھر کی فیس معاف کر رہی ہے جس کی طرف سے پچیس ہزار روپے جمع کرائے جا رہے ہیں اور جس بچے کی طرف سے یہ رقم جمع نہیں کروائی جا رہی ہے اس سے ہر مہینے اسکول فیس لی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیس کی معافی ادھار کے بدلے میں ہے اور ہر وہ ادھار جس کے بدلے میں پہلے سے طے شدہ زائد رقم ملے وہ سود ہوتی ہے۔ صدر الشریعۃ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ اپنی مایہ ناز کتاب بہارِ شریعت میں فرماتے ہیں:

''عقدِ معاوضہ میں جب دونوں طرف مال ہو اور ایک طرف زیادتی ہو کہ اس کے مقابل میں دوسری طرف کچھ نہ ہو یہ سود ہے''۔ (بہارِ شریعت حصہ ۱۱ ص ۹۷ 'مشتاق بک کارنر' لاہور)

یعنی یہ کہ اگر کچھ رقم ادھار دی جائے اور دی جانے والی رقم سے زیادہ لی جائے اور یہ زیادہ لینا پہلے سے مشروط ہو تو یہ سود ہے۔

ہدایہ میں ہے: ''**الربوا هو الفضل المستحق لاحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه**'' سود یہ ہے کہ معاوضہ میں دونوں عاقدین میں سے ایک کے واسطہ ایسی زیادتی ہو جو عوض سے خالی ہو اور عقد میں مشروط ہو۔

(ہدایہ آخرین' باب الربوا ص ۷۸' مکتبہ شرکت علمیہ' ملتان)

اس کے علاوہ فقہ حنفی سے وابستہ تمام فقہاء کی کتب میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر کچھ رقم ادھار دی جائے اور اس کے بدلے میں کچھ معین (پہلے سے طے شدہ) رقم حاصل کی جائے تو وہ زائد رقم سود ہے۔ سوالِ مذکور کے مطابق جب بچے کے والدین پچیس ہزار روپے اسکول کی انتظامیہ کو دیں گے تو وہ سال بھر کی فیس جو بارہ ہزار روپے بنتی ہے

معاف کر دیں گے اور یہ نفع معین ہے، گویا یہ اب ایسا ہو گیا کہ پچیس ہزار روپے دیئے اور ایک سال بعد 37 ہزار روپے واپس لے لیے اور ایسا کرنا بداہۃً سود ہے۔ لہٰذا یہ پیکیج سود کی ایک شکل ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا حرام ہے۔

سود کے بارے میں کثرت سے آیاتِ مبارکہ اور احادیث طیبہ وارد ہوئی ہیں جن میں سود کھانے اور کھلانے والوں کے لیے سخت وعیدوں کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا".

(البقرہ:۲۷۵)

یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (اپنی قبروں سے) ایسے اٹھیں گے جس طرح وہ شخص اٹھتا ہے جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا بیع سود کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

اسی سورت میں اللہ عزوجل نے فرمایا ہے کہ جس نے سود کھانا نہ چھوڑا اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ (البقرہ:۲۷۹)

جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔ حدیث شریف میں ہے جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سود کے کاغذات تیار کرنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی اور یہ فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں۔ (صحیح مسلم، باب لعن اکل الربوا وموکلہ ص ۶۲۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ایک حدیث شریف میں سود خور کے متعلق یہ وعید بیان ہوئی: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شب معراج میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جس کے پیٹ گھر کی طرح (بڑے بڑے) تھے ان پیٹوں میں سانپ تھے جو باہر سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ حضرت جبریل نے جواب دیا یہ سود خور ہیں۔ (سنن ابن ماجہ: ۲۲۷۳، مکتبہ دار الفکر، بیروت)

اس طرح کی اور بہت سی احادیث طیبہ میں سود خور کے عذاب کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا آپ

پر لازم ہے کہ آپ اس پیکیج سے خود بھی بچیں اور اسکول کی انتظامیہ سمیت دیگر افراد جو اس پیکیج سے فائدہ اٹھا رہے ہیں یا اٹھانے کا عزم رکھتے ہیں' انہیں بھی اس فعلِ حرام سے دور رہنے کی نصیحت کریں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ائمہ مساجد' مدرسین اور دیگر ملازمین کی شرعی ذمہ داریوں پر ایک مفصل فتویٰ

سوال:

زید ایک مدرسہ میں درسِ نظامی پڑھاتا رہا' مدرسہ کا قانون یہ ہے کہ جو اساتذہ شروع سال یعنی کہ شوال المکرم سے تدریس کا آغاز کر دیتے ہیں' جب شعبان المعظم اور رمضان المبارک کے مہینے کی سالانہ تعطیلات ہوتی ہیں تو ان کو ایک اضافی تنخواہ اور دو ماہ کی ایڈوانس تنخواہ دی جاتی ہے۔ رجب المرجب کے مہینے میں مدرسے کے ایک استاد (جو کہ مدرسے میں بڑا سمجھا جاتا تھا) کے ساتھ اختلافات ہوگئے۔ اس نے کسی استاد کے توسط سے زید تک یہ بات پہنچائی کہ انتظامیہ ان کو فارغ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لہٰذا آپ کو مشورہ ہے کہ بجائے اس کے انتظامیہ آپ کو نکالے آپ خود ہی استعفاء دے دیں تاکہ آپ کی عزت پر حرف نہ آئے۔ زید نے جواب دیا کہ میں دین کا کام کر رہا ہوں اس سے کیسے استعفاء دے دوں میں ہرگز استعفاء نہیں دوں گا۔ ہاں آپ اگر مجھے فارغ کرنا چاہتے ہیں تو مجھے نوٹس دے دیجئے میری عزت میں کمی نہیں آئے گی۔ بات یہاں پر ختم ہوئی انتظامیہ کی طرف سے کسی قسم کا نوٹس نہیں دیا گیا چنانچہ زید نے استعفاء نہیں دیا اور نہ ہی انتظامیہ نے اس کو فارغ کیا البتہ جب رجب کے مہینے کی تنخواہیں دی گئیں تو دیگر تمام اساتذہ کو دو تنخواہیں ایڈوانس اور ایک تنخواہ بونس کے طور پر دی گئی' ان میں وہ اساتذہ بھی شامل تھے جن کی تاریخ تقرر وہی ہے جو زید کی ہے۔ لیکن زید کو بونس اور ایڈوانس تو دور کی بات ہے رجب کی بھی تنخواہ پوری نہ دی گئی بلکہ پورے سال کی جتنی چھٹیاں تھیں ان کی کٹوتی بھی اسی رجب کی تنخواہ سے کر کے چند سو روپے جو ماہ رجب کی تنخواہ کے باقی بچے وہ زید کو دے کر ٹرخا دیا گیا۔ نہ تو اضافی تنخواہ دی گئی اور نہ

ہی دو ماہ کی ایڈوانس تنخواہ دی گئی جس کی وجہ سے اگلے سال سے زید اس مدرسے میں پڑھانے نہیں گیا۔اس معاملہ کو تقریباً تین سال کا عرصہ گزرنے کو ہے۔

اب اس مدرسہ کی انتظامیہ بدل چکی ہے (لیکن یہ انتظامیہ پچھلے معاملات ڈیل کر رہی ہے' مثلاً سابقہ انتظامیہ نے بعض اساتذہ کی تنخواہوں میں زیادہ اور بعض میں کم اضافہ کیا تھا جب کہ اس موجودہ انتظامیہ نے جن بعض کی تنخواہوں میں کم اضافہ ہوا تھا اس میں زیادہ اضافہ والوں کے برابر اضافہ کر کے اس کا اطلاق ان مہینوں پر بھی کیا جب کنٹرول سابقہ انتظامیہ کے پاس تھا اور اس موجودہ انتظامیہ نے چارج نہ سنبھالا تھا۔ چنانچہ جس قدر اضافہ کیا گزشتہ مہینوں کے حساب سے جتنی تنخواہ مزید بنی اس انتظامیہ نے وہ ادا کی) زید کا سوال یہ ہے کہ انتظامیہ نے اس کی ایک اضافی تنخواہ اور دو ماہ کی تنخواہ جو ابھی تک زید کو نہیں دی آیا زید اس کا مستحق ہے یا نہیں؟ اور اگر مستحق ہے تو آیا موجودہ انتظامیہ پر یہ ادائیگی لازم ہے یا نہیں؟ اور اگر موجودہ انتظامیہ بھی زید کو ادائیگی نہیں کرتی تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور اگر سابقہ انتظامیہ کے معاملات کی یہ انتظامیہ ذمہ دار نہیں تو پھر تنخواہوں میں جو اضافہ کر کے ادا کر چکی ہے اس کا تاوان کس کے ذمہ ہوگا؟ [سائل: محمد افضل ابوالعلائی' کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیرِ صدقِ سائل سب سے پہلے جاننا چاہیے کہ ایامِ تعطیل کی تنخواہ کو علماء (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے تنخواہ کا حصہ اور مدرس کا حق قرار دیا ہے۔ اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت امام احمد رضا خان محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں: ''معمولی قلیل تعطیل جس قدر اس صیغہ میں معروف و مروج ہو عادۃً معاف رکھی گئی ہے اور یہ امر باختلاف حاجت مختلف ہوتا ہے۔ درس تدریس کی حاجت روزانہ نہیں' بلکہ طلبہ بلا تعطیل ہمیشہ پڑھے جائیں تو قلب اس محنت کا متحمل نہ ہو' لہٰذا ہفتہ میں ایک دن یعنی جمعہ اور کہیں دو دن منگل' جمعہ تعطیل ٹھہری' اور رمضان المبارک میں مطالعہ کرنا سبق یاد کرنا دشوار ہے'' **وقال سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ ان القلب اذا اکرہ عمی** ''سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جبر کی صورت میں دل بینا نہیں رہتا۔ لہٰذا اس صیغہ میں رمضان المبارک کی چھٹی بھی معمول ہوئی' بہ خلاف خدمتگاری کہ اس کی حاجت روزانہ ہے۔ اگر

خدمت گار رمضان مبارک کا عذر کر کے گھر بیٹھ رہے ہر گز ایک حبہ تنخواہ کا مستحق نہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۶ ص ۲۰۹ـ ۲۰۸)

حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: مدرسہ میں تعطیل کے جو ایام ہیں مثلاً جمعہ، منگل یا جمعرات جمعہ، ماہ رمضان اور عید بقرعید کی تعطیلات جو عام طور پر مسلمانوں میں معمول اور رائج ہیں ان تعطیلات کی تنخواہ کا مدرس مستحق ہے۔

(بہار شریعت حصہ ۱۰ ص ۴۰)

ان دونوں عبارات سے واضح ہو گیا کہ ایام تعطیل کی تنخواہ مشاہرہ کا حصہ ہے اور تنخواہ کی طرح اس کی ادائیگی بھی لازم ہے۔

جہاں تک اس رقم کا تعلق ہے جس کو بونس یا اضافی تنخواہ کہا جاتا ہے اس کے احوال مختلف ہیں۔ بنیادی طور پر یہ رقم فضل واحسان اور تبرعات وہبات سے تعلق رکھتی ہے، کہ ملازمین اور مدرسین کو ان کی حسن کارکردگی اور خدمت ومحنت پر بہ طور فضل وعطیہ پیش کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شرعاً نہ اس کی ادائیگی واجب قرار پاتی ہے اور نہ عدم اداء کی صورت میں ملازم یا مدرس کو مطالبہ کا حق ٹھہرتا ہے، لیکن بعض مقامات پر اس کی حیثیت قانونی اور معاہداتی ہوتی ہے کہ باضابطہ شرائط ملازمت میں اس کا اندراج اور تعین ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں بونس کی اس رقم کا شمار بھی تنخواہ کی اس رقم میں ہوگا جو بہ طور اجرت مدرس یا ملازم کو دی جاتی ہے۔ زیر بحث سوال میں سائل نے اس رقم کے دیئے جانے کو مدرسہ مذکورہ کا قانون قرار دیا ہے، اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ (مدرسہ مذکورہ میں) تعطیلات کی تنخواہ کے ساتھ ساتھ بونس کی رقم بھی مدرسین کی تنخواہ کا حصہ ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد اصلِ سوال کا جواب یہ ہے کہ زید مدرسہ مذکورہ میں اجیر خاص تھا اور اجیر خاص کا حکم یہ ہے کہ وہ اپنے معین وقت میں تسلیمِ نفس یعنی جائے کار پر کام کے لیے حاضر رہنے کا پابند ہوتا ہے، پھر اگر چہ اس کا کام انجام نہ پاسکے وہ بہ ہر حال اجرت کا مستحق ہوتا ہے۔

تنویر الابصار مع رد المحتار میں ہے:

''وهو (الاجير الخاص) من يعمل لو احد عملا موقتا بالتخصيص ويستحق الاجر بتسليم نفسه في المدة وان لم يعمل. أى اذا تمكن من

العمل''. (تنویر الابصار مع رد المحتار ج ۹ ص ۸۱ 'طبع جدید)

یعنی اجیر خاص وہ ہوتا ہے جو ایک معین وقت میں خاص کر کے کسی ایک شخص کا کام سر انجام دے۔ ایسا شخص اپنے معین وقت میں تسلیم نفس سے ہی اجرت کا مستحق ہوگا' اگر چہ وہ کام نہ کرے۔ یعنی جب کہ اسے کام کی قدرت ہو۔

اس عبارت میں اجیرِ خاص کا جو حکم بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اجیر خاص پر تسلیم نفس لازم ہے' یعنی کام کے لیے اپنے آپ کو (مقامِ معین پر) حاضر اور تیار رکھنا۔ پھر اگر کسی وجہ سے وہ اپنا کام نہ کر سکے تو اس سے اجرت ساقط نہیں ہوگی۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: مدرسین وامثالہم اجیر خاص ہیں اور اجیر خاص پر وقت مقرر ومعہود میں تسلیم نفس لازم ہے اور اسی سے وہ اجرت کا مستحق ہوتا ہے اگر چہ کام نہ ہو۔ مثلاً مدرس وقت معہود پر مہینہ بھر برابر حاضر رہا اور طالب علم کوئی نہ تھا کہ سبق پڑھتا' مدرس کی تنخواہ واجب ہوگئی۔ ہاں اگر تسلیم نفس میں کمی کرے مثلاً بلا رخصت چلا گیا یا رخصت سے زیادہ دن لگائے یا مدرسہ کا وقت چھ گھنٹے تھا اس نے پانچ گھنٹے دیئے یا حاضر تو آیا لیکن وقت مقرر خدمت مفوضہ کے سوا اور کسی اپنے ذاتی کام اگر چہ نماز نفل یا دوسرے شخص کے کام میں صرف کیا کہ اس سے بھی تسلیم منتقص ہوگئی' یونہی اگر آتا اور خالی باتیں کرتا چلا جاتا ہے' طلبہ حاضر ہیں اور پڑھاتا نہیں کہ اگر چہ اجرت کام کی نہیں تسلیم نفس کی ہے' مگر یہ منعِ نفس ہے نہ کہ تسلیم۔ بہ ہر حال جس قدر تسلیمِ نفس میں کمی کی ہے اتنی تنخواہ وضع ہوگی۔ معمولی (معمول کی) تعطیلیں مثلاً جمعہ وعیدین و رمضان مبارک کی یا جہاں مدارس میں سہ شنبہ کی چھٹی بھی معمولی ہے وہاں یہ بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کہ ان ایام میں بے تسلیمِ نفس بھی مستحق تنخواہ ہے۔ سوا اس کے اور کسی صورت میں تنخواہ کل یا بعض ضبط نہیں ہوسکتی۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۹ ص ۵۰۶)

مذکورہ دونوں عبارات سے واضح ہوگیا کہ اجیر خاص جب تسلیمِ نفس کر دے یعنی کام کے لیے اپنے معین وقت پر حاضر اور تیار ہو تو وہ اجرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں زید کے حوالہ سے جس مدت کی تنخواہ کے استحقاق کا سوال کیا گیا ہے اس میں زید نے اگر تسلیمِ نفس (بالمعنی المذکور) میں کوئی کمی نہیں کی تھی تو شرعاً وہ اس

تمام اجرت اور رقم کا حق رکھتا ہے جو مدرسہ مذکورہ کی انتظامیہ کے ذمہ واجب الاداء تھی اور تا حال ادا نہیں کی گئی۔ موجودہ انتظامیہ پر لازم ہے کہ وہ زید کو (بر تقدیر تسلیم نفس اور بہ قدر تسلیم نفس) تنخواہ اضافی تنخواہ اور ایڈوانس تنخواہ کے عنوان سے وہ تمام رقم جلد از جلد ادا کرے جو گزشتہ انتظامیہ پر واجب الاداء تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**اعطو الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ**'' اجیر کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت دیدو۔

(سنن ابن ماجہ: ۲۴۴۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۸۷)

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں: ''**المراد منہ المبالغۃ فی اسراع الاعطاء وترك الامطال فی الایفاء**'' اس حدیث کی مراد اس بات میں مبالغہ کرنا ہے کہ اجیر کو اجرت جلد ادا کی جائے اور ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام نہ لیا جائے۔ (مرقاۃ المفاتیح ج ۶ ص ۱۸۱)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**یقول اللہ عزوجل: ثلاثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ ومن کنت خصمہ خصمتہ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرا واکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یوفہ اجرہ**''.

(صحیح بخاری: ۲۲۲۷، ۲۲۷۰، سنن ابن ماجہ: ۲۴۴۲، مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۸، مشکوٰۃ: ۲۹۸۴)

یعنی اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ تین لوگ ایسے ہیں جن کا قیامت کے دن میں مخالف ہوں گا۔ اور جس کا میں مخالف ہو جاؤں تو میں ہی اس پر غالب رہتا ہوں: (۱) ایک وہ شخص جو میرے نام کا حلف اٹھا کر وعدہ کرے پھر اس سے پھر جائے (۲) دوسرا وہ شخص جو آزاد آدمی کی خرید و فروخت کرے اور اس کی قیمت کھا جائے (۳) تیسرا وہ شخص جو کسی اجیر کو اجرت پر رکھے اور اس سے کام بھی پورا لے لیکن اجرت اسے مکمل ادا نہ کرے۔

اس حدیث پاک میں اجرت کی مکمل ادائیگی نہ کرنے والے کو مستحق وعید قرار دیا گیا ہے۔ سو جو شخص اپنے اجیر کو مطلقاً ہی اجرت نہ دے وہ یقیناً وعید شدید کا مستحق ہوگا۔

عمدۃ الشارحین علامہ بدر الدین عینی حنفی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ جس طرح اس حدیث میں آزاد شخص کی خرید و فروخت کو گناہِ عظیم قرار دیا گیا ہے اسی طرح اجیر کو مکمل اجرت نہ دینا بھی آزاد شخص کو بیچنے کی مانند ہے کیونکہ (مکمل اجرت نہ دیکر) آدمی نے اپنے اجیر سے بلاعوض کام لیا اور یہ عین ظلم ہے۔(عمدۃ القاری' موضحاً' ج ۸ ص ۵۵۱)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مسجد کی چیزیں اگر کسی کے پاس محفوظ ہوں اور پھر اس سے وہ چوری ہو جائیں تو......

سوال:

ایک شخص نے مسجد کا چارج سنبھالا۔ جب کہ اس سے پہلے جو شخص مسجد کا صدر تھا اس کے پاس مسجد کے ۲۱ ہزار روپے تھے جو اس نے گھر میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔لیکن سُوءِ اتفاق کہ اس کے گھر میں چوری ہوگئی اور دیگر سامان کے ساتھ مسجد کی مذکورہ رقم بھی چوری ہوگئی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس رقم کی ادائیگی کون کرے گا؟ آیا نئے صدر کی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ گزشتہ صدر سے مطالبہ کرے یا کیا صورت ہوگی؟!

[سائل: ڈاکٹر محمد اکرم' کورنگی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ مسجد کے انتظامیہ کے افراد مسجد کی رقم وغیرہ کے امین ہوتے ہیں۔یعنی ان میں سے جو شخص اپنے پاس مسجد کی رقم وغیرہ رکھتا ہے وہ اس کے پاس بہ طور امانت ہوتی ہے۔اور امانت کے بارے میں شرعی قانون یہ ہے کہ جس شخص کے پاس امانت رکھوائی جائے اور وہ اس پر کسی قسم کی اجرت نہ لے خیانت نہ کرے اور حفاظت اور غفلت میں کوتاہی نہ کرے اور پھر وہ چیز اس سے کسی طرح ضائع ہو جائے تو اس پر کسی قسم کا تاوان نہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''لا علی المستودع غیر المغل ضمان'' ایسا شخص جس کے پاس امانت رکھوائی جائے اور وہ اس میں خیانت نہ کرے اس پر کسی قسم کا تاوان نہیں ہے۔(سنن دار قطنی)

امانت کا یہ حکم علامہ علاؤالدین حصکفی اور امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہما الرحمۃ والرضوان نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔

(دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ج ۸ ص ۳۹۵' فتاویٰ رضویہ' ج ۱۶' ۱۹۴' ۲۲۶)

لہٰذا سوال مذکور میں جس شخص کے پاس مسجد کی رقم موجود تھی اس نے اگر اس رقم میں نہ خیانت کی نہ حفاظت میں کوئی غفلت برتی تو شرعاً اس پر تاوان نہیں ہے۔ یعنی اس سے اس رقم کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا' الا یہ کہ اگر وہ خود رضائے الٰہی کے لیے اس رقم کو (یک شمت یا قسط وار جس طرح ہو سکے) ادا کر دے تو یقیناً یہ بہت عظیم نیکی اور اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

اپنی خوشی سے قرض کی رقم اضافہ کے ساتھ لوٹانا

سوال:

اگر کوئی شخص اپنی مجبوری یا خوشی کے موقعہ پر کسی سے کچھ پیسے بطور قرضہ لیتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں اس اصلی رقم کے از خود مزید اتنے پیسے بھی دونگا' جب کہ قرض دینے والا اپنی اصل رقم سے زائد رقم کو سود سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ بقایا پیسے جو آپ مجھے دے رہے ہیں یہ سود ہے۔ حالانکہ قرض لوٹانے والا کہہ رہا ہے کہ میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہا ہوں؟ تو کیا یہ رقم واقعی سود کہلائے گی؟ قرآن و سنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں؟ بینوا و توجروا [سائل: محمد صدیق ڈار' آزاد کشمیر]

جواب:

قرض لینے والا اگر قرض لیتے وقت خود اضافہ کے ساتھ لوٹانے کی بات کرے یا قرض دینے والا اضافہ کی شرط عائد کرے' دونوں صورتوں میں اضافی رقم جائز نہیں ہے' ہاں! اگر قرض لینے والا لیتے وقت اضافہ کی بات نہیں کرتا اور قرض دینے والا بھی خود قرض دیتے ہوئے اضافہ کے ساتھ واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی اس طرح کی کوئی شرط عائد کرتا ہے تو ایسی صورت میں قرض لینے کے بعد اپنے آپ سے قرضدار اگر زائد رقم دیدے تو یہ سود نہیں کہلائے گا۔ حدیثِ پاک میں قرض پر جس اضافی رقم کو سود قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ قرض

دینے والا قرض دیکر نفع حاصل کرنیکا ارادہ رکھتا ہو یا مطالبہ کرتا ہو۔ لہٰذا ایسی تمام صورتوں میں جہاں اصل رقم واپسی کے وقت دینے والے کی طرف سے نہ اضافہ کی شرط ہو نہ مطالبہ اور قرض لینے والا خوشی سے اضافی رقم دیدے تو وہ سود نہیں کہلائیگی۔ بلکہ اسے تبرع (خوشی سے دیا جانے والا عطیہ) سمجھا جائے گا اور تبرع جائز ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ان خیر عباد الله احسنهم قضآء" بے شک اللہ کے بندوں میں بہترین شخص وہ ہے جو قرض کو اچھے طریقہ سے ادا کرے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰ مطبوعہ کراچی)

اس حدیث کی شرح میں امام نووی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"وفيها انه يستحب لمن عليه دين من قرض وغيره ان يرد اجود من الذي عليه و هذا من السنة و مكارم الاخلاق وليس هو من قرض جر منفعة فانه منهي عنه لان المنهي عنه ما كان مشروطا في عقد القرض". (ایضاً)

یعنی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص پر قرض وغیرہ ہو اس کے لیے بہتر ہے کہ لوٹاتے وقت بہتر اور عمدہ چیز لوٹائے۔ یہ سنت ہے اور اخلاق کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے۔ اور (کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ) قرض سے فائدہ اٹھانے والی بات ہے کیونکہ وہ تو شرعاً ممنوع ہے۔ اور فائدہ بھی وہی ممنوع ہے جس کو قرض لیتے وقت مشروط کیا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اولاد کا اپنے والد کو کوئی چیز دینے کے بعد واپسی کا مطالبہ کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

میرا ایک پلاٹ تھا، جس کی مالیت =/54,000 تھی۔ والد صاحب نے اسے فروخت کر کے کارخانہ لگا لیا۔ بعد ازاں میرے بڑے بھائی کے مشورے پر والد صاحب نے اس کارخانے کو بھائی کے کارخانے میں ضم کر دیا۔ میں والد صاحب کی تعظیم میں کچھ نہ بولا بلکہ انہوں نے جو مناسب سمجھا وہ کرتے رہے۔ اب والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ کیا میں

بڑے بھائی سے اپنے پلاٹ کی رقم کا مطالبہ کرسکتا ہوں یا نہیں؟ اگر ہاں تو اس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا یا اب جو قیمت بنتی ہے اس کا اعتبار ہوگا؟ [سائل: محمد اشفاق' کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل نے جو وضاحت تحریر کی ہے اس میں مسئلے کی نوعیت واضح نہیں ہے کہ بیٹے نے یہ پلاٹ باپ کو بطور قرض دیا تھا یا بطور ھدیہ وھبہ۔ اس طرح کے مسائل میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس نے بھی کسی کو کچھ دیا ہے' اگر دیتے وقت وضاحت ہو کہ یہ دینا ھدیۂ وھبۂ ہے یا بطور قرض ہے تو وجہ از خود متعین ہے اور اگر دیتے وقت وجہ متعین نہ ہو تو دینے والے کی بات قسم کے ساتھ مان لی جائے گی کہ اس کی نیت دیتے وقت کیا تھی۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت اسی مسئلہ سے ملتے جلتے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان مسائل میں اصل کلی یہ ہے کہ جو شخص اپنے مال سے کسی کو کچھ دے' اگر دیتے وقت تصریح ہو کہ یہ دینا فلاں وجہ پر ہے جب تو آپ ہی وہی وجہ متعین ہوگی۔ اور اگر یہ کچھ ظاہر نہ کیا جائے تو دینے والے کا قول معتبر ہے کہ وہ اپنی نیت سے خوب آگاہ ہے۔ اگر اپنی نافع نیت بتائیگا تو اس کا قول قسم کے ساتھ مان لیا جائے گا۔ اور جو اس کے خلاف کا مدعی ہو' وہ محتاج اقامت بینہ ہوگا۔ مگر جب کہ قرائن ودلائل عرف سے اس کا یہ قول خلاف ظاھر ہو تو نہ مانیں گے اور اسی کو اقامت بینہ کی تکلیف دیں گے۔ بہ کثرت مسائل اسی اصل پر متفرع ہیں''۔ (ملخصاً از فتاویٰ رضویہ ج ۱۶ ص ۹۶)

فتاویٰ رضویہ کی اس عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صورت مسئولہ میں دینے والے کی نیت کا معلوم ہونا ضروری ہے کہ آیا اس نے والد کو پلاٹ قرضاً دیا تھا یا ھدیۂ۔ بہر کیف مذکورہ دونوں صورتوں کی تقدیر پر صورت مسئولہ سے متعلق حکم شرعی کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) اگر سائل نے اپنا پلاٹ باپ کو اس لیے دیا تھا تا کہ فروختگی کے بعد اس کی قیمت بطور قرض والد کو مل جائے تو اس صورت میں بیٹے کو اختیار حاصل ہے کہ وہ پلاٹ کی رقم کا مطالبہ کرے۔ اس لیے کہ دائن بہر حال اپنی رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اور چونکہ والد نے وہ پلاٹ فروخت کر کے اس کی مالیت سے کارخانہ لگایا تھا اور پھر اس کارخانہ کو بھائی کے کارخانہ میں ضم کر کے بھائی کو ہی مکمل تصرف دے دیا تھا' اس لیے سائل بڑے بھائی

سے اتنی رقم اور مالیت کا مطالبہ کرے گا جتنی مالیت کے عوض والد نے اس پلاٹ کو فروخت کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ پلاٹ اب موجود نہیں ہے جو اس کی موجودہ مالیت کا اعتبار کیا جائے۔

(۲) اور اگر بیٹے نے یہ پلاٹ باپ کو ھدیۃً اور ھبۃً دیا تھا تو چونکہ ''موھوب لہٗ'' یعنی والد اور ''واہب'' یعنی بیٹے کے درمیان قرابتِ محرّمہ ہے' لہٰذا اس صورت میں سائل بڑے بھائی سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قرابتِ محرّمہ کی وجہ سے رجوع کرنا ممنوع ہو جاتا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہونے والے شخص کی دیت کا شرعی حکم

سوال:

میری عمر 32 سال ہے اور میرے 6 بچے ہیں' سب سے بڑے بچے کی عمر 9 سال ہے اور سب سے چھوٹے بچے کی عمر 1 سال ہے۔ میرا خاوند محمد حنیف عمر 35 سال مورخہ 20 دسمبر 2000 کو شارع نور جہاں تھانے کی حدود میں عبد اللہ کالج اور نارتھ ناظم آباد تقریباً ڈھائی بجے دن نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہو گیا ہے۔ جس کی ایف۔ آئی۔ آر نمبر 171/2000 بتاریخ 20-12-2000 تھانے میں درج ہے۔ دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے اب تک میرے شوہر کے قاتل نہیں پکڑے جا سکے اور نہ ہی مجھے کہیں سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ ملا۔ معاوضے کے مقدمے کے لیے مختلف وکلاء سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کیونکہ مارنے والے نامعلوم ہیں اس لیے معاوضے کا دعویٰ کس کے خلاف ہوگا؟ مجھ بیوہ (جو چھ معصوم بچوں کی کفالت کر رہی ہے) پر یہ جواب بہت ہی قیامت کے طور پر ٹوٹ پڑا۔ جنابِ محترم! آپ سے مودبانہ میری درخواست ہے کہ اسلامی جزئیات کا اصول ہے کہ کوئی بھی قتل بغیر ہرجانے کے نہیں جائے گا تو اس صورت میں جب کہ مارنے والے قاتل نہ پکڑے جائیں یا نامعلوم ہوں تو کیا حکومت کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے بیت المال سے کسی شہری کے قتل کا معاوضہ

اس کے لواحقین کو دے؟

دوئم یہ کہ اگر حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے تو معاوضے کے تعین کے لیے کیا اصول متعین ہوں گے اور معاوضے کی رقم کس حد تک دی جاسکتی ہے؟ اگر مناسب تحریر اور حوالوں سے اس پر روشنی ڈالی جائے تو مجھ بیوہ اور یتیم بچوں پر احسان عظیم ہوگا کیونکہ آپ کا جواب ہی ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہوگی جس کا مثبت ہونے کی صورت میں ہمیں مزید کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ [سائلہ: آمنہ حنیف' F.B ایریا کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائلہ کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ گاڑی کی ٹکر اور ایکسیڈنٹ سے جو موت واقع ہوتی ہے اصطلاح میں اسے ''قتل بالسبب'' کہا جاتا ہے اور قتل بالسبب کا حکم یہ ہے کہ اس میں قاتل کے وہ رشتہ دار جو باپ کی طرف سے ہوں' ان پر دیت کی ادائیگی لازم ہوتی ہے' جیسا کہ فقہ حنفی کی تمام کتب میں مذکور ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس حکم پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ عدالت سے قاتل کے معلوم ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر قاتل کے نامعلوم ہونے کا فیصلہ صادر ہوجائے تو بیت المال سے دیت ادا کی جائے گی۔ اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ بن مسعود کا واقعہ مذکور ہے کہ وہ دونوں خیبر گئے اور وہاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے' تھوڑی دیر کے بعد حضرت محیصہ نے اپنے ساتھی کو مقتول پایا' وہ ان کو دفنا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اتحلفون خمسين يمينا فتستحقون صاحبكم او قاتلكم قالوا و كيف نحلف ولم نشهد قال فتبرئكم يهود بخمسين يمينا قالو و كيف نقبل ايمان قوم كفار فلما رأى ذالك رسول الله ﷺ اعطى عقله''.

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۵۰' جامع ترمذی ج ۱ ص ۲۶۱' سنن نسائی ج ۲ ص ۲۳۵' سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۷۳' سنن ابن ماجہ ص ۱۹۲' مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۰۶)

یعنی کیا تم پچاس قسمیں کھا کر اپنے ساتھی کا خون ثابت کرلو گے؟ انہوں نے کہا: ہم کیسے قسمیں کھاسکتے ہیں جب کہ ہم موقعہ پر موجود نہیں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر

یہودی پچاس قسمیں کھا کر اپنی براءت کو ثابت کرلیں گے! انہوں نے کہا کہ ہم کافروں کی قسموں کو کیسے قبول کرسکتے ہیں؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ صورتحال دیکھی تو آپ نے خود مقتول کی دیت ادا فرمائی۔

اسی طرح حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص عرفہ کی بھیڑ میں کچلا گیا' اس کے ورثاء نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آکر شکایت کی۔ حضرت عمر نے فرمایا: تم اس کے قاتلین کے خلاف گواہ لاؤ۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین! مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ اگر آپ کو اس کے قاتل کا علم ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بیت المال سے اس کی دیت ادا کیجیے۔

(شرح صحیح مسلم ج ۴ ص ۲۳۶)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''ان وجد القتیل فی الشارع الاعظم فلا قسامة فیه والدیة علی بیت المال''۔ (ج ۶ ص ۸۰) اگر بڑے روڈ پر کوئی مقتول پایا جائے تو اس میں محلہ والوں سے حلف نہیں لیا جائے گا بلکہ بیت المال سے اس کی دیت ادا کی جائے گی۔ واضح رہے کہ دیت کی شرعی مقدار ایک ہزار دینار (4.374 کلوگرام سونا) یا دس ہزار درہم (30.618 کلوگرام چاندی) یا اس کے برابر قیمت ہے' جو بیت المال سے ادا کی جائے گی۔

(تبیان القرآن ج ۲ ص ۷۵۷) واللہ ورسوله اعلم بالصواب

مسجد کے لیے وقف کی جانے والی زمین میں لوازماتِ مسجد تعمیر کرنا

سوال:

زید نے 320 گز کا پلاٹ مسجد بنانے کے لیے وقف کیا۔ کمیٹی نے پلاٹ کے تقریبا 60 گز پر مسجد تعمیر کی۔ 20 گز پر وضو خانہ و بیت الخلاء' 40 گز پر امام کا گھر' 10 گز پر اسٹور اور 10 گز پر جوتے رکھنے کی جگہ بنائی۔ اور بقایا 100 گز پر کچھ کمرے بنانے کا ارادہ ہے تاکہ کمرے کرائے پر دے کر آمدنی مسجد کے کاموں (مثلاً امام و مؤذن کے وظائف یا دیگر

محافل وتعمیری کام) میں لگائے۔

سوال یہ ہے کہ مسجد کے لیے وقف کردہ زمین پر لوازماتِ مسجد جو اوپر مذکور ہیں بنائے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ مسجد کی زمین پر کمرے تعمیر کر کے کرائے پر دیئے جاسکتے ہیں یا نہیں جب کہ اس میں مسجد کی منفعت مقصود ہے؟ [سائل: انتظامیہ مسجد' کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ وقف کردہ زمین پر مسجد اور ان تمام چیزوں کی تعمیر کرنا جائز ہے جو مسجد کے لوازمات اور ضروریات کی قبیل سے ہوں۔ ایسی چیزوں کو ''مصالح مسجد'' کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ جتنی جگہ پر مسجد بنادی جائے گی اس کو پھر کسی اور چیز میں تبدیل نہیں کرسکتے۔ ہاں جتنی جگہ باقی ہے اس پر وضوء خانہ کرایہ کے کمرے' بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیر جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''الذی یبدء من ارتفاع الوقف عمارته شرط الواقف ام لا ثم الی ماهو اقرب الی العمارة و اعم للصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة یصرف الیهم بقدر کفایتهم ثم السراج والبسط''. (الخ)

(فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۳۶۸)

یعنی وقف کے مال میں سب سے پہلے عمارت بنائی جائے گی' خواہ وقف کرنے والے نے شرط لگائی ہو یا نہیں پھر جو اس عمارت کی ضروریات اور مصالح ہوں ان کو تعمیر کیا جائے گا' جیسے مسجد کا امام یا مدرسہ کا مدرس ہو تو ان کو ان کے گزارے کے مطابق دیا جائے گا' پھر روشنی اور بچھونے پر خرچ کیا جائے گا۔

اسی طرح جو بھی مصالح اور لوازمات ہوں وہ سب اسی مال وقف میں داخل ہوں گے۔ یہ اس صورت میں ہے جب مال وقف کسی خاص کام کے لیے نہ ہو۔ اگر کسی خاص کام کے لیے مال دیا گیا ہے تو وہ صرف اسی کام میں استعمال ہوگا۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں: کسی نے اپنی جائیداد مصالح مسجد کے لیے وقف کی تو امام مؤذن' جاروب کش' فراش' دربان' چٹائی' جائے نماز' قندیل' تیل' روشنی کرنے والا' وضوء کا پانی' لوٹے کی رسی' ڈول' پانی بھرنے والے کی اجرت

اس قسم کے مصارف ''مصالح'' میں شمار ہوں گے۔ (درمختار) (ایک مقام پر فرماتے ہیں:) مسجد کے نیچے کرایہ کی دوکانیں بنائی گئیں یا اوپر مکان بنایا گیا جن کی آمدنی مسجد ہی میں صرف ہوگی تو حرج نہیں، یا مسجد کے نیچے ضرورت مسجد کے لیے تہ خانہ بنایا کہ اس میں پانی وغیرہ رکھا جائے گا یا مسجد کا سامان اس میں رہے گا تو حرج نہیں (عالمگیری) مگر یہ اس وقت ہے کہ قبل تمام مسجد دوکانیں یا مکان بنالیا ہو۔ مسجد ہو جانے کے بعد نہ اس کے نیچے دوکان بنائی جاسکتی ہے نہ اوپر مکان۔ (درمختار، بہارِ شریعت حصہ ۱۰ص ۴۰۔۴۶)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

چور اپنی چوری سے توبہ کرنے کے بعد چرائے ہوئے مال کا کیا کرے؟

سوال:

ایک شخص نے لاعلمی کی وجہ سے متعدد چوریاں کیں بعد میں اسے معلوم ہوا کہ میں نے یہ غلط فعل کیے ہیں اس بناء پر اس نے توبہ کی۔ پوچھنا یہ ہے کہ آیا یہ توبہ کرنا اس شخص کے لیے کافی ہے یا چوری شدہ مال واپس کرے یا جن حضرات کا مال چرایا ہے ان سے بخشوائے؟ اگر وہ مال واپس کرتا ہے یا بخشواتا ہے تو اسے اپنی عزت کا ڈر ہے۔ برائے مہربانی اس مسئلہ کے بارے میں رہنمائی فرمائیں۔ [سائل: محمد منظور، اورنگی ٹاؤن]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ شرعی قوانین کے مطابق کوئی بھی شخص جو کسی کا مال وغیرہ چوری کرے اس پر اس کا لوٹانا واجب ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**علی الید ما اخذت حتی تردہ**'' جب تک کوئی شخص لی ہوئی چیز کو واپس نہ لوٹائے وہ اس پر لازم رہتی ہے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۵، رقم: ۳۵۶۱)

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی علیہ الرحمۃ اسی حدیث کی بنیاد پر لکھتے ہیں: ''**الثانی وجوب رد عین المسروق علی صاحبہ اذا کان قائما بعینہ**'' یعنی دوسرا یہ کہ جو چیز

چوری کی ہے اس کو مالک کی طرف واپس لوٹانا واجب ہے جب کہ وہ چیز اس کے پاس بعینہ موجود ہو۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۴۴)

فقیہ اعظم مفتی نور اللہ نعیمی بصیر پوری علیہ الرحمۃ نے بھی قرآن وسنت سے متعدد دلائل کی روشنی میں یہی لکھا ہے۔ (فتاویٰ نوریہ ج ۴ ص ۸۸)

لہٰذا سوال مذکور میں چوری کرنے والے پر چوری کردہ مال کو واپس کرنا ضروری ہے یا اصل مالکان اس کو بخش دیں اور معاف کردیں۔

رہی یہ بات کہ مال کو واپس کرنے یا بخشوانے میں چوری کرنے والے کو اپنی عزت کا ڈر ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ چوری کردہ مال اصل مالکان کو لوٹا دے اور ظاہری ہی نہ کرے کہ یہ وہ مال ہے جو میں نے چوری کیا تھا۔ یوں مال بھی واپس ہو جائے گا اور عزت بھی بچ جائے گی۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ سے اسی طرح کا ایک سوال کیا گیا تو آپ نے جواباً فرمایا کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ واپس کرتے وقت یہ ظاہر کرے کہ یہ فلاں چیز کی قیمت ہے جو میں نے چوری کی تھی۔

(فتاویٰ امجدیہ حصہ ۳ ص ۳۴۵) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

وصیت

وراثت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وصّی اور نفاذِ وصیت کا شرعی حکم

سوال:

ایک صاحب بنام اختر علی خان صاحب میرے محلے میں رہتے تھے۔ان کی ایک بیوی اور ایک بیٹی (جو کہ طلاق یافتہ ہے) ان کے وارث ہیں۔ تین چار برس سے مرحوم اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات ختم کر چکے تھے لیکن طلاق نہیں دی تھی اور بیٹی سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی تھی اور تنہا رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنا مکان بیچ کر میرے ذریعے مبلغ چھ لاکھ روپے (=/600,000) کے سیونگ سرٹیفکیٹ خریدے اور ان میں وارث کے طور پر مجھے نامزد کر دیا اور یہ سرٹیفکیٹ میرے پاس رکھوا دیے اور ان سے ملنے والے منافع سے اپنی گذر بسر کرتے رہے۔ مرحوم نے مجھے زبانی طور پر یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد اگر کوئی میرے دستخط کے ساتھ (جو کہ میرے پاس محفوظ ہیں) میری کوئی تحریری وصیت لائے تو اس کے مطابق معاملہ کر لینا۔ دوسری صورت میں تمام رقم مسجد میں دے دینا اور میری بیوی اور بیٹی کو مت دینا۔ یہ مرحوم کے الفاظ ہیں لیکن یہ تمام وصیت زبانی ہے اور اس کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ 26 مارچ 2002ء کو ڈیرہ غازی خان میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ رقم سرٹیفکیٹ کی صورت میں میرے پاس ہے اور سرٹیفکیٹ میں مرحوم نے مجھے نامزد کیا ہوا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد مرحوم کی بیوی اور بیٹی نے رقم کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ اس وقت میں شدید الجھن میں ہوں۔ بیوی اور بیٹی کے پاس مرحوم کی کوئی وصیت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا شخص ان کی کوئی وصیت لے کر ابھی تک میرے پاس آیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس بھی مرحوم کی کوئی تحریری وصیت نہیں ہے اور نہ ہی مرحوم کے اور کوئی رشتہ دار ہیں۔ آپ قرآن و حدیث کے مطابق اس مسئلے کا شرعی حل بیان فرمائیں۔ [سائل: محمد سعید ملیر کراچی]

جواب:

سوالِ مذکور میں جو تفصیل بیان کی گئی اُس کے مطابق سائل (سعید صاحب) مرحوم اختر

علی کے وصی ہیں۔ اور وصی اُس شخص کو کہتے ہیں جس کو کسی شخص نے اپنے قرض کی ادائیگی وصیت کی تنفیذ اور تقسیم جائیداد کے معاملات کا ذمہ دار بنایا ہو۔ نیز آدمی اپنی زندگی میں جو کچھ وصیت کرتا ہے وہ اُس کے انتقال کے بعد اُس کے کل مال کے ایک تہائی (One Third) میں نافذ ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے سائل (سعید صاحب) پر بہ حیثیت وصی لازم ہے کہ وہ مرحوم کے کل مال میں سے ایک تہائی مقدار مسجد میں صرف کریں۔ کیونکہ مرحوم نے مسجد میں دینے کی وصیت کی تھی جبکہ بقیہ مال شرعی قانون کے مطابق اُن کے دو وارث (بیوہ اور بیٹی) میں تقسیم کریں۔ شرعی قانون سے مراد یہ ہے کہ کل مال کے آٹھ حصے کیے جائیں جن میں سے ایک حصہ بیوہ کو اور بقیہ سات حصے بیٹی کو دیے جائیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ورثاء کے لیے وصیت کی شرعی حیثیت

سوال:

دو بیٹیوں نے اپنی والدہ کی ۲۲ برس خدمت کی اس طویل عرصے میں دوسرے بہن بھائی (جو کہ دونوں بہنوں سے عمر میں بڑے ہیں اور صاحب حیثیت بھی ہیں) نے کسی قسم کی کوئی خدمت اپنی والدہ کی نہیں کی اور نہ ہی کچھ دیا۔ والدہ نے اپنے انتقال سے قبل کچھ وصیتیں زبانی کیں اپنی دونوں چھوٹی بیٹیوں کو بھی اور باقی اولاد کو بھی۔ اپنی دونوں چھوٹی بیٹیوں کو کہا کہ چونکہ تم دونوں نے میری خدمت کی ہے میرے بعد اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے تمہارا کوئی بھی نہیں لہٰذا میں وراثت کے علاوہ بھی حق خدمت تمہیں دیتی ہوں اور فلاں فلاں چیز تمہاری ہے۔ والدہ کی وفات کے بعد وراثت کا جو شرعی حصہ ہے وہ تو دونوں کو مل گیا ہے لیکن جو وصیت کی تھی وہ دوسرے بہن بھائیوں نے ان کو نہیں دیا حالانکہ وہ سب صاحب حیثیت ہیں اور یہ بیچاری غریب و بے وارث ہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ کیا شرعی طور پر وراثت کے علاوہ وصیت کے مطابق یہ دونوں بہنیں اپنی والدہ کی جائیداد سے لے سکتی ہیں؟ [سائل: محمد سراج احمد سعیدی کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں والدہ کا یہ جملہ درج ہے کہ "میں وراثت کے علاوہ بھی حق خدمت تمہیں دیتی ہوں اور فلاں فلاں چیز تمہاری ہے"۔ اس قول کے بموجب والدہ نے اگر اپنی زندگی ہی میں اپنی ملکیت میں سے کوئی چیز دو بیٹیوں کے قبضہ میں دیدی تھی تب تو وہ بیٹیاں اس چیز کی مالک ہوگئیں، اس چیز کا وراثت کی تقسیم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اور اگر والدہ نے مرنے کے بعد کی وصیت کی تھی تو یہ وصیت درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ بیٹیاں شرعاً وارث ہیں اور وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا: "ان اللہ تبارک وتعالیٰ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث"۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۳۲، سنن ابوداود ج ۲ ص ۴۰، سنن نسائی ج ۲ ص ۱۳۱، سنن ابن ماجہ ص ۱۹۴، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۶۵) بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق عطا فرما دیا ہے۔ لہٰذا اب وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "کانت الوصیۃ للاقارب فرضا قبل نزول اٰیۃ المیراث فلما نزلت بطلت الوصیۃ فان اوصی واجاز باقی الورثۃ صحت"۔ (مرقات ج ۶ ص ۲۵۵) اقارب کے لیے وصیت کرنا آیت میراث کے نزول سے پہلے فرض تھا پھر جب آیت میراث نازل ہوگئی تو (اقارب کے لیے) وصیت کرنا باطل ہوگیا۔ ہاں! اگر کوئی وارث کے لیے وصیت کرے اور باقی ورثاء بھی اجازت دے دیں تو یہ وصیت درست ہوگی۔

علامہ علی قاری علیہ الرحمۃ کی صراحت سے معلوم ہوا کہ وارث کے لیے وصیت اصلاً درست نہیں، ہاں اس صورت میں درست ہوسکتی ہے جب کہ ورثاء اس کی اجازت دے دیں۔ یہی ائمہ اربعہ علیہم الرحمۃ کا موقف ہے۔ (کما صرح فی الانفصاح عن معانی الصحاح ج ۲ ص ۶۱) اس کی تائید سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لا تجوز وصیۃ لوارث الا ان تجیز الورثۃ"۔ (نصب الرایۃ ج ۵ ص ۲۱۹، سنن بیہقی ج ۶ ص ۲۶۳) وارث کے لیے وصیت صرف اسی صورت درست ہوسکتی ہے جب کہ ورثاء اس کی اجازت دے دیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مرحوم یا مرحومہ کی کسی وصیت کی وجہ سے دفنانے میں تاخیر کرنا

سوال:

زید کی والدہ کا انتقال ہو گیا اس کی والدہ نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میرا جنازہ گھر سے نکالنے سے قبل تمام لوگوں کو سیر ہو کر کھانا کھلانا ہے اس کے بعد دفنانا ہے۔ یا پھر وصیت نہ کی لیکن رسم کو برقرار رکھتے ہوئے زید نے غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا اس کے بعد میت کو قبرستان لے جایا گیا اور دفنایا۔ آیا ایسا عمل کرنے سے زید کی والدہ کو ثواب ملے گا یا گناہ؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ [سائل: عابد حسین' ضلع مظفر آباد]

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائل نے زید کی والدہ کی جس وصیت کا تذکرہ کیا یہ وصیت اور اس طرح کی وہ تمام وصیتیں جو شرعی حکم کے خلاف ہوں' باطل و مردود ہیں۔ مرنے کے بعد شریعت مطہرہ کا حکم یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے' تجہیز و تکفین عمل میں لائی جائے اور کسی رسم کی بنیاد پر تجہیز و تکفین میں تاخیر نہ کی جائے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اذا مات احدکم فلا تحبسوه واسرعوا به الی قبره"۔ (مشکوۃ شریف ص ۱۴۹) یعنی جب تم میں سے کوئی شخص مر جائے تو اسے روکے مت رکھو اور قبر کی طرف لے جانے میں جلدی کرو۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ: "غسل و کفن و دفن میں جلدی چاہیے کہ حدیث میں اس کی بہت تاکید آئی۔"

(بہار شریعت حصہ ۴ ص ۷۳' مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

مذکورہ بالا حوالوں سے معلوم ہوا کہ تجہیز و تکفین میں کسی رسم یا وصیت کی بنیاد پر تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں! اگر تجہیز و تکفین کو نہ روکا جائے اور دوسری جانب ایصال ثواب کے لیے کوئی کھانا بھی کھلا دے تو حرج نہیں ہے۔ واضح رہے کہ فقراء و مساکین کو میت کے ترکہ میں

سے کھانا نہیں کھلایا جائے گا بلکہ کوئی بھی وارث اپنی طرف سے ایصال ثواب کے لیے یہ عمل کرسکتا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اولاد کو عاق کرنے کی شرعی حیثیت

سوال:

اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو نافرمانی کی بناء پر اپنی جائیداد سے عاق کردیتا ہے اور بیٹے کو بیٹا ماننے سے انکار کردیتا ہے تو کیا شریعت میں باپ کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کو جائیداد سے عاق کردے اور اپنے بیٹے کے خون کے رشتہ سے بھی انکار کردے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت سے جواب عنایت فرمائیں۔ [سائل: سید فاروق احمد، گلشن اقبال، کراچی]

جواب:

عاق کرنے کا جو مفہوم عوام الناس میں رائج ہے یعنی والدین کا اپنے بیٹے یا بیٹی کو جائیداد سے محروم کردینا بلکہ بعض اوقات اولاد کو اولاد تسلیم کرنے سے انکار کردینا اور اس طرح کی دیگر صورتیں ان کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جائیداد سے محروم کرنے کے بارے میں سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من قطع میراث وارثہ قطع اللہ میراثہ من الجنۃ یوم القیامۃ'' جس نے اپنے وارث کے حصہ کو منقطع کیا اللہ تبارک وتعالیٰ جنت سے اس کا حصہ قطع فرمادے گا۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۶۶) اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اپنی اولاد کو جائیداد سے محروم نہیں کرسکتا۔ کیونکہ کسی بھی شخص کے مرنے کے بعد اس کا مال اس کے ورثاء میں جو تقسیم ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنیاد پر ہے۔ ہاں اگر والدین کو شرعی وجہ کی بنیاد پر اولاد سے ناراضی ہو (مثلاً اولاد کسی شرعی حکم میں والدین کی نافرمان ہو یا حد درجہ فاسق وفاجر ہو اور والدین کو اپنے انتقال کے بعد اولاد کی ناجائز عیش پرستی کا خطرہ ہو) تو والدین اپنے نافرمان بیٹے یا بیٹی کو ان صورتوں میں جائیداد سے محروم کرسکتے ہیں۔ اس طور پر کہ یا تو والدین اپنی حیات میں اپنی جائیداد کا مالک اپنی نیک اولاد کو بنادیں یا اپنی جائیداد کسی نیک کام میں صرف کردیں اور کچھ اپنی نیک اولاد کو دیدیں۔ ان دونوں صورتوں میں والدین کے انتقال کے بعد نہ کوئی ترکہ ہوگا نہ اس کی تقسیم کا مسئلہ درپیش ہوگا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

نافرمان اولاد کو میراث سے محروم کرنے کا حکم

سوال:

(۱) اللہ رب العزت کی طرف سے اولاد کو حکم ہے کہ وہ اپنے سن رسیدہ والدین کے ساتھ ”اف“ بھی نہ کرے‘ اگر اولاد اس حکم ربی کے خلاف نہ صرف نافرمانی بلکہ مار پیٹ اور قصداً جھوٹے الزام تراشی پر آمادہ اور عمل پیرا ہو جائے تو کیا ایسی اولاد اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی اور نافرمانی کی بناء پر دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گی یا نہیں؟

(۲) کیا قرآن پاک اور احادیث نبوی شریف کی رو سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اللہ رب العزت اور اس کے محبوب مکرم نبی کریم ﷺ نے کہیں یہ فرمایا کہ حد درجہ نافرمان اور سرکش اور مغرور اولاد کو بھی والدین کی موت کے بعد ترکہ یا وراثت میں حصہ دینا ضروری اور لازمی ہے؟ اگر ایسا کوئی حکم ہے تو جواب کے ذریعہ میرے علم میں اضافہ فرمائیں تاکہ میری تشفی ہو سکے۔

(۳) وہ اولاد جو انتہائی نافرمان‘ سرکش اور مغرور ہو اگر اسے بلا مشقت ایک بڑی رقم ترکہ میں مل جائے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کے غرور اور سرکشی (جسے عرف عام میں غنڈہ گردی کہتے ہیں) میں اضافہ ہو جائے اور دوسروں کے لیے مصیبتوں اور مشکلات کا باعث بننے میں معاون ثابت ہو جس کی وجہ سے مخلوق خدا کے لیے غیر ضروری طور پر ممکنہ اذیت کا باعث ہو جائے۔ ایسی صورت میں محترم والدین کا اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کیا مقام ہوگا؟ [سائل: سید فاروق احمد‘ گلشن اقبال]

جواب:

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی‘ بدکلامی‘ بداخلاقی‘ ان کی نافرمانی اور ان کی عزت وحرمت کی پامالی اشد حرام اور سخت محرومی کا باعث ہے‘ تاہم یہ کفر اور دائرہ اسلام سے خروج کا باعث نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی کلمہ گو مسلمان کتنے ہی بڑے گناہوں کا ارتکاب کیوں نہ کر لے وہ بہر حال مسلمان ہی رہتا ہے اور اس وقت تک

مسلمان رہتا ہے جب تک کہ اس سے کوئی کفریہ بات یا کفریہ فعل صادر نہ ہو جائے۔

(۲۔۳) ویسے تو احادیث میں مطلقا وارد ہوا ہے کہ کسی بھی وارث کو اس کے حصۂ وراثت سے محروم کرنا ممنوع ہے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ المصابیح کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ''جس نے اپنے وارث کی میراث کو قطع کیا قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ جنت سے اس کا حصہ قطع فرمادے گا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۶۶)

لیکن ہمارے علماء وفقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے کتب فقہ میں یہ صورت بھی بیان فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص کی اولاد حد درجہ فاسق وفاجر اور نافرمان ہو اور والدین کو اپنے انتقال کے بعد اولاد کی سرکشی کا خطرہ ہو تو والدین اس نافرمان بیٹے یا بیٹی کو اپنے ترکہ سے محروم کر سکتے ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ:

(۱) اپنی زندگی میں اپنی نیک اور فرمانبردار اولاد کو اپنی جائیداد اور ملکیت کا مالک بنادیں اور نافرمان کو محروم کردیں یا (۲) اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کسی نیک کام میں صرف کردیں اور نافرمان کو محروم کردیں۔ یہ دونوں صورتیں شرعاً جائز اور درست ہیں۔

چنانچہ البحر الرائق' فتاویٰ عالمگیری اور بہار شریعت میں ہے:

''ولو كان ولده فاسقا فاراد ان يصرف ماله الى وجوه الخير و يحرمه عن الميراث هذا خير من تركه لان فيه اعانة على المعصية''۔

(البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۸' فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۳۹۱' بہار شریعت حصہ ۱۴ ص ۵۶)

یعنی اولاد (لڑکا' لڑکی) اگر فاسق ہو (اور یہ گمان ہو کہ میرے مرنے کے بعد یہ مال کو بدکاری اور گناہ میں خرچ کر ڈالے گا) تو اس کے لیے مال چھوڑ جانے سے یہ بہتر ہے کہ نیک کاموں میں یہ اموال صرف کر ڈالے۔ اس صورت میں اسے میراث سے محروم کرنے میں گناہ نہیں کہ یہ حقیقۃً میراث سے محروم کرنا نہیں ہے بلکہ اپنے اموال اور اپنی کمائی کو حرام میں خرچ کرنے سے بچانا ہے۔ اور اگر اس نافرمان اولاد کے لیے مال چھوڑا تو یہ معصیت اور گناہ کے کام پر تعاون کرنا کہلائے گا۔

اوپر جو حدیث ذکر کی گئی کہ ''جس نے اپنے وارث کی میراث کو قطع کیا' قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ جنت سے اس کا حصہ قطع فرمادے گا'' اس کے بارے میں صدر الشریعہ

علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے جب کوئی شخص بلا وجہ شرعی اپنے کسی وارث کو محروم کرے۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۲ ص ۲۶۷)

یعنی اگر کسی شرعی وجہ کی بناء پر وارث کو وراثت سے محروم کر دیا جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قدس سرہ العزیز سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے نافرمان بیٹے کو وراثت سے محروم کر کے اپنی جائیداد بقیہ اولاد کو دینا چاہے تو آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں تو آپ نے جواباً فرمایا کہ ''اگر فی الواقع اُو فاسق و فاجر است پدر را می رسد کہ اُو را محروم دارد''۔ یعنی اگر وہ واقعۃ فاسق و فاجر ہو تو باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو محروم رکھے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۹ ص ۳۵۸) **واللہ و رسولہ اعلم بالصواب**

گود لیے ہوئے بیٹے کی شرعی حیثیت

سوال:

زید اور بکر دو بھائی ہیں۔ زید بے اولاد ہے جب کہ بکر صاحبِ اولاد ہے جن میں اولادِ نرینہ بھی موجود ہے۔ برعکس اس کے زید کی بیوی اپنے بھائی کے بیٹے کو گود اس لیے لینا چاہتی ہے تاکہ زید کی جائیداد کا وارث اس کا بھتیجا ہو جائے۔ بیوی کے اصرار پر زید اپنے سالے کے بیٹے کو گود لے لیتا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد زید اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ زید کے وصال کے بعد بکر اور اس کے خاندان کے لوگ زید کی وراثت کے اصل حقدار یہ کہتے ہیں: جب اپنے ہی خاندان اور قبیلے میں گود لینے کے لیے بچے موجود تھے تو غیر خاندان اور غیر قبیلے سے گود لیے ہوئے بچے کا زید کی جائیداد میں کیونکر حق یا حصہ ہو سکتا ہے؟

دریافت کرنا یہ مقصود ہے کہ قانونِ شریعت میں گود کی کیا حیثیت ہے؟

[سائل: پیر فتح محمد ولد مولیٰ بخش، کراچی]

جواب:

کسی کے بچہ یا بچی کو گود لینا، ان کی پرورش کرنا شرعاً جائز اور باعث ثواب ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس بچہ یا بچی کو وہ حقوق بھی حاصل ہو جائیں جو شرعاً حقیقی بیٹے یا

بیٹی کو حاصل ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے بیٹے کو گود لیتا تو وہ ہر لحاظ سے اس کا حقیقی بیٹا شمار ہوتا' حقیقی بیٹے کے تمام حقوق اور سب مراعات اسے حاصل ہو جاتیں' وہ وراثت میں حصہ دار بن جاتا' گھر کی خواتین کے ساتھ اس کا میل جول حقیقی بیٹے کی طرح بے پردگی کے ساتھ اور بے تکلفانہ ہوتا۔ یہ رواج بہت ساری حق تلفیوں اور اخلاقی قباحتوں کا سبب بن کر رہ گیا تھا۔ مرنے والے کے حقیقی وارث' حصہ پانے سے محروم ہو جاتے اور ایک گود کا بچہ یا بچی سب کچھ لے جاتے۔ قرآن حکیم نے اس بدترین رسم و رواج کا خاتمہ کر دیا اور ارشاد فرمایا: "مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَ کُمْ اَبْنَآءَ کُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ" (الاحزاب: ۴) (اللہ تعالیٰ نے) تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا (یہ تو صرف) تمہارے منہ کی باتیں ہیں' اس آیت کی تفسیر میں تمام مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئی جو گود کے بیٹے یا بیٹی کو حقیقی بیٹے کے حقوق دیدیتے اور اس کو اپنی جائیداد میں حصہ دار بناتے۔ (مدارک التنزیل' خزائن العرفان' الاحزاب: ۴)

لہٰذا سوالِ مذکور میں زید کی بیوی کا اپنے بھائی کے بیٹے کو گود لینا شرعاً درست ہے لیکن اسے اپنے شوہر کے مال میں سے حصہ دینا جائز نہیں ہے۔ (زید نے اپنے مرنے کے بعد جو کچھ ترکہ چھوڑا ہے وہ سب اسی زید کے ورثاء میں شرعی قانون کے مطابق تقسیم ہوگا۔)

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اپنے ہی خاندان اور رشتہ داروں کا بچہ گود لیا جائے یا غیر خاندان کا بچہ سب کا حکم یکساں اور برابر ہے یعنی وہ جائیداد کا وارث نہیں ہوگا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بعض علاقوں میں میت کی جائیداد تقسیم کرنے کا ایک جاہلانہ طریقہ اور اس کا شرعی حکم

سوال:

میراث کا مال (ترکہ) جو باپ نے چھوڑا ہے اس کے بچے اس کے مرنے کے بعد اس کا چھوڑا ہوا مال اور اس کے بیٹے کچھ روپیہ پیسہ اپنی طرف سے ملاتے ہیں اور کچھ سسرال

والے بذریعہ مال ان کی مدد کرتے ہیں یہ تمام پیسہ ملا کر ایک جگہ جمع کر کے مرنے والے کے رشتہ داروں کو اور دوسرے خاندان کے لوگوں کو حسب رسم تقسیم کرتے ہیں۔ (رسم یہ ہے کہ یہ میراث جمع کر کے ہر ایک کے گھر کا حساب لگایا جاتا ہے کہ کتنے افراد ہیں پھر اسی حساب سے ۱۰ کلو گھی یا ایک کلو یا پندرہ کلو گھی کے حساب سے فرداً فرداً ہر ایک کو بطور مثال ۱۰ کلو گھی کے پیسے دیتے ہیں اور یہ بھی بطور اصرار بار بار بلا کر میت کے بیٹے رشتہ داروں کو دیتے ہیں) اور اگر کوئی یہ رسم نہ کرے تو پھر اس پر لعنت ملامت طعن و تشنیع کی جاتی ہے اس پر راستے میں تھوکا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے گھر میں رشتہ داری کا بندھن بھی نہیں باندھتے۔ اور جو شخص (میت کے ورثاء) یہ کام کرتے ہیں وہ بہ ظاہر تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں مگر دل میں ان کے بددعائیں نکل رہیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس رسم میں لاکھوں روپے میت کے ورثاء کے لگ جاتے ہیں لہٰذا آپ سے گزارش ہے مسئلہ کا تفصیلی تشفی بخش جواب دیں کہ آیا ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو کیوں اور ناجائز ہے تو وجوہات بیان کریں اور شرعی قباحت قرآن و سنت کی رو سے واضح کریں۔ [سائل: محمد انیس عطاری، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ یہ رسم سراسر قبیح، شریعت مطہرہ کے بالکل برخلاف اور زمانہء جاہلیت کے رسوم و رواج کی ایک کڑی ہے۔ اسلام اس قسم کی تمام رسوم و رواج کو مٹانے کے لیے آیا ہے جن میں حقدار کو اس کا حق نہ دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ رسم اسلامی قانون وراثت کے بھی مخالف ہے۔ اسلامی قانون وراثت کے مطابق میت کا ملکیتی ترکہ اس کے ورثاء میں ہی تقسیم کیا جائے، ورثاء کے علاوہ اس میں شرعی طور پر کوئی غیر شریک نہیں۔ ورثاء پر لازم ہے کہ اپنے حق وراثت کو شرعی طریقے پر وصول کریں اس سے اعراض جائز نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْأَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا'' (النساء:۷) مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قرابت والے اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قرابت والے، ترکہ تھوڑا ہو یا بہت (یہ اللہ عزوجل کی طرف سے) مقرر کردہ حصہ ہے''۔ اس آیت

میں بیان فرمایا گیا کہ میراث میں سے حصہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہے اور یہ میت کے ورثاء کا حق ہے لہٰذا اس میں غیر ورثاء شریک نہیں ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:
"وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا" (الفجر:۱۹) اور تم میراث کا مال مزے لے کر کھا جاتے ہو۔"
اس آیت میں رب تعالیٰ نے جاہلیت کی ایک قبیح رسم کا ذکر فرمایا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور ان کو ان کا حق میراث نہ دیا جاتا تھا تو یہ آیتِ وعید نازل کی گئی۔ صورت مسئولہ میں بھی تقریباً یہی صورت ہے کہ میراث ورثاء میں تقسیم ہونے کے بجائے غیر ورثاء رشتہ داروں اور خاندان کے دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے جو ایک طرح سے وراثت کے حقداروں کو ان کے حق سے دور کرنے کے مترادف ہے۔

لہٰذا یہ رسم جاہلانہ اور زمانۂ جاہلیت کی ایک یادگار ہے جس کو ہر حال میں ختم ہونا چاہیے تاکہ ہر حقدار کو اس کا حق دیدیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اعطوا کل ذی حق حقه" ہر حقدار کو اس کا حق دو۔ صورت مسئولہ میں مزید یہ بھی کہا گیا ہے کہ مذکورہ رسم اگر ادا نہ کی جائے تو خلاف ورزی کرنے والے کی عزت کو نشانہ بنایا جاتا ہے اس سے رشتہ داری ختم کر دی جاتی ہے، اس کے بارے میں سرور دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "فان دمائکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم" پس بے شک تمہارا خون، تمہارا مال تمہاری آبرو تمہارے لیے قابل احترام ہے۔ (مسلم شریف ج ۲ ص ۶۰)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کسی بھی شخص کا اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرنے کا شرعی طریقہ

سوال:

میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ میرا کنبہ سات بیٹوں اور چار بیٹیوں پر مشتمل ہے، جس میں سے ایک بیٹا ابھی غیر شادی شدہ ہے میرے دو

پلاٹ ہیں جن کی اندازاً مالیت چودہ لاکھ روپے ہوسکتی ہے۔اس رقم میں سے اپنے ایک بیٹے کی شادی کرنا چاہتا ہوں اور کچھ رقم میں اپنے کفن دفن کے لیے رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس سال اللہ تعالیٰ کی بہت مہربانی' عنایت اور کرم نوازی سے حج کا فریضہ ادا کر رہا ہوں اور میں جانے سے پہلے اپنی ملکیت کی تقسیم چاہتا ہوں۔ برائے کرم شریعت کی رو سے میں اپنے لیے کتنی رقم رکھ سکتا ہوں اور کتنی اپنی اولاد میں تقسیم کرسکتا ہوں۔اور یہ بھی بتایئے کہ میرے انتقال کے بعد اس ملکیت کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ [سائل: محمد احمد ولد حاجی عبدالرحمٰن' نیو کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندگی ہی میں اپنی اولاد کے درمیان مال تقسیم کرنا چاہے تو شرعاً اس کے لیے کوئی حصہ مقرر نہیں ہے بلکہ جتنا مال بھی تقسیم کرنا چاہے اس کو بیٹوں اور بیٹیوں میں برابر تقسیم کرے۔ بلاوجہ کم یا زیادہ کرنا مکروہ ہے۔ فقہ حنفی کی تمام مستند کتب میں اسی طرح ہے۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۹۹' فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۳۹۱' البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۸)

لہٰذا سوال مذکور میں سائل اپنی ملکیت کو اگر اپنی اولاد کے درمیان زندگی ہی میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو سب کے درمیان برابر تقسیم کرے اور چونکہ مال کا خود مالک ہے لہٰذا اس میں سے جتنا رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ سائل نے اپنے انتقال کے بعد کی تقسیم کا جو سوال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سائل کے انتقال کے بعد جتنی اولاد بیان کی گئی ہے اگر وہ سب زندہ ہوں اور سائل کے انتقال تک کنبہ ان ہی افراد پر مشتمل رہے تو سائل کے کل ترکہ کو (کفن دفن کے اخراجات اور قرض وغیرہ کی ادائیگی کے بعد) ۱۸ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا' جن میں سے ہر بیٹے کو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے گا۔ **واللہ ورسولہ اعلم بالصواب**

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کے دوران بیٹیوں کو محروم کرنے کی ممانعت

سوال:

ہمارے ایک عزیز عبدالکریم صاحب نے دو سال پہلے اپنا مکان اپنے دو بیٹوں

عبدالمنان اور عبدالقیوم کے نام کر دیا اور انہیں اس مکان میں علیحدہ علیحدہ معین حصہ پر قبضہ بھی دے دیا، اپنی حیات میں بیٹوں کے ساتھ رہے اور مکان میں بیٹیوں کو کوئی حصہ نہ دیا کیونکہ بیٹیوں کے سلوک پر نالاں تھے۔ لیکن حیات میں ایک دو بار ضرور کہا کہ مکان میں بیٹیوں کا حصہ نکال کر رقم بیٹے بیٹیوں کو دے دیں مگر عملاً اس پر شدید زور نہ دیا۔ اب انتقال کے تیسرے روز وصیت سامنے آئی جس کے مطابق باپ نے دونوں بیٹوں کو مالک تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ بیٹیوں کو مکان میں سے حصہ دیں۔ وصیت کی رائٹنگ ان ہی کی ہے مگر کوئی گواہ اور اس کے سائن موجود نہیں ہیں۔

آیا بیٹے حصہ دینے کے پابند ہیں یا نہیں؟ آگاہ فرمائیے۔

[سائل: سید عثمان الدین، کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ زندگی میں جب کوئی شخص اپنی جائیداد کو اولاد کے درمیان تقسیم کرے تو اس میں لڑکے اور لڑکیوں کو برابر دینا ضروری ہے۔ بلاوجہ لڑکیوں کو نہ دینا یا لڑکوں سے کم دینا ظلم ہے۔ مسمی عبدالکریم صاحب نے اپنی زندگی میں اپنا مکان صرف اپنے بیٹوں کے نام کر کے اور بیٹیوں کو حصہ نہ دے کر یقیناً خلاف شریعت کام کیا۔ اگرچہ ان کے مالک بنانے سے ان کے بیٹے مذکورہ مکان کے مالک ہو گئے اور لڑکیوں کا اس مکان میں کوئی حصہ نہیں ہے، لیکن سوچنا چاہیے کہ والد کا یہ گناہ قبر و حشر میں گرفت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس لیے بیٹوں کو چاہیے کہ والد سے گناہ کا بوجھ کم کرنے کے لیے یا ختم کرنے کے لیے ذاتی طور پر اپنی خوشی سے بہنوں کے ساتھ جس قدر ہو سکے ہمدردی کا مظاہرہ کریں اور اپنی جانب سے انہیں بھی جائیداد سے نفع پہنچائیں۔ (جس وصیت نامہ کا سوال میں تذکرہ ہے اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہے۔) قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اولاد کے نیک عمل اور حسن سلوک سے فوت ہونے والے والدین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ والدین کے درجات میں بلندی اور ان پر ہونے والے عذاب میں کمی کا ایک بہت بڑا سبب اولاد ہے۔ خصوصاً اولاد کا باہمی محبت سے رہنا اور بہنوں سے ہمدردی کا کرنا شریعت میں بہت ہی مطلوب ہے۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

جائیداد میں مطلقہ عورت کا حصہ اور مرحوم کے نام کمپنی کی طرف سے جاری ہونے والے واجبات کا شرعی حکم

سوال:

ایک شخص (مستقیم ولد شہاب الدین) ۴ مئی ۲۰۰۶ء کو لاولد فوت ہوگیا۔ مرحوم ۲۰۰۴ء میں اپنی بیوی (نگہت پروین) کو پہلے ایک طلاق اور پھر تقریباً ساڑھے تین ماہ بعد بقیہ دو طلاقیں دے کر نکاح سے فارغ کر چکا تھا۔ لیکن مسلک اہل حدیث سے فتویٰ لیکر بدستور ازدواجی زندگی قائم رکھی۔ مرحوم چونکہ سرکاری ملازم تھا اس لیے اس نے کمپنی کے نومینیشن فارم میں واجبات کی وصولیابی کے لیے ۱۹۹۹ء میں اپنی بیوی (نگہت پروین) کو نامزد کیا تھا۔

اس پس منظر میں دو چیزیں دریافت طلب اور حل طلب ہیں:

(۱) مذکورہ عورت کے علاوہ مرحوم کے ورثاء میں والدہ، ایک بھائی، ایک بہن اور ایک بھتیجی ہے۔ مرحوم کا ترکہ اور سرکاری واجبات میں ان ورثاء کا کیا حصہ ہوگا؟ اور آیا مرحوم کی بیوی اس میں حصہ دار ہوگی یا نہیں؟

(۲) سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے کمپنی نے مرحوم کے گھر والوں کو پنشن یا دیگر واجبات ادا کیے ہیں ان کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ خصوصاً اس صورت میں جب کہ مرحوم نے واجبات کی وصولیابی کے لیے اپنی بیوی کو نامزد کیا تھا۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا وہ واجبات ورثاء میں تقسیم ہوں گے یا مرحوم کی بیوی ان واجبات کی حق دار ہوگی؟ [سائل: حکیم زین افغانی، نیو کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل نے جو صورت حال بیان کی ہے اس کے مطابق مرحوم (مستقیم) کی بیوی (نگہت) کسی بھی حیثیت سے مرحوم کے مال میں حصہ دار نہیں ہے۔ کیونکہ ۲۰۰۴ء میں وہ مرحوم کے نکاح سے مکمل طور پر فارغ اور خارج ہو چکی تھی۔ اہل حدیث کے فتویٰ پر عمل

کرتے ہوئے مرحوم نے جو دن مذکورہ عورت کے ساتھ گزارے وہ خالصۃً حرام کاری میں گزارے۔ جس کے لیے عورت پر لازم ہے کہ وہ صدق دل سے اپنے اس جرم کی توبہ کرے اور مرحوم کے ورثاء پر لازم ہے کہ وہ مرحوم کے اس گناہ کی بخشش کے لیے خصوصی دعا اور ایصال ثواب کا اہتمام کریں۔

اب مرحوم کی کل جائیداد خواہ وہ کمپنی کی طرف سے ملنے والے واجبات ہوں یا کوئی ذاتی پراپرٹی اور بینک بیلنس، سب کا سب مرحوم کے صرف اور صرف تین ورثاء میں تقسیم ہوگا (ایک والدہ، ایک بھائی اور ایک بہن) اور اس کا طریقہ درج ذیل ہے:

المسئلۃ من ۶x۳=۱۸

میت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

والدہ	ایک بھائی	ایک بہن
۱	۵	
۳	۱۰	۵

یعنی مرحوم کی کل جائیداد (بشمول دیگر واجبات) کے ۱۸ حصے کیے جائیں گے جن میں سے مرحوم کی والدہ کو تین حصے، بھائی کو دس حصے اور بہن کو پانچ حصے دیے جائیں گے۔ مرحوم کی بھتیجی اور سابقہ مطلقہ بیوی کا شرعاً کوئی حصہ نہیں ہے۔ جہاں تک پنشن کا معاملہ ہے تو وہ جائیداد میں شامل نہیں ہے، بلکہ حکومت کی طرف سے کسی بھی نامزد کردہ فرد کے لیے عطیہ و ہبہ ہے۔ لہٰذا یہ رقم حکومت جن افراد کے نام پر جاری کرے، وہ اس کے مالک ہوں گے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اگر کسی شخص کے ورثاء میں ایک وارث اہل حدیث ہو تو……

سوال:

زید کنوارہ تھا اس کا انتقال ہو گیا۔ پسماندگان میں ایک بھائی اہلحدیث اور تین بھائیوں کا تعلق مسلک سنی بریلوی سے ہے۔ ارشاد فرمائیں کہ زید کی وراثت میں اہلحدیث وہابی بھائی

کا کچھ حصہ شرعاً لگتا ہے یا نہیں؟ مفصل جواب ارشاد فرمائیں۔ مرحوم کا تعلق اہل سنت سنی بریلوی سے تھا۔ والدین کا پہلے ہی سے انتقال ہو چکا ہے۔

[سائل: محمد یوسف صابر سعیدی نیو کراچی]

جواب:

علم فقہ اور علم میراث کی تمام کتب میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ میت اور وارث کے درمیان اگر دین کا اختلاف ہو تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ سراجی اور شریفیہ میں ہے کہ: ''**والثالث اختلاف الدينين فلا يرث الكافر من المسلم اجماعا لقوله عليه السلام لا يتوارث اهل ملتين شتى**'' (اخرجہ ابوداؤد والدارمی) میراث نہ پانے کا تیسرا سبب وارث اور میت کے مذہب کا الگ ہونا ہے۔ لہٰذا کافر شخص بالاتفاق مسلمان کا وارث نہیں ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ دو مختلف مذہب رکھنے والے آپس میں وارث نہیں ہو سکتے۔ (سراجی مع شرح شریفیہ ص ۱۷) لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کا جو بھائی بد مذہب ہے اس کی بدعقیدگی اگر مسلمہ علماء کے فتویٰ کے مطابق حد کفر تک پہنچ چکی ہے تو وہ قطعاً وارث نہیں ہوگا' کہ دین اور مذہب کا اختلاف موجود ہے اور اگر اس کی بدعقیدگی حد کفر کو پہنچی ہوئی نہ ہو تو وہ میت کا وارث ہوگا۔ **واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب**

کسی شخص کی جائیداد میں ساس اور نندوں کا حصہ ہوتا ہے یا نہیں؟

سوال:

میں ضامن علی مرحوم کی بیوہ ہوں۔ میری جائیداد کے مالک میرے سسر تھے۔ سسر نے یہ پلاٹ میرے شوہر کے نام کرادیا تھا۔ اور میرے شوہر نے اپنی وفات سے پہلے میرے نام کرادیا تھا۔ میں نے یہ پلاٹ گیارہ لاکھ پچاس ہزار میں بیچ دیا ہے اس مکان پر چھ لاکھ کا قرض ہے۔ قرض کی رقم نکال کر پانچ لاکھ پچاس ہزار روپے بچتے ہیں۔ میری ساس صاحبہ یہ کہتی ہیں کہ اس رقم سے میری لڑکیوں کا بھی حصہ دیا جائے جب کہ میری تمام نندیں شادی شدہ ہیں اور باحیثیت ہیں۔ میں شرعی طور پر ترکہ کی رقم وارثوں میں کس طرح تقسیم کروں۔

میرے عزیز واقارب یہ ہیں: میں، میری ساس، میری ۴ نندیں، میرے ۴ بیٹے اور میری ۵ بیٹیاں۔ شرعی طور پر اس رقم سے حصے نکال کر میری رہنمائی فرمائیں۔ میں آپ کے لیے دعا گو رہوں گی۔ [سائلہ: بیوہ ضامن علی مرحوم، شاہ فیصل کالونی]

جواب:

صورت مسئولہ میں مذکورہ پلاٹ اگر واقعۃً شوہر نے اپنی زندگی میں سائلہ کے نام کر دیا تھا تو سائلہ تنہا اس مکان کی مالکہ ہے اور جب تک سائلہ زندہ ہے اس مکان میں کسی کا بھی حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ وراثت کے مطابق حصوں کی تقسیم کا عمل آدمی کے مرنے کے بعد جاری ہوتا ہے۔ زندگی میں ہر شخص کو اپنی ملکیت میں جائز تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ صورت مسئولہ میں پہلی بات یہ ہے کہ سائلہ پر مذکورہ پلاٹ کی رقم کو تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی فی الوقت اس رقم میں کسی کا حصہ ہے۔ اگر سائلہ اپنی اولاد کے درمیان پلاٹ کی رقم کو تقسیم کرنا چاہے تو برابر تقسیم کرے گی، کمی بیشی ممنوع ہے۔ جہاں تک سائلہ کی ساس اور نندوں کا حصہ ہے تو وہ نہ تو سائلہ کی زندگی میں حقدار ہیں نہ مرنے کے بعد ان کا کوئی حصہ ہے۔ سائلہ کے مرنے کے بعد بھی پلاٹ کی رقم صرف سائلہ کی اولاد کے درمیان (شرعی طریقہ کے مطابق) تقسیم ہوگی۔ سائلہ جب تک زندہ ہے اگر وہ زندگی میں مذکورہ رقم میں سے اپنی ساس اور نندوں کو کچھ دینا چاہے تو اس کی مرضی پر ہے، چاہے تو دے اور چاہے تو نہ دے۔ اسی طرح اولاد کو بھی اگر دینا چاہے تو دے اور نہ دینا چاہے تو نہ دے۔ بہر حال سائلہ کے انتقال کے بعد وہ رقم شرعی قانون کے مطابق اس کی اولاد کے درمیان تقسیم ہوگی ساس اور نندوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بیوی کے انتقال کے بعد اس کے زیورات اور سامان جہیز کا حکم

سوال:

میری ڈیڑھ سال پہلے شادی ہوئی اور اس کے بعد میری اہلیہ بیمار ہوئی جس کا علاج

میں نے اپنے پیسوں سے کرایا اور میری بیوی کے گھر والوں نے اس سلسلے میں کوئی تعاون نہیں کیا بلکہ بیماری کے زمانے میں وہ چیزیں جو کہ جہیز میں میری بیوی لائی تھی وہ انہوں نے لیجانا شروع کر دیں اور اب اس کے بعد وہ سارا جہیز مانگ رہے ہیں۔ از روئے شرع میری بیوی کے انتقال کے بعد ان زیورات اور دیگر سامان جو کہ جہیز میں آیا تھا' اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ [سائل: عُبدالغفار نارتھ کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی کو جو چیزیں جہیز میں (زیورات اور دیگر سامان) دیا جاتا ہے' وہ سب لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے کسی اور کا شرعاً اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ شرعی حکم یہ ہے کہ اگر بیوی کو شوہر طلاق دیدے اور دونوں میں علیحدگی ہو جائے تو بیوی ہی اس تمام ساز و سامان کی حقدار ہے جو اسے جہیز میں دیا گیا تھا۔ اسی طرح جب بیوی کا انتقال ہو جائے تو شوہر یا کوئی اور اس مال کا تنہا مالک یا حقدار نہیں بلکہ وہ سب کچھ جو عورت کی ذاتی ملکیت تھا' اس کے مرنے کے بعد وہ شرعی قانون کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت امامِ اہلسنت مولانا شاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان لکھتے ہیں: ''وہ مال تمام و کمال خاص ملکِ عورت ہے۔ دوسرے کا اس میں کچھ حق نہیں۔ ''فی ردِالمحتار: **كل احد يعلم ان الجهاز ملك المرأة وانه اذا طلقها تأخذه كله واذا ماتت يورث عنها ولا يختص بشيئى منه**''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۴۴۹' قدیم)

اسی طرح علامہ شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''**قال الشيخ الامام الاجل الشهيد: المختار للفتوىٰ ان يحكم بكون الجهاز ملكا**''۔ (فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۲۳۰) فتویٰ اس قول پر دیا جائے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہے۔

اسی طرح تنویر الابصار میں ہے: ''**جهز ابنته بجهاز وسلمها بذالك ليس له الاسترداد منها وبه يفتى**''۔ (تنویر الابصار ج ۴ ص ۲۲۸) باپ اپنی بیٹی کو جب جہیز دے چکے تو باپ کو اپنے لیے واپس لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یعنی یہ سب کچھ بیٹی کی ملکیت ہے۔ اسی پر فتویٰ ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں بیوی کے گھر والے بیماری کے زمانہ میں جہیز میں سے جو

چیزیں گھر لے گئے تھے اور جو ابھی تک شوہر کے یہاں باقی ہیں وہ سب چونکہ بیوی کی ملکیت تھا، شرعی قانون کے مطابق وہ سب بیوی کے ورثاء میں درج ذیل طریقے پر تقسیم ہو‌ں

المسئلة من ستة ۶

میت---------------بیوی

شوہر	ماں	باپ
۳	۱	۲

یعنی مرنے والی خاتون کے جہیز اور دیگر ترکہ کے کل چھ حصے ہوں گے جن میں سے شوہر کو تین، ماں کو ایک اور باپ کو دو حصے ملیں گے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا''
پر ایک اشکال کا جواب

سوال:

''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا'' یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اتنی آزمائش میں نہیں ڈالتا مگر جتنا وہ برداشت کر سکے' بعض اوقات دیکھا گیا کہ کسی کو کوئی غم' صدمہ' پریشانی لاحق ہوئی اور وہ اسے برداشت نہ کر سکا اور ہارٹ فیل ہونے کے سبب انتقال کر گیا' اس اعتبار سے آیت کا مفہوم کیا ہوگا؟ مدلل جواب سے ممنون و مشکور فرمائیں۔ [سائل: محمد شاہنواز' ملیر' کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ آیتِ مبارکہ ''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا'' معنوی اعتبار سے عموم پر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے دینی معاملات اور شرعی احکام مراد ہیں' یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ ہر شخص کو احکام کا اتنا ہی مکلف فرماتا ہے جس قدر وہ استطاعت رکھتا ہے۔ جیسا کہ آیتِ مبارکہ کا اگلا حصہ اس پر واضح دلیل ہے کہ ''لھا ما کسبت وعلیھا ما کتسبت'' ہر نفس کے لیے اس کا اجر و ثواب ہے جو وہ نیک اعمال کرے اور اس کا عذاب ہے جو وہ بداعمالی کرے۔ ''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا'' کے بیان کردہ مفہوم کی تائید قرآن حکیم کی دیگر آیات سے بھی ہوتی ہے جیسے فرمایا: ''يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ''۔ (البقرہ: ۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے نہ کہ تنگی کا۔ اسی طرح فرمایا: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ'' (الحج: ۷۸) اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر تمہارے لیے کوئی مشقت نہیں رکھی۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ ''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا'' میں عدم تکلیف سے مراد امور دینیہ اور اعمال و افعال ہیں' چنانچہ ممتاز مفسرِ قرآن علامہ ابو حیان اندلسی ''لا یکلف

اللّٰہ'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لایکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا خبر من اللّٰہ تعالٰی اخبر بہ انہ لا یکلف العباد من افعال القلوب والجوارح الا ماھو فی وسع المکلف و مقتضی ادراکہ و نیتہ''. (البحر المحیط ج۲ص۷۶۰)

یعنی آیت مبارکہ ''لایکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا'' ایک خبر ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ وہ بندوں کو ظاہری اور باطنی افعال کا اسی قدر مکلف فرماتا ہے جتنا بندے کی استطاعت اور اس کے ادراک ونیت کا تقاضا ہوتا ہے۔

اسی طرح آیت مذکورہ کی تفسیر میں امام بغوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''روی ابن عباس رضی اللّٰہ تعالٰی عنھما انہ قال ھم المؤمنون خاصۃ وسع علیھم امر دینھم ولم یکلفھم فیہ الا مایستطیعون کما قال اللّٰہ تعالٰی یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر وقال اللّٰہ تعالٰی و ما جعل علیکم فی الدین من حرج''. (معالم التنزیل ج۱ص۴۰۲، تفسیر خازن ج۱ص۲۲۶)

یعنی حضرت سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خاص مؤمنین مراد ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دینی معاملات کشادہ فرمادیے اور انہیں اتنا ہی دینی امور میں مکلف فرمایا جتنی وہ استطاعت رکھتے تھے جیسا کہ البقرۃ: ۱۸۵ اور الحج: ۷۸ میں اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

آیت مبارکہ ''وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ'' پر ایک اعتراض اور اس کا مفصّل جواب

سوال:

قرآن شریف میں آیا ہے کہ ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ جب کہ مخنث (ہیجڑا) کا جوڑا نہیں ہوتا؟ وضاحت فرمادیں نہایت ممنون ہوں گا۔

[سائل: سید ذوالفقار علی (ایف بی ایریا)]

جواب:

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ’’وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ O‘‘
اور ہم نے ہر چیز سے جوڑے جوڑے بنائے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (الذاریات: ۴۹)

اس آیت کو پڑھ کر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ جب ہر چیز کا جوڑا بنایا گیا ہے تو مخنث کا جوڑا کیوں نہیں بنایا گیا؟ اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) عربی میں جب کوئی چیز ’’کلّ شیء‘‘ کے لفظ سے بیان کی جائے تو ضروری نہیں ہے کہ اُس سے ہر ہر فرد مراد ہو بلکہ کئی مرتبہ یہ اکثری تعداد بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ھُد ھُد (پرندہ) نے ملکۂ بلقیس کے متعلق کہا: ’’وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ‘‘ اُسے ہر چیز حاصل ہے۔ (النمل: ۲۳)

اس میں ملکۂ بلقیس کے لیے ’’کلّ شیء‘‘ کا لفظ آیا ہے، حالانکہ اُسے دنیا کی تمام چیزیں حاصل نہ تھیں، بلکہ دنیا کا کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کو تمام چیزیں حاصل ہوں۔ ھُد ھُد کی مراد یہ تھی کہ بلقیس کو چیزوں کی ایک بہت بڑی تعداد حاصل ہے۔ اسی طرح جس آیت میں یہ فرمایا کہ ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے، اُس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اکثر چیزیں ایسی بنائی ہیں جو جوڑے والی ہیں۔ کیونکہ بعض چیزوں کو اللہ عزوجل نے بے جوڑ رکھا ہے۔ جیسے عرش، کرسی اور فرشتے وغیرہ۔ لہٰذا تمام چیزوں کا جوڑے والا ہونا لازمی نہیں ہے۔ ورنہ معترض نے آج مخنث کی بناء پر اعتراض کیا ہے، کل فرشتوں کی بناء پر اعتراض کرے گا! اس لیے صحیح فکر یہ ہے کہ ’’ہر چیز‘‘ سے اکثر چیزیں مراد ہیں۔ تا کہ اللہ کی قدرت کی یہ دونوں جہتیں مخلوق پر آشکارا ہو جائیں کہ وہ جوڑے والی چیزیں پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور بے جوڑے والی چیز پر بھی قادر ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ آیت میں صرف اتنا فرمایا ہے کہ ’’ہم نے ہر چیز کا جوڑا تخلیق فرمایا‘‘۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ جوڑا تم پر ظاہر بھی فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کا جوڑا (تخلیق کے اعتبار سے) موجود ہو اور ہم پر اُس کا حال ظاہر نہ ہو۔ چنانچہ مخنث (ہیجڑا) اگرچہ عوام کے نزدیک مذکر و مؤنث دونوں اقسام سے خارج ہو، لیکن اللہ عزوجل کے نزدیک اُس کا مذکر یا مؤنث ہونا متعین ہے۔ کیونکہ وہی اس کو تخلیق فرمانے والا ہے۔

علامہ جلال الدین محلی علیہ الرحمۃ' سورۃ اللّیل کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

(وما خلق الذكر والانثى) ادم وحواء وكلّ ذكر وكلّ انثى والخنثى المشكل عندنا' ذكر او انثى عند الله تعالٰى فيحنث بتكليمه من حلف لا يكلّم ذكرا ولا انثى. (ترجمہ) اللہ عزوجل کا ارشاد کہ اُس نے جو بھی مذکر اور مؤنث پیدا فرمایا' اُس کی قسم! اس میں مذکر و مؤنث سے یا تو حضرت آدم وحوا علیہما السلام مراد ہیں' یا ہر مذکر اور ہر مؤنث مراد ہے۔ جہاں تک خُنثیٰ (ہیجڑے) کا معاملہ ہے تو وہ ہمارے نزدیک پیچیدہ ہے' ورنہ اللہ عزوجل کے نزدیک وہ مذکر یا مؤنث میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ وہ کسی بھی مذکر یا مؤنث سے گفتگو نہیں کرے گا' پھر وہ کسی ہیجڑے سے گفتگو کرلے تو اُس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ (جلالین مع حاشیہ الجمل ج ۴ ص ۵۴۵' مطبوعہ کراچی)

قسم ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے علمِ الٰہی میں یہ قوم (مُخنّثین) مذکر اور مؤنث میں سے کسی ایک میں شامل ہے۔ لہٰذا ان سے کلام کرنے کی صورت میں قسم ٹوٹ جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعتِ مطہرہ میں یہ کسی ایک جنس میں شامل ہیں۔

(۳) آیت میں جو فرمایا کہ ''ہم نے ہر چیز کا جوڑا تخلیق فرمایا'' اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مثل یا مدِ مقابل پیدا فرمایا ہے۔ جیسے ''رات'' کے مقابل ''دن'' اور ''سفیدی'' کے مقابل ''سیاہی'' اور ''آسمان'' کے مقابل ''زمین'' پیدا فرمائی۔ اسی طرح جان دار چیزوں کے مقابلہ میں بے جان چیزیں پیدا فرمائیں۔ جان دار چیزوں میں تمام انسان داخل ہیں' خواہ مرد ہوں یا عورتیں یا ہیجڑے۔ اور جتنی چیزیں بے جان ہیں وہ سب کی سب انسانوں کے مقابل ہیں۔ یوں ہیجڑوں کو اگر مطلقاً انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کا جوڑ (اور مقابل) بے جان چیزیں ہیں۔ لہٰذا ہیجڑوں کو بے جوڑ سمجھنا درست نہیں ہے۔

مُفسرِ شہیر حضرت ابوالفضل سید محمود آلوسی حنفی بغدادی علیہ الرحمہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت مجاہد کا قول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **''قال مجاهد هذا اشارة الى المتضادات والمتقابلات كالليل والنهار والشقوة والسعادة والهدٰى والضّلال والسماء والارض والسواد والبياض والصّحة والمرض الى غير**

ذالك ورجحه الطبری بانه ادلّ علی القدرة''(ترجمہ) حضرت مجاہد نے فرمایا: جوڑے سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی ضد اور مدمقابل پیدا کیا گیا ہے' جیسے دن اور رات' بدبختی اور خوش بختی' ہدایت اور گمراہی' زمین وآسمان' سیاہی اور سفیدی' صحت اور بیماری وغیرہ وغیرہ۔ امام ابن جریر طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے' کیونکہ اس میں اللہ کی قدرت کی زیادہ تائید ہے۔ (روح المعانی جز ۲۷ ص ۲۷ 'مطبوعہ بیروت)

ہماری اس گفتگو سے جو باتیں سامنے آئیں' اُن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) آیتِ مبارکہ کا یہ ارشاد کہ ''ہم نے ہر چیز کا جوڑا تخلیق فرمایا'' اس سے ہر چیز مراد نہیں ہے' بلکہ اکثر چیزیں مراد ہیں۔ لہٰذا اگر ہیجڑوں کا جوڑا نہ بھی ہو تو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کر کے اپنی قدرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ بتایا کہ وہ جوڑے والے اور بے جوڑے والے ہر طرح کے لوگ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

(۲) جس آیت میں ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کرنے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے' اُس میں یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا ہونا لوگوں پر واضح اور ظاہر فرما دیا ہے۔ لہٰذا یہ بہت ممکن ہے کہ ایک چیز لوگوں کی نظر میں بے جوڑ ہو اور علمِ الٰہی میں اُس کا جوڑا موجود ہو۔ اس لیے اگر کوئی چیز بہ ظاہر پیچیدہ اور بے جوڑ نظر آتی ہے تو یہ بندہ کی نگاہ اور سمجھ کا قصور تو ہو سکتا ہے' لیکن تخلیقِ الٰہی کا اس میں کوئی قصور اور نقص نہیں ہے۔ معترض کا اعتراض تب درست ہوتا جب آیت میں یہ فرمایا گیا ہوتا کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا لوگوں پر ظاہر فرما دیا۔ جب کہ آیت میں ایسا نہیں فرمایا گیا۔

(۳) آیت میں جوڑے کا جو لفظ فرمایا گیا ہے' وہ ''مدمقابل'' کے معنی میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مدمقابل پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہیجڑا چونکہ انسان ہونے کی وجہ سے جان دار چیزوں میں شمار ہوتا ہے' اس لیے اس کا مدمقابل بے جان چیزیں ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

حجرۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضرت عمر کے مدفون ہونے کے بعد سیدہ عائشہ کا وہاں جانے سے گریز کرنا

سوال:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قبر پر تشریف لے جاتی تھیں لیکن حضرت عمر کے وصال کے بعد آپ نہیں جاتی تھیں۔ آخر کیوں؟ [سائل: قاری الطاف حسین سعیدی، کراچی]

جواب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے حجرے میں دفن ہوئے میں بغیر چادر اوڑھے بے حجابانہ حاضر ہوتی اور کہتی: ''انما ھو زوجی'' (یہ میرے شوہر ہی تو ہیں) پھر میرے باپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دفن ہوئے جب بھی میں بغیر احتیاط کے چلی جاتی اور کہتی: ''انما ھما زوجی وابی'' (یہ میرے شوہر اور باپ ہی تو ہیں) پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوئے تو میں نہایت احتیاط کے ساتھ چادر سے لپٹی ہوئی حاضر ہوتی اس طرح کہ کوئی عضو کھلا نہ رہے۔ ''حیاء من عمر رضی اللہ عنہ'' (حضرت عمر سے شرم کی وجہ سے)۔ (مسند احمد ج ۶ ص ۲۰۲، المستدرک ج ۳ ص ۶۱، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۶۔ ج ۹ ص ۳۷، الملفوظ ج ۳ ص ۷۴، شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۴۷۶)

مندرجہ بالا روایت کے آخری الفاظ یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونا بوجہ عمر رضی اللہ عنہ ترک نہ فرمایا تھا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے کافی احتیاط کے ساتھ باپردہ حاضر ہوتی تھیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وصالِ عمر کے بعد وہاں جانا ترک کر دیا تھا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

شرط کے متعلق ایک حدیث کی سند پر اعتراض کا جواب

سوال:

(۱) حدیث صحیح کے لیے چند لازمی شرائط میں سے یہ بھی ہیں کہ (۱) راوی ثقہ ہو (۲) کامل الضبط ہو (۳) متقن ہو (۴) سند میں اتصال ہو۔ جب کہ صحیح مسلم کی روایت ہے:
''کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل'' ایک صاحب جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث شریف، راوی کی ذکر کردہ شرائط پر پوری نہیں ہے بلکہ راوی کی شرائط اور اس حدیث میں ٹکراؤ ہے۔
کیا ان کی یہ بات درست ہے۔؟ ان کی اس بات کو مان لینے سے احادیث صحیحہ سے اعتماد تو مجروح نہیں ہوتا؟ ایسے شخص سے ملنے جلنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

(۲) وہ عالم صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ سندِ حدیث کا تعلق امورِ دین سے ہے؟ کیا یہ بات درست ہے یا خلافِ شرع ہے؟ اپنا جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

[سائل: محمد فیصل F.C ایریا کراچی]

جواب:

سوالِ مذکور میں مسلم شریف کے حوالہ سے جو حدیث پاک تحریر کی گئی ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں: ''من اشترط شرطا لیس فی کتاب اللہ فلیس لہ وان شرط مائۃ مرۃ'' یعنی جس نے کوئی ایسی شرط لگائی جو کتاب اللہ میں نہ ہو یا اس کے مخالف ہو، اس کا اعتبار نہیں، اگرچہ وہ سو مرتبہ شرط لگائے۔ تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی صحیح میں اس روایت کو نقل فرمایا۔ (دیکھئے: صحیح بخاری: ۲۵۶۱، صحیح مسلم: ۱۵۰۴)

سوال میں جن الفاظ کے ساتھ حدیث شریف تحریر کی گئی ہے وہ سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور کنز العمال وغیرہ میں موجود ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھئے: سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲۹، ابن ماجہ ص ۱۱، مسند احمد بن حنبل ج ۸ ص ۱۴، ۴، رقم: ۲۶۳۰۵'' کنز العمال ج ۱۰ ص ۳۲۲، رقم: ۹۶۱۶۔

حدیث مذکور کے متعلق جن صاحب نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث اور راوی کی شرائط میں

ٹکراؤ ہے ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس دعوے کی وضاحت کریں اور ثابت کریں کہ یہ حدیث صحت کی شرائط پر پوری نہیں ہے۔ اس کے بعد ہی جواب کی مزید وضاحت ہوگی۔

(۲) سند حدیث کا تعلق بلاشبہ امور دین سے ہے کہ اس کا لحاظ ضروری ہے حضرت سیدنا عبداللہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''الاسناد من الدین ولو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء'' (صحیح مسلم ج ا ص ۱۲) اسناد کا تعلق امور دین سے ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی مرضی سے جو چاہتا کہہ دیتا۔ واللہ ورسوله اعلم بالصواب

سیاہ عمامہ باندھنے کی فضیلت

سوال:

سیاہ عمامہ باندھنے کی کیا فضیلت ہے۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟ [سائل: سید بابر علی، کراچی]

جواب:

سیاہ عمامہ باندھنے کی فضیلت یہ ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ اور کئی صحابہ کرام کی سنت ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے اس وقت آپ ﷺ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔

(صحیح مسلم ج ا ص ۴۳۹، شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۳۶۴)

اسی طرح حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میری نظروں کے سامنے اب بھی یہ منظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ سیاہ عمامہ باندھے منبر پر تشریف فرما ہیں۔ (الی اخرہ) (سنن نسائی ج ۲ ص ۲۶۰، شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۳۶۵)

امام ابوبکر ابن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) نے اپنی معروف کتاب ''المصنف'' میں سیاہ عمامہ کے عنوان سے مستقل باب باندھا ہے اس میں مختلف صحابہ کے حوالہ سے سیاہ عمامہ کے استعمال پر ۲۲ روایات ذکر کی ہیں۔ جن میں سے چار روایات میں نبی اکرم ﷺ کے سیاہ عمامہ استعمال فرمانے کا ذکر ہے ایک روایت میں حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے حوالہ سے ہے کہ انہوں نے فرعون کے غرق ہونے کے دن سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ بقیہ سترہ روایات

میں متفرق طور پر مختلف صحابہ کرام کے سیاہ عمامہ استعمال کرنے کا ذکر ہے۔ جن میں حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسماء گرامی سرِ فہرست ہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۱۷۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

لہٰذا سیاہ عمامہ باندھنا شرعاً نہ صرف جائز و مستحسن ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ اور جلیل القدر صحابہ کرام کی سنت ہے۔ اگر کچھ لوگ اس رنگ کے عمامہ کو اپنا مذہبی شعار بنالیں تو اس کا شرع سے تعلق نہیں۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

عمامے کا شملہ سینے پر لٹکانے کا حکم

سوال:

زید صاحب ایک مسجد میں امامت کرواتے ہیں اور جب نماز پڑھانے کا قصد کرتے ہیں تو قصداً اپنے عمامے کے ایک شملے کو اپنے سیدھے کندھے کی طرف آگے کو لے آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ عمل سنتِ رسول ﷺ میں سے ہے۔ دلائل کی روشنی میں اصلاح فرمائیں؟ [سائل: محمد زاھد، شاہ فیصل کالونی]

جواب:

عمامہ کے شملہ کو پیچھے لٹکانا اور سینے پر لے آنا دونوں طریقے حدیث شریف سے ثابت ہیں۔ سنن ابو داؤد کی حدیث ہے: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے سر پر عمامہ باندھا تو اسے میرے آگے اور میرے پیچھے کی طرف لٹکا دیا۔ (سنن ابو داؤد ج ۲ ص ۲۰۹، رقم: ۴۰۷۹، مشکوٰۃ شریف ۴۳۳۹)

علامہ علی قاری حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حدیث مذکور کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قال ابن الملك: ای أرسل لعمامتی طرفین احدهما علی صدری والاخر من خلفی و روی ابن ابی شیبة عن علی کرم الله تعالٰی وجهه انه ﷺ عممه بعمامة واسدل طرفیها علی منکبیه وفی شرح السنة قال محمد

بن قیس: رأیت ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنھما معتما قد ارسلھا بین یدیہ ومن خلفہ''. (مرقات شرح مشکوٰۃ ج۸ ص۱۴۶)

یعنی ابن الملک نے حدیث مذکور کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمامہ کے دو شملے چھوڑے۔ ایک شملہ کو سینہ پر اور دوسرے کو پیچھے کی جانب لٹکایا۔ امام ابن ابی شیبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور ان کے کاندھوں پر دو شملے چھوڑے۔ شرح السنۃ میں ہے کہ محمد بن قیس نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو عمامہ باندھے ہوئے دیکھا' انہوں نے ایک شملہ آگے اور ایک شملہ پیچھے کی طرف لٹکایا ہوا تھا۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ عمامے کے شملہ کو سینے پر لٹکانا نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے اور سنت ہے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

عمامہ میں اعتجار کا شرعی حکم

سوال:

اعتجار کس صورت میں ہوتا ہے؟ ٹوپی پہنے ہوئے یا بغیر ٹوپی کی صورت میں؟

[سائل: محمد افضل قادری' کورنگی]

جواب:

اعتجار کے مسئلہ پر بطور تمہید اولاً یہ بات جاننی چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت میں مختلف رسومات کی طرح سر پر عمامہ کہ طرح کپڑا لپیٹنا بھی رسم و رواج کا ایک حصہ تھا۔ اور وہ لوگ بغیر ٹوپی کے سر پر عمامہ باندھا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ان سے ممتاز کرنے کے لیے ٹوپی پر عمامہ باندھنے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ''فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس'' یعنی ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق' وہ عمامہ ہیں جو ٹوپیوں پر باندھے جائیں۔ (سنن ترمذی: ۱۷۸۴)

اس تمہید کی روشنی میں ہم یہ کہتے ہیں کہ عمامہ ٹوپی پر باندھنا چاہیے۔ بغیر ٹوپی کے محض

سر پر عمامہ اس طرح باندھنا کہ درمیانی حصہ کھلا رہے' شرعاً یہ اعتجار ہے۔ محقق علی الاطلاق علامہ ابن ہمام علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "یکرہ الاعتجار وھو ان یلفّ العمامۃ حول راسہ ویدع وسطھا" "اعتجار مکروہ (تحریمی) ہے اور اعتجار یہ ہے کہ عمامہ سر کے آس پاس لپیٹے اور درمیانی حصہ خالی چھوڑ دے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۴۱۲) شارح کنز علامہ ابن نجیم مصری اور علامہ ابن عابدین شامی علیہما الرحمۃ نے بھی یہی لکھا ہے۔

(دیکھیے: البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴' ردالمحتار ج ۲ ص ۳۶۶)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں کہ: "اعتجار یعنی پگڑی اس طرح باندھنا کہ بیچ سر پہ نہ ہو' مکروہ تحریمی ہے"۔ (بہار شریعت حصہ سوم ص ۹۲)

فتاوی امجدیہ میں حضرت صدر الشریعہ سے سوال کیا گیا کہ نماز میں اعتجار ٹوپی کی عدم موجودگی میں مکروہ تحریمی ہے یا مطلق اعتجار مکروہ تحریمی ہے؟ تو آپ نے جواباً فرمایا کہ "لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹوپی پہنے رہنے کی حالت میں اعتجار ہوتا ہے' مگر تحقیق یہ ہے کہ اعتجار اس صورت میں ہے کہ عمامہ کے نیچے کوئی چیز سر کو چھپانے والی نہ ہو"۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۱ ص ۱۹۹)

صدر الشریعہ کی اس تحقیق کی روشنی میں ان لوگوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے جو عمامہ کی ٹوپی کھلی رہنے پر اعتجار کا حکم لگاتے ہیں اور اسے مکروہِ تحریمی یا فسق قرار دیتے ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اسٹون واش' راسلک اور ان جیسے دیگر ملبوسات پہننے کا حکم

سوال:

ریشمی کپڑا پہننا مرد کے لیے حرام ہے؟ آج کل ریشم نما جو مختلف کپڑے نکلے ہیں مثلاً اسٹون واش' راسلک۔ ان کے پہننے کا کیا حکم ہے۔ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

[سائل: عبدالرحمٰن' لیاقت آباد]

جواب:

آج کل مارکیٹ میں بہت سارے کپڑے ایسے آچکے ہیں جو بہ ظاہر ریشم معلوم ہوتے

ہیں' مثلاً اسٹون واش اور را سلک وغیرہ' ان کے بارے میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں اصلی ریشم نہیں ہوتا ہے بلکہ عموماً ان میں پولیسٹر یا نقلی ریشم ہوتا ہے یا ریڈیم کی ملاوٹ کر کے شائننگ اور چمک پیدا کی جاتی ہے' جس سے کپڑا ریشمی معلوم ہوتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہے کہ ان کپڑوں میں اصلی ریشم نہیں ہوتا ہے تو ان کا استعمال جائز ہے' کیونکہ شرعاً ریشم وہی ہے جو اصلی ہو۔ یعنی کسی کیڑے کے لعاب سے بنایا گیا ہو' حکم شرعی اسی پر لاگو ہوگا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۲۰۷)

اور اگر بالفرض ان کپڑوں میں ریشم ہو تب بھی ان کے استعمال کی ایک جائز صورت موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر ان کپڑوں کا تانا ریشم ہو اور بانا سوت ہو تو ریشمی ہونے کے باوجود ان کا استعمال جائز ہوگا۔

لیکن بہر حال ایسا کپڑا جس کے پہننے سے لوگ بدگمانی میں مبتلا ہوں اس کے لیے استعمال سے بچنا ہی بہتر ہے' خصوصاً وہ حضرات جو عوام الناس کے درمیان کسی دینی منصب پر فائز ہیں' انہیں زیادہ احتیاط چاہیے۔ حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ والرضوان لکھتے ہیں:

ریشم کے کپڑے مرد کے لیے حرام ہیں' بدن اور کپڑوں کے درمیان کوئی دوسرا کپڑا حائل ہو یا نہ ہو' دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ اگر تانا ریشم ہو اور بانا سوت ہو تو ہر شخص کے لیے ہر موقع پر جائز ہے' لیکن اس صورت میں اگر کپڑے کی بناوٹ ایسی ہے کہ ریشم ہی ریشم دکھائی دیتا ہے تو اس کا پہننا مکروہ ہے۔ بعض قسم کی مخمل ایسی ہوتی ہے کہ اس کے روئیں ریشم کے ہوتے ہیں اس کے پہننے کا بھی یہی حکم ہے۔ سن اور رام بانس کے کپڑے جو بہ ظاہر بالکل ریشم معلوم ہوتے ہیں ان کا پہننا اگرچہ ریشم کا پہننا نہیں ہے مگر اس سے بچنا چاہیے۔ خصوصاً علماء کو' کہ لوگوں کو بدظنی کا موقع ملے گا یا دوسروں کو ریشم پہننے کا ذریعہ بنے گا۔

(بہار شریعت حصہ ۱۶ ص ۴۳ ملخصاً)

فتاویٰ امجدیہ میں حضرت صدر الشریعہ سے ایک قسم کا کپڑا (چینا سلک) کے متعلق سوال کیا گیا کہ آیا اس کا پہننا جائز ہے یا نہیں؟ تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

ریشم کیڑے سے پیدا ہوتا ہے۔ آج کل درختوں کی چھال کو باریک کر کے بھی ریشم

بناتے ہیں مگر یہ حقیقۃً نہ ریشم ہے نہ اس کا پہننا حرام۔ اگر یہ چینا سلک نقلی ریشم ہو تو جائز ہوگا۔ جو لوگ اس کے ماہر ہیں وہ شناخت کر سکیں گے کہ یہ اصلی ریشم ہے۔ بہ ہر حال اگر اس کا نقلی ہونا ثابت ہو جائے تو حرام نہ ہوگا' پھر بھی احتیاط چاہیے کہ اگر چہ حرام نہ ہو مگر لوگوں کو بدگمانی کا موقع ہے اور ایسے امور سے پرہیز چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے: ''اتقوا مواضع التھم'' تہمت کی جگہوں سے پرہیز کرو۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۴ ص ۶۴)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

انبیاء واولیاء اور دیگر شعائر اسلام کے متعلق ایک شخص کی ہرزہ سرائی اور اس کا جواب

سوال:

ایک شخص لوگوں سے بیان کرتا ہے کہ:

(۱) ایک سید صاحب نے مجھے بیٹا بنایا تھا اس لیے میں سید ہوں وہ اپنے آپ کو سید کہتا ہے اور نام کے ساتھ سید لکھتا ہے جب کہ یہ خود قوم کا ''میواتی'' ہے۔

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجھے زیارت نصیب ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ پر بہت شفقت فرمائی اور مجھے اپنے اہل بیت میں شامل کر لیا اور تمام اہل بیت سے میرا تعارف کروایا۔

(۳) میرے استاد خواب میں آئے اور تمام دنیا کی مجھے سیر کرائی' دنیا کا ہر ملک مجھے دکھایا اور تمام دنیا میری دسترس میں آگئی۔

(۴) وہ ڈاڑھی کے بارے میں کہتا ہے کہ قرآن وحدیث میں دکھا دو کہ ڈاڑھی کتنی ہونی چاہیے۔ ایسا کوئی ذکر نہیں ہے' آپ کی مرضی ہے جتنی یا جیسے چاہو رکھو یہ سنت ہے اور خود ڈاڑھی کتروا کر چھوٹی رکھتا ہے۔

(۵) میں نے دو آدمیوں میں صلاح کروادی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے خواب میں آئے اور فرمایا ''اے شخص آج تو نے اتنی بڑی نیکی کی ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ڈھا دوں تو اتنا گناہ نہیں ہوگا' تو نے اتنی بڑی نیکی کی ہے''۔ وہ کہتا ہے میں نے خواب میں مسجد

نبوی ﷺ کے مینار کے کنگورے گرائے ہیں۔

(۶) حضور ﷺ میرے خواب میں آئے مجھے بھائی کہہ کر خطاب کیا اور انہوں نے مجھے بھائی بنالیا۔

(۷) میرے شاگرد کو غوث پاک رضی اللہ عنہ نے 40 دن تک خواب میں تعلیم دی ہے جب کہ وہ شاگرد بھی کلین شیو ہے۔

(۸) وہ شخص نماز روزہ کی پابندی بھی نہیں کرتا' نہ پڑھتا ہے نہ حکم دیتا ہے' کسی سے مرید نہیں ہے' لیکن خود مرید کرتا ہے' وہ کہتا ہے کہ خواب میں بیعت و خلافت ہوئی ہے۔ کیا یہ باتیں و خواب قابل اعتبار اور قابل یقین ہیں۔ کیا ان باتوں پر یقین کر سکتے ہیں' باوجود ان باتوں کے اس شخص کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے جا سکتے ہیں؟

[سائل: محمد رمضان' کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ میں بر تقدیر صدق سائل جواب یہ ہے کہ کسی بھی شخص کا اپنا نسب بدلنا اور اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''**من ادعی الی غیر ابیه وهو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام**'' جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔ (بخاری: ۴۳۲۶' مسلم: ۶۳' مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۴' داؤد: ۵۱۱۳' سنن دارمی ج ۲ ص ۲۴۴' ابن ماجہ: ۲۶۱۰' ابن حبان ص ۴۱۵)

نیز سوال میں یہ بھی مذکور ہے کہ شخصِ مذکور نماز روزہ کی ادائیگی نہ خود کرتا ہے' نہ دوسروں کو حکم دیتا ہے' ایسا شخص شرعاً فاسق ہے اور فاسق کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا'' (الحجرات: ۶) اے ایمان والو! اگر فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لیکر آئے تو اس کی چھان بین کر لیا کرو۔ قرآن مجید کے اس فرمان کے بموجب اس کی باتیں خصوصاً خواب قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔ خواب کو بنیاد بنا کر کوئی شخص مرید نہیں بن سکتا' چہ جائیکہ وہ پیر بن جائے۔ ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنا یا اس سے دوستانہ تعلقات رکھنا شرعاً ناجائز ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ''وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ

ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ'' (ھود:۱۱۳) ظالموں کے ساتھ تعلق نہ رکھو ورنہ تمہیں (بھی) آگ چھوئے گی۔ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ: ''ایاکم و ایاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم'' (صحیح مسلم ج۱ ص۱۰) تم اپنے آپ کو ان سے جدا رکھو اور ان کو اپنے سے دور رکھو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کردیں اور فتنوں میں ڈالدیں۔ دعائے قنوت میں ہم پڑھتے ہیں کہ: ''و نخلع و نترك من یفجرك'' یعنی اے اللہ! جو تیرا نافرمان ہو ہم اس کو چھوڑتے ہیں اور اس سے جدا ہوتے ہیں۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

کالا خضاب لگانے کی ممانعت اور اس میں وسمہ ملانے کا استحباب

سوال:

(۱) ایک حدیث پاک میں ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو مذاق میں بھی منعقد ہوجاتی ہیں۔ وہ تین چیزیں کیا ہیں؟ نیز اس حدیث پاک کا مکمل حوالہ مع راوی بیان فرمادیں؟

(۲) کالا خضاب مردوں کو لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کون سا اور کن صورتوں میں؟ وَسمہ یا بُسمہ کیا ہوتا ہے؟ [سائل: محمد عرفان عطاری' لیاقت آباد]

جواب:

(۱) جس حدیث شریف میں یہ ہے کہ تین چیزیں مذاق میں بھی منعقد ہوجاتی ہیں وہ حدیث درج ذیل ہے:

''عن ابی ھریرة رضی اللہ تعالٰی عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: ثلاث جدھن جد و ھزلھن جد النکاح و الطلاق و الرجعة''۔ (سنن ترمذی: ۱۱۹۴' سنن ابن ماجہ: ۲۰۳۹' سنن دارقطنی ج۳ ص۲۵۶' المستدرک ج۲ ص۱۹۸' مشکوٰۃ المصابیح: ۳۲۹۴' ص۲۸۴)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے یا مذاقاً وہ واقع ہوجاتی ہیں' نکاح' طلاق اور رجوع۔

(۲) کالا خضاب مردوں کو لگانا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں شدت کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"**یکون قوم یخضبون آخر الزمان بالسواد کحواصل الحمام لا یریحون رائحة الجنة**" آخر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو سیاہ خضاب کریں گے جیسے کبوتر کے پوٹے' یہ لوگ جنت کی خوشبو نہیں پائیں گے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۲)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: "**من خضب بالسواد سود اللہ وجهه یوم القیامة**" جس نے کالا خضاب لگایا' قیامت کے دن اللہ عزوجل اس کا چہرہ سیاہ فرمائے گا۔ (مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۶۳)

احادیث مبارکہ میں چونکہ مطلقاً کالے رنگ کے استعمال سے منع فرمایا ہے اس لیے ہر وہ چیز جس کے لگانے سے سر یا ڈاڑھی میں کالا رنگ آئے وہ ممنوع ہوگی' خواہ وہ سیاہ مہندی ہو' کالا کولا ہو یا کچھ اور ہو۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ نے گیارہ احادیث مبارکہ سے سیاہ خضاب کی ممانعت کو ثابت کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

"احادیث و روایات میں مطلق سیاہ رنگ سے ممانعت فرمائی۔ تو جو چیز بالوں کو سیاہ کرے خواہ نرا نیل یا مہندی کا میل یا کوئی تیل' غرض کچھ ہو سب ناجائز و حرام اور ان وعیدوں میں داخل ہے۔ بالفرض اگر خالص مہندی سیاہ رنگت لاتی وہ بھی حرام ہوتی اور خالص نیل زرد یا سرخ رنگ دیتا وہ بھی جائز ہوتا۔ یوں ہی نیل اور مہندی کا میل یا کوئی بلا ہو جو کچھ سیاہ رنگ لائے سب حرام ہے"۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۵۶)

سوال میں وَسمہ اور بُسمہ کے متعلق پوچھا گیا ہے' اس میں بُسمہ تو کوئی چیز نہیں ہے البتہ وَسمہ نیل کے پتوں کو کہتے ہیں' ان کو مہندی میں ملا کر خضاب کیا جاتا ہے' جس سے بالوں میں ڈارک براؤن (Dark Brown) رنگ آ جاتا ہے۔ عربی میں اس کو کَتم کہتے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بڑھاپے کی علامت کو بدلنے کی سب سے بہترین چیز "حناء اور کتم" ہے (یعنی مہندی اور وسمہ) ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حناء اور کتم کا آمیزہ بالوں میں لگایا ہوا تھا' نبی اکرم ﷺ نے اسے خالص مہندی کے رنگ سے زیادہ اچھا قرار

دیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح' باب الترجل)

لہٰذا بالوں کو خالص مہندی سے رنگنا بھی جائز ہے لیکن اس میں وسمہ کی اس حد تک آمیزش کہ وہ سیاہی کو نہ پہنچے زیادہ بہتر ہے۔ البتہ سیاہی کو پہنچنے کی صورت میں اس کا استعمال حرام ہوگا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

سیاہ مہندی یا کالا کولا لگانے کا حکم

سوال:

ڈاڑھی یا سر پر سیاہ مہندی یا کالا کولا لگانا کیسا ہے؟ دلائل کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

[سائل: غلام حسن قادری' یاسین آباد]

جواب:

ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو رنگنا سنتِ مستحبہ ہے' جیسا کہ کثیر احادیث مبارکہ اور کتبِ فقہ کی عبارات سے ثابت ہے لیکن احادیث مبارکہ میں سیاہ رنگ کو استعمال کرنے کی شدت سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یکون قوم یخضبون فی اٰخر الزمان بالسواد کحواصل الحمام لایریحون رائحة الجنة'' آخر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو سیاہ خضاب کریں گے جیسے کبوتر کے پوٹے' یہ لوگ جنت کی خوشبو نہیں پائیں گے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۲)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ''من خضب بالسواد سوّد اللہ وجهه یوم القیامة'' جس نے کالا خضاب لگایا' قیامت کے دن اللہ عزوجل اس کا چہرہ سیاہ فرمائے گا۔ (مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۶۳)

اور جلیل القدر تابعی حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ سب سے پہلے فرعون نے کالا خضاب لگایا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۲۵۱)

ان تمام احادیث سے واضح ہوگیا کہ کالا خضاب لگانا جائز نہیں ہے۔ باقی دیگر رنگوں کے خضاب لگانا جائز اور احادیث میں چونکہ مطلقا کالے رنگ کے استعمال سے منع فرمایا ہے اس لیے وہ چیز جس کے لگانے سے سر یا ڈاڑھی میں کالا رنگ آئے وہ ممنوع ہوگی' خواہ وہ سیاہ

مہندی ہو کالا کولا ہو یا کچھ اور ہو۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان نے گیارہ احادیث مبارکہ سے سیاہ خضاب کی ممانعت کو ثابت کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

احادیث و روایات میں مطلق سیاہ رنگ سے ممانعت فرمائی۔ تو جو چیز بالوں کو سیاہ کرے خواہ وہ نرا نیل ہو یا مہندی یا کوئی تیل' غرض کچھ ہو سب ناجائز وحرام اور ان وعیدوں میں داخل ہے۔ بالفرض اگر خالص مہندی سیاہ رنگ لاتی وہ بھی حرام ہوتی اور خالص نیل زرد یا سرخ رنگ دیتا وہ بھی جائز ہوتا۔ یوں ہی نیل اور مہندی کا میل یا کوئی بلا ہو جو کچھ سیاہ رنگ لائے سب حرام ہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج۱۰ ص۵۹) **واللّٰہ و رسولہ اعلم بالصواب**

مونچھیں بالکل منڈوا دینا کیسا ہے؟

سوال:

مونچھوں کا مونڈنا کیسا ہے جیسا کہ دیوبندی وغیرہ کرتے ہیں جب کہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمۃ بھی مونچھیں مونڈا کرتے تھے' کیا یہ بھی جائز ہے؟ کیا یہ مثلہ کے حکم میں نہیں؟ [سائل: محمد عرفان عطاری' لیاقت آباد]

جواب:

مونچھیں منڈانے کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ بعض علماء نے اس کو جائز اور سنت قرار دیا ہے اور بعض نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔

درمختار میں علامہ علاؤالدین حصکفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "**في المجتبى حلق الشارب بدعة وقيل سنة**" مجتبیٰ میں ہے کہ مونچھیں منڈانا بدعت ہے اور بعض کے نزدیک سنت ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار ج۹ ص۴۹۷)

مذکورہ عبارت میں "قیل سنۃ" پر حاشیہ لکھتے ہوئے علامہ شامی قدس سرہ فرماتے ہیں:

"**مشى عليه في الملتقى و عبارة المجتبى بعد مارمز للطحاوى: حلقه سنة ونسبه الى أبي حنيفة وصاحبيه**" ملتقیٰ میں بھی مونچھیں منڈانے کو سنت قرار دیا گیا ہے۔ مجتبیٰ کے مصنف نے امام طحاوی کے علامتی نشان کے ساتھ لکھا ہے کہ مونچھیں منڈانا سنت ہے اور امام طحاوی نے اس کو امام اعظم ابوحنیفہ' امام ابویوسف اور امام محمد علیہم الرحمۃ کا قول قرار دیا ہے۔

علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے اس عبارت میں ''ملتقی'' کا جو حوالہ دیا ہے اس سے امام ابراہیم بن محمد حلبی المتوفی ۹۵۶ ھ کی کتاب ''ملتقی الابحر'' مراد ہے۔ اس میں علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''والسنة تقليم الاظافير ونتف الابط وحلق العانة والشارب و قصه حسن''

سنت یہ ہے کہ ناخن تراشے جائیں' بغل کے بال اکھیڑے جائیں' زیر ناف اور مونچھوں کے بال مونڈے جائیں' اور مونچھیں کم کرانا اچھا ہے۔ (ملتقی الابحر ج ۴ ص ۲۲۵۔۲۲۶)

اس عبارت میں مونچھوں کے بال منڈانے کو سنت اور کم کرانے کو حسن قرار دیا گیا ہے۔ اور علامہ شامی کی محولہ عبارت کے مطابق امام طحاوی بھی اس کے قائل ہیں کہ مونچھیں منڈانا سنت ہے۔ اور امام طحاوی کی تحقیق کے مطابق ائمہ احناف کا یہی مذہب ہے۔ ''شرح معانی الآثار'' میں امام طحاوی نے مونچھیں منڈانے کے عنوان سے مستقل ایک باب باندھا ہے' اس میں انہوں نے حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر' حضرت انس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مونچھیں منڈانے کا (بھی) حکم دیا ہے۔ اور جن روایات میں یہ ہے کہ ''مونچھیں کم کرانا فطرت سے ہے'' ان کا جواب یہ دیا ہے کہ ان روایات کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مونچھیں کٹوانا اور کم کرانا فطرت سے ہے' البتہ منڈوانا افضل ہے۔ اس کے بعد آخر میں لکھا ہے: ''هذا مذهب ابی حنيفة و ابی يوسف و محمد رحمهم الله تعالیٰ'' امام اعظم ابوحنیفہ' امام ابو یوسف' اور امام محمد علیہم الرحمۃ کا یہی مذہب ہے۔ پھر حضرت عثمان بن عبید اللہ بن رافع المدنی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت ابوھریرہ' حضرت ابوسعید خدری' حضرت ابو اسید ساعدی' حضرت رافع بن خدیج' حضرت جابر بن عبد اللہ' حضرت انس بن مالک' حضرت سلمہ بن اکوع اور حضرت سہل بن سعد یہ سب کے سب مونچھیں منڈایا کرتے تھے۔

(شرح معانی الآثار' کتاب الکراھیۃ' باب حلق الشارب ج ۴ ص ۲۷۔۳۰ مطبوعہ قدیمی کراچی)

امام طحاوی کی اس تحقیق کو فتاویٰ عالمگیری میں بھی ذکر کیا گیا ہے' چنانچہ عالمگیری' کتاب الکراھیۃ میں ہے:

''ويأخذ من شاربه حتى يصير مثل الحاجب كذا في الغياثيه و كان بعض السلف يترك سباليه وهما اطراف الشوارب كذافي الغرائب. ذكر

الطحاوی فی شرح الاثار ان قص للشارب حسن و تقصیرہ ان یوخذ حتی ینقص من الاطار وھو الطرف الاعلی من الشفۃ العلیا قال والحلق سنۃ وھو احسن من القص وھذا قول ابی حنیفۃ و صاحبیہ رحمھم اللہ تعالیٰ کذا فی محیط السرخسی''. (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۵۸)

یعنی آدمی اپنی مونچھیں اتنی کتروائے کہ وہ بھنوؤں کی طرح ہو جائے' یہ غیاثیہ میں ہے۔ اور غرائب میں اس طرح ہے کہ بعض اسلاف اپنی مونچھوں کے کنارے چھوڑ دیتے تھے۔ شرح آثار میں امام طحاوی نے یہ بیان کیا ہے کہ مونچھیں کتروانا اچھا ہے اور کتروانے کی صورت یہ ہے کہ اتنی کاٹ دے کہ وہ اوپر والے ہونٹ کے کنارے سے اونچی ہو جائے۔ (امام طحاوی نے فرمایا کہ) منڈانا سنت ہے اور یہ کتروانے کے مقابلہ میں زیادہ اچھا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) علیہم الرحمۃ کا یہی موقف ہے' جیسا کہ محیط سرخسی میں ہے۔

امام طحاوی علیہ الرحمۃ اور دیگر کتب فقہ کی تصریحات کے مطابق ہمارے نزدیک مونچھیں منڈانا رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مطابق ہے اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی اتباع ہے۔ ہمارے امام'' علامہ شاہ احمد نورانی'' نور اللہ مرقدہ چونکہ جلیل القدر عالم دین اور بلند پایہ مفکر تھے اس لیے بلاشبہ وہ مذکورہ دلائل ہی کی بناء پر اپنی مونچھیں منڈاتے تھے۔ اگر اس کو مثلہ قرار دیا جائے تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل پر اعتراض اور تنقید متصور ہوگی۔ محض دیوبندیوں یا اور دیگر فرقہائے باطلہ کا کسی عمل کو پابندی سے کرنا جائز کو ناجائز اور ثابت شدہ کو باطل نہیں کرسکتا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ایک مشت یا اس سے زائد ڈاڑھی رکھنے کا حکم

سوال:

ڈاڑھی کو ایک مشت کے برابر رکھنا کسی حدیث مبارک سے ثابت ہے یا نہیں؟ نبی اکرم ﷺ کا اس بارے میں ارشاد اور عمل کیا تھا اور صحابہ کرام کا طریقہ مبارکہ کیا تھا؟

[سائل: محمد سعید قادری' نیو کراچی]

جواب:

احادیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے ڈاڑھی کو بڑھانے اور دراز کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مونچھیں بہت کم کرو اور ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۷۵، صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۲۹)

اس حدیث میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ ڈاڑھی کو کس قدر بڑھایا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے دیکھا جائے گا کہ نبی اکرم ﷺ کا اپنا عمل کیا تھا اور صحابہ کرام کا عمل کیا تھا؟ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ڈاڑھی مبارک ایک مشت سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ حضرت قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمۃ بیان کرتے ہیں کہ: ''کث اللحیۃ تملأ صدرہ'' یعنی نبی اکرم ﷺ کی ڈاڑھی مبارک گھنی تھی جو کہ آپ کے سینہ مبارک کے بالائی حصہ کو بھر لیتی تھی۔ (الشفاء ج ۱ ص ۳۸، مطبوعہ ملتان) سینہ مبارک کے بالائی حصہ کو بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک ایک مشت سے بھی زیادہ ہوتی تھی، کیونکہ آپ دراز گردن تھے جو کہ حسن کا تقاضا ہے۔ اور دراز گردن ہونے کی صورت میں سینہ کے بالائی حصہ کو بھرنے کے لیے ممکن نہیں ہے کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک ایک مشت سے کم ہو بلکہ کم از کم ایک مشت یا اس سے زائد ہوتی تھی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ایک مشت سے زائد ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ڈاڑھی اس قدر لمبی رکھی جائے کہ دیکھنے والے اس پر ہنسیں اور اس کا مذاق اڑائیں، جیسا کہ فی زمانہ بعض غیر مقلدین کا طریقہ ہے۔ یہ لوگ اس قدر لمبی ڈاڑھیاں رکھ لیتے ہیں کہ جب ہوا چلتی ہے تو ان کا چہرہ عجیب وغریب منظر پیش کرتا ہے۔ حالانکہ روایات سے ثابت ہے کہ ڈاڑھی کی اس قدر لمبائی ''کم عقلی'' کی نشانی ہے۔ (کما ذکرہ العلی القاری فی شرح الشفاء ج ۱ ص ۱۶۰) اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ ڈاڑھی کم از کم ایک مشت رکھی جائے جیسا کہ سیدنا ابن عمر اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ہم عنقریب واضح کریں گے، یا ایک مشت سے زائد رکھی جائے مگر اس قدر کہ وہ حدِ اعتدال میں ہو۔

صحابہ کرام میں بھی بعض کے حوالہ سے یہ ثابت ہے کہ وہ ایک مشت کے بعد اپنی ڈاڑھی

کو کم کرتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑتے اور جو مقدار فاضل ہوتی اس کو کاٹ دیتے تھے۔ (صحیح بخاری ج۲ص ۸۷۵) اسی طرح امام ابن ابی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑتے اور مٹھی سے زائد ڈاڑھی کو کاٹ دیتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج۸ ص ۳۷۴)

ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کا معمول ایک مشت یا اس سے زائد ڈاڑھی رکھنے کا تھا۔ ایک مشت سے کم ڈاڑھی رکھنے کا عمل کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاڑھی ایک مشت یا (معتدل مقدار میں) اس سے زائد رکھی جائے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ایک مشت ڈاڑھی کا شمار ہونٹوں کے نیچے سے کیا جائے یا ٹھوڑی کے نیچے سے؟

سوال:

(۱) ایک مشت ڈاڑھی کہاں سے ناپی جانی چاہیے؟ ہونٹوں کے نیچے سے یا ٹھوڑی کے نیچے سے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہونٹوں کے نیچے سے ناپنی چاہیے۔ کیونکہ ڈاڑھی ہونٹوں کے نیچے سے شروع ہوتی ہے؟

(۲) ایسا شخص جو ہونٹوں کے نیچے سے ڈاڑھی ناپ کر کاٹے اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ کیونکہ اس کے نزدیک ڈاڑھی ہونٹوں کے نیچے سے شروع ہوتی ہے اور اسی حساب سے وہ ایک مشت ناپ کر بقیہ بالوں کو کاٹتا ہے۔

[سائل: سید محمد وقاص ہاشمی، خطیب میمن مسجد اسکیم ۳۳]

جواب:

(۱) علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک مشت ڈاڑھی کا شمار ٹھوڑی کے نیچے سے ہوتا ہے۔ جو شخص ٹھوڑی کے اوپر والے بالوں سے ایک مشت شمار کر کے ڈاڑھی کاٹتا ہے وہ درحقیقت اپنی ڈاڑھی کو ایک مشت سے کم کرتا ہے۔ بلکہ اس صورت میں اصل ڈاڑھی

صرف ایک یا ڈیڑھ انگلی کی مقدار بچتی ہے اور یہ کھلا فسق ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاڑھی میں امتِ مسلمہ کے متفقہ عمل کے خلاف نئی نئی تراش خراش سے بچا جائے۔ اور کم از کم ایک مشت کی مقدار مکمل ڈاڑھی رکھی جائے۔

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا محدّث بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ ڈاڑھی کی مقدار ٹھوڑی کے نیچے سے لی جائے گی۔ یعنی چھوٹے ہوئے بال اس قدر ہوں۔ وہ جو بعض بے باک جُہال لبِ زیریں کے نیچے سے ہاتھ رکھ کر چار انگل ناپتے ہیں کہ ٹھوڑی کے نیچے ایک ہی انگل رہے یہ محض جہالت اور شرع مطہر میں بے باکی ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۲۲ ص ۵۸۱)

(۲) جو شخص ہونٹوں کے نیچے ڈاڑھی ایک مشت ناپ کر کاٹے وہ قابلِ امامت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک مشت سے کم ڈاڑھی رکھنے والا فاسق ہے اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی واجب الاعادہ ہے۔ کما هو مقرّر فی کتب مذهبنا المهذّب.

واللّٰہ ورسوله اعلم بالصواب

''احد حسین'' نام رکھنے کا حکم

سوال:

احد حسین نام رکھنا کیسا ہے؟ اگر رکھ لیا ہو تو کیا کیا جائے؟

[سائل: حافظ محمد شاہنواز خداداد کالونی]

جواب:

بہتر یہ ہے کہ اس نام کو بدل دیا جائے۔ کیونکہ واحد اور وحید کے مقابلے میں احد کا استعمال عموماً اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ بندوں کے لیے یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ ایسا نام جو بندوں کے لیے نہ اللہ عزّ وجلّ نے ذکر فرمایا ہو نہ اللہ کے رسول نے اور نہ ہی مسلمانوں میں اس کا استعمال ہو تو ایسے نام سے بچنا ہی بہتر ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۶۲)

صورت مسئولہ میں احد حسین کو محمد حسین یا احمد حسین کر دیا جائے یا کوئی اور اطمینان بخش

نام رکھ لیا جائے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

''عبد المناف'' نام رکھنے کا حکم

سوال:

عبد المناف نام رکھنا کیسا ہے؟ اور مناف کا معنی کیا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ [سائل: عبد الرحیم مکرانہ راجھستان انڈیا]

جواب:

عبد المناف نام رکھنا جائز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ عبد المناف کی بجائے عبد مناف رکھا جائے۔ نبی کریم ﷺ کے سکڑ دادا کا لقب عبدِ مناف تھا۔ یعنی سیدنا محمد ﷺ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ (کذافی کتب السیرۃ النبویۃ)

''مناف'' عربی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی ہے: بلند وبالا اور معزز ومکرم۔ صاحب سبل الہدیٰ والرشاد علامہ سہیلی فرماتے ہیں کہ عبد مناف اپنی عادات واطوار اور خصلتوں میں اپنے ہم زمانہ لوگوں سے چونکہ بلند وبالا تھے اس لیے عبد مناف کے لقب سے مشہور ہوئے۔

(ضیاء النبی ﷺ ج ۱ ص ۴۳۵)

خلاصہ یہ کہ عبد مناف کا معنی ہے: بلند وبالا اور معزز خصلتوں والا۔ لہٰذا یہ نام رکھنا جائز ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

باہمی جھگڑے میں مدعی اور منکرِ دعویٰ کی شرعی ذمہ داری

سوال:

میں ایک امام مسجد ہوں اور گزشتہ 25 سال سے مسجد کی خدمت کر رہا ہوں، میری مسجد کی انتظامیہ میں ایک شخص جس کا نام فتح محمد نیازی ہے وہ بہت بیمار ہو گیا تھا اور اس کا علاج کرنے کے لیے ایک حکیم آیا تھا اور اس نے نیازی صاحب کا علاج کیا اور وہ ٹھیک ہو گیا اور

نیازی صاحب نے اس حکیم کی بڑی تعریف کی تو میں نے کوشش کی کہ میں اس سے حکمت کے کچھ نسخہ لے لوں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر اور اس کی رحمت ہے کہ میرے پاس روحانیت ہے اور لوگوں کو اس سے فائدہ ہو رہا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ حکمت بھی ہوتا کہ لوگوں کو اور زیادہ فائدہ ہو تو میں نے اس حکیم سے رابطہ رکھا اور ملتا رہا لیکن بعد میں جب پتا چلا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو میں اس سے ہٹ گیا اور رابطہ ختم کر دیا بعد میں انتظامیہ نے الزام لگایا کہ وہ شخص کالے علم والا تھا اور امام صاحب نے اس سے کالا علم سیکھا ہے حالانکہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ میں نے اس سے کچھ نہیں سیکھا اور میں ایک عالم اور امام ہو کر ایک غلط کام کو کیسے سیکھ سکتا ہوں؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے کا حل فرمائیں۔ [سائل: محمد معین، ایئر پورٹ]

جواب:

صورتِ مسئولہ میں سائل کی صداقت پر اعتماد کرتے ہوئے جواب یہ ہے کہ شرعاً کسی بھی دعویٰ کرنے والے پر گواہ پیش کرنا لازم ہے اور جو اس دعویٰ کا منکر ہو اس پر قسم اٹھانا لازم ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’**البینة علی من ادعی والیمین علی من انکر**‘‘ جو دعویٰ کرے وہ گواہ پیش کرے اور جو انکار کرے وہ قسم اٹھائے۔ (ترمذی' کتاب الاحکام: ۱۳۴۱' سنن دار قطنی ج ۳ ص ۱۱۰' مشکوٰۃ ص ۳۲۶' الجامع الصغیر للسیوطی: ۴۹۵۷' سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۷۹۔ ج ۱۰ ص ۲۵۲' معرفۃ السنن للبیہقی' ج ۶ ص ۴۲۱' شرح السنۃ ج ۱۰ ص ۱۰۱)

صورتِ مسئولہ میں کمیٹی کا دعویٰ ہے کہ امام صاحب نے حکیم سے کالا علم سیکھا ہے اور امام صاحب اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے' نہ ہی حکیم سے اس دعوے کو تصدیق حاصل ہے۔ لہٰذا حدیثِ مذکور کے مطابق کمیٹی پر لازم ہے کہ وہ اپنے دعوے کی سچائی پر گواہ پیش کرے اور اس بات کو ثابت کرے کہ امام صاحب کو کالا علم آتا ہے۔ اگر کمیٹی اپنے دعوے کو ثابت نہ کر سکے تو امام پر قسم اٹھانا لازم ہے کہ میں نے کالا علم نہیں سیکھا ہے۔ جب امام قسم اٹھالے تو کمیٹی کا دعویٰ شرعاً غیر معتبر ہوگا اور وہ دعویٰ امام پر محض الزام اور تہمت ہوگا' جو کسی بھی مسلمان پر عائد کرنا یا اس کے خلاف بنیاد بنانا جائز نہیں ہے۔ **واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب**

گالی دینے کی شرعی ممانعت

سوال:

زید نے عمرو کو گالی دی اور عمرو زید کا باپ بھی ہے اور عمرو نے زید کو پڑھایا بھی ہے اور زید عمرو کے پیچھے نمازیں بھی پڑھتا ہے۔ اب زید کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا حکم ہے؟ [سائل: عبدالمالک سیفی، کراچی]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا احترام لازم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صریح ارشادات کے مطابق کسی بھی مسلمان کو گالی دینا صریح جرم اور فسق ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے: ''سباب المسلم فسق'' یعنی مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے۔
(صحیح بخاری: ۴۸، صحیح مسلم: ۶۴، مشکوۃ المصابیح ص ۴۱۱)

صورتِ مسئولہ میں عمرو زید کے لیے کئی حوالوں سے قابلِ احترام اور لائقِ اکرام ہے۔ عمرو زید کا والد بھی ہے اور امام بھی بلکہ اس کا استاذ اور معلم و مربی بھی ہے۔ لہٰذا زید پر بدرجۂ اولیٰ و اعلیٰ عمرو کا احترام لازم ہے۔

ذیل میں ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو ارشادات پیش کر رہے ہیں جن کی روشنی میں زید کا حکم شرعی واضح ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان من اکبر الکبائر ان یلعن الرجل والدیه. قیل یارسول اللہ و کیف یلعن الرجل والدیه؟ قال یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امه فیسب امه'' کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین پر لعنت کرے۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ! آدمی اپنے والدین پر کیسے لعنت کر سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ وہ کسی شخص کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ شخص اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور وہ کسی شخص کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ شخص اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۸۳)

دوسری حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من الکبائر شتم الرجل والدیه'' آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا

کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ (سنن ترمذی ج ۲ ص ۱۲)

مذکورہ احادیث کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ زید اپنے والد عمرو کو گالی دے کر گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے اور صحیح بخاری کی مذکور الصدر حدیث کے مطابق وہ فسق کا بھی مرتکب ہے۔ لہٰذا زید پر لازم ہے کہ اپنے اس گناہ کی سچے دل سے توبہ کرے اور اپنے والد کو جو اذیت پہنچائی ہے اس کی ان سے معافی مانگے کہ درحقیقت والد کی رضا میں رب کی رضا ہے اور والد کی ناراضگی میں رب کی ناراضگی ہے۔ او کما قال ﷺ (سنن ترمذی ج ۲ ص ۱۲)

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

نابالغ کے تحائف کا استعمال

سوال:

نابالغ اولاد کو مختلف مواقع (مثلاً پیدائش کے بعد عقیقہ میں رسم بسم اللہ، رسم آمین اور رسم روزہ کشائی وغیرہ) پر ملنے والی رقم اور تحائف کو والدین استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

[سائل: محمد آصف عطاری، R-18 مدرسۃ المدینہ، گلشن شمیم، یٰسین آباد]

جواب:

فقہاء کرام نے اس کی مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) کسی تقریب اور خوشی کے بغیر نابالغ کو کسی نے کوئی چیز دی اور وہ چیز کھانے پینے کی ہو۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر دینے والے کے انداز سے معلوم ہو کہ خالص بچہ کو ہی دینا مقصود ہے تو والدین اُس میں سے نہیں کھا سکتے اور اگر دینے والے کے انداز سے معلوم ہو کہ بچہ کے بہانے والدین کو دینا مقصود ہے تو وہ کھا سکتے ہیں۔

(۲) کسی تقریب اور خوشی کے بغیر نابالغ کو کسی نے کوئی چیز دی اور وہ چیز کھانے پینے کی نہ ہو۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ والدین اس کو بلاضرورت استعمال نہیں کر سکتے۔ اور ضرورت ہو تو ضرورت کی مقدار استعمال کر سکتے ہیں۔

(۳) بچہ کی ولادت کی تقریب یا اس کی خوشی میں جو تحائف (رقم، لباس اور دیگر اشیاء) دی جاتی ہیں، اُن میں جن چیزوں کے متعلق معلوم ہو کہ یہ صرف بچہ کے لیے ہیں (جیسے

چھوٹے کپڑے) تو وہ صرف بچہ کے لیے شمار ہوں گے اور جو چیزیں بچہ کے لیے خاص نہ ہوں وہ والدین کے لیے شمار ہوں گی (جیسے رقم اور بڑے کپڑے وغیرہ)۔

(۴) ولادت کے علاوہ دیگر تقریبات (رسم بسم اللہ اور روزہ کشائی وغیرہ) میں جو تحائف آتے ہیں اُن میں جو چیزیں بچوں کے لیے خاص کر کے دی جاتی ہیں (جیسے اُن کے مناسب کپڑے یا کھلونے) وہ اُنہی کے شمار ہوں گے۔ اور دیگر چیزیں (رقم وغیرہ) میں عرف اور رواج دیکھا جائے گا۔ اگر عرف میں وہ چیزیں بچہ کی شمار ہوتی ہوں تو کسی اور کے لیے اُن کا استعمال درست نہیں ہوگا اور اگر عرف میں وہ بچہ کی شمار نہ ہوتی ہوں تو پھر وہ والدین کے لیے ہیں۔ (بہار شریعت حصہ ۱۴ ص ۵۱ موضحاً و مرتباً)

کسی مسلمان کو خبیث کہنے اور اس کے ساتھ گالی گلوچ کی ممانعت

سوال:

مولانا عزیز الرحمٰن ایک مسجد کے خطیب اور مدرسے کے مہتمم ہیں علاقے میں لوگ انہیں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کچھ شر پسند ایسے ہیں جن سے ان کا احترام دیکھا نہیں جاتا ان میں ایک شخص کا نام سبز علی ہے اس نے ایک پنچایت کے دوران مولانا صاحب کو "خبیث" کہا اور دیگر بیہودہ کلمات منسوب کیے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے شخص کے لیے شریعت مطہرہ میں کیا حکم ہے؟ [سائل: عبدالرحمٰن کراچی]

جواب:

شرعاً یہ بات خلافِ ایمان ہے کہ آدمی لعن طعن اور بیہودہ گوئی سے اپنی زبان کو آلودہ کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "**لیس المؤمن بالطعان ولا باللعان ولا الفاحش ولا البذی**" "وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہے جو طعنہ دے لعنت بے حیائی اور بے ہودگی کی باتیں کرے۔ (سنن ترمذی: ۱۹۷۷ مسند احمد ج ۱ ص ۴۰۵ مشکوٰۃ المصابیح: ۴۸۴۷)

اسی طرح شرعی نقطہ نظر سے کسی مسلمان کو خبیث کہنا قابل تعزیر جرم ہے۔ (کذا فی الدر

الخارج ۶ ص ۸۵) خصوصاً وہ شخص جو مقتدیٰ اور امام ہو اس کو ''خبیث'' کہنا یا اور دیگر بیہودہ باتیں اس کی طرف منسوب کرنا شرعاً انتہائی قابل مذمت وملامت اور ممنوع ہے۔

لہٰذا سوال مذکور میں سائل کے بیان کے مطابق مسمی سبز علی نے جو بدکلامی کی ہے اس سے توبہ کرنا اور جس مسلمان سے بدکلامی کی ہے' اس سے حقوق العباد کی ادائیگی کے طور پر معافی مانگنا ضروری ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اخلاقیات اور حسن سلوک کے متعلق اسلامی تعلیمات

سوال:

الحمدللہ میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے اور بفضلہ تعالیٰ میں اسلام کے احکامات پر عمل کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں۔ مذاق کرنے اور کسی کو تنگ کرنے سے میں ہمیشہ دور رہتا ہوں۔ لیکن ایک صاحب ہیں' ان کا تعلق بھی ایک مذہبی جماعت سے ہے۔ وہ جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو میرا خوب مذاق اڑاتے ہیں۔ اور ناقابل برداشت حد تک تنگ کرتے ہیں۔ اور جب انہیں لوگ سمجھاتے ہیں کہ ایسا نہیں کیا کرو تو کہتے ہیں: ''زندگی چند روزہ ہے' کھیلو کودو عیش کرو۔ ہم اسی لیے تو یہاں آئے ہیں''۔ مذکورہ وضاحت کے بعد آپ کی خدمت میں میری چند گذارشات ہیں جن کا مجھے قرآن وسنت کی روشنی میں حل مطلوب ہے:

(۱) مذکورہ شخص کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس کا فعل تعلیمات اسلامیہ کے خلاف نہیں؟

(۲) آپ بتائیں کہ میں اس سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس کے خلاف کیا انتقامی کاروائی کرسکتا ہوں؟

(۳) اس کا یہ کہنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے کہ ''زندگی چند روزہ ہے' کھیلو کودو عیش کرو۔ ہم اسی لیے تو یہاں آئے ہیں؟'' [سائل: محمد عمران قادری' برنس روڈ' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ میں سائل نے جو وضاحت تحریر کی ہے اگر وہ مبنی برصداقت ہے تو بالترتیب جوابات یہ ہیں:

(۱) دین اسلام نہایت جامع دین اور دین فطرت ہے اس میں جہاں احکام شریعت کی بجا آوری اور حرمتِ دین کی پاسداری ضروری ہے وہاں بالخصوص اپنے اعزاء اقارب اور بالعموم تمام مسلمانوں کی نہ صرف عزت نفس کا لحاظ ضروری ہے بلکہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا بھی نہایت اہمیت کا حامل اور لازمی حصہ ہے۔ سائل نے جس شخص کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ وہ میرا بہت زیادہ مذاق اڑاتا ہے اور ناقابل برداشت حد تک پریشان کرتا ہے' شرعی نقطہ نظر سے یہ نہایت قابل مذمت اور ممنوع فعل ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ (سورہ الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! نہ تو مرد مرد کا مذاق اڑائیں کہ ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں کہ ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔

مذکورہ آیت مبارکہ میں بڑے واضح انداز میں اللہ رب العلمین مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمارہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مذاق اڑائیں۔ واضح رہے کہ مذاق کرنا اور ہے' مذاق اڑانا اور۔ مذاق کرنے کو عربی میں ''مزاح'' کہتے ہیں اور مذاق اڑانے کو لفظ ''سخریہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذاق کرنے کی ایک حد تک تو اجازت ہے لیکن مذاق اڑانا قطعاً ممنوع ہے اس لیے کہ مذاق اڑانے میں ایذائے مسلم یعنی مسلمان کو ایذاء پہنچانا ہے جو کہ بلا وجہ شرعی کے ممنوع ہے۔ ہمارے اس دعوے پر علامہ علی قاری حنفی اور امام احمد رضا فاضل بریلوی کی درج ذیل عبارات واضح دلیل ہیں:

(الف) علامہ علی قاری حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''المزاح انبساط مع الغير من غير ايذاء فان بلغ الايذاء يكون سخرية (الى قوله) قال النووى :اعلم ان المزاح المنهى عنه هو الذى فيه افراط ويداوم عليه فانه يورث الضحك وقسوة القلب ويشغل عن ذكر الله والفكر فى مهمات الدين ويأول فى كثيرمن الاوقات الى الايذاء ويورث الاحقاد

ویسقط المھابة والوقار"۔ (مرقات ج۸ ص۲۱۷)

یعنی کسی کو تکلیف دیئے بغیر خوش دلی کے ساتھ پیش آنا مزاح (مذاق کرنا) کہلاتا ہے۔ اور اس سے تکلیف پہنچے تو یہ سخریہ (مذاق اڑانا) کہلائے گا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ وہ مذاق جو شرعاً ممنوع ہے وہ وہ ہے جس میں آدمی حد سے بڑھ جائے اور مسلسل کرتا رہے' اس لیے کہ ایسا مذاق ہنسی اور دل کی سختی کا باعث بنتا ہے' دل کو اللہ کے ذکر اور معاملاتِ دین کی فکر سے غافل کر دیتا ہے' بسا اوقات ایذاء تک لے جاتا ہے' کینہ اور دشمنی کا سبب بنتا ہے اور انسان کے وقار کو مجروح کر دیتا ہے۔

(ب) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری حنفی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"ایذائے مسلم بے وجہ شرعی حرام قطعی۔ قال اللہ تعالٰی والذین یؤذون المؤمنین والمؤمنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا۔ آنانکه آزار دہند مردان مومن و زنان مومنه را بے جرم پس بتحقیق که بھتان و گناه آشکارابر خود برداشتند۔ سید عالم ﷺ فرماید: من اذی مسلما فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ ہر که مسلمانے را آزار داد' مرا اذیت رسانید وہر که مرا اذیت رسانید حق تعالٰی را ایذا کرد۔ اے وہر که سبحانه را ایذا کرد پس سر انجام است که بگیرد او را۔ اخرجه الطبرانی فی الاوسط عن انس رضی اللہ عنه"۔

(فتاویٰ رضویہ ج۱۰ ص۴۷)

یعنی کسی مسلمان کو بلاشرعی وجہ کے تکلیف دینا حرام قطعی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اور وہ لوگ جو مومنین اور مومنات کو بلاوجہ تکلیف دیتے ہیں بے شک انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے ذمہ لیا۔ (الاحزاب:۵۸) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جس نے کسی مسلمان کو تکلیف دی' اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی' اس نے اللہ کو تکلیف دی۔

اس مضمون سے متعلق کثیر احادیثِ مبارکہ وارد ہیں جن میں آپ ﷺ نے کسی

مسلمان پر ظلم کرنے، تکلیف دینے اور اسے ذلیل و رسوا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز ایسے شخص کو جس کی شرارتوں سے لوگ محفوظ ہوں اس کو بہترین اور جس کی شرارتوں سے لوگ محفوظ نہ ہوں اس کو بدترین قرار دیا۔ حتی کہ مسلمان کی تعریف ہی یہ فرمائی کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

(حوالے کے لیے دیکھئے: مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۲۔ ۴۱۷۔ ۴۲۲۔ ۴۲۵) وفی ضمن ما بسطناه لا یخفی علی احد وضوح حکم المسئول عنه و کونه مخالفا للتعالیم الاسلامیة.

(۲) قائل کا یہ قول کہ ''زندگی چندروزہ ہے کھیلو کودو، عیش کرو، ہم اسی لیے تو یہاں آئے ہیں'' شرعاً قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝'' (الانعام: ۳۲) دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں اور دارِ آخرت پرہیزگاروں کے لیے ضرور بہتر ہے۔ تو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا کہ دنیا محض کھیل کود ہے اور قرآن کے اس بیان کا مقصد صرف اور صرف لوگوں کی اصلاح اور آخرت کی جانب راغب کرنا ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ دنیا لہو ولعب کا نام ہے لہٰذا جو چاہو سو کرو۔ لہٰذا یہ کہنا کہ زندگی چندروزہ ہے کھیلو کودو عیش کرو، قرآنی آیات کے خلاف ہے۔ قائل کے اس جملے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے فعل (تکلیف وایذاء رسانی) پر نہایت جرأت مند، دلیر اور عادی ہو چکا ہے۔ اسی لیے اس نے صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی کہہ دیا ''ہم اسی لیے تو یہاں آئے ہیں''۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ'' (الذاریات: ۵۶) میں نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

قائل ایذاء رسانی کے ساتھ ساتھ زبان کے معاملہ میں بھی حد سے گذر چکا ہے۔ اس مقام پر ایک حدیث شریف تحریر کرنا نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے:

حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ان الرجل ليتكلم بالكلمة من الشر ما يعلم مبلغها يكتب الله بها عليه سخطه الى يوم يلقاه. رواه فى شرح السنة وروىٰ مالك و الترمذى و ابن ماجة

نحوہ''. (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۱۲)

یعنی آدمی اپنی زبان سے ایسی بری بات بول دیتا ہے جس کے انجام سے بے خبر ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اپنی ناراضی اس دن تک کے لیے لکھ دیتا ہے جس دن وہ اس کے حضور حاضر ہوگا۔

(۳) سوال میں وضاحت سے یہ بات مذکور ہے کہ تنگ کرنے والا شخص سائل کو ناقابل برداشت حد تک پریشان کرتا ہے' شرعی نقطہ نظر سے یہ ظلم اور اعتداء (زیادتی) ہے۔ اور قرآن حکیم میں ایک سے زائد مقامات پر ارشاد ہوا کہ جو تم پر زیادتی اور ظلم کرے اور حد سے بڑھ کر ایذاء رسانی کرے تو تم بھی ویسا ہی سلوک اس کے ساتھ کرو جیسا اس نے تمہارے ساتھ سلوک روا رکھا ہے۔ ہم یہاں پر قرآن حکیم سے فقط ایک جامع بیان اور اس پر مفسرین کی تعبیرات وتشریحات پیش کر رہے ہیں' جس سے ذکر کردہ مسئلہ شمس وامس کی طرح واضح ہو جائے گا:

اللہ رب العٰلمین ارشاد فرماتا ہے:

''وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْىُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ''. (الشوریٰ: ۴۰)

یعنی (اجر ہے ان کے لیے) جن کو حد سے بڑھ کر تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ اسی قدر برائی ہے۔ ہاں! جو معاف کر دے اور اصلاح کر دے تو پس اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے' بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔

اس آیت مبارکہ میں واضح بیان ہے کہ جب ایذاء وتکلیف حد سے بڑھ جائے تو بدلہ لینا چاہیے۔ علامہ قرطبی نے ایسے مقام پر بدلہ لینے کو افضل قرار دیا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''یدلّ علی ظاهره علی ان الانتصار فی هذا الموضع افضل (الی قوله) وقد عقبه (ای ولمن انتصر بعد ظلمه) بقوله :ولمن صبر وغفر ان ذالك لمن عزم الامور وهو محمول علی الغفران عن غیر المصر فاما المصر علی البغی والظلم فالافضل ان الانتصار منه بدلالة الاٰیة التی قبلها''. (تفسیر قرطبی ج ۱۶ ص ۳۶)

یعنی آیت مذکورہ کا ظاہر اس بات پر دلیل ہے کہ بدلہ لینا افضل ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو

یہ فرمایا کہ "جو شخص (مصائب پر) صبر کرے اور معافی سے کام لے تو بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے" یہ اس وقت ہے جب تکلیف پہنچانے والا اس فعل کو اپنی عادت نہ بنا لے اور اگر وہ حد سے زیادہ تکلیف پہنچانا اور ستانا اپنی عادت بنا لے تو پھر بدلہ لینا بہتر ہے۔

امام بیضاوی علیہ الرحمہ نے بھی ایسے مقام پر بدلہ لینے کو محمود اور مستحسن قرار دیا اور وجہ یہ بیان فرمائی تا کہ ظالم اور تکلیف دینے والا اپنے فعل پر جرأت مند نہ ہو جائے۔

(بیضاوی علی حاشیہ الشہاب ج۸ ص۳۰۸)

لیکن یہ اس وقت ہے جب بدلہ اور انتقامی کاروائی اتنی ہی کی جائے جتنی زیادتی ہوئی ہے نہ یہ کہ انتقام کی حدوں کو پار کر جائے۔ اسی لیے آیت مذکورہ کے آخر میں فرمایا: "انه لا یحب الظلمین " "بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔ اس آیت میں ظالم سے مراد وہ بھی ہے جو بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جائے اور وہ بھی جو تکلیف دینے میں پہل کرے۔ چنانچہ اس مقام پر مفسرین نے لکھا: "ای المعتدین وھو المبتدئ بالسیئة والمتجاوزین فی الانتقام"۔ (مدارک التنزیل ج۲ ص۵۱۴، تفسیر ابن کثیر ج۴ ص۱۱۸، تفسیر قرطبی ج۱۶ ص۳۷)

مذکورہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جب کوئی شخص زیادتیوں اور تکالیف کے خلاف انتقامی کاروائی کرنا چاہتا ہو۔ ہاں! شرعی اجازت کے باوجود اگر کوئی شخص زیادتی کا بدلہ زیادتی سے نہ لینا چاہے تو وہ انتقامی کاروائی کے بجائے تادیبی کاروائی کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی قرآن حکیم کی رو سے ایک مستحسن اور قابل تعریف اقدام ہے۔ چنانچہ ذکر کردہ آیت مبارکہ میں خود اللہ تعالیٰ نے "فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ" فرمایا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تکالیف کے باوجود جو شخص (انتقامی کاروائی سے) درگذر کر کے بصورت اصلاح تادیبی کاروائی کرے تو اس کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے پاس موجود ہے۔

ویسے امید ہے کہ انشاء اللہ ہمارا یہ مفصل فتویٰ ہی ایک زبردست اصلاحی اور تادیبی کاروائی ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ معمولی سے معمولی سمجھ رکھنے والا آدمی بھی اس فتویٰ کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ اسلام میں بندوں کے حقوق کا کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن بہر حال قرآن و سنت کا فیصلہ اٹل ہے۔ لہٰذا سوال میں جس شخص کے حوالے سے پوچھا گیا ہے اس پر لازم ہے کہ رب ذوالجلال

کے حضور اپنے گناہ کی معافی طلب کرے اور جو جو ایذاء رسانیاں کی ہیں' سائل سے ان کی معافی مانگے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

بات بات پر قسم اٹھانے کا شرعی حکم

سوال:

ایک شخص عادۃً ہر بات پر قرآن اٹھاتا ہے اور قسمیں کھاتا ہے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی سزا کیا ہے یا ہر بار اس کو کفارہ ادا کرنا ہوگا؟ برائے مہربانی اس کا جواب تفصیلاً دیا جائے۔ (نوٹ) وہ شخص صاحب ہوش و عقل ہے اور ایک دفتر میں ملازم ہے۔

[سائل: حافظ فیاض احمد' کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ بات بات پر قسم اٹھانا شرعاً لائق ملامت اور قابل مذمت فعل ہے۔ کیونکہ بہ کثرت قسمیں کھانے سے جہاں آدمی کے دل میں شرعی حدود و قیود سے غفلت و لاپرواہی پیدا ہوتی ہے وہاں اس کی بات میں بھی وزن اور اعتماد برقرار نہیں رہتا۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ کو قرآن مجید میں حکم دیا گیا کہ ''وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ'' آپ کسی بھی ایسے شخص کی بات نہ مانیں جو بہت زیادہ قسمیں اٹھاتا ہو۔ (القلم: ۱۰) اور مسلمانوں کو پابند کیا گیا کہ: ''وَلَا تَجْعَلُوْا اللّٰهَ عُرضة لايمانكم'' تم اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ (البقرۃ: ۲۲) بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ بات بات پر قسم نہ اٹھایا کرو۔ (تفسیر قرطبی وخزائن العرفان) اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ''وَاحْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ'' اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔ (المائدہ: ۸۹) صدر الافاضل فرماتے ہیں: یہ بھی حفاظت سے ہے کہ قسم کھانے کی عادت ترک کردی جائے۔

مذکورہ تمام تر تفصیل سے واضح ہوگیا کہ بات بات پر قسم اٹھانا شریعت مطہرہ کی نظر میں ایک مذموم اور برا فعل ہے۔ جہاں تک اس شخص کیلیے شرعی حکم (یعنی قسم کے کفارہ وغیرہ) کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ شخص' ماضی یا حال کے کسی واقعہ پر جان بوجھ کر قسم اٹھائے اور اس میں وہ جھوٹا ہو تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اور اس پر توبہ کرنا لازم ہوگی۔ اس

میں کفارہ نہیں ہے۔ اور اگر وہ شخص مستقبل کے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے تو اس پر اس قسم کو پورا کرنا لازم ہوگا (بہ شرط یہ کہ وہ کسی ناجائز کام کی قسم نہ ہو) اگر وہ اس قسم کو توڑ دے تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔ کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا دیدیا جائے یا انہیں کپڑا دیدیا جائے۔ اگر ان باتوں کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے مسلسل روزے رکھے جائیں۔ یہی کفارہ اس صورت میں ہے جب کوئی شخص مستقبل میں گناہ کی قسم کھائے۔ یعنی ایسی صورت میں لازم ہو جاتا ہے کہ آدمی اس قسم کو توڑ کر کفارہ دے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی چیز کی قسم کھائی پھر وہ اس چیز کے خلاف کرنے کو بہتر جانے تو وہ اس قسم کے خلاف کرے اور اس کا کفارہ دے۔ (صحیح مسلم: ۶۵۰)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

دو بیٹے اگر والدہ کے کفیل ہوں تو کس کی کیا ذمہ داری ہے؟

سوال:

ایک مکان جس میں دو بھائی والدہ سمیت رہائش پذیر ہیں اس میں دونوں بھائیوں کے درمیان والدہ کو ٹھہرانے کے مسئلہ میں جھگڑا ہے۔ کیونکہ بڑے بھائی نے اس مکان میں اپنے حصہ کو فروخت کر دیا ہے اور چھوٹا بھائی بھی اپنا حصہ فروخت کر رہا ہے۔ اب بڑا بھائی اس پر بہ ضد ہے کہ چھوٹا بھائی والدہ کو ساتھ لیجائے جب کہ چھوٹے بھائی کا کہنا ہے کہ ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہوا تھا کہ "جب تک والدہ زندہ ہے تب تک یہ مکان نہ دونوں بھائی فروخت کر سکتے ہیں نہ مکان کو چھوڑ سکتے ہیں' جو مکان چھوڑ کر جائے گا وہ والدہ کو ساتھ لے کر جائے گا"۔ اس معاہدہ کی رو سے بڑا بھائی والدہ کو لے کر جائے کیونکہ اس نے مکان کا اپنا حصہ فروخت کر دیا ہے۔

دونوں بھائیوں کے درمیان جھگڑے کے خاتمہ کے لیے ایک شخص کا مشورہ یہ ہے کہ اس مکان میں والدہ کا جو حصہ ہے وہ ایک بھائی لے لے اور والدہ کو اپنے ساتھ رکھے۔ جب

کہ بعض کا مشورہ یہ ہے کہ دونوں بھائی اس مکان کو چھوڑنے کے بعد باری باری (ایک ماہ یا دو ماہ) والدہ کو اپنے ساتھ رکھیں۔ برائے کرم آپ شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

نوٹ: والدہ دماغی اور ذہنی طور پر کمزور ہے اس لیے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ کس بیٹے کے یہاں ٹھہرا جائے؟ [سائل: محمد سکندر ولد محمد اسماعیل، نیو کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل (محمد سکندر) نے جو صورت حال بیان کی ہے اگر وہ درست ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً دونوں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہونا ہی نہیں چاہیے۔ کیونکہ والدہ کی خدمت عین عبادت اور ابدی سعادت کا باعث ہے۔ جھگڑے کے بجائے ہر بھائی کی جانب سے یہ کوشش ہونی چاہیے تھی کہ سعادت اور خدمت کا یہ موقع اسے حاصل ہو۔

قرآن کریم میں اللہ عزوجل نے فرمایا: ''وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ''

والدین کے لیے نرم دلی کے ساتھ عاجزی کا بازو جھکا کر رکھو۔ (بنی اسرائیل: ۲۴)

حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ذلیل ہو جائے، ذلیل ہو جائے ذلیل ہو جائے'' پوچھا گیا کون؟ فرمایا: جس نے اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا اور پھر بھی جنت کو حاصل نہ کر سکا۔

(صحیح مسلم: ۲۵۵۱، سنن ترمذی: ۳۵۴۵، مشکوٰۃ شریف: ۴۹۱۲)

قرآن کریم اور حدیث پاک کے مذکورہ ارشاد کا تقاضا یہ ہے کہ والدہ کے مسئلہ میں دونوں آپس میں قطعاً جھگڑا نہ کریں بلکہ خوشی سے اپنے پاس ٹھہرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

شرعی قانون کے مطابق مذکورہ جھگڑے کا حل یہ ہے کہ دونوں بھائی باری باری والدہ کو اپنے پاس ٹھرائیں۔ فتاویٰ عالمگیری (ج ۱ ص ۵۶۴) اور دیگر کتب فقہ میں یہ بات مرقوم ہے کہ کسی شخص کے دو بیٹے ہوں یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو ان پر اپنے والدین کا خرچ (رہائش، طعام وغیرہ) برابر ہے۔ یعنی سب برابری کے ساتھ شریک ہوں گے۔ لہٰذا زیر بحث سوال میں دونوں بھائی برابری کی بنیاد پر مسئلہ کو حل کریں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

جانوروں کو شوقیہ پالنے کا شرعی حکم

سوال:

زید بکری کا ایک چھوٹا بچہ خرید کر شوق کو پورا کرنیکی خاطر پالنے لگا کہ کچھ عرصے بعد بکری کا بچہ طبعی موت مر گیا آیا اس صورت میں زید نظر شرع میں مجرم ٹھہرے گا یا کہ نہیں؟ شوق پورا کرنے کی خاطر بکری کا بچہ پالنا جائز ہے یا کہ نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ [سائل: سراج احمد، کراچی]

جواب:

شوقیہ یا کسی بھی جائز مقصد کے لیے بکری کا بچہ پالنا شرعاً جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کے کھانے پانی کا بھرپور لحاظ رکھے اور اس کی نگہداشت میں قطعاً کوئی کمی نہ کرے۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشاد پاک کے مطابق ایک عورت اس وجہ سے عذاب میں گرفتار ہوئی کہ اس نے ایک بلی کو پالا اور اسے اتنا بھوکا رکھا کہ وہ مر گئی۔

(صحیح بخاری: ۳۳۱۸، صحیح مسلم: ۲۲۴۲، مشکوۃ شریف: ۱۹۰۳)

اس حدیث شریف سے جہاں اشارۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جانور کو پالنا شرعاً جائز ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی بھرپور نگہداشت بھی لازم اور ضروری ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کو ''ابو ہریرہ'' کی کنیت کیوں دی گئی؟ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے گھریلو جانور چرایا کرتا تھا، میرے پاس ایک چھوٹی سی بلی تھی جس کو رات کے وقت میں ایک درخت میں چھوڑ دیتا تھا اور دن میں اپنے ساتھ لیکر جاتا تھا اور اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے مجھے ''ابو ہریرہ'' کی کنیت دیدی۔ (سنن ترمذی: ۳۸۴۰) اس روایت سے معلوم ہوا کہ جانور کو شوقیہ پالنا شرعاً جائز ہے۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو منع فرما دیتے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

سمندر یا دریا کے کون سے جانور حلال ہیں؟

سوال:

سمندر یا دریا کے کون سے جانور حلال ہیں؟ نیز کیا سمندر اور دریا وغیرہ کی ساری مچھلیاں حلال ہیں؟ مغرا مچھلی جو بازار میں تلی ہوئی بک رہی ہے اس کا کھانا کیسا ہے؟

[سائل: محمد عرفان عطاری، لیاقت آباد]

جواب:

سمندری جانوروں میں احناف کے نزدیک صرف مچھلی کھانا جائز ہے۔ صدر الشریعہ قدس سرہ ''درمختار'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ''پانی کے جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے''۔

(بہار شریعت حصہ ۱۵ ص ۸۵)

صاحب ہدایہ علیہ الرحمۃ امام قدوری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''لا یوکل من حیوان الماء الا السمک ولا باس باکل الجریث والمار ماھی وانواع السمک'' پانی کے جانوروں میں صرف مچھلی کھائی جاسکتی ہے۔ جریث (سیاہ مچھلی کی ایک قسم) مار ماہی (سانپ کی شکل کی مچھلی) اور مچھلی کی دیگر اقسام کھانا جائز ہے۔ (ہدایہ اخرین ص ۴۴۲)

فتاویٰ شامی ج ۹ ص ۴۷۱، بدائع الصنائع ج ۵ ص ۵۹، اور فقہ حنفی کی تمام کتب میں اسی طرح مرقوم ہے۔ لہٰذا بازار وغیرہ میں مچھلی کے عنوان سے جتنی مچھلیاں بک رہی ہیں ان کا اگر بہ تحقیق مچھلی ہونا معلوم اور ثابت ہو جائے تو ان کا کھانا جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

جانوروں کے ساتھ ہمدردی کرنے میں لوگوں کو ایذاء پہنچانے کا مرتکب ہونا

سوال:

ہمارے برابر میں ایک کرایہ دار رہتے ہیں، ان کی عادت ہے کہ وہ بلیوں کو گوشت کے

ٹکڑے اور چھیچھڑے کھلاتے رہتے ہیں۔ ان کی اس عادت سے ہمارے گھر کے ہر طرف بلیوں نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ تقریباً کوئی بارہ پندرہ بلیاں جمع ہوگئی ہیں جو کہ ہمارے لیے طرح طرح کی پریشانیوں کا باعث بنتی جارہی ہیں۔ کبھی باورچی خانے میں گھس کر گندگی پھیلادیتی ہیں اور صحن بھی ہر طرف پاخانہ سے بھرا رہتا ہے جسے صاف کر کر کے گھر والے عاجز آچکے ہیں مگر چونکہ بلیوں کو نسبت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے اس لیے انہیں مارتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ شرعی اعتبار سے اس مسئلے کا حل کیا ہوگا؟

[سائل: محمد عبدالحفیظ، کراچی]

جواب:

جانوروں کی نگہداشت بلاشبہ ایک قابلِ تحسین اور باعث اجر فعل ہے۔ لیکن شرعی اعتبار سے اچھا کام کرنے میں بھی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو پڑوسی یا اور دیگر افراد کے لیے باعثِ ضرر اور تکلیف دہ نہ ہو۔ رسولِ کریم علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! مجھے یہ کیسے معلوم ہو کہ میں نے اچھا کیا یا برا کیا؟ فرمایا: جب تم اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو کہ تم نے اچھا کیا ہے تو بیشک تم نے اچھا کیا اور جب یہ کہتے سنو کہ تم نے برا کیا تو بیشک تم نے برا کیا ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

سوال میں جو صورتحال بیان کی گئی ہے وہ یقیناً باعثِ اذیت اور تکلیف دہ ہے۔ اس کے باوجود قرآن حکیم کی رو سے مستحسن طریقہ یہ ہے کہ درگزر کرتے ہوئے آپس میں مصالحت و مفاہمت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ ''**فمن عفا و اصلح فاجره على الله**'' جو درگزر کرتے ہوئے اصلاح سے کام لے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، کرایہ دار کو بھی چاہیے کہ اپنے عمل میں مثبت طریقہ اختیار کرے جو پڑوسی کے لیے باعثِ ضرر نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''والله لا يؤمن والله لايؤمن والله لايؤمن قيل من يارسول الله ﷺ؟ قال: الذى لا يامن جاره بوائقه''. (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۲۲)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا: وہ شخص مومن نہیں۔ پوچھا گیا کون؟ فرمایا: جس کی اذیتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ و مامون نہ ہو۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مجبوری کی صورت میں حرام کھانے کا شرعی حکم

سوال:

(۱) فدوی نے بارہا علماء سے سنا ہے کہ تمام عبادات کی مقبولیت کے لیے اکل حلال شرط اور لازمی ہے۔ حرام کھانے کی صرف اتنی گنجائش ہے کہ آدمی اضطراب کی حالت میں جان بچانے کی مقدار کھالے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا کھانا حرام ہو اور وہ اس میں سے صرف اتنا کھائے کہ اس کی جان بچ جائے تو اس صورت میں اس کی عبادات مقبول ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اس نے بہر حال حرام ہی کھایا ہے اگرچہ کم کھایا ہے؟

(۲) جس شخص کا کھانا پینا حرام ہو اگر وہ اذکار و استغفار کرے تو اس کے لیے مفید ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ براہ کرم تسلی بخش جواب دیکر مشکور فرمائیں؟

[سائل: ایک طالبعلم اشرف المدارس کراچی]

جواب:

(۱) صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ مضطر کے لیے اتنا حرام کھانا جس سے رمق حیات برقرار رہے جائز ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں حرام اشیاء سے شرعاً حرمت اٹھ جاتی ہے اور ان چیزوں کو بہ قدر ضرورت کھانا مضطر کے لیے مباح ہو جاتا ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

''اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O'' (البقرة: ۱۷۳)

یعنی اللہ نے تم پر جس کا (کھانا) حرام کیا ہے وہ صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، سو جو شخص مجبور ہو جائے جب کہ وہ نافرمانی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے۔

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''ان المقتضی للحرمة قائم فی المیتة والدم الا انه زالت الحرمة لقیام المعارض'' حرمت کا

تقاضا تو مردار اور خون میں اب بھی برقرار ہے لیکن رکاوٹ (ضرورت) کی وجہ سے حرمت زائل ہو چکی ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۹۴ 'مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور)

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''لا یأکل المضطر من المیتة الا قدر ما یمسك رمقه لان الاباحة للاضطرار وقد اندفع به''۔ (البقرۃ: ۱۷۳ ج ۱ ص ۶۰۱ 'مطبوعہ بیروت) مجبور شخص مردار جانور سے صرف اسی قدر کھا سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے کیونکہ شریعتِ مطہرہ کی طرف سے یہ اجازت فقط مجبوری کی صورت میں ہے اور جو مقدار بیان کی گئی اس سے مجبوری دور ہو جاتی ہے (لہٰذا اس سے زائد کھانے کی اجازت نہیں)۔

امام فخر الدین الرازی اور علامہ سید محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہما کی عبارات سے معلوم ہوا کہ حرام اشیاء مضطر آدمی کے لیے حرام نہیں رہتی ہیں بلکہ وہ مباح ہو جاتی ہیں یعنی ضرورت کی مقدار ان کا کھانا جائز ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی مضطر شخص اتنا ہی حرام کھائے جتنی اسے ضرورت ہو تو یقیناً اس کی عبادات مقبول ہیں۔ کیونکہ اس نے شرعی حکم کی مکمل پاسداری کی اور حد سے تجاوز نہیں کیا ہے۔

(۲) جو شخص مضطر نہ ہو اور اس کا کھانا پینا حرام ہو اس کے اذکار و تسبیحات اور دیگر اعمال اصولاً مقبول نہیں ہوتے۔ ہاں اگر اللہ تبارک و تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرمانا چاہے تو وہ قادرِ مطلق ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ عزوجل پاکیزہ ہے اور پاکیزہ چیز ہی قبول فرماتا ہے۔ اور اللہ عزوجل نے مومنوں کو اسی بات کا حکم فرمایا ہے جس کا حکم اپنے رسولوں کو فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ''یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ'' (المؤمنون: ۵۱) اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرتے رہو بے شک میں وہ تمام کام جاننے والا ہوں جو تم کرتے ہو۔ اور ارشاد فرمایا: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ'' (البقرۃ: ۱۷۲) اے ایمان والو! ان پاک چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے اس شخص کا ذکر فرمایا جو دور دراز کا سفر طے کر کے

آتا ہے' اس کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہوتے ہیں وہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا ہے: اے میرے رب! اے میرے رب! حالانکہ اس شخص کا کھانا حرام ہوتا ہے' اس کا پینا حرام ہوتا ہے' اس کا لباس حرام ہوتا ہے اور حرام سے وہ پرورش پاتا ہے تو اس کی دعا کہاں سے قبول ہوگی؟

(صحیح مسلم: ۱۰۱۵' سنن الترمذی: ۲۹۸۹' مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۸' مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۱)

امام حافظ ابو العباس قرطبی علیہ الرحمۃ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ: ''**اکل الحرام یفسد القلوب فتحرم الرقة و الاخلاص فلاتقبل الاعمال**'' حرام کھانا دلوں کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے دلوں سے نرمی اور اخلاص ختم ہو جاتا ہے' اس لیے حرام کھانے والے کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔ حدیث مذکور میں جو فرمایا کہ: اس کی دعا کہاں سے قبول ہوگی؟ اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''**معناه انه ليس اهلا لاجابة دعائه لكن يجوز ان يستجيب الله له تفضلا و لطفا و كرما**'' دعا کے قبول نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بندہ اس قابل نہیں رہتا ہے کہ اس کی دعا مقبول ہو۔ ہاں اللہ تبارک وتعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما سکتا ہے۔ (المفہم ج ۳ ص ۵۹-۶۰' بیروت)

نوٹ: جواب مذکور میں جہاں جہاں مضطر اور اضطرار کا لفظ آیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو اتنی بھوک اور پیاس لگے کہ اسے مرجانے کا خطرہ لاحق ہو اور اسے حلال طعام نہ ملے۔ ایسا شخص صرف جان بچانے کی مقدار حرام کھا سکتا ہے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب

علم نجوم حاصل کرنے کا حکم

سوال:

(۱) ہاتھ دیکھ کر کوئی چیز بتانا' ستاروں کا علم رکھنا اور اس پر ایمان رکھنا کیسا ہے؟

(۲) بعض لوگ نام اور عمر پوچھ کر شخصیت کے احوال بتاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

[سائل: محمد ارشاد اورنگی ٹاؤن]

جواب:

(۱) ستاروں کا علم حاصل کرنا علماء نے ممنوع قرار دیا ہے۔ صرف اتنی مقدار کو جائز قرار دیا ہے جس کی بناء پر خشکی اور خصوصاً سمندری سفر میں راستوں کی صحیح سمتوں کے تعین میں آسانی ہو اور نمازوں کے اوقات اور قبلہ کی سمت کی تحقیق ہو سکے۔ احیاء العلوم میں حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے امام غزالی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ستاروں کا وہ علم حاصل کرو کہ جس سے تم بحروبرّ میں راستوں کی ہدایت حاصل کرسکو۔ اس سے زیادہ حاصل کرنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو منع فرمایا اس کی تین وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ یہ علم اکثر مخلوق کے لیے مضر ہے کیونکہ عوام جب یہ علم سیکھیں گے تو وہ یہ عقیدہ بنائیں گے کہ ستاروں کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ستاروں کے احکام محض اندازوں پر مبنی ہوتے ہیں جن کا اعتبار نہیں ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ جو چیز مقدر کردی گئی ہے اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ (احیاء العلوم ج ۱ ص ۴۸ 'مطبوعہ بیروت)

علی العموم ستاروں کا علم حاصل کرنے سے جو منع کیا جاتا ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد پاک ہے کہ جس نے ستاروں کا علم حاصل کیا اس نے جادو کا علم حاصل کیا۔ (سنن ابوداؤد: ۳۹۰۵) اور جادو کا علم سیکھنا کفر کی طرف لے جاتا ہے ورنہ کم از کم حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ تو یہی معاملہ ستاروں کے علم کا ہے۔

جہاں تک ہاتھ دیکھ کر کسی چیز کے بتانے اور اس پر ایمان رکھنے کا معاملہ ہے تو اس کے شرعی حکم کی تین صورتیں ہیں:

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں کہ کاہنوں اور جوتشیوں (یعنی نجومیوں) سے ہاتھ دکھا کر تقدیر کا بھلا برا دریافت کرنا: (۱) اگر بطور اعتقاد ہو یعنی جو یہ بتائیں حق ہے تو کفرِ خالص ہے۔ اسی کو حدیث میں فرمایا: "**فقد کفر بما نزّل علی محمد** ﷺ"۔ (۲) اور اگر بطور اعتقاد و تیقّن نہ ہو مگر میلان اور رغبت (دلی خواہش) کے ساتھ ہو تو گناہ کبیرہ ہے۔ اسی کو حدیث میں فرمایا: "**لن یقبل اللّٰہ صلاتہ اربعین صباحاً**" اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہ فرمائے گا (۳) اور اگر بطور ہزل واستہزاء

(مذاق وخوش طبعی) ہو تو عبث ومکروہ وحماقت ہے۔ ہاں اگر انہیں عاجز اور بے بس ظاہر کرنے کے ارادے سے ہو تو حرج نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۳۶۱ طبع قدیم)

(۲) نام اور عمر پوچھ کر شخصیت کے احوال بتانا محض گمان اور تخمینوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں مشغول ہونا محض فضول اور لغو ہے۔ اس میں بھی یقین اور عدم یقین کی بعض صورتیں گمراہی یا کفر کا سبب بن سکتی ہیں۔ صاحب ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر بے مقصد چیز کو ترک کر دے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من حسن اسلام المرء ترکه مالایعنیه'' کسی بھی شخص کے اسلام کی عمدگی یہ ہے کہ وہ بے مقصد چیزوں کو چھوڑ دے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۱، مشکوٰۃ شریف: ۴۸۳۹)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

جعلی سند کی بنیاد پر کوئی عہدہ حاصل کرنا

سوال:

(۱) کوئی شخص جعلی سند حاصل کر کے زکوٰۃ کمیٹی کی چیئرمین شپ حاصل کر لیتا ہے وہ قانونی طور پر تو مجرم ہے اس شخص کے لیے شرعی حکم کیا ہوگا؟

(۲) مذکورہ شخص زکوٰۃ فنڈ کی اسکیم (اجتماعی شادی پیکیج) سے اپنے بیٹے کے لیے جو کہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے کچھ رقم حاصل کر لیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

[سائل: حافظ محمد خلیل، اورنگی ٹاؤن]

جواب:

(۱) جو شخص کسی عہدہ اور منصب کا اہل نہ ہو اس کا اس منصب کے حصول کے لیے جعلی سند حاصل کرنا اور اس سند کی بنیاد پر مطلوبہ عہدہ حاصل کرنا قانونی طور پر جرم ہونے کے ساتھ ساتھ شرعی نقطہ نظر سے بھی جرم ہے۔ کیونکہ جعلی سند حاصل کر کے کسی منصب پہ فائز ہونا کئی خرابیوں کو متضمن ہے۔ اس میں آدمی ایک جگہ نہیں، متعدد جگہ کذب بیانی کرتا ہے اور لوگوں پر اپنی سچائی ثابت کر کے فریب کاری اور دھوکہ دہی کا مرتکب ہوتا ہے اور دھوکہ دہی کے سہارے خیانت و بددیانتی کا ارتکاب کرتا ہے۔ سب سے بڑھ کر

یہ کہ جعلی سند حاصل کرنے والا کسی عہدہ پر فائز ہوکر درحقیقت اس منصب کی اہلیت رکھنے والے افراد کی حق تلفی کرتا ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام خامیاں خرابیاں نظرِ شرع میں گناہِ کبیرہ سے کم نہیں! اس لیے جعلی سند کی بنیاد پر کوئی منصب یا عہدہ (مثلاً زکوٰۃ کمیٹی کی چیئر مین شپ) حاصل کرنے والا قانون کے علاوہ شریعت کی نگاہ میں بھی مجرم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیامت کے متعلق ایک اعرابی کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا: ''اذاضیّعت الامانۃ فانتظر السّاعۃ'' جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرنا! اعرابی نے پوچھا کہ امانت کس طرح ضائع کی جائے گی؟ فرمایا: ''اذاوسّد الامر الٰی غیر اھلہٖ فانتظر السّاعۃ'' جب کوئی عہدہ کسی نااہل کے سپرد کردیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ (صحیح بخاری: ۵۹)

فی زمانہ پاکستانی سیاست اور بہت سارے معاملات اسی نااہلیت کے جھوٹے سہارے پر چل رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مناصب کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا کریں جو ان مناصب کے اہل ہوں۔

(۲) جو رقم زکوٰۃ کے فنڈ میں جمع کی جائے اس سے کسی غیر مستحق فرد کی امداد شرعاً جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ شخص کا بیٹا واقعۃً اگر زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے تو اس کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے رقم لینا شرعاً ممنوع اور قابلِ گرفت ہے۔ جو رقم لی ہے اس کو واپس لینا ضروری ہے۔

واللّٰہ وَرَسُولہ اعلم بالصواب

بالوں کو ڈائی کروانے کا حکم

سوال:

آج کل بہت سارے نوجوان خوبصورتی کے لیے سر کے بالوں کو ڈائی کرواتے ہیں۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

[سائل: سید محمد ثقلین حیدر گلشن جمال]

جواب:

اللہ تعالیٰ نے جسمانی اعتبار سے انسان کو ایک مخصوص ساخت اور بناوٹ عطا فرمائی ہے

اسی طرح اعضاء کے درمیان یا ان اعضاء کے اجزاء کے درمیان ایک حد تک رنگت کا فرق بھی رکھا ہے۔ جیسا کہ ہونٹ، ہتھیلی، بازو، آنکھ اور بالوں کے درمیان فرق واضح ہے۔ ان اعضاء یا اجزائے بدن کو اس طرح مختلف شکلوں اور متفرق رنگت کے ساتھ پیدا کرنا یقیناً عظیم حکمت الٰہیہ کا نتیجہ ہے۔ شیطان لعین نے اسی حکمت الٰہیہ کے خلاف تحریک چلانے کا دعویٰ کیا تھا۔ چنانچہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں مردود قرار دیئے جانے کے بعد اس نے کہا تھا: ''وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ'' میں لوگوں کو ضرور حکم دوں گا وہ اللہ کی پیدا کردہ صورت کو بدل ڈالیں گے۔ (النساء: ۱۱۹)

اس آیت مبارکہ اور اس کی متعدد تفاسیر کی رو سے دیکھا جائے تو بدن کے اجزاء کی قدرتی بناوٹ اور ان کی رنگت میں تبدیلی شیطانی منصوبہ کی تکمیل ہی معلوم ہوتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج کل کے نت نئے فیشن، زیب و زینت اور خوبصورتی کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں اور خوبصورتی کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خوبصورتی اللہ کے نزدیک وہی محبوب ہوگی جو نفسانی خواہشات اور شیطانی منصوبہ جات کی پیروی سے پاک ہو۔ اس لیے ہمارے نزدیک وہ لوگ جنہیں اللہ نے سیاہ بال عطا فرمائے ہیں اور جنہیں جھوٹی خوب صورتی کے لیے تبدیلیوں کی ضرورت نہیں پڑتی انہیں اپنے بالوں کو ڈائی کرانے سے بچنا چاہیے۔ ہاں! جن کے بال سفید ہو گئے ہیں انہیں چونکہ خود شریعت مطہرہ نے رنگنے کی اجازت دی ہے اور سیاہ خضاب کے علاوہ دیگر رنگوں کا حکم فرمایا ہے لہٰذا وہ لوگ اپنے بال رنگ سکتے ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

جو شخص باقاعدہ عالم نہ ہو اس کا درسِ قرآن دینا

سوال:

ہماری مسجد کے امام صاحب نے درسِ قرآن دینا شروع کیا اور الحمد للہ سورۃ الحجرات اور سورۃ النساء کو مکمل کیا اور اب سورۃ البقرہ کا درس دے رہے ہیں۔ ایک شخص نے مسجد کمیٹی کو کہا کہ غیر عالم کو درس قرآن دینا حرام ہے تو مسجد انتظامیہ نے امام صاحب کو کہا کہ درس قرآن دینا بند کر دیں۔ ہماری مسجد کے امام صاحب نے کہا کہ میں ایسے درس قرآن نہیں دیتا

بلکہ کافی تفاسیر سے مطالعہ کر کے اور غور وفکر کر کے دیتا ہوں۔ اس پر انتظامیہ نے کہا کہ بحث نہیں کرتے ہم نے کہہ دیا ہے اور علمائے کرام فرماتے ہیں کہ غیر عالم درس قرآن نہیں دے سکتا۔ تو قبلہ مفتی صاحب! ہمارے امام صاحب بہترین حافظِ قرآن' قاری اور درسِ نظامی کے چند سال یعنی کچھ کتابیں علامہ مفتی کرامت اللہ صاحب اور مفتی محمد شفیع حامدی صاحب اور بھیرہ شریف کی شاخ دار العلوم ضیاء القرآن گجرات سے پڑھی ہیں اور کراچی یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان دے رہے ہیں اور کافی تفاسیر سے مطالعہ کرتے ہیں مثلاً تفسیر مظہری' ابن کثیر' ضیاء القرآن' تفسیر الحسنات' تفسیر نعیمی' تبیان القرآن' جلالین شرح کمالین اور احادیث کی کافی کتب موجود ہیں و دیگر متفرق کتب بھی ہیں ان سے مطالعہ کرتے ہیں ایسا شخص درس دے سکتا ہے یا نہیں؟ غیر عالم سے کیا مراد ہے؟ درس قرآن ضیاء القرآن سے دیکھ کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ ہمارے امام صاحب خطابت یعنی وعظ کر سکتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غیر عالم کا وعظ حرام ہے۔ امام صاحب کو تقریباً بارہ سال امامت کرتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ لوگ بھی ان کی امامت سے خوش ہیں۔ برائے مہربانی رہنمائی فرما کر احسان فرمائیں۔ [سائل: محمد ضیاء خورشید بدایونی' نارتھ کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں سائل نے جو صورت حال بیان کی ہے اگر وہ درست ہے تو شرعی نقطہ نظر سے امام مذکور کے درس دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت امام احمد رضا محدث بریلوی نور اللہ مرقدہ سے ایک جاہل شخص کے متعلق سوال کیا گیا جو کسی عالم کی تصنیف سے درس دے تو آپ نے اس کو جائز قرار دیا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۵۹۶)

مقام غور ہے کہ ایک جاہل شخص کا کسی عالم کی تصنیف سے درس دینا جائز ہے تو جو امام باضابطہ طور پر علم دین سے شغف رکھتا ہو اور علمائے مفسرین کی تحقیقات و تصانیف کا مکمل مطالعہ کر کے انہی باتوں کو بیان کرے جو علمائے امت نے ارقام فرمائی ہیں تو اس میں شرعاً کیا قباحت ہو سکتی ہے؟

ہمارے نزدیک مذکورہ امام کا درس دینا نہ صرف جائز بلکہ انتہائی عظیم علمی اور مذہبی خدمت ہے۔ عوام الناس اور مسجد انتظامیہ پر لازم ہے کہ امام کے ساتھ تعاون کریں اور لوگوں

میں اس محفل سے فائدہ اٹھانے کا شعور بیدار کریں۔ خصوصاً اس لیے کہ ہمارے زمانے میں محافل نعت کا رواج بہت بڑھ چکا ہے اور عوام الناس بھی بہت ذوق وشوق سے رات رات بھر جاگ کر ان محافل میں شرکت کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس اہل سنت کے مخالفین مسجد مسجد اور گھر گھر درسِ قرآن اور درسِ حدیث کے عنوان سے لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہلسنّت کی کسی مسجد میں علمی درس کی محفل کا انعقاد ہوتا ہے اور لوگ بھی اس کی تائید اور حمایت کرتے ہیں تو ایسے سلسلے کو روکنا قطعاً درست نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اپنی ہی قوّت کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ فروغِ علم کی محافل کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ ارشادِ ربانی ہے: ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ (المائدہ:۲)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

ڈاڑھی منڈے شخص کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور فاسق وفاجر کی تعریف کرنے کا حکم

سوال:

ایسا شخص جو ڈاڑھی منڈواتا ہو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا کیسا ہے؟ اور اس کو دنیا کی زندگی یا مرنے کے بعد فاسق وفاجر کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کوئی شخص ایسے آدمی کی تعریف کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آیا اس کو اس سے منع کیا جائے یا نہیں؟

[سائل: حافظ محمد ارشد مدنی، گلشن اقبال]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ جو شخص ڈاڑھی منڈواتا ہو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا جائز نہیں ہے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں کہ پیری کے لیے چار شرطیں ہیں، اگر ان میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو اس کے ہاتھ پر بیعت ناجائز ہے:

اول سنی صحیح العقیدہ ہو۔ دوم اس کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ تک متصل ہو۔ سوم فاسق معلن نہ

ہو۔ چہارم بقدرِ ضرورت علم رکھتا ہو کہ اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب کر سکے (یعنی جن امور کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل کر سکے اور جن امور سے شرعاً روکا گیا ہے ان سے اپنا بچاؤ کر سکے)۔ (فتاویٰ امجدیہ ج ۴ ص ۳۲۲)

اس عبارت میں تیسری شرط قابلِ غور ہے کہ پیر ''فاسق معلن'' نہ ہو یعنی علانیہ فسق کا مرتکب نہ ہو۔ سوال مذکور میں جس پیر کے حوالے سے پوچھا گیا ہے وہ ڈاڑھی منڈواتا ہے اور ڈاڑھی منڈوانے والا شرعاً فاسق معلن ہے۔ لہٰذا ایسے شخص سے بیعت ہونا جائز نہیں ہے۔ اور جب تک وہ اپنی اس حالت پر برقرار ہو اس کو فاسق کہہ سکتے ہیں اور جو فاسق و فاجر کی تعریف کرے وہ غضبِ الٰہی کا مستحق ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ حدیثِ پاک میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اذا مدح الفاسق غضب الرب تعالٰی و اهتزّله العرش'' جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ غضب فرماتا ہے اور عرشِ الٰہی ہلنے لگتا ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۴۱۴) واللّٰہ و رسوله اعلم بالصواب

حقیقی والد کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے کا حکم

سوال:

ایک شخص ہے جس کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ جب یہ شخص 25 دن کا تھا تو اس کی والدہ کو طلاق ہو گئی تھی۔ اب یہ شخص اپنے والد کے پاس دن کا کچھ حصہ رہا اور اس کی والدہ اپنے والدین کے گھر جا چکی تھی۔ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے اپنے باپ کے پاس یہ شخص نڈھال ہوا تو برادری کے پنچ نے والد کے حکم سے اس شخص کو والدہ کے حوالے کرنا چاہا تو والدہ نے کہا کہ بچہ کو اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جب پنچ اس کے والد سے یہ حکم نامہ لکھوا کر لائے کہ یہ (بچہ) اس کی والدہ کے پاس ہی رہے گا۔ والد کا اس پر کوئی حق نہیں ہوگا۔ پھر اس شخص کی والدہ نے دوسرے شخص سے شادی کر لی اور یہ شخص والدہ کے پاس ہی پرورش پاتا رہا اور یہ اپنے نام کے ساتھ والد کے نام کی جگہ اپنے سوتیلے والد کا نام لکھواتا رہا ہے اور اب

شادی فارم پر والدہ کے پہلے شوہر کا نام لکھوانے سے گریز کر رہا ہے اور سوتیلے باپ کا نام لکھوانا چاہتا ہے۔ آیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔ [سائل: غلام پیر پریٹ آباد حیدر آباد]

جواب:

صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ ولدیت میں حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کا نام استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ادعوھم لاٰباء ھم'' (الاحزاب: ۵) انہیں ان کے باپ ہی کا کہہ کر پکارو۔ اور حدیث شریف میں اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''من ادعیٰ الی غیر ابیه وھو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام''۔ (صحیح بخاری: ۶۷۶۶، صحیح مسلم: ۶۳، سنن ابوداؤد: ۵۱۱۳، سنن ابن ماجہ: ۲۶۱) جس شخص نے یہ جانتے ہوئے کہ فلاں شخص میرا حقیقی باپ نہیں ہے پھر بھی اس کی طرف اپنی نسبت کی تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے۔

مذکورہ آیت مبارکہ اور حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ کسی بھی شخص کا اپنے آپ کو حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔ خصوصاً نکاح میں ایسا کرنا سنگین غلطی ہے۔ اسلیے کہ نکاح میں لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت صحیح ولدیت کا تعین ضروری ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص لوگوں کے درمیان سوتیلے باپ کے نام سے مشہور ہو یعنی لوگ اسے سوتیلے باپ کے نام ہی سے پہچانتے ہوں تو سوتیلے باپ کے نام سے بھی نکاح ہو جائے گا۔ لیکن نکاح نامہ پر اصل باپ کا نام لکھ کر ساتھ ہی یہ بڑھا دیا جائے ''معروف سوتیلا بیٹا فلاں''۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ حقیقی والد کون ہے اور لوگوں میں کس سے معروف ہے۔

(وقار الفتاویٰ ج ۳ ص ۴۰ ملتقطاً و موضحاً) واللہ و رسوله اعلم بالصواب

ساس کا اپنے داماد اور نواسے سے پردہ کرنا

سوال:

کیا ساس اپنے داماد اور نواسے سے پردہ کرے گی یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرمائیں؟ [سائل: عبدالکریم پیر کالونی]

جواب:

جاننا چاہیے کہ عورت کے بعض قرابت دار وہ ہوتے ہیں جن سے پردہ کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ اور بعض قرابت دار وہ ہیں جن سے پردہ کرنا واجب ہے اور بعض قرابت دار یا تعلق دار وہ ہیں جن سے پردہ کرنے نہ کرنے دونوں کا اختیار ہے البتہ فتنہ پیدا ہونے کی صورت میں پردہ ہی مناسب ہے۔

(۱) عورت کے وہ متعلقین جن سے عورت کا نسبی رشتہ ہے اور کبھی ان سے نکاح نہیں ہوسکتا ان سے پردہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ جیسے باپ دادا' بھائی بھتیجا' چچا' ماموں' بیٹا' پوتا' نواسا۔

(۲) اور وہ متعلقین جن سے فی الحال نکاح کرنا جائز نہ ہو لیکن فی الواقع نکاح کیا جاسکتا ہو' جیسے بہنوئی۔ کہ جب تک بہن زندہ ہے اس سے نکاح نہیں ہوسکتا لیکن بہن کی وفات یا طلاق کے بعد عورت بہنوئی سے نکاح کرسکتی ہے۔ یا جیسے عورت کے چچازاد' ماموں زاد' پھوپھی زاد بھائی یا جیٹھ اور دیور' ان سب سے پردہ شرعاً واجب ہے۔

(۳) اور عورت کے وہ متعلقین جن سے نکاح تو ہمیشہ کو حرام ہے لیکن وہ نسبی رشتہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دودھ کے رشتہ کی وجہ سے یا سسرالی رشتہ کی وجہ سے نکاح حرام ہے' جیسے ساس کے لیے داماد اور بہو کے لیے سسر' ان کا باہمی پردہ شرعاً نہ واجب ہے نہ ممنوع۔ یعنی کرنا نہ کرنا دونوں جائز ہیں' البتہ بحالت جوانی یا کسی فتنہ کا خدشہ ہونے کی صورت میں پردہ ہی مناسب بلکہ واجب اور باعثِ عافیت ہے۔

(پردہ کی مکمل تفصیل امام اہل سنت عظیم المرتبت الشاہ احمد رضا خان قدس سرہ العزیز نے فتاویٰ رضویہ قدیم' ج ۱۰ ص ۲۶۳ اور ۲۱۴ پر بیان فرمائی ہے۔)

اس تفصیل کی روشنی میں صورت مسئولہ کا جواب واضح ہے کہ عورت اپنے نواسے سے پردہ نہیں کرے گی۔ اور داماد سے پردہ کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے۔ الا یہ کہ کسی فتنہ کا خدشہ ہو تو پردہ کرنا واجب ہوگا' جیسا کہ اوپر وضاحت سے مذکور ہو چکا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

خواتین کا دینی اجتماعات میں شرکت کرنا

سوال:

اگر کوئی عورت شرعی پردے میں دعوت اسلامی یا دیگر اسلامی، روحانی تبلیغی اجتماعات میں شرکت کریں تو ان کو ثواب ملے گا یا نہیں؟ [سائل: سید منور شاہ، سنگھو پیر]

جواب:

ایسے دینی اجتماعات جن میں قرآن وسنت کی روشنی میں احکام شرعیہ اور مسلک حق اہل سنت کے عقائد و معمولات کی تبلیغ کی جاتی ہو انبیاء کرام خصوصاً سید الانبیاء حضور سرور کائنات ﷺ اور اولیائے امت کی تعظیم ومحبت کا درس دیا جاتا ہو ان میں خواتین کا شرکت کرنا بلاشبہ جائز اور باعث ثواب ہے۔ خصوصاً اس دور میں جب کہ خواتین کا بیشتر وقت بے مقصد زیب و آرائش، بازاروں کی سیر اور دیگر لغو کاموں میں ضائع ہوتا ہے، ایسے دینی اجتماعات کا انعقاد یقیناً باعث برکت ہے۔ کہ ایسے اجتماعات میں اگر خواتین شرکت نہ کریں تو اغلب یہ ہے کہ ان کا یہ وقت کسی کی غیبت یا متذکرہ فضول کاموں میں سے کسی کام میں صرف ہوگا جو کہ شرعاً قابل گرفت ہے۔ اس لیے مردوں کے اجتماعات منعقد کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کی اصلاح کے لیے بھی دینی اجتماعات کا انعقاد ہونا چاہیے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ عورتوں میں ناواقفیت غالب ہوتی ہے۔

خواتین کے دینی اجتماعات منعقد کرنے اور اس میں خواتین کی شرکت کا حکم درج ذیل حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:

"قال النساء للنبی ﷺ غلبنا علیك الرجال فاجعل لنا یوما من نفسك فوعدهن یوما لقیهن فیه فوعظهن وامرهن. (ولفظ مسلم) فاجعل لنا من نفسك یوما ناتیك فیه تعلمنا مما علمك الله قال اجتمعن یوم كذا و كذا فاجتمعن فاتاهن رسول الله ﷺ فعلمهن مما علمه الله".

(صحیح بخاری: ۱۰۱، صحیح مسلم: ۲۶۳۳)

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ خواتین نے آکر عرض کی کہ آپ کے پاس (حصول علم میں) مرد ہم پر سبقت لے گئے ہیں' اس لیے آپ اپنی جانب سے ہمارے لیے ایک دن مخصوص فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمایا' جس میں آپ نے انہیں نصیحت اور تبلیغ فرمائی۔ (صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ:) آپ ہمارے لیے اپنی جانب سے ایک دن مقرر فرمادیں جس میں ہم آپ کے پاس آئیں اور آپ ہمیں وہ باتیں سکھائیں جو آپ کو اللہ عزوجل نے سکھائی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم فلاں فلاں دن جمع ہوجانا' وہ جمع ہوئیں' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں وہ باتیں سکھائیں جو اللہ عزوجل نے آپ کو سکھائیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

لوگوں سے اپنی تعظیم واحترام کی خواہش رکھنا

سوال:

جو شخص دل میں ایسا خیال رکھتا ہو کہ میرے آنے جانے پر لوگ تعظیما کھڑے ہوں' اس کے بارے میں شریعت نے کیا وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں؟ [سائل: عبدالحفیظ' کراچی]

جواب:

حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ''سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول من سره ان یتمثل له الرجال فلیتبوأ مقعده من النار'' (جامع ترمذی ج ۲ ص ۱۰۴' ابوداؤد ج ۲ ص ۳۶۳' مشکوۃ المصابیح ص ۴۰۳) میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ لوگ اس کے لیے (تعظیما) کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

علامہ علی بن سلطان محمد القاری الحنفی علیہ الرحمۃ حدیث مذکور کی شرح میں لکھتے ہیں:

''لفظه الامر و معناه الخبر کانه قال: من سره ذالك وجب له ان ینزل منزله من النار. قیل: هذا الوعید لمن سلك فیه طریق التکبر بقرینة السرور للمثول واما اذا لم یطلب ذالك وقاموا من تلقاء انفسهم طلبا للثواب او لا رادة التواضع فلا باس به''. (مرقات ج ۸ ص ۴۷۶)

یعنی حدیث مذکور میں "فلیتبوأ" امر کا لفظ ہے لیکن خبر کے معنی میں ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا: جو یہ چاہتا ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ جہنم میں اپنا گھر بنا لے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جو تکبر کی نیت سے اس راستے کو اختیار کرے۔ کیونکہ حدیث پاک میں سرور (چاہت اور خواہش) کا لفظ آیا ہے۔ ہاں! جس کا مقصد (لوگوں سے اپنی تعظیم کروانا) نہ ہو بلکہ لوگ از خود ثواب کی نیت سے یا انکساری کا اظہار کرتے ہوئے کھڑے ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یعنی وعید اس کے لیے ہے جو اپنی تعظیم کی خواہش رکھتا ہو۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

سوتیلی ماں کی کفالت کا شرعی حکم

سوال:

مرحوم محمد بدر نے دو بیوائیں چھوڑیں۔ ایک بیوہ سے ایک بیٹا اور بیٹیاں ہیں، جب کہ دوسری بیوہ سے بیٹیاں ہیں۔ بیٹا اپنی سگی ماں کی پوری کفالت کر رہا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بتائیں کہ کیا بیٹے پر اپنی سوتیلی ماں کی کفالت کی بھی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ وراثت کے معاملات پہلے ہی شریعت کے مطابق انجام پا چکے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا کوئی سوال یا ابہام نہیں۔ براہ کرم جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ [سائل: ڈاکٹر فاروق حسن، کراچی]

جواب:

شرعی نقطہ نظر سے کسی شخص پر اپنی سوتیلی والدہ کی کفالت (نفقہ وغیرہ) "واجب" نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "ان کان للاب زوجتان او اکثر لم یلزم الابن الا نفقة واحدة" (عالمگیری ج ا ص ۵۶۵) کسی شخص کی دو یا دو سے زائد بیویاں ہوں تو بیٹے پر صرف ایک کی کفالت لازم ہوگی۔

"وفی مقام اٰخر فی الھندیة وفی التاتارخانیة: ان کان للرجل المعسر زوجة لیست ام ابنه الکبیر لم یجبر الابن علی ان ینفق علی امرء ة ابیه".

(فتاویٰ عالمگیری ج ا ص ۵۶۵، فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۴ ص ۲۴۸)

یعنی اگر کسی تنگدست آدمی کی بیوی ہو جو اس کے بڑے بیٹے کی والدہ نہ ہو تو بیٹے کو اپنے والد کی زوجہ (سوتیلی ماں) کی کفالت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص پر اپنی سوتیلی ماں کی کفالت شرعاً واجب نہیں ہے۔ تاہم اس بات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ سوتیلی ماں اگر مجبوری، ضرورتمندی اور تنگی کا شکار ہو تو صاحبِ استطاعت بیٹے کو اپنی جانب سے ازراہِ تبرع (رضائے الٰہی) اور فضل وحسن سلوک والد کی منکوحہ ہونے کے ناطے سوتیلی ماں کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے والد سے تعلق رکھنے والے جملہ افراد کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: ''ان من ابرّ البرّ صلة الرجل اهل ودّ ابيه بعد ان يولّيه'' (صحیح مسلم: ۴۹۱۷) بلاشبہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کی غیر موجودگی (موت یا سفر) کی صورت میں والد سے تعلق رکھنے والے تمام اہل محبت کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔ واللہ ورسوله اعلم بالصواب

شوہر کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنے کا شرعی حکم

سوال:

ایک عورت نے کوئی ایسا کام کیا جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے کہا کہ اگر یہ بات جو تمہارے حوالہ سے مجھ تک آئی ہے اگر سچ ثابت ہوئی تو میں خودکشی کرلوں گا تو عورت نے قرآن مجید کے اوپر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ اور یہ عورت نے اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے اس طرح جھوٹ بولا۔ آیا اب اس کا ازالہ کیسے ہوگا؟

[سائل: سید وقاص ہاشمی، کراچی]

جواب:

سوال مذکور میں عورت کا اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا اور قرآن مجید پر ہاتھ رکھنا قابلِ گرفت نہیں ہے۔ علامہ شامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''ان امکن التوصل الیه بالکذب وحده فمباح ان ابیح تحصیل ذالک المقصود وواجب ان وجب تحصیله. ولو ساله سلطان عن فاحشة وقعت منه سرا کزنا او شرب فله ان یقول ما فعلته لان اظهار ها فاحشة اخریٰ''.

(فتاویٰ شامی' ج۹' ۵۲۵)

یعنی اگر کوئی اچھا مقصد حاصل کرنا صرف جھوٹ سے ممکن ہو تو جھوٹ جائز ہے بشرطیکہ اس مقصد کا حصول لازمی نہ ہو۔ اور اگر اس مقصد کا حصول واجب ہو تو اس صورت میں جھوٹ بولنا واجب ہے۔ اگر بادشاہ کسی شخص سے اس کی بدکاری کے متعلق سوال کرے جو اس نے چھپ کر کی ہو مثلاً زنا کاری یا شراب نوشی تو آدمی کو اختیار ہے کہ وہ بادشاہ سے کہے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ کیونکہ اس کام کو ظاہر کرنا ایک اور بڑا گناہ ہے۔

نوٹ: لیکن یہ بات واضح رہے کہ یہاں جھوٹ سے ''تعریض'' مراد ہے۔ یعنی ایسا کلام کرنا جس کے دو معنی ہوں' ایک معنی ظاہر اور ایک معنی باطن۔ اور ان دونوں میں سے ایک سے اپنا مقصد پورا کرنا اور دوسرے کو اپنی مراد بنانا' تاکہ جھوٹ بولنا لازم نہ آئے۔ حضرت اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کذب صرف تین مواقع پر جائز ہے: ایک یہ کہ آدمی اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے کوئی بات کرے' دوسرا جنگ کے موقع پر (دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے) اور تیسرا جھگڑنے والوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے۔ (سنن ترمذی: ۱۹۳۹) علامہ شامی قدس سرہ صاحب مجتبیٰ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ امام طحاوی اور دیگر ائمہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں کذب سے تعریض مراد ہے' حقیقی جھوٹ مراد نہیں ہے' کیونکہ وہ حرام ہے۔ (علامہ شامی مزید فرماتے ہیں:) اس طرح کا کلام جو تعریض پر مشتمل ہو' اُس کو چونکہ ضرورت کے تحت جائز قرار دیا گیا ہے' اس لیے بلاضرورت اس کی اجازت نہیں ہوگی' کیونکہ ایسا کلام اگرچہ ظاہراً جھوٹ پر مشتمل نہیں ہوتا لیکن اس میں جھوٹ کا شائبہ موجود ہوتا ہے۔ (فتاویٰ شامی ج۹ ص۵۲۶) البتہ اگر کبھی ایسی صورت در پیش ہو جائے جس میں ''تعریض'' بھی ممکن نہ رہے تو پھر بوقت ضرورت کذب پر مشتمل کلام کی اجازت ہو گی۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

اولاد کے لیے جائیداد وقف کرنا

سوال:

ایک عورت اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد کا تمیں فیصد حصہ اپنی خواہش کے مطابق کسی کو بھی دینا چاہتی ہے۔ باقی ستر فیصد حصہ اپنی اولاد کے نام وقف کرنا چاہتی ہے تا کہ اس سے ہونے والی آمدنی سب اولاد میں برابر تقسیم ہو۔ واضح رہے کہ اس کی اولاد بالغ اور شادی شدہ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے۔ خاتون بیوہ ہیں اور ان کا کوئی بہن بھائی بھی حیات نہیں ہے۔ آیا اس عورت کا یہ طریقہ شریعت کے اعتبار سے کیسا ہے؟

[سائل: تنویر احمد گلشن اقبال کراچی]

جواب:

صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی زندگی میں اپنی ذاتی ملکیت میں جس طرح چاہے جائز تصرف کرسکتا ہے۔ خواہ وہ تصرف ہدیہ وہبہ کی صورت میں ہو یا وقف کی شکل میں ہو یا کوئی اور جائز صورت ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت اپنی جائیداد کا تمیں فیصد یا کم وبیش حصہ اپنی خواہش کے مطابق جسے چاہے دے سکتی ہے۔ اسی طرح بقیہ حصہ اپنی اولاد کے نام وقف بھی کرسکتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ خاتون اپنی جائیداد کا جتنا حصہ بھی وقف کرنا چاہتی ہے اگر خاص اپنی اولاد کے لیے وقف کرنا چاہتی ہے تو اس میں صرف صلبی اولاد داخل ہوگی۔ یعنی اس کی اولاد کے ختم ہونے پر اولاد کی اولاد اس وقف کی حقدار نہیں ہوگی بلکہ پھر یہ مساکین کا حق کہلائے گا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ''رجل قال ارضی هذه صدقة موقوفة علی ولدی كانت الغلة لولد صلبه يستوی فيه الذكر والانثی واذاجاء هذا الوقف فما دام يوجدواحد من ولد الصلب كانت الغلة له لا غيرفان لم يبق واحد من البطن الاول تصرف الغلة الی الفقراء ولا يصرف الی ولد الولد شيئ''۔

(فتاوی عالمگیری ج ۲ ص ۳۷۳)

اسی طرح علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ ''خانیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں: اگر اولاد پر

وقف کیا مگر نسلاً بعد نسل نہ کہا (یعنی خاص اپنی اولاد کے لیے وقف کیا) تو صرف صلبی کو ملے گا اور صلبی اولاد ختم ہونے پر ان کی اولاد مستحق نہیں ہوگی بلکہ حق مساکین ہے۔

(بہار شریعت حصہ ۱۰ ص ۴۰) واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا

اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب: ۷۱)

الرسول ﷺ یسأل الصحابی ؓ یسأل
والصحابی ؓ یجیب والنبی ﷺ یجیب

نبی کریم ﷺ کے سوالات و جوابات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوالات اور صحابہ کرام کے جوابات اور صحابہ کرام کے سوالات پر حضور کے جوابات کے انداز میں دینی معلومات پر حدیث کی بہترین کتاب

تصنیف

فضیلۃ الشیخ الواعظ

سلمان نصیف الدحدوح

مترجم

حافظ محمد اکرم مجددی

مہتمم دارالعلوم مجددیہ موضع چرنڈ سیالکوٹ

ناشر

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور

إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا

بے شک ہم نے آپکو گواہی دینے والا، ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (الفتح: ۸)

(مترجم)

فقہ السیرۃ

سیرت مصطفیٰ ﷺ سے متعلقہ منضبط علمی تحقیقات
اور ان کی روشنی میں حاصل ہونے والے اصول و احکام اور پند و نصائح

مؤلف
ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی
مترجم
مولانا حافظ محمد عمران انور نظامی
فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

ناشر
فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار، لاہور

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اور نصیحت کیجئے بے شک نصیحت مومنوں کو فائدہ دیتی ہے (الذّٰریٰت: ۵۵)

بُستان الواعظین
و
ریاض السّامعین

امام ابنِ جوزی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ۱۸ وعظ

احوالِ قیامت و میزان، پُل صراط، مقامِ اعراف، حساب و کتاب
جنت و دوزخ، انبیاء و اولیاء کی وفات، فضائلِ رمضان و عاشورہ
اور فضائلِ دُرود و سلام

تصنیف
علامہ عبدالرحمٰن بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ

مُترجم
ڈاکٹر محمد سلیمان قادری
مدرس جامعہ نعیمیہ، لاہور

ناشر
فرید بک سٹال ۳۸۔ اُردو بازار لاہور

تحقیقی و دلکش طباعت
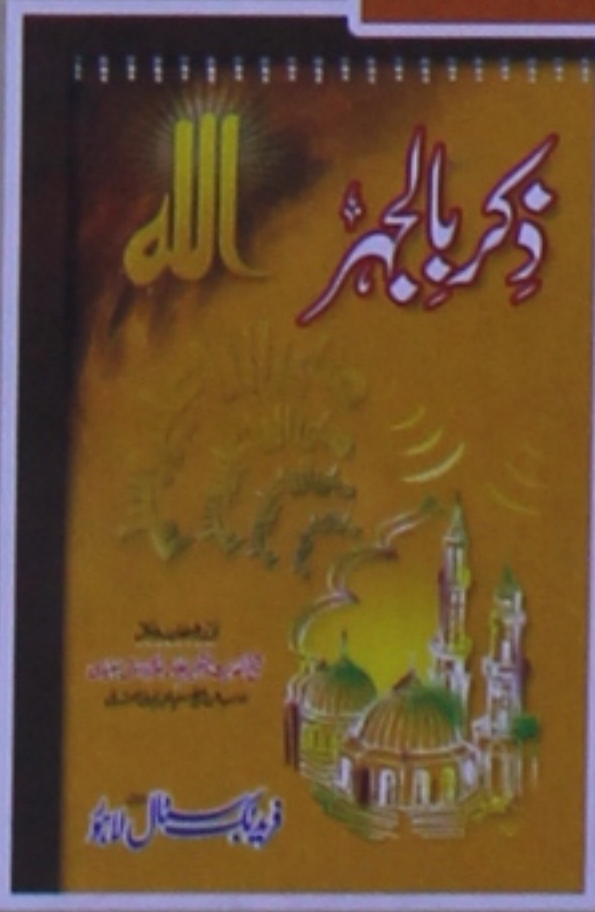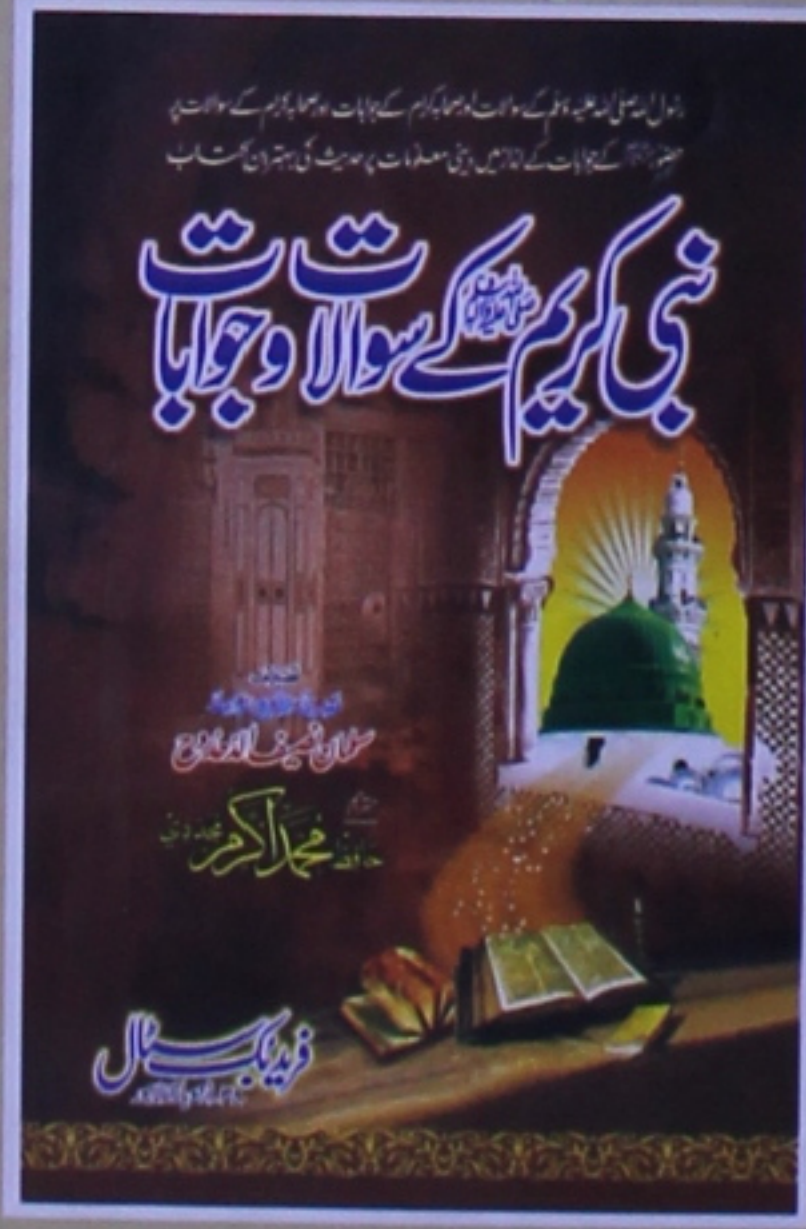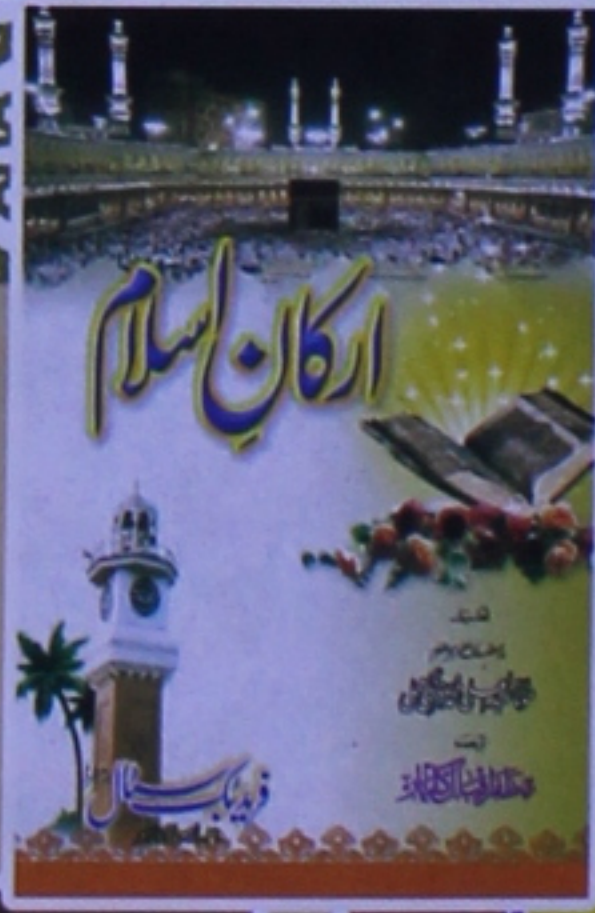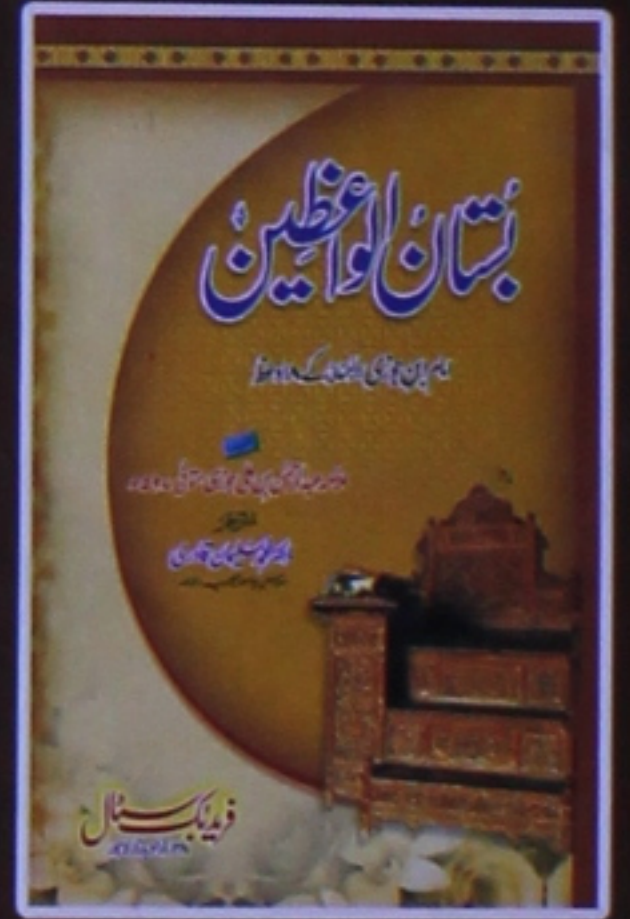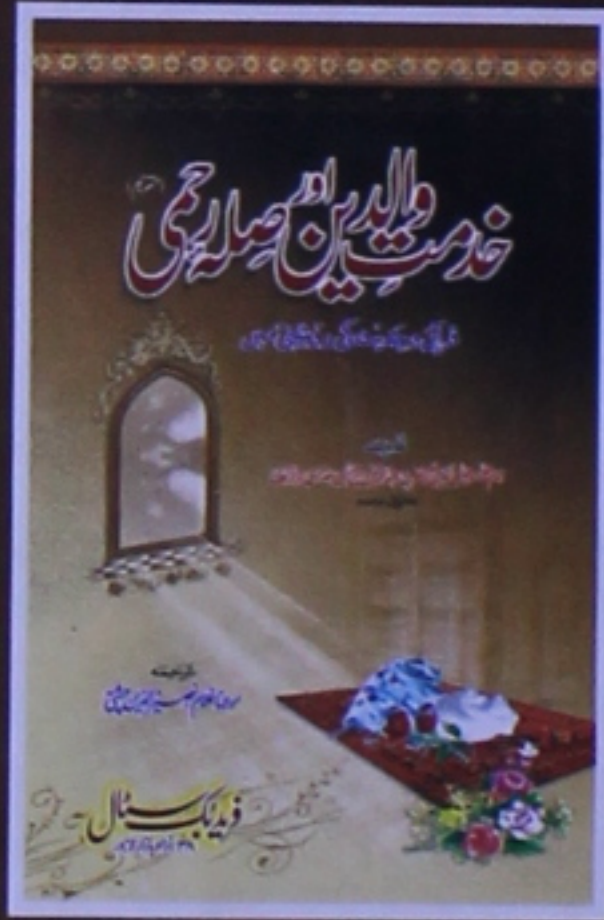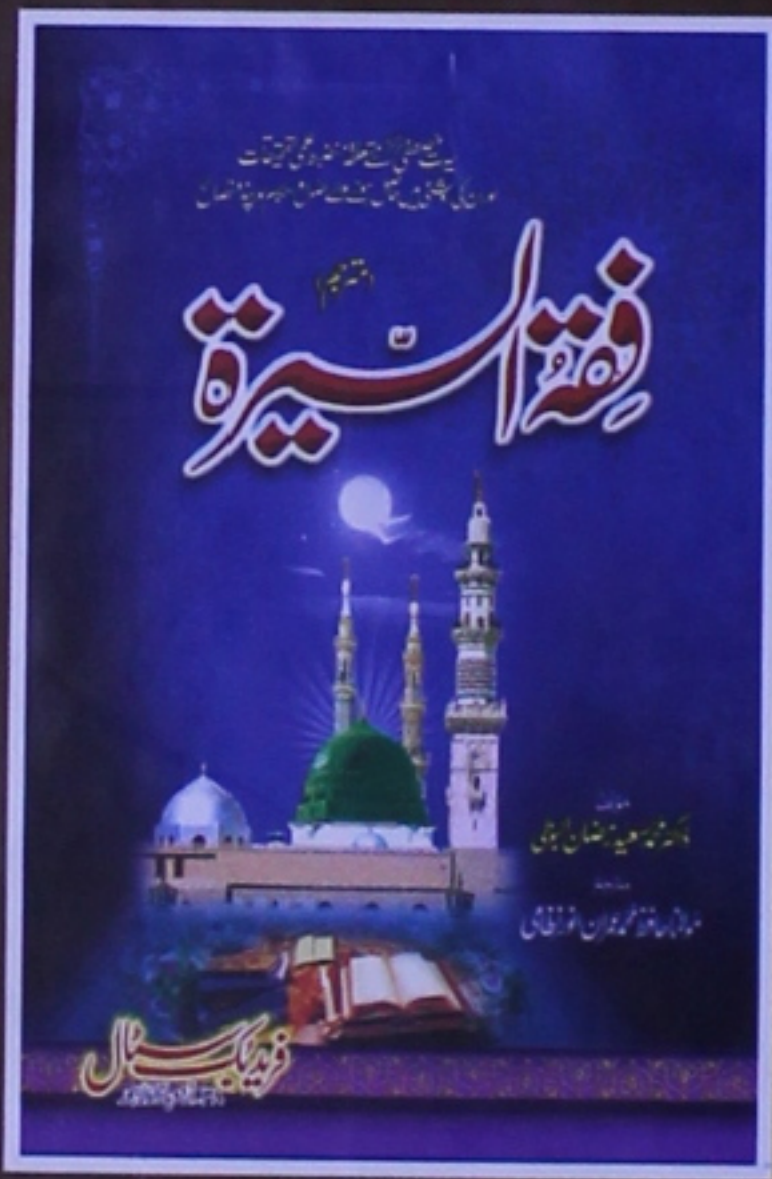
۳۸۔اردو بازار لاہور

E-mail:info@faridbookstall.com

Web Site: www.faridbookstall.com